بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ کتٰب انزلنٰہ الیک مبٰرک لیدبروا اٰیٰتہ ولیتذکر اولوا الالباب

اردو زبان میں ایک جامع تفسیر [illegible] حقائق و معارف
[illegible] اسرار و لطائف [illegible] قرآنیہ [illegible]

مسمیٰ بہ

معارف القرآن

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا الحافظ محمد ادریس صاحب کاندھلوی

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

جلد اول مشتمل بر تفسیر پارہ ۱ ۲ ۳

با ترجمہ [illegible] حضرت شاہ عبدالقادر بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس اللہ سرہما

شائع کردہ

مکتبۃ المعارف

دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور

سندھ، پاکستان

بہ اجازت: مکتبہ عثمانیہ بیت الحمد ۵۴ مہران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

www.ahlehaq.org

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولوی عبداللہ مؤلف تیسیر المنطق سے آپ نے کسب فیض کیا۔ مولانا تھانوی کے مدرسہ میں چونکہ صرف ابتدائی تعلیم کا انتظام تھا اس لیے اعلیٰ تعلیم کے لیے مولانا آپ کو سہارنپور لائے اور مدرسہ عربیہ مظاہر العلوم میں داخل کیا۔ مظاہر العلوم میں آپ نے مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا حافظ عبداللطیف، مولانا ثابت علی جیسے جلیل القدر علماء سے استفادہ کیا اور ۱۹ برس کی عمر میں سند فراغ پائی [illegible] مظاہر العلوم سے سند فراغ حاصل کرنے کے بعد ذوق پیدا ہوا کہ دارالعلوم دیوبند میں بھی جو عالم اسلام کی معتمد ہستیوں کا مرکز تھا، دورۂ حدیث کیا جائے چنانچہ مظاہر علوم سے سند فراغ حاصل کر کے دوبارہ دورۂ حدیث کیا اور محدث عصر امام العصر علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ شبیر احمد عثمانی، میاں اصغر حسین دیوبندی اور مفتی عزیز الرحمن رحمہم اللہ جیسے اجلہ محدثین کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

تدریسی زندگی

۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء سے آپ کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مفتی محمد کفایت اللہ کے قائم کردہ مدرسہ امینیہ دہلی سے آپ نے تدریس شروع کی اور ایک سال بعد ہی اہلیہ دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دیوبند میں تدریس کی دعوت دی۔ اس وقت دارالعلوم دیوبند کی تدریس ایک بڑا اعزاز تھا، مولانا نے اس پیشکش کو قبول کیا اور دیوبند فروکش ہوگئے۔ اتفاقات سے اس اعزاز کا اس طرح [illegible] کی کہ ایک سال قبل جن کبار اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا انہی کے پہلو میں بیٹھ کر ان سے حاصل کردہ فیض کو عام کرنا شروع کر دیا۔ دارالعلوم دیوبند میں تدریس کے حال نو برس میں آپ نے فقہ کی اعلیٰ ترین کتاب الہدایہ، ادب کی ایک اہم کتاب مقامات حریری جیسی مشکل کتب پڑھائیں۔ دارالعلوم دیوبند سے یہ تعلق کم و بیش نو سال قائم رہا، اسی دوران نماز فجر کے بعد روزانہ درس قرآن دیتے جس میں دارالعلوم کے متوسط اور اعلیٰ درجات کے طلباء حتیٰ کہ بعض اساتذہ بھی شریک ہوتے۔ اسی درس کی بنا پر آپ کو بیضاوی اور تفسیر ابن کثیر پڑھانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ ۱۳۴۸ھ میں دارالعلوم چھوڑ کر حیدرآباد دکن آ گئے۔

حیدرآباد دکن میں قیام

حیدرآباد دکن کا نو برس پر مشتمل قیام آپ کی زندگی میں اس اعتبار سے تاریخی گردانا جاتا ہے کہ وہاں قیام کے دوران آپ نے عظیم الشان کتاب التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح کی تالیف کی۔ حیدرآباد دکن میں قیام کے دوران دنیائے علم کے ایک عظیم کتب خانہ، کتب خانہ آصفیہ میں موجود بعض نادر مخطوطات سے استفادہ کیا جن میں تورپشتی کی المفاتیح شرح مصابیح سب سے اہم ہے۔ جس سے آپ نے تصنیف میں استفادہ کیا اور بعض مقامات پر التعلیق الصبیح میں بھی اس کے حوالہ جات موجود ہیں۔ علامہ تورپشتی کی یہ کتاب مصابیح کی ایک جید شرح ہے جس کا مخطوطہ نسخہ دنیا میں صرف کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں

علامہ شبیر احمد عثمانی صدر مہتمم اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند ہوئے تو ان حضرات نے آپ کو بحیثیت شیخ التفسیر دارالعلوم آنے کی دعوت دی جو آپ

www.ahlehaq.org

نے قبول کرلی اور حیدرآباد دکن کے ڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پر سترہ روپے ماہانہ کی دارالعلوم کی مدرسی کو ترجیح دی۔
اور ۱۳۳۹ھ میں دوبارہ دارالعلوم آ گئے۔ دارالعلوم میں یہ قیام ہجرت پاکستان تک تقریباً بیس سال رہا اور وہاں آپ نے تفسیر بیضاوی، تفسیر ابن کثیر، سنن ابی داؤد اور طحاوی کی مشکل الآثار جیسی اہم کتب پڑھائیں۔

پاکستان ہجرت

مارچ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور اس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے حصول کے لیے بھرپور تحریک شروع ہو گئی۔ مولانا نے اگرچہ کھلا تو سیاست میں حصہ نہیں لیا لیکن آپ دو قومی نظریہ کے زبردست حامی تھے۔ سیرۃ المصطفیٰ میں بھی جہاد کی بحث میں دو قومی نظریہ پر مدلل اور مثبت گفتگو کی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرض وجود میں آیا۔ مئی ۱۹۴۹ء میں مولانا نے پاکستان ہجرت کرنے کا ارادہ کر کے بادل ناخواستہ دارالعلوم دیوبند سے استعفیٰ دے دیا۔ اس موقع پر آپ کو دارالعلوم ہاٹ ہزاری چاٹگام (مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش)) کی جانب سے بحیثیت شیخ الحدیث آنے کی دعوت دی گئی لیکن آپ نے مغربی پاکستان آنے کو ترجیح دی اور دسمبر ۱۹۴۹ء میں ریاست بہاولپور کی دعوت پر آپ یہاں آ گئے اور جامعہ عباسیہ بہاولپور میں بحیثیت شیخ الجامعہ تدریسی خدمات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا۔

جامعہ عباسیہ بہاولپور سے وابستگی

۲۵ دسمبر ۱۹۴۹ء کو آپ نے جامعہ عباسیہ میں بحیثیت شیخ الجامعہ چارج لیا۔ جامعہ عباسیہ میں عصری و دینی تعلیم کے اختلاط کی وجہ سے روحانیت اور للہیت نہ تھی جو دینی مدارس کا خاصہ ہوتی ہے، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کو وہاں کا یہ ماحول اور دنیوی دوڑ پسند نہ آئی اور جلد ہی طبیعت میں تکدر پیدا ہو گیا۔

جامعہ اشرفیہ لاہور سے تعلق

۱۹۵۱ء کے اوائل میں مولانا جامعہ اشرفیہ کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ دوران خطاب فرمایا، مولانا مفتی محمد حسن کی نظر انتخاب نے مولانا کو جامعہ اشرفیہ کے شیخ الحدیث کے طور پر منتخب کر لیا۔ چنانچہ بہاولپور واپس جانے کے بعد ایک خط میں مولانا کو جامعہ اشرفیہ آنے کی دعوت ان الفاظ میں دی۔

"میں آپ کو پلاؤ اور بریانی چھوڑ کر دال ساگ کی دعوت دے رہا ہوں"

مولانا نے دال روٹی کی اس مخلصانہ دعوت کو بصد اخلاص قبول کیا۔ مفتی صاحب نے دل کی گہرائیوں سے جو بات کہی تھی وہ مولانا کے دل پر اثر کر گئی اور مولانا ۱۰ اگست ۱۹۵۱ء کو جامعہ عباسیہ سے کنارہ کش ہو کر جامعہ اشرفیہ آ گئے اور پھر عمر عزیز کے آخری لمحے تک جامعہ اشرفیہ سے اپنا تعلق قائم رکھا۔

☆ ☆ ☆

الفتح السماوی بتوضیح تفسیر البیضاوی

ساتویں صدی ہجری کے مفسر قرآن قاضی ناصر الدین ابو الخیر عبداللہ بن عمر الشیرازی البیضاوی م ۶۸۵ھ کا نام علم تفسیر میں کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی مرتب کردہ تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل ہمیشہ علماء مفسرین کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے اور اس پر متعدد تعلیقات لکھی گئیں اور بہت سی شروح لکھی گئیں۔ ۲۰ شوال [illegible]ھ کو اس کتاب کی تصنیف کا آغاز کیا گیا یہ تفسیر ابھی زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی اور اس کا واحد مخطوطہ [illegible] التحقیق میں موجود ہے۔

بیضاوی کی توضیح اور اس کے ادق نکات کی تشریح میں یہ کتاب ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ طوالت واطناب سے گریز کیا گیا ہے اور بقدر ضرورت اختصار سے کام لیا گیا کہ بیضاوی کے دقیق نکات وضاحت طلب نہ رہ جائیں۔ اس مسودہ کی تدوین کے بعد اگر موزوں سائز پر طبع کرایا جائے تو تقریباً چار ہزار صفحات اس کی ضخامت ہوگی۔

مقدمۃ التفسیر

اصول و تاریخ تفسیر پر ایک جامع اور مفصل رسالہ ہے جو ابھی تک مخطوطہ کی شکل میں ہے۔

علم حدیث: تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری

بخاری کے مشکل مقامات خصوصاً تراجم ابواب جو امام بخاری کی ایک امتیازی شان ہے، کی توضیحات پر مشتمل ہے۔ اس کے تین اجزاء طبع ہو چکے ہیں جبکہ بقیہ اجزاء ابھی طبع نہیں ہو سکے۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب کی کتاب مشکوٰۃ المصابیح مجموعہ حدیث میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے۔ علماء نے اس کتاب کی جس قدر شروح لکھی ہیں، شاید کسی اور کتاب کو یہ سعادت حاصل نہ ہوئی ہو۔ مولانا نے اس کتاب میں مشکوٰۃ کی عمدہ اور آسان زبان میں بلیغ پیرایہ میں توضیح و تشریح کی ہے۔ مولانا کی حیات میں اس کتاب کے چار اجزاء دمشق اور باقی چار اجزاء پاکستان میں شائع ہوئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد یہ کتاب از سر نو [illegible] جلدوں میں مکمل طبع ہوئی ہے۔

حجیت حدیث

حدیث کی قطعیت، اس کی حجیت اور اس کا تعبد شرعی ہونا، اس پر مولانا نے اپنی اس کتاب میں دلائل عقلیہ و نقلیہ سے بڑی عمدہ بحث کی ہے اور یہ کتاب منکرین حدیث کے لیے ایک مسکت جواب ہے۔

علم عقائد و کلام — الکلام الموثوق فی ان کلام اللہ غیر مخلوق

قرآن کے کلام الٰہی ہونے اور کلام الٰہی کے غیر مخلوق اور قدیم ہونے پر مولانا نے اس رسالہ میں بھرپور علمی، تحقیقی اور مدلل گفتگو کی ہے اور معتزلہ و فلاسفہ کے تمام نظریات کی تردید کی ہے۔

احسن الحدیث فی ابطال التثلیث

عیسائیت کے نظریہ تثلیث کی تردید، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت و بشریت پر ایک عظیم تحقیق ہے۔ عیسائیت کے خلاف مولانا کے متعدد رسائل ہیں جن کو تدوین و تعلیق کے بعد شائع کیا جائے اور قوم کے ان بچوں کو پڑھایا جائے جو عیسائی مشنری سکولوں میں پڑھ کر اپنے ایمان و اسلام کو ضائع کر رہے ہیں۔

عقائد اسلام

دین اسلام کے بنیادی و اساسی عقائد جن میں توحید، رسالت، قیامت اور دیگر ایمانیات شامل ہیں پر مشتمل اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے جو اس سلسلہ میں علمی بحث پر مشتمل ہے۔

علم الکلام

مذہب اسلام کی خصوصیات، احوال قیامت، جنت و جہنم، عالم برزخ اور خالق کائنات کے وجود پر مدلل و محکم بحث پر مشتمل ہے۔

دستور اسلام

اسلامی نظام حکومت کے بیان پر مشتمل ایک اہم کتاب ہے جس میں اسلامی نظام انتخاب، اقتصادی نظام اور تعلیمی نظام پر بحث کی گئی ہے اور نظام حکومت کی بنیادوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

خلافت راشدہ

صحابہ کی عظمت پر ایمان، عقائد اسلامی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے، مولانا نے اپنی اس کتاب میں خلافت راشدہ پر علمی بحث کی ہے۔

سیرۃ المصطفیٰ

مولانا کی تصانیف دینی و علمی میں سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ایک تابندہ ستارے کی مانند ہے۔ آپ کی تصانیف میں سب سے زیادہ قبولیت عامہ سیرۃ المصطفیٰ کو حاصل ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں "ہر شخص اردو کی ضروری استعداد رکھتا ہو کتاب مذکور کے مطالعہ کی برکت سے محروم نہ رہے"۔ ان کتب کے علاوہ مولانا کی بہت سی دیگر تالیفات ہیں جن کو خوف طوالت سے ترک کر دیا گیا۔

محمد سعد صدیقی

حضرت کاندھلویؒ کے دست مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ
وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ ذٰلِكَ مِنْ
اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ
الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا
لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ۭ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ
حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۭ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ لِلَّذِيْنَ
لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا
عَلَيْهَآ اٰبَاۗءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا ۭ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ

حضرت کاندھلوی کے دست مبارک سے لکھا ہوا صفحہ

لطائف و معارف

اس آیت سے حضرت ابوبکر صدیق کی جو فضیلت نکلتی ہے
وہ بالکل ظاہر ہے واقعی واقعہ غار میں ان کی جان نثاری قابل صد
آفرین ہے یار غار کی مثل جو دنیا میں مشہور ہے وہ یہیں سے
چلی ہے حضرت عمر فرمایا کرتے تھے کہ اگر ابوبکر مجھ سے وقت غار
کی فضیلت دیدیں اور مجھ سے تمام عمر کی عبادت اور نیکیاں لے لیں
تو میں اس پر راضی ہوں

امت مرحومہ کا اتفاق اس پر آنا تھا کہ اس وقت آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق غار صرف حضرت صدیق تھے
حتی کہ مخالفین بھی اس کے مقر اور معترف ہیں لہٰذا یہ ایک
ایسی فضیلت ہے جو حضرت صدیق کی شان عظمت کو واضح کر رہی ہے
اور اگر [illegible] ان کو شرف قبولیت حاصل نہ ہو تو ان کی اس فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ عَبْدِہٖ وَرَسُوْلِہٖ سَیِّدِ
الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَذُرِّیَّاتِہٖ اَجْمَعِیْنَ
وَعَلَیْنَا مَعَھُمْ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

حمد ہے تجھ کو اور سب تعریفیں بے قیاس خاص تیرے ہی لئے ہیں اے خداوند ذوالجلال کہ تو نے ہم کو وجود عطا کیا اور ایمان اور اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا اور سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہم کو پیدا کیا اور قرآن جیسی کتاب نازل فرمائی جو روشن ہے اور اظہار ما فی الضمیر و بیان کے لئے زبان عطا کی تاکہ تیرا کلام پڑھ سکیں اور تیرا شکر ادا کر سکیں اور تیرے حکموں کو کانوں سے سن سکیں اور سمجھ سکیں اور ہزاراں ہزار بے حد سلام و درود تیرے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جن کے ذریعہ ہم ناکاروں اور ناسمجھوں کو تیرا پیغام پہنچا اور جن کے ذریعہ ہم گمگشتگان راہ کو تجھ تک پہنچنے کا راستہ معلوم ہوا اور ہزاراں ہزار رحمتیں اور برکتیں ہوں آنحضرت کے آل و اصحاب پر جنہوں نے بلا کم و کاست نہایت امانت و دیانت اور کمال حفاظت کے ساتھ تیرے کلام کو اور تیرے پیغام اور تیرے دین کو اور تیرے رسول کی شریعت کو لوگوں تک پہنچایا اور دنیا میں تیرے دین کا ڈنکا بجایا اور تیرے دشمنوں سے جہاد و قتال کیا اور تیری راہ میں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کو پانی کی طرح بہایا اور اپنے ماں باپ اور اہل و عیال کو تجھ پر اور تیرے رسول پر قربان کیا حتیٰ کہ تیرے دین کو سربلند کیا اور کفر کو سرنگوں کیا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

اور ہزاراں ہزار رحمتیں ہوں ان علماء دین پر جنہوں نے تیرے عطا کردہ نور فہم اور نور تقویٰ سے کتاب و سنت کے حقائق و دقائق کو اور شریعت کے لطائف و معارف کو ایسا روشن کیا کہ جس کو دیکھ کر دنیا حیران ہے اور کسی امت میں یہ جرأت نہیں کہ وہ امت محمدیہ جیسے مفسرین اور محدثین اور فقہاء اور متکلمین اور اولیاء اور عارفین کے مقابلہ میں توریت و انجیل کا مفسر اور محدث اور فقیہ اور متکلم اور صوفی اور محقق پیش کر سکے کہ وہ علماء اسلام کی طرح توریت و انجیل کی تفسیر کرتا ہو اور توریت و انجیل کی روشنی میں اپنے ہم مذہبوں کو فتوے دیتا ہو اور حلال و حرام سے آگاہ کرتا ہو۔ یہود و نصاریٰ میں اگر کچھ ہمت ہے تو گزشتہ ادوار کے کسی گوشہ میں توریت اور انجیل کا کوئی یکتا عالم یا نمونہ مفسر اور محدث اور مفتی ہو تو نکال کر

اور بے نظیر ہے اور ہر طرح سے قابل اطمینان اور قابل وثوق و اعتماد ہے اور علماء ربانیین کے نزدیک مستند اور معتمد ہے شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے علاوہ ترجمہ کے مختصر اور ضروری فوائد بھی لکھے ہیں جو مشکلات میں مشعل راہ کا کام دیتے ہیں اور جن مشکل مقامات میں اکابر علماء کا قلم خاموش نظر آتا ہے وہاں شاہ عبدالقادر کا قلم بولتا ہے اور بلا مبالغہ اس شعر کا مصداق نظر آتا ہے ؎

[illegible]

اور اس ترجمہ کا نام "موضح القرآن" رکھا جو اس کی صفت بھی ہے اور تاریخی بھی۔ شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۳۰ھ میں بمقام دہلی وفات پائی۔[۱]

دوسرا اردو ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کے بھائی شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی متوفی ۱۲۳۳ھ نے کیا مگر شاہ رفیع الدین کا ترجمہ تحت اللفظ تھا کہ جو ترتیب الفاظ قرآن کی ہے وہی ترتیب اردو ترجمہ کے الفاظ کی رہے تاکہ کم استعداد والے کو یہ معلوم ہو سکے کہ کس لفظ کا ترجمہ ہے اسی امر کو ملحوظ رکھ کر شاہ رفیع الدین نے لفظی ترجمہ فرمایا اور یہ امر ایک مترجم کیلئے بہت مشکل ہے کہ اردو ترجمہ میں الفاظ قرآنی کی ترتیب بھی ملحوظ رہے اور حتی الامکان اردو زبان کی فصاحت بھی ملحوظ رہے الغرض اس مصلحت کی بنا پر شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی تھا اور شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بامحاورہ تھا کہ قرآن کا سمجھنا آسان ہو جائے اور مطلب بخوبی ذہن میں آجائے کیونکہ جو سہولت فہم بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے وہ لفظی ترجمہ سے حاصل نہیں ہو سکتی اگرچہ تحت اللفظ ترجمہ کرنے والے کو ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا یہ بھی بہت بڑا کمال ہے جیسی آسانی سے مطلب سمجھا جو بامحاورہ ترجمہ سے نکلتا ہے وہ تحت اللفظ ترجمہ سے ممکن نہیں غرض یہ کہ شاہ عبدالقادر نے بامحاورہ ترجمہ کیا جو عجب شان رکھتا ہے کہ جس کے الفاظ، فصاحت و بلاغت کے دریا میں کوزے بھرے ہیں اور اس کے تحت معانی کا ایک سمندر موجزن ہے۔ کسی بزرگ کا قول ہے کہ اگر قرآن اردو زبان میں نازل ہوتا تو انہی محاورات اور الفاظ کے لباس میں نازل ہوتا جو شاہ عبدالقادر نے استعمال کئے ہیں اسی عرصہ میں شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادہ شاہ عبدالعزیز نے ۱۲۰۸ھ میں فارسی زبان میں ایک مبسوط تفسیر لکھنی شروع کی جو حقائق و معارف میں بلاشبہ امام رازی کی تفسیر کبیر کا نمونہ تھی کاش کہ مکمل ہو جاتی مگر افسوس کہ مکمل نہ ہو سکی ایک حصہ میں صرف پارہ الم اور پارہ سیقول کی آیت [illegible] تک تفسیر آئی اور دوسرے حصہ میں پارہ تبارک الذی اور پارہ عم کی تفسیر آئی درمیان قرآن کی تفسیر نہ ہو سکی اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو بلا مبالغہ اس تفسیر کی نظیر نہ ہوتی جیسا کہ تفسیر عزیزی کے موجودہ حصہ کو دیکھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایسے دقیق اور عمیق مسائل کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آسکتے۔

---

[۱] مرأۃ التفسیر کے مصنف مولانا عبدالقادر [illegible] شاہ عبدالقادر کی تاریخ وفات ۱۲۳۰ھ لکھی ہے اور صاحب حدائق الحنفیہ نے یہ لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب نے ۱۲۴۰ھ میں وفات پائی اور [illegible] ۔ دیکھو حدائق الحنفیہ [illegible] واللہ اعلم

شاہ عبدالعزیزؒ نے ۱۲۳۹ھ میں وفات پائی۔ نمازِ جنازہ بیرونِ شہر دہلی ادا کی گئی۔ اطراف و اکناف سے آنے والوں کے ہجوم کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا۔ پچپن مرتبہ نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ اور دہلی کے ترکمان دروازہ کے باہر اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

غرض یہ کہ ہندوستان میں فارسی اور اردو میں ترجمہ اور تفسیر لکھنے کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے وقت سے شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۵۱ھ میں فارسی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا جس کا نام "فتح الرحمٰن" رکھا اور ۱۱۷۶ھ میں وفات پائی۔ "مقتدائے وقتیہ" مسلمانی تاریخ وفات ہے۔

تفسیر قرآن کا اصل وہ بنیادی پتھر ہے کہ وہ صحیح ترجمہ ہو جو قواعد عربیت اور قواعد شریعت کے بالکل مطابق ہو۔ حسن اتفاق سے ہندوستان میں تفسیر قرآن کا یہ سنگِ بنیاد یعنی صحیح ترجمۂ قرآن، شاہ ولی اللہ اور ان کے دونوں صاحبزادے حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے ہاتھوں رکھا گیا اور ہندوستان میں یہ خیر کثیر (ترجمہ قرآن کریم) اس مبارک باپ اور مبارک بیٹوں کے ہاتھوں سے جاری ہوا اور یہی تین ترجمے اردو زبان میں تفسیر قرآن کے لئے سنگ بنیاد ہیں اور ہندوستان میں کوئی عالم ان ترجموں سے بہتر ترجمہ نہ کر سکا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ عن الاسلام والمسلمین خیراً آمین یا رب العالمین۔

غرض یہ کہ یہ حضرات ترجمۂ قرآن کے بانی اور امام ہیں اور علوم و معارف میں تمام ہندوستان کے استاذ ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اگر یہ تین ترجمے نہ ہوتے تو ہر کس و ناکس کو ترجمہ کا حوصلہ بھی نہ ہوتا اس لئے کہ کسی کے کلام اور مطلب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں ادا کرنے کا نام ترجمہ ہے اور یہ کام نہایت دشوار ہے جب تک مترجم دونوں زبانوں کے لغات اور محاورات اور استعارات و کنایات اور حقیقت و مجاز اور صاحب کلام سے پورا واقف نہ ہو تو ترجمہ نہیں کر سکتا ہر کس و ناکس کا تو ذکر کیا ہے۔ اگر ان حضرات کے یہ تراجم نہ ہوتے تو بڑے سے بڑے علماء کو ترجمہ دشوار ہو جاتا اور شاید بڑی بڑی تفاسیر کے مطالعہ کے بعد بھی ایسا ترجمہ نہ کر سکتے۔ ان حضرات جیسا فہم اور نورِ تقویٰ کس کے پاس ہے جو ان جیسا ترجمہ کر سکے۔ ان تین ترجموں کے بعد جس کسی نے بھی قرآن کا ترجمہ کیا سوائے اس کے نہیں کہ شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کے ترجموں کی مدد اور سہارے سے کیا۔ حق جل شانہ نے اپنے کلام پاک کی اس خدمت یعنی ترجمہ کے لئے سرزمین ہندوستان سے شاہ ولی اللہ اور ان کے بیٹوں کو منتخب فرمایا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔

بحمدہٖ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ پہلی منزل یعنی ترجمہ کی منزل طے ہوگئی اور ہندوستان کے مسلمان

عہ شاہ عبدالعزیز کا تاریخی نام "غلام حلیم" ہے جس سے ۱۱۵۹ھ حاصل ہوتا ہے یہی آپ کا سن ولادت ہے۔ تحفۂ اثنا عشریہ کے دیباچہ میں غلام حلیم کہا گیا ہے۔ جو کہ مؤلف کتاب ظاہر کیا ہے [illegible]: بیٹے زیادہ علم والد ماجد شاہ ولی اللہ سے حاصل کئے اور ان کی وفات کے بعد [illegible] سال کی عمر میں وفات پائی۔

کے ہاتھوں میں یہ ان تین علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے تین نہایت صحیح اور بے مثال ترجمے پہنچ گئے تو اب اس منزل کے طے ہو جانے کے بعد ضرورت اس کی تھی کہ اردو زبان میں قرآن کریم کی کوئی مختصر اور جامع تفسیر لکھی جائے جس میں فقط حل مطالب اور ربط آیات کو قدرے اہتمام کیا جائے اور شیخ جلال الدین سیوطیؒ کی طرح اقوال مختلفہ میں سے ارجح الاقوال پر اکتفا کیا جائے اور لطائف و نکات اور مذاہب باطلہ کی تردید کی تفصیل سے گریز کیا جائے تاکہ عوام اس سے نفع اٹھا سکیں۔

یہ خدمت اور یہ سعادت من جانب اللہ حکیم الامت حضرت مولانا حافظ محمد اشرف علی صاحب تھانوی متوفی ۱۳۶۲ھ قدس اللہ سرہ کے حصہ میں آئی اور بیان القرآن کے نام سے ۱۳۲۶ھ میں ایک تفسیر لکھی جو اپنی افادیت اور جامعیت اور مقبولیت میں ترقی سے شہرت تک پہنچ گئی۔

اور اسی زمانہ میں "بیان القرآن" سے کچھ عرصہ پہلے حضرت مولانا عبدالحق صاحب دہلوی نے "فتح المنان" کے نام سے ایک تفسیر لکھی جو تفسیر حقانی کے نام سے مشہور ہے جس میں مختصر حل القرآن و توضیح مطالب کے علاوہ یہود و نصاریٰ اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید بھی فرمائی اور فلسفہ قدیم و جدید کے اعتراضات کے تشفی بخش جوابات دیئے یہ تفسیر بھی بحمد اللہ تعالیٰ بہت مقبول ہوئی اور گم گشتگان راہ کے لیے مشعل ہدایت بنی مگر تفسیری حیثیت سے مطالب قرآنیہ کی بابت استیعاب توضیح اور مسلسل تشریح کا اور ربط آیات اور حل مشکلات اور بیان معانی میں جو نرالی شان "بیان القرآن" کو حاصل ہوئی وہ اردو زبان میں کسی اور تفسیر کو حاصل نہیں ہوئی وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ۔

اور اسی طرز پر ایک نہایت مختصر اور جامع تفسیر جو جدید شبہات کے قلع قمع کے لیے کافی اور شافی ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی قدس اللہ سرہ نے لکھی جو نہایت مقبول ہوئی۔ اور فصاحت و بلاغت اور حسن تعبیر کے اعتبار سے بھی بے نظیر ہے۔

بحمد اللہ تعالیٰ جب فہم قرآن کی یہ دو منزلیں طے ہو گئیں اول صحیح ترجمہ دوم مختصر اور جامع تفسیر جس سے قرآن کریم کے مطالب اور معانی بخوبی و آسانی سمجھ میں آ سکیں تو اب ضرورت اس کی ہوئی کہ بیان القرآن کے طرز پر ایک ایسی تفسیر لکھی جائے جو مطالب قرآنیہ کی توضیح و تشریح اور ربط آیات کے علاوہ قدرے احادیث صحیحہ اور اقوال صحابہ و تابعین پر اور بقدر ضرورت لطائف و معارف اور نکات اور حل مشکل کی تحقیقات اور ملاحدہ و زنادقہ کی تردید اور ان کے شبہات اور اعتراضات کے جوابات پر بھی مشتمل ہو تاکہ کلام خداوندی کی عظمت و شوکت اور اس کی جامعیت اور اس کے عجائب کے کچھ نمونے نظروں کے سامنے آ جائیں پھر یہ کردہ ترجمہ اور تفسیر سلف صالحین کے مسلک سے ذرہ برابر ہٹا ہوا نہ ہو عہد نبوت اور عہد صحابہ و تابعین سے لے کر اس وقت تک امت کے علماء ربانیین اور راسخین فی العلم نے جس طرح قرآن کریم کا مطلب سمجھا ہے اسی طرح اس امانت کو بلا کسی خیانت کے مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے اور کسی جگہ بھی اپنی رائے اور خیال اور نظریہ کو قرآن کے بہانہ سے پیش کر کے مسلمانوں کو دھوکا اور فریب نہ دیا جائے جیسا کہ

آج کل آزاد منشوں کا یہ طریقہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیریں لکھ کر اس لیے شائع کر رہے ہیں کہ تاویل و تحریف کے ذریعہ قرآنی تعلیمات کو مغربی تہذیب و تمدن کے مطابق کر دیں۔ ان آزاد مفسروں کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ لفظ تو عربی ہوں اور معنی مغربی ہوں اور یورپ کے ملحدین کے خیالات باطلہ کو قرآن کے نام سے مسلمانوں میں پھیلایا جائے۔ غرض یہ کہ یہ گروہ قانون خداوندی کو مسخ کر رہا ہے اور اپنے حسب منشاء قرآن کے معنی گھڑ کر لوگوں میں شائع کر رہا ہے۔ انتہیٰ ملخصاً۔

اے مسلمانو! خوب سمجھ لو یہ گروہ قرآن کریم کا مترجم اور مفسر نہیں بلکہ یورپ کے نفسانی تمدن کا مترجم اور مفسر ہے ان سے بچتے رہنا۔ ناچیز نے مسلمانوں کو اس فتنہ سے بچانے کے لیے تفسیر لکھنی شروع کی کہ جیسا مطلب قرآن کریم کا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین نے سمجھا ہے وہی مسلمانوں کے سامنے پیش کر دے تاکہ لوگ صحیح تفسیر قرآن کو سمجھ سکیں اور صحیح طور پر اس پر عمل کر سکیں بغیر علم و تقویٰ کے قول صحیح ممکن نہیں ہے یہ ناچیز سلف صالحین کے اتباع کو سعادت سمجھتا ہے اور سلف کے مسلک سے ہٹ کر تفسیر کو ضلالت اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت سمجھتا ہے۔

تو مباش اصلاً کمال اینست و بس　　تو در و گم شو وصال اینست و بس

بحمد للہ تعالیٰ اس فقیر و حقیر نے اسی التزام کے ساتھ تقریباً ۱۳۶۲ھ میں تفسیر لکھنی شروع کی مگر دیگر مشاغل کی بنا پر یہ پابندی نہ ہو سکی جب موقع ملا کچھ لکھ لیا۔ اور ارادہ یہ کیا کہ جس طرح صحابہ و تابعین اور سلف صالحین نے قرآن کریم کو سمجھا ہے بعینہٖ اسی طرح اس کو مسلمانوں تک پہنچا دیا جائے شریعت اور طریقت کے نفسانی تفصیلوں سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کے مدلول اور مفہوم کو نہ بدلا جائے۔

اور "معارف القرآن" اس تفسیر کا نام رکھا گیا اور رمضان المبارک ۱۳۶۳ھ میں سورۂ نساء کے ختم تک ہو چکی و للہ الحمد والمنۃ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور عنایت سے باقی کی تکمیل فرمائے اور قبول فرمائے۔ آمین

احسن حقیر و فقیر کی یہ تفسیر گداگروں کی جھولی کی طرح ہے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے نوالوں سے لبریز ہے اور فقیروں کی گدڑی کی طرح ہے جس میں ناظرین کو رنگ برنگ کے پیوند نظر آئیں گے۔ اگر کوئی اس گداگر سے یہ دریافت کرے کہ تیرے پاس یہ قسم قسم کے کھانے اور رنگ برنگ کے اطعمہ و اثواب کے ٹکڑے کہاں سے میسر آئے تو یہ ناچیز جواب میں یہ عرض کرے گا کہ میں تو گداگر ہوں گداؤں بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر بھیک مانگنے کے لیے جاتا ہوں وہاں سے بھیک میں جو کھانے مل جاتے ہیں وہ لا کر دوستوں کے سامنے رکھ دیتا ہوں جس کو جو لقمہ اور جو نوالہ خوش ذائقہ معلوم ہو نوش جان کرے اور جو مرغوب طبع نظر آئے وہ تناول کرے۔ یہی حال اس ناکارہ کے نوالے کا ہے کہ اس تفسیر میں جو کچھ بھی علم ہے وہ سب کا سب خسروان علم و حکمت کے دروازوں سے ملی ہوئی بھیک ہے جو ایک دریوزہ میں جمع کر دی گئی ہے اور اکثر و بیشتر ان دروازوں کے نام بھی بتلا دیئے ہیں جہاں سے یہ فقیر بھیک مانگ کر لایا ہے تاکہ جسے اور کچھ مانگنا منظور ہو تو وہ خود ان دروازوں پر پہنچ جائے۔ اس بالاجمال

حقیقت کے بعد امید ہے کہ جناب کریم اس ناچیز کو اس تالیف میں بیک ترجمان سمجھانے والے سے زیادہ نہ سمجھیں گے ۔ اور نگاہ و بنگاہ اس شعر و بیمن کریم و فرق نصیحت ہے وہ اور مغفرت سے نوازیں گے ۔ آخر حرف خادم و ترجمان سمجھتے ۔ اور اس پر کھا لے اگر چہ اس کا بھی کچھ حق ہے ۔ علمی شعر و بیمن کا حق یہ ہے کہ اس کے لیے یہ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازیں اور آخرت کی ذلت اور ندامت سے محفوظ رکھیں ۔ آمین

عرض حال کے بعد اب یہ ناچیز اپنے قدرت پروردگار سے بصد ہزار عجز و نیاز ملتجی ہے کہ اس تفسیر کو اس فقیر و حقیر کے ہاتھ سے تکمیل کو پہونچائے اور اس کو قبول فرمائے ۔ آمین ثم آمین ۔ اور میرے لیے اور میرے والدین کے لیے اور میری اولاد جسمانی اور روحانی کے لیے خصوصاً اور عام مسلمانوں کے لیے عموماً مفید اور نافع اور مشعل ہدایت بنائے ۔ آمین ۔ اور اس تحریر سراپا تقصیر کو اس فقیر و حقیر کے لیے زاد معاد اور توشۂ آخرت اور ذخیرۂ عاقبت اور ذریعۂ مغفرت اور سرمایۂ سعادت بنائے آمین یا رب العالمین

ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

در قیامت ہر کہ در دست آورد نامہ　　من نیز حاضر می شوم تفسیر قرآن در بغل

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

بندۂ ناچیز

محمد ادریس کان اللہ لہ وکان ہو للہ ووفقہ لما یحب ویرضاہ وجعل آخرتہ خیراً من اولاہ ۔ آمین

۲۴ شوال المکرم ۱۳۸۲ھ ہجری

جامعہ اشرفیہ لاہور
پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین جلد اوّل تفسیر "معارف القرآن"

سُورۂ فاتحہ و بقرہ

www.ahlehaq.org

پارہ ۳ تلک الرسل

www.ahlehaq.org

(۱) سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ (۵) آیاتہا ۷ رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

سب تعریف اللہ کو ہے جو صاحب سارے جہان کا بہت مہربان نہایت رحم والا

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ

مالک انصاف کے دن کا تجھ ہی کو ہم بندگی کریں اور تجھ ہی سے

نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾

مدد چاہیں چلا ہم کو راہ سیدھی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ

راہ ان کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر

الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۶﴾

غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے۔

سُورۂ فاتحہ کی تفسیر

سورۂ فاتحہ جمہور علماء کے نزدیک مکی ہے بعض علماء اس کے مدنی ہونے کی طرف

لہ مترجم محمود یعنی عالم انس و عالم جن و عالم ملائکہ و علیٰ ہذا القیاس۔ روح المعانی

گئے ہیں مگر یہ قول شاذ ہے۔ ابتداء بعثت میں سب سے پہلے اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ کی چند آیتیں نازل ہوئیں جیسا کہ صحیحین میں ہے اور چند روز کے بعد پوری سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور ابونعیم اور بیہقی کی دلائل النبوت میں عمرو بن شرحبیلؒ سے مرسلاً مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو غیب سے کچھ آوازیں سنتا ہوں خدا کی قسم مجھ کو اپنی جان کا اندیشہ ہے۔ حضرت خدیجہ نے فرمایا معاذ اللہ خدا تعالیٰ کبھی آپ کے ساتھ ایسا نہ کرے گا خدا کی قسم آپ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اتفاق سے اسی وقت ابوبکرؓ آگئے۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا اے ابوبکر تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لیکر ورقہ کے پاس جاؤ اور یہ واقعہ بیان کرو چنانچہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے حال دریافت کیا اس پر آپ نے یہ فرمایا۔

فقال اذا خلوت وحدی سمعت نداءً خلفی یا محمد یا محمد فانطلق هاربا فی الارض فقال لا تفعل اذا اتاک فاثبت حتی تسمع ما یقول ثم ائتنی فاخبرنی فلما خلا ناداه یا محمد قل بسم الله الرحمٰن الرحیم. الحمد لله رب العلمین حتی بلغ ولا الضالین قال قل لا اله الا الله فاتی ورقة فذکر ذلک له فقال له ابشر ثم ابشر فانی اشهد انک الذی بشر به ابن مریم وانک علی مثل ناموس موسیٰ وانک نبی مرسل الحدیث (تفسیر درمنثور بحوالہ قرطبی ص۱۱ ج۱)

کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز یا محمد یا محمد سنتا ہوں جس کی وحشت سے بھاگنے لگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا مت کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر مجھ کے پاس آکر مجھ کو خبر دو۔ چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے کہ آواز آئی۔ اے محمد یہ پڑھئے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم الحمد للہ رب العلمین الی آخر السورۃ اس کے بعد کہا لا الٰہ الا اللہ کہو آپ یہ سب سن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ ذکر کیا۔ ورقہ نے کہا اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو تحقیق میں گواہی دیتا ہوں کہ تم بلاشبہ وہی نبی ہو کہ جن کی عیسیٰ بن مریم نے بشارت دی ہے اور تمہاری شریعت موسیٰ کی شریعت کے طرز پر ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسل ہو۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ سورت ابتداء بعثت کے چند روز بعد اتری ہے کہ جب خدیجۃ الکبریٰ اور ابوبکر صدیق مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اور ورقہ بن نوفل ابھی بقید حیات تھے۔ ابتداء بعثت میں نزولِ وحی کی شدت اور اس کی عجیب و غریب کیفیت کی وجہ سے جو اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی اور نہ سنی تھی آپ پر ایک خاص خشیت اور وحشت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب آدمی پر کوئی خاص کیفیت اور شدت طاری ہوتی ہے تو دل کی تسلی اور تشفی کے لیے اپنے محرم خاص اور محب باختصاص سے ذکر کرتا ہے تاکہ دل کو سکون اور اطمینان ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت خدیجہؓ سے ذکر کرنا اور ورقہ کے پاس جانا محض اس لیے تھا کہ یہ محرم راز اور ہمدم و ہم ساز تھیں۔ نجیب اور لبیب تھیں۔ ہوشمند اور دانش مند ذی علم اور ذی فہم تھیں ان سے مل کر تسلی ہوگی۔ معاذ اللہ آپ کو اپنی نبوت و رسالت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا اور نہ ورقہ سے کوئی تفہیم و تلقین مقصود تھی۔ ورقہ تو صرف توریت اور انجیل کے ایک عالم تھے۔ اور حضرت تو اوتیت علم الاولین والآخرین کے مصداق تھے حضور ورقہ سے کیا علم اور فیض حاصل کرنے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ ورقہ اگرچہ عالم تھے مگر صاحب حال اور صاحب کیفیت نہ تھے آپ کے قلب مبارک پر جو وحی کی کیفیت گزر رہی تھی، اس کی حقیقت اور اس کی لذت کی کیفیت تو آپ ہی کو معلوم تھی۔ ورقہ ذوقی طور پر نہیں جانتے تھے۔ بلکہ محض علمی طور پر اتنا جانتے تھے کہ حضرات انبیاء پر نزولِ وحی کے وقت یہ کیفیات گزرتی ہیں۔ اس لیے وہ آپ کی تسلی کرتے تھے اور ایسے وقت میں تسلی اور تشفی وہی کر سکتا ہے کہ جس پر یہ حالت اور یہ کیفیت نہ گزر رہی ہو اور کچھ اجمالی طور پر اس قسم کی چیزوں سے واقف اور باخبر ہو۔ جیسے تیماردار بیمار کی تسلی کرتا ہے ورنہ جس پر یہ کیفیت گزر رہی ہے اور جس پر یہ حالت طاری ہوگی وہ خود ہی خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو جائے گا۔ اسے اپنی ہی خبر نہ رہے گی۔ دوسرے کی کیا تسلی اور کیا تشفی کرے گا۔ اور عقلاً یہ ضروری نہیں کہ تسلی دینے والا صاحب حال سے افضل اور اکمل یا اعلم اور افہم ہو۔ فافہم ذلک واستقم۔ ورقہ بن نوفل کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ انجیل متی کے باب سوم میں یوحنا حواری کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینا مذکور ہے۔ اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا جائے۔

چونکہ سب سے پہلے اقرأ باسم ربک کا نزول ہوا جس میں یہ حکم تھا کہ اللہ کے نام سے پڑھو اس لیے اس کے چند روز بعد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، الحمد للہ کا نزول ہوا یعنی ہم اسی حکم سابق کے مطابق اللہ ہی کے نام سے پڑھتے ہیں۔

بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ سب سے پہلے سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔ مگر صحاح ستہ

کی تمام روایتوں میں سورۂ اقراء کی ابتدائی آیتوں کا سب سے پہلے نازل ہونا مذکور ہے اور یہی جمہور کا قول ہے۔ عجب نہیں کہ ان بعض علماء کی مراد یہ ہو کہ سب سے پہلے پوری سورت جو نازل ہوئی وہ سورۂ فاتحہ ہے۔ ورسورۂ اقراء ابتداءً پوری نازل نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی چند آیتیں اتریں اور بقیہ سورت بعد میں نازل ہوئی اور سورۂ فاتحہ پہلی ہی مرتبہ میں پوری نازل ہوئی جیسا کہ روایت مذکورہ سے ظاہر ہے۔

اسماء سورۂ فاتحہ

اس سورت کے بہت سے نام ہیں مشہور نام فاتحہ ہے اس لئے کہ قرآن شریف اسی سے شروع ہوتا ہے اور سورۃ الحمد ہے۔ اس لیے کہ ابتداء میں یہ لفظ حمد واقع ہے اور اس سورۃ کو فاتحۃ الکتاب اور فاتحۃ القرآن بھی کہتے ہیں اس لیے کہ کتاب الٰہی کا آغاز اور شروع اسی سورت سے ہوتا ہے اور اسکا ایک نام ام الکتاب بھی ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال۔

حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ سے منقول ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عالم کی ہدایت کے لیے ایک سو چار کتابیں مختلف انبیاء و رسل علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام پر اتاریں اور تمام علوم اور حکمتوں کو ان میں ودیعت رکھا اور پھر ان سب کا خلاصہ توریت و انجیل و زبور و قرآن حکیم میں درج فرمایا اور پھر ان سب علوم کو قرآن حکیم میں بھر دیا اور پھر قرآن کے تمام علوم کو مفصل میں اور علوم مفصل کو فاتحۃ الکتاب میں ودیعت فرمایا اور فاتحۃ الکتاب کے علوم کو اپنی حکمت بالغہ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں بھر دیا۔

کہتی ہے سو زبان سے قرآن کی فاتحہ
لاریب ذات پاک کی یکتا کتاب ہوں
مجھ میں بھرے جہاں کے علوم و فنون ہیں
قرآن میرا نام ہے اُم الکتاب ہوں

اور اسی سورۃ کا نام سورۃ الکنز بھی ہے۔ یعنی یہ علوم الٰہی کا ایک عظیم خزانہ ہے ایک حدیث میں ہے کہ یہ سورت ایک خزانہ سے نازل ہوئی ہے جو عرش کے نیچے ہے اور چونکہ اس سورت میں حق جل شانہ نے بندوں کو اپنی بارگاہ میں عرض و معروض کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے اس لیے اس سورۃ کا نام تعلیم المسئلۃ بھی ہے یعنی جب ہمارے دربار میں حاضر ہوا کرو تو اس طرح معروض کیا کرو کہ اپنی التجا و پیش کرنے سے پہلے خدا کی حمد و ثنا کرو اور اس کی عظمت اور طاقت اور اس کی قدرت اور ربوبیت کا دل اور زبان سے اعتراف کرو اور پھر اسکے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرو اور اسی کو اپنی حاجتوں کا برلانے والا اور معین و مددگار سمجھو اور یہ دعا مانگو کہ اے اللہ

ہمیں ان لوگوں کا راستہ دکھا جن پر تیرا فضل و کرم ہو چکا ہے نہ ایسے لوگوں کا راستہ جن پر تیرا قہر و
غضب ہوا اور نہ گمراہوں کا راستہ۔ سبحان اللہ کیسی دعا ہے جو دین و دنیا کی ایسی تمام نعمتوں کو
شامل ہے جو قہر و غضب اور گمراہی سے پاک صاف ہوں یعنی سعادت عطا فرما اور شقاوت سے
بچا۔ مطلب یہ ہے کہ اہل انعام کی طرح ہم کو فضائل سے آراستہ فرما اور اہل غضب اور اہل ضلال کے
ذمائم اور رذائل سے ہم کو بچا تاکہ نابکار و ناہنجار ہو کر تیرے مقبول بندوں کی صف میں کھڑے
ہو کر تیرے انعام و اکرام سے بہرہ یاب ہو سکیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اہل عقل غور کریں کہ کیا اس سے بڑھ کر کوئی دعا ہو سکتی ہے جو اکثر امیدوں اور آرزوؤں کو
اپنے اندر لیے ہوئے ہو۔ اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الشفاء اور سورۃ الشافیہ بھی ہے کیونکہ حدیث
میں ہے کہ سورۃ فاتحہ ہر مرض کے لیے شفا ہے اور ایک نام اسکا کافیہ اور وافیہ بھی ہے کہ خیر و برکت
کے لیے کافی و وافی ہے اور اس سورت کا ایک نام سورۃ الصلوٰۃ بھی ہے کہ نماز میں اسکا پڑھا
جانا ضروری ہے جاننا چاہیے کہ اس سورت کا نماز میں پڑھا جانا ضروری ہے۔ مگر ہر نمازی کے
لیے نہیں بلکہ جو امام ہو یا منفرد ہو یعنی اپنی تنہا نماز پڑھتا ہو۔ اس کے لیے نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری
ہے اور مقتدی کے لیے امام کے پیچھے سننا اور خاموش رہنا فرض و لازم ہے مقتدی کو امام کے پیچھے
کچھ پڑھنا جائز نہیں۔ اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ
اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ یعنی جب قرآن پڑھا جائے تو نہایت غور اور توجہ کے ساتھ امام کی قرأت کی طرف
کان لگا کر سنو اور بالکل خاموش رہو امید ہے کہ اگر تم نے امام کی قرأت کو سنا اور خاموش کھڑے
رہے اور امام کے ساتھ قرآن میں کوئی منازعت اور مخالفت نہ کی تو تم پر رحم کیا جائے گا۔ یعنی مقتدیوں
سے رحمت خداوندی کا وعدہ استماع اور انصات کے ساتھ مشروط ہے اور پھر یہ وعدہ بھی اور
یہ آیت بالاجماع قرأت خلف الامام کے بارہ میں نازل ہوئی جیسا کہ امام بیہقی اور زرقانی نے اس
کی تصریح کی ہے۔ اور احادیث صحیحہ مشہورہ میں ہے کہ اِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا (جب امام پڑھے تو
خاموش رہو) اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں
ہوتی۔ سو امام احمد بن حنبل اور سفیان بن عیینہ سے ترمذی اور ابو داؤد میں ہے کہ یہ حکم امام اور
منفرد کا ہے۔ احادیث دو قسم کی ہیں ایک وہ قسم ہے کہ جس میں امام اور منفرد کے احکام بیان ہوئے
ہیں ان میں یہ آیا ہے کہ نماز میں فاتحہ کا پڑھنا ضروری ہے اور دوسری قسم احادیث کی وہ ہے کہ
جس میں مقتدی کے احکام آئے ہیں ان تمام احادیث میں صرف یہی حکم آیا ہے اذا قرأ فانصتوا
کہ جب امام پڑھے تو خاموش رہو۔ امام کے احکام الگ ہیں اور مقتدی کے احکام الگ اپنی اپنی جگہ دونوں
ٹھیک ہیں امام پڑھے اور مقتدی خاموش رہے دونوں میں کوئی تعارض نہیں

استعاذہ

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

پناہ پکڑتا ہوں اور حمایت ڈھونڈتا ہوں خدا تعالیٰ کی بچانے

اور بچنا ہے سے شیطان مردود کے

جمہور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ تلاوت قرآن کی ابتداء سے پہلے أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پڑھنا سنت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ میں شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ میں آنے کی درخواست کرتا ہوں۔ کما قال تعالیٰ فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ۔ اس لیے کہ استعاذہ شیطان کے مکر اور شر سے بچنے کے لیے تریاق کا حکم رکھتا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ إِنَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ۔ اور علماء یہ کہتے ہیں کہ ہر قراءت کے شروع میں استعاذہ واجب ہے خواہ نماز میں ہو یا غیر نماز میں استعاذہ کی حقیقت یہ ہے کہ شیطان کے جال میں پھنسنے سے محفوظ ہو جائے اور بسم اللہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ کی رحمت میں داخل ہونے کے لئے استعاذہ بسم اللہ پر مقدم ہوا کیونکہ دفع مضرت، جلب منفعت پر مقدم ہے۔ نیز قرآن کریم حق تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی تلاوت سے پہلے زبان اور قلب کی طہارت ضروری ہے۔ اس لیے تلاوت قرآن سے پہلے استعاذہ کا حکم دیا گیا تاکہ زبان اور قلب کو ایک گونہ طہارت حاصل ہو جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ ہی کے نام نامی اور اسم گرامی کی اعانت اور امداد سے کہ جو بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے اس کے کلام کو شروع کرتا ہوں اور اس کے کلمات طیبہ کے انوار و تجلیات اور ظاہری اور باطنی خیرات و برکات کا امیدوار ہوں۔

ے نام نامی یہ ترجمہ اسم کی اصل کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کیا گیا ہے اس لیے کہ اسم کی اصل سمو ہے جو علو اور رفعت پر دلالت کرتی ہے اور شروع کرتا ہوں آخر تک بسم اللہ کے متعلق کی طرف اشارہ ہے کہ تقدیر کلام اس طرح سے ہے بسم اللہ اشرع کلام اللہ او ببرکۃ اسم اللہ اقرأ کلام اللہ تبرکا و تیمنا اور اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جار مجرور کی تقدیر مؤخر مناسب ہے تاکہ حصر مقصود کا حاصل ہو اور اس حصر کے ظاہر ہونے کے لیے ترجمہ میں اللہ ہی کا لفظ بڑھایا اللہ ہی کے نام نامی الخ

بِسْمِ اللّٰہ بعض علماء کے نزدیک سورۂ فاتحہ اور ہر سورت کا جزو ہے اور امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ سوائے سورۂ نمل کے کسی سورۃ کا جزو نہیں دو سورتوں میں فصل کرنے کے لئے یہ آیت نازل ہوئی۔ تبرکاً ہر سورت کے ابتداء میں اسکو لکھا جاتا ہے۔

سنن ابی داؤد میں باسناد صحیح ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان لا یعرف فصل السورۃ حتی ینزل بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں میں فصل نہ جانتے تھے یہاں تک کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نازل ہوئی۔

اسی وجہ سے بسم اللہ کو نماز میں سورۃ فاتحہ کے ساتھ جہر نہیں پڑھا جاتا تاکہ جزو فاتحہ ہونے کا واہمہ نہ ہو۔ اور اسی لیے بسم اللہ الخ کو کسی سورۃ کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہر ایک سورۃ سے علیحدہ دو خطوں کے درمیان میں لکھتے ہیں تاکہ جزو سورت ہونے کا شبہ نہ ہو مگر سورۂ نمل میں بسم اللہ بالاتفاق سورت کا جزو ہے اس لیے اس کو مثل دیگر آیات کے ملا کر لکھا جاتا ہے۔
نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور خلفائے راشدین کی مستمرہ سنت یہی تھی کہ بسم اللہ کو نماز میں آہستہ پڑھتے تھے۔ (ابن کثیر، ترمذی، زاد المعاد)

امام ابوبکر رازی رحمہ اللہ تعالیٰ نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کی خوب تفصیل فرمائی ہے اور امام اعظم نعمان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلک کا خوب مدلل اور مبرہن ہونا ثابت کیا ہے حضرات اہل علم اسکی طرف مراجعت فرمائیں۔

بسم اللہ کے شروع میں جو با ہے بعض علماء کے نزدیک وہ مصاحبت اور الصاق کے لیے ہے اور بعض علماء کے نزدیک استعانت کے لیے ہے اور یہی راجح معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس صورت میں ابتداء ہی سے اپنی عبودیت اور عجز و مسکنت کا اظہار اور پہلے ہی وہلہ میں اپنی حول اور قوۃ سے تبری کا اعلان ہو جاتا ہے یعنی اس کی اعانت اور توفیق سے ہم شروع کرتے ہیں۔ حاشا اپنی حول اور قوۃ سے نہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور بارگاہ الوہیت کا ادب بھی یہی مقتضی ہے کہ وہاں عبودیت اور تذلل ہی کا اظہار ہو۔ اور ادعاء مصاحبت نہ ہو۔ تَعٰلیٰ جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَۃً اور یہی معنی اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے زیادہ مناسب ہیں اور یہی معنی لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے مرادف ہونے کی وجہ سے کَنْزٌ مِّنْ کُنُوْزِ الْجَنَّۃِ (یعنی جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ) کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور بسم اللہ کی با کا کسرہ بھی انکسار و ذل عبودیت ہی کی طرف مشیر ہے۔

اَللّٰہ اسی ذات واجب الوجود کا علَم ہے جو تمام صفات کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص سے اور شائبہ اور وہم سے بھی پاک اور منزہ ہے اور اسی وجہ سے لفظ جلالت ہمیشہ موصوف

ہی واقع ہوتا ہے اور اسماء حسنیٰ کو بطور صفت اسی اسم جلیل کے بعد ذکر کیا جاتا ہے کما قال تعالیٰ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۔

اور یہ اسم جلیل رب اعلیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات پاک کے لیے ہوا ہے جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک وسہیم نہیں۔ اسی طرح اس اسم جلیل میں بھی اس کا کوئی سہیم نہیں۔ اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہی اسم اعظم ہے اور امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بھی لفظ اللہ ہی کو اسم اعظم فرمایا ہے جیسا کہ امام طحاوی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے۔

حدثنا محمد بن الحسن عن ابی حنیفة قال اسم اللہ الاکبر ہو اللہ قال محمد الا تری ان الرحمن مشتق من الرحمة والرب من الربوبیة وذکر اشیاء نحو ہذا واللہ غیر مشتق من شیء۔
(مشکل الآثار ص ۱۲۹ ج ۱)

محمد بن حسن نے روایت کیا امام ابوحنیفہؒ سے کہ اسم اعظم وہ لفظ اللہ ہے، کہا محمد بن حسن نے اس لیے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے اور رب مشتق ہے ربوبیت سے اور اسی طرح کی مثالیں ذکر فرمائیں اور لفظ اللہ کسی شی سے مشتق نہیں۔
(مشکل الآثار)

خود چہ شیریں ست نام پاک تو ۔ خوشتر از آب حیات ادراک تو
نام تو چوں بر زبانم میرود ۔ ہر بن مو از عسل جوئے شود
اللہ اللہ ایں چہ شیریں است نام ۔ شیر وشکر می شود جانم تمام
اللہ اللہ ایں چہ نام خوش مذاق ۔ عرف عرفاں میدہد جاں را رواق
اسم اعظم ہست اللہ العظیم ۔ جلوہ جاں را کن عظیم رحیم

(مناجات منظوم از مفتی الٰہی بخش کاندھلوی قدس اللہ سرہٗ)

اسم اللہ کے بعد تمام اسماء حسنیٰ میں اسم رحمٰن کا مرتبہ معلوم ہوتا ہے، کما قال تعالیٰ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو لہٰذا اسی وجہ سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے نزدیک سب سے

زیادہ محبوب یہ دو نام ہیں۔ عبداللہ اور عبدالرحمٰن۔ عبداللہ میں عبد، اسم اعظم کی طرف مضاف ہے
اور عبدالرحمٰن میں اسم رحمٰن کی طرف مضاف ہے جس کا مرتبہ اسم اعظم کے بعد ہے اسی وجہ سے حدیث
میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو پہلے ذکر فرمایا اور عبدالرحمٰن کو بعد میں۔

رحمٰن اور رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اختلاف اس میں ہے کہ
کس میں مبالغہ زیادہ ہے جمہور کا قول یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے اس لیے کہ لفظ
رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قرآن کریم میں رحیم کا اطلاق نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کے حق میں بھی آیا ہے۔ کما قال تعالیٰ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔ پس رحمٰن
کے معنی ایسا انعام کرنے والا کہ کوئی اس جیسا انعام نہ کر سکے اور یہ معنی حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص
ہیں اور رحیم مطلق منعم کو کہتے ہیں خواہ دوسرا اس جیسا انعام کر سکے یا نہ کر سکے اور بعض علماء یہ کہتے
ہیں کہ دونوں ہم معنی ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیے دونوں کو جمع کر دیا ہے۔ اور ان صفتوں کا
اطلاق حق جل و علا پر ایسا ہی حقیقی ہے جیسے علیم و قدیر اور سمیع و بصیر کا اطلاق اس پر حقیقی ہے
اور جس طرح اس کی حیات ہماری حیات کی طرح نہیں اور اس کا سننا اور دیکھنا اور کلام کرنا ہمارے
سننے اور دیکھنے اور کلام کرنے کے مشابہ نہیں اسی طرح اس کی رحمت بھی ہماری رحمت کے
مماثل نہیں۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ۔ — کوئی شے اس کے مثل نہیں وہ خوب سننے والا اور دیکھنے والا ہے

وہ اپنے سننے اور دیکھنے میں اور ادراک اور علم میں جوارح کا محتاج نہیں۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ۔ — اللہ ہی ہر طرح سے بے نیاز ہے اور تم ہی ہر طرح سے اس کے محتاج ہو۔

اسی طرح وہ اپنی صفت رحمت میں بھی رقت قلب کا محتاج نہیں۔ اور نہ انفعال نفس
کا جیسے اس کی ذات بے چون و بے چگون ہے اسی طرح اس کی صفت علم و قدرت اور صفت رأفت
و رحمت وغیرہ بھی بے چون و بے چگون ہے۔

اس کی بے چون و بے چگون رحمت حقیقیہ، علماء کی مجاز و تاویل اور استعارہ و تمثیل کی ذرہ برابر
محتاج نہیں۔

اے برون از وہم و قال و قیل من — خاک بر فرق من و تمثیل من

صفات باری تعالیٰ میں صحابہ و تابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کا یہی مسلک تھا اور یہ
حضرات لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ کے اسماء حسنیٰ میں تاویل کو بدعت سمجھتے تھے
امام ابوالحسن اشعری نے اخیر عمر میں متکلمین کے طریق تاویل و تمثیل کو چھوڑ کر مذہب سلف

ہی کی طرف رجوع فرمایا جیسا کہ امام موصوف نے اپنی آخری تصنیف کتاب الابانہ میں اسکی تصریح کی ہے قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ رحمت کے حقیقی معنی رقت قلب کے ہیں۔ باری تعالیٰ کی شان میں رحمت کا اطلاق مجاز ہے حضرت حکیم الامۃ مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جہاں رحمت حقیقی تھی وہاں تو مجاز بنا دیا اور جہاں مجاز سراپا مجاز تھا وہاں حقیقت بنا دی یعنی حقیقت کے اعتبار کو دیکھا جائے تو رحمت بارگاہ خداوندی میں حقیقت ہے اور بندہ میں سراسر مجاز مگر ارباب تاویل نے معاملہ برعکس کر دیا۔

اور ابتداء کے لیے ان تین ناموں کو یعنی اللہ اور رحمٰن اور رحیم کو اس لیے خاص فرمایا کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔ اول اسکا عدم سے نکل کر وجود میں آنا۔

دوم۔ اس کا باقی رہنا اور جس قدر خلاق علیم نے اس کے لیے مدۃ بقا مقرر فرمائی ہے اس کو پورا کرنا جسکو عرف میں حیاتِ دنیا اور زندگی کہتے ہیں۔

سوم اس نشاۃ دنیا کے ختم ہونے کے بعد حیاتِ دنیویہ پر ثمرات کا مرتب ہونا۔ عمل نیک پر جزاء اور عمل بد پر سزا پانا۔

پس ابتداء میں تین نام ذکر فرمائے تاکہ تینوں حالتوں کی جانب اشارہ ہو جائے لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے کہ تخلیق و تکوین بارگاہ الوہیۃ سے متعلق ہے اور لفظ رحمٰن سے دوسری حالت کی طرف اشارہ ہے۔ اس لیے کہ دنیا دار ابتلاء اور دار امتحان ہے جو اس جگہ ٹھیک راستہ پر چلا اس کے لیے آخرت کی تمام منزلیں آسان ہیں۔ شیطان اور نفس امارہ ہر وقت اس کی تاک میں ہے اس لیے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہاء رحمت کا محتاج ہے۔

اور لفظ رحیم کو تیسری حالت یعنی نشاۃ آخرت کے یاد دلانے کے لیے ذکر فرمایا۔

دار دنیا چونکہ مومن و کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے۔ مومن کے لیے تو ظاہر ہے کافر کے حق میں دنیا اس لیے رحمت ہے کہ وہ اپنے کفر سے توبہ کر سکتا ہے اور اگر سوء اختیار سے توبہ بھی نہ کرے تو فی الحال اسکا عذاب جہنم سے رکا رہنا ہی بہت بڑی رحمت ہے نیز بعثت انبیاء، اور ارسال رسل اور انزال کتب ایک ایسی عظیم رحمت ہے کہ جو مومن اور کافر سب کے لیے ہے یہ امر آخر ہے کہ کوئی اس رحمت سے متمتع اور منتفع ہوا اور کوئی نہ ہوا الحاصل دار دنیا مومن اور کافر سب کے لیے باعث رحمت ہے اور دار آخرت صرف مومنوں کے لیے باعث رحمت ہے اور کافروں کے واسطے باعث عذاب و نقمت۔ کما قال تعالیٰ:

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ ۝ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ ۝ عَلَى الْكَافِرِينَ	جب صور پھونکا جائیگا تو وہ دن کافروں پر نہایت سخت اور دشوار ہوگا۔ کسی قسم

عقیدۂ تثلیث ... کی اس میں آسانی نہ ہوگی۔

اس لیے نشأۃ دنیا کے یاد دلانے کے لیے لفظ رحمٰن ذکر فرمایا کہ جس میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے اور نشأۃ آخرت کے یاد دلانے کے لئے رحیم کا لفظ استعمال فرمایا اس لیے کہ رحمٰن مبالغہ کا صیغہ ہونے کی وجہ سے عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اور عموم رحمت کا محل صرف دار دنیا ہے جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا اور دار آخرت صرف مومنوں کی رحمت کے لیے ہے۔

نیز رحمٰن فعلان کا وزن ہونے کی وجہ سے کچھ تجدد اور حدوث پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ کلام عرب میں وزن فعلان اکثر صفات عارضہ اور اوصاف متجددہ اور حادثہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسے عطشان اور غضبان اور ریّان اور لہفان وغیرہ لہٰذا لفظ رحمٰن سے اس دار حدوث و تجدد اور دار فانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ اور لفظ رحمٰن چونکہ عموم رحمت پر دلالت کرتا ہے اس لیے قرآن کریم میں استواء علی العرش کو صفت رحمٰن کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی اس لیے کہ عرش تمام مخلوقات کو محیط ہے جیسا کہ اسکی رحمت تمام مخلوق کو محیط اور واسع ہے کما قال تعالیٰ۔ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ پس اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی سے یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے زیادہ وسیع مخلوق یعنی عرش پر سب سے زیادہ وسیع صفت رحمٰن کے ساتھ استواء فرمایا ہے اور صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تقضائے خلق کے بعد ایک کتاب میں یہ لکھ کر ان رحمتی تغلب غضبی، یقیناً میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے اپنے قریب عرش پر رکھا حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ سبقت رحمتی غضبی مراحم خسروانہ کا قانون ہے جو عرش پر آویزاں ہے۔

رحیم صفت مشبہ کا صیغہ ہے یا اسکے ہم وزن ہونے کی وجہ سے دوام اور استمرار پر دلالت کرتا ہے فعیل کا وزن کلام عرب میں معانی ثابتہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے جیسا کہ علیم و حکیم و جمیل لہٰذا لفظ رحیم سے دار باقی اور عالم جاودانی کی طرف اشارہ مناسب ہوا۔ علامہ آلوسی کے کلام سے رحمٰن اور رحیم میں یہ فرق معلوم ہوتا ہے کہ رحمٰن سے عام رحمت مراد ہے خواہ بالواسطہ یا بلا واسطہ صورۃً اور معنیً ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہو یا فقط معنیً اور باطناً رحمت ہو۔ اگرچہ صورت اور ظاہر کے لحاظ سے وہ عذاب ہو۔ جیسے مریض کو تلخ دوا کا پلانا صورۃً ایلام اور تکلیف ہے مگر معنیً سراسر رحمت ہے پس رحمٰن سے ایسی ہی عام رحمت مراد ہے کہ جو ان تمام انواع و اقسام کو شامل ہو یہ دار فانی اسی قسم کی رحمت کا محل ہے اسکی رحمت راحت و انعام کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی مصائب و آلام کی شکل میں۔ کما قال تعالیٰ عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا

شَيْئًا ۔ وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۔ اور رحیم سے وہ رحمت مراد ہے جو بلا واسطہ ہو، اور ظاہراً اور باطناً ہر طرح سے رحمت ہی رحمت ہو، خاص آخرت میں اسی قسم کی رحمت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا واسطہ ہی ہوگی اور کسی قسم کا اس میں شائبہ رنج و الم کا بھی نہ ہوگا۔

خلاصہ

پس لفظ اللہ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ جو ذات تمام صفات کمال کی جامع اور تمام نقائص و عیوب سے پاک اور منزہ ہے، تمام مباحث الٰہیات کی طرف اشارہ ہے۔

اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت و شریعت کی طرف اشارہ ہے کہ جس کے بغیر خدا کی مرضی کے موافق ایک لمحہ گزارنا محال ہے۔

اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امور آخرت کی طرف اشارہ ہے اور یہی وہ تین امور ہیں کہ جو تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم کا لباب اور عطر ہیں، اور تفتازانی اور جرجانی انہیں تین مقاصد اور مواقف کی شرح میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ علامہ تفتازانی اور علامہ جرجانی اور تمام متکلمین کو تمام اہل اسلام کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے کہ دین کے مقاصد اصلیہ کو خوب واضح فرمایا اور سنت کے صحیح موقف کو خوب واضح اور روشن کر دیا۔ آمین یا رب العالمین۔

سورۂ فاتحہ میں بھی انہی تین باتوں کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں صفات الٰہیہ کو بیان فرمایا ہے اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے احوال آخرت کی طرف اشارہ فرمایا اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الخ سے مباحث نبوت و رسالت، ایمان اور کفر، سعادت اور شقاوت، ہدایت اور ضلالت کے فرق کی جانب اشارہ فرمایا۔

اور تمام قرآن انہیں مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو سورۂ فاتحہ میں اجمالاً ذکر فرمائے اسی وجہ سے اس سورت کا نام ام الکتاب ہے یعنی تمام کتاب الٰہی کا خلاصہ اور اجمال اور چونکہ کتاب الٰہی کی ہر سورت انہی مضامین ثلاثہ کی تفصیل ہے جو اجمالاً بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ میں درج ہیں، اس لیے ہر سورت کی ابتداء میں بسم اللہ کا لکھنا اور پڑھنا مسنون قرار دیا گیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

حقیقی سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے جو تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا ہے

۱۔ جو فعل علم اور اختیار اور قدرت اور ارادہ سے صادر ہو اس کی واقعی خوبی بیان کرنے کو حمد کہتے ہیں۔ مدح میں نہ فعل کا اختیاری ہونا ضروری ہے اور نہ اس خوبی کا واقعی ہونا لازمی ہے کسی وجہ سے مدح کسی وقت ممنوع بھی ہو جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

احثوا التراب فی وجوہ المداحین — مدح کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دو۔

مگر حمد سے کسی وقت منع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس میں واقعی خوبی کا اظہار ہے۔ بعض علماء نے تعریف حمد سے قید اختیار کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ اس قید کے لگانے سے حق تعالیٰ شانہ کی صفات ذاتیہ کی بنا پر حمد کرنا دشوار ہو گا۔ اس لیے کہ صفات ذاتیہ جیسے علم و قدرت افعال خداوندی کی طرح اختیاری نہیں۔ اگرچہ یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ یہ صفات اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان کے آثار ضرور اختیاری ہیں یا ان کے موصوف کا فاعل مختار ہونا حمد کے لیے کافی ہے۔ حمد اور مدح میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ حمد انہی صفات کمال پر ہو سکتی ہے جن کا صفات کمال ہونا قطعی اور یقینی ہو۔ اور ان میں کسی قسم کے نقص اور عیب کا شائبہ بھی نہ ہو بخلاف مدح کے کہ اس میں نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صفت قطعاً اور یقیناً صفت کمال ہو، ظناً بھی صفت کمال ہونا مدح کے لیے کافی ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ صفت کمال شائبہ نقص سے پاک ہو بلکہ اگر اس میں کچھ نقص بھی ہو تب بھی مدح ہو سکتی ہے۔

نیز حمد میں یہ ضروری ہے کہ محاسن و کمالات کا ذکر محبت اور اجلال کے ساتھ ہو اور مدح میں یہ ضروری نہیں۔ مطلقاً محاسن اور کمالات کے بیان کرنے کو خواہ وہ محبت اور اجلال سے ہو یا نہ ہو مدح کہتے ہیں۔ جیسا کہ ایک برابر والا دوسرے برابر والے کی مدح کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ حمد سے جو تعظیم و تفخیم مترشح ہوتی ہے وہ لفظ مدح سے نہیں ہوتی اسی لیے کہ حمد کا اکثر اطلاق اس معنی حمیدی پر ہوتا ہے نیز حمد زندہ ہی کی ہوتی ہے اور مدح زندہ اور غیر زندہ دونوں کی ہوتی ہے اور حمد کے بعد سب سے پہلے اسم ذات کو ذکر فرمایا اور اس کے بعد پھر دیگر اسماء صفات و افعال کو ذکر کیا تاکہ ذاتاً اور صفۃً اور فعلاً ہر طرح سے اس کا مستحق حمد و ثناء ہونا معلوم

لہ قولہ حقیقی سب تعریفیں اشارۃ الی ان الاولیٰ ان یکون لام التعریف فی الحمد للجنس والحقیقۃ کما اختارہ جار اللہ العلامۃ وهذا یلزم من الاستغراق کما لا یخفی علی ارباب الذوق فافهم فلا وجہ لما ... قولہ مخصوص ہے۔ هذه ترجمۃ لام الاختصاص فی للہ۔

ہو جائے۔

۲۔ ربوبیت یعنی پرورش کرنا اور کسی شئ کو بتدریج حد کمال تک پہنچانا تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔	اور یہ دعا مانگا کرو کہ اے اللہ میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے خورد سالی میں مجھ کو پالا۔

مگر والدین کی تربیت نور آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں بلکہ نور زمین کی طرح مستعار اور عطاء غیر ہے جس طرح نور زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے۔

نیز حقیقی تربیت جب ہو سکتی ہے کہ کسی شئے کو نیست سے ہست کیا جائے۔ اور پھر اس کے تمام اسباب تربیت کو پیدا کیا جائے۔ اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کے تمام موانع دور کر دیئے جائیں۔ تب تربیت مکمل ہو سکتی ہے۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں مگر نہ اولاد ان کی مخلوق ہے اور نہ وہ سامان تربیت کی خالق ہیں بلکہ سب کا سب خدا ہی کا پیدا کیا ہوا ہے نیز والدین کی تربیت چند اشخاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ تمام عالم کے لیے عام اور محیط نہیں اور حق تعالیٰ شانہ کی تربیت غیر محدود اور عام اور محیط ہے پس قابل ستائش وہی ربوبیت ہو سکتی ہے جو اصلی اور ذاتی ہو۔ مستعار اور عطاء غیر نہ ہو۔ ہر طرح سے کامل اور مکمل ہو کسی قسم کا اس میں نقص نہ ہو۔ تمام عالمین کے لیے عام اور محیط ہو اس لیے ارشاد ہوا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

یعنی حقیقی ستائش[ل] خدا تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے کہ جس کی ربوبیت اصلی اور ذاتی اور کامل ہونے کے علاوہ تمام جہانوں کے لیے عام اور محیط ہے اسی وجہ سے جب فرعون نے کہا۔

وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔	رب العالمین کیا چیز ہے
تو موسیٰ علیہ السلام نے یہ ارشاد فرمایا	
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا	یعنی رب وہ ہے کہ جس کی تربیت جمیع سماوات اور جمیع ارضین اور کل عالم کو محیط ہے۔

ل اشارہ اس طرف ہے کہ الحمد کا لام تعریف۔ لام حقیقت اور لام جنس ہے یعنی حمد کی حقیقت اور جنس ہی اللہ کے لیے مخصوص ہے اور بعض علماء نے لام کو استغراق کے لیے لیا ہے انہوں نے اس طرح ترجمہ کیا کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد شاید فرعون کو یہ تردد ہوا ہو کہ تربیت کو صرف ذات خداوندی میں منحصر کر دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ ہم والدین اور آفتاب اور ماہتاب کی تربیتوں کا بھی روزانہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام دوبارہ جواب کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا۔

رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ — وہ رب ہے تمہارا اور تمہارے اگلے آباؤ و اجداد کا۔

یعنی تمہارے آباؤ اجداد کی تربیت اصلی اور ذاتی نہیں بلکہ عطیہ الٰہی ہے، تمہارا اور تمہارے تمام آباء اولین کا حقیقی رب اور پروردگار وہی ہے اور تیسری بار یہ فرمایا۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ — وہ رب ہے مشرق اور مغرب کا اور انکے درمیان کا اگر تم کچھ عقل رکھتے ہو۔

یعنی آفتاب اور ماہتاب کو اپنی کھیتوں کا مربی سمجھنا غلط ہے اس لیے کہ خود آفتاب و ماہتاب اور ان کے نور کو اسی رب العالمین نے پیدا کیا ہے۔

هُوَ الَّذِي جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا — اسی نے سورج کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا۔

اگر وہ رب العالمین شمس و قمر کو روشنی نہ بخشتا یا کھیتیاں پکانے کی خاصیت ان میں نہ رکھتا تو کہاں سے کھیتیاں پکاتے۔

رب العالمین میں ربوبیت خداوندی کا تمام اجناس وانواع اور تمام افراد و اشخاص کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی آیت یعنی رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ میں اس کی ربوبیت کا تمام امکنہ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ اور دوسری آیت رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ میں اس کی ربوبیت کا ماضی اور حال اور مستقبل اور تمام اوقات اور ازمنہ مختلفہ کو محیط ہونا بیان فرمایا اور تیسری بار رب المشرق والمغرب فرما کر اس کی ربوبیت کا تمام اوضاع اور حالات تمام تغیرات اور کیفیات کو محیط ہونا بیان فرمایا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کسی شخص اور کسی زمان کسی مکان اور کسی حالت اور وضع کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ سب کو عام اور محیط ہے اس لیے وہی لائق عبادت اور مستحق حمد و ثنا ہے۔

حضرات صوفیہ کرام قدس اللہ اسرارہم فرماتے ہیں کہ ارواح کے کانوں میں سب سے پہلے وصف ربوبیت ہی کا نغمہ جانفزا پہنچا ہے اور اسی وصف سے اول خدا کو پہچانا ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ — اس وقت کو یاد کرو کہ تیرے رب نے بنی آدم کی پشت سے انکی ذریت کو نکالا

وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۔
اور خود ان کو انکی جانوں پر گواہ بنایا گیا ہے تمہارا رب نہیں، سب نے کہا بے شک آپ ہمارے رب ہیں۔

حق تعالیٰ شانہ نے سب سے پہلے اسی اسم رب کے ساتھ ارواح کو مخاطب کیا اور اسی نام سے ان سے عہد اور میثاق لیا اور بظاہر یہی وجہ ہوئی کہ اوّل الانبیاء حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیاء و مرسلین اور عباد مخلصین کی جو دعائیں حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں ذکر فرمائی ہیں وہ اکثر و بیشتر کلمہ رَبَّنَا سے وارد ہوئی ہیں اور ایک مقام پر یعنی رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا۔ الخ ان آیات میں کلمہ رَبَّنَا سے دعا کرنے والوں کو مژدہ استجابت فرمایا ہے۔

(۳) عالم کی تعبیر جو کہتے ہیں جس سے خالق کو علم حاصل ہوتا ہے۔ کلمہ علامت سے مشتق ہے۔ عالم کو عالم اس لیے کہتے ہیں کہ وہ علامت ہے اسماء الٰہی و صفات خداوندی کے لیے عالم میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کے کسی اسم کا مظہر اور آئینہ ہے مومن و کافر اس کی شان اور انعام اور انتقام کے مظہر ہیں۔ صاحب عزت اور صاحب ذلت اس کی شان تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ کے آئینہ میں ہیں۔ عالم غیب اور عالم شہادت اسکے نام الظاہر اور الباطن کے لیے آئینہ ہیں۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔

بے حد مہربان، نہایت رحم والا

عجب نہیں کہ بسم اللہ میں رحمٰن اور رحمت مراد ہو کہ جو تکوین اور تربیت عالم کے لیے باعث ہوئی۔ اور الحمد میں الرحمٰن سے وہ رحمت مراد ہو جو خاص حالت تربیت میں مبذول ہوتی ہے کہ یہ رحمت روک لی جائے تو تربیت اور پرورش ناممکن ہو جائے۔

اور الرحیم سے وہ رحمت مراد ہو کہ جو تربیت اور پرورش کے بعد جزا اور سزا کی شکل میں ظاہر ہوگی۔ اس لیے کہ تربیت اور تکمیل کے بعد آثار اور ثمرات کا مرتب ہونا اس تربیت کے نتائج کرنے کے مرادف ہے۔

کھیتی پک جانے کے بعد اگر اس پر درانتی نہ چلائی۔ گندم اور بھوسہ الگ الگ نہ کیا جائے تو کھیتی کو ضائع کرنا ہے۔

اسی طرح اگر اس عالم کی تربیت ختم ہو جانے کے بعد مومن اور کافر، سعید اور شقی کو جدا جدا نہ کیا جائے تو عالم کی تربیت کا ضائع اور بیکار ہونا لازم آئے گا اور آئندہ آیت یعنی مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ کا تکرار اسکی رحمت کے مکرر اور مضاعف ہونے کی طرف مشیر ہے لیکن ہمارا رحمت کی یہ فراوانی کہیں بندوں کو مغرور نہ بنا دے اس لیے

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا اضافہ فرمایا تاکہ رحمت کے ساتھ رہبت کا ضروری ہونا معلوم ہو جائے جیسے غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ کے بعد شَدِيْدِ الْعِقَابِ کی صفت کا ذکر فرمایا۔ انتہیٰ کلامہ

اور عجب نہیں کہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ سے پہلے ذکر کرنا سبقت رحمتی علیٰ غضبی کی جانب مشیر ہو۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ
روزِ جزاء کا مالک

یعنی اللہ تعالیٰ قیامت اور جزاء کے دن کا مالک ہے جس میں فرمانبرداروں اور نافرمانوں کی جزاء کا فیصلہ فرمائیگا۔ اس لیے کہ نیکی اور بدی اور فرمانبردار اور نافرمان اور موافق اور مخالف میں فرق کرنا عقلاً و نقلاً ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ۔ وَقَالَ تَعَالٰی لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۤءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى وقال تعالیٰ۔ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰى۔ نیز دنیا میں کوئی ظالم ہے اور کوئی مظلوم اور مظلوم کا ظالم سے انتقام عین عدل اور عین حکمت ہے اور دنیا میں یہ انتقام نہیں لیا گیا تو آخرت میں لا محالہ لیا جائے گا۔

اس آیت میں دو قراءتیں ہیں اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں ایک مَلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی روزِ جزاء کا بادشاہ اور دوسری قراءت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ یعنی روزِ جزاء کا مالک۔ اور اصل مالکیت اور ملکیت یعنی بادشاہت کے لیے روزِ جزاء کو اس لیے خاص کیا گیا کہ اس کے جلال و جبروت کا بلا واسطہ ظہور علیٰ وجہ التمام والکمال عالم کے ہر ہر فرد کے لیے ایک ہی آن میں صرف اسی روز ہوگا۔ دنیا میں بھی وہی حقیقی مالک اور حقیقی بادشاہ ہے مگر دنیا میں اس کی مشیت اور حکمت سے کچھ مجازی بادشاہت اور مجازی مالکیت نظر آتی ہے۔ قیامت کے دن سارے مجاز ختم ہو جائیں گے اور صرف حقیقت ہی حقیقت رہ جائے گی۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ ان دونوں قراءتوں میں سے کون سی قراءت افضل ہے بعض علماء ملک یعنی بادشاہ کی قراءت کو راجح قرار دیتے ہیں۔ اور وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت میں جو عظمت ہے وہ وصف مالکیت میں نہیں۔ مالک تو ہر ایک ہوتا ہے مگر بادشاہ ہر ایک نہیں ہوتا۔

۲۔ مالک کا حکم فقط اپنے مملوک پر چلتا ہے اور بادشاہ کا حکم تمام ملک اور تمام رعایا پر جاری اور نافذ ہوتا ہے۔

www.ahlehaq.org

۲۔ بادشاہ کی اطاعت سب پر واجب ہے اور مالک کی اطاعت فقط اسکے مملوک پر واجب ہے۔

۳۔ نیز لفظ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ بھی مالکیت پر دلالت کرتا ہے یعنی اگر مالک کے بعد رب کہا جائے تو تکرار لازم آتا ہے۔

۵۔ قرآن کریم کی آخری سورت میں مَلِکِ النَّاسِ آیا ہے لہٰذا قرآن کی پہلی سورت میں بھی مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ پڑھنا چاہیے تاکہ اول قرآن اور آخر قرآن ایک دوسرے کے مناسب اور ہم رنگ ہو جائے۔

اور جو حضرات علماء مٰلِکِ کی قرأت کو ترجیح دیتے ہیں وہ یہ وجوہ بیان کرتے ہیں۔

۱۔ کہ ملکیت یعنی بادشاہت انسانوں کے ساتھ مخصوص ہے اور مالکیت انسان اور غیر انسان سب کو شامل ہے۔

۲۔ مالک اپنی مملوک کو فروخت کر سکتا ہے۔ بادشاہ رعایا کو فروخت نہیں کر سکتا۔

۳۔ رعیت بادشاہ کے ملک اور سلطنت سے بھاگ کر نکل سکتی ہے اور مملوک بھاگ کر مالک کی ملکیت سے نہیں نکل سکتا۔

۴۔ غلام پر مولیٰ کی خدمت واجب ہے رعایا پر بادشاہ کی خدمت واجب نہیں۔

۵۔ غلام بغیر آقا کی اجازت اور اذن کے کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور رعیت بغیر بادشاہ کی اجازت کے کام کر سکتی ہے۔ اور مملوک چونکہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کو دل کے کسی چیز سے تعلق بھی نہیں ہوتا۔ غلام کے پیش نظر ہر وقت آقا کی خوشنودی رہتی ہے رعایا چونکہ اپنی چیزوں کی مالک بھی ہوتی ہے اس لیے ان کو بادشاہ سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔

۶۔ غلام کو آقا سے توقع رحم و کرم کی ہوتی ہے اور رعیت کو بادشاہ سے عدل و انصاف کی امید ہوتی ہے۔ اور بندہ رحم و کرم کا زیادہ محتاج ہے۔

۷۔ بادشاہت میں ہیبت زیادہ ہے اور مالکیت میں شفقت اور عنایت زیادہ ہے۔

۸۔ بادشاہ کے سامنے جب لشکر پیش ہوتا ہے تو ضعیفوں اور کمزوروں اور بیماروں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اور مالک ضعیف اور کمزور غلاموں پر اور زیادہ توجہ کرتا ہے اور ان کی اعانت اور خبر گیری میں مشغول ہوتا ہے۔

۹۔ مالک کو مملوک سے تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ بادشاہ کو رعایا سے اتنی محبت اور تعلق نہیں جتنا کہ آقا کو غلام سے ہوتا ہے اور عاشقوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی مژدۂ جانفزا نہیں کہ محبوب کو ہم سے محبت اور تعلق ہے۔

۱۰- مٰلِکِ میں مَلِکِ سے ایک حرف زیادہ ہے لہذا مٰلِکِ کی قراءت میں ثواب بھی زیادہ ہوگا اس لیے کہ ایک حرف کے زیادہ ہونے کی وجہ سے دس نیکیاں اور زیادہ ہوں گی۔ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ

(خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور خاص تجھ ہی سے ہر کام میں مدد چاہتے ہیں
اس لیے کہ بغیر تیری اعانت اور امداد کے کچھ نہیں ہو سکتا)

یعنی اجسام علویہ اور سفلیہ اور کواکب اور نجوم اور نور اور ظلمت کسی کو تیرا شریک نہیں ٹھہراتے ہیں ہر خیر و شر اور سعادت و نحوست کا تجھ ہی مالک سمجھتے ہیں پہلی آیت میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کو بیان کیا اور معرفت ربوبیت کے بعد معرفت عبودیت کا درجہ ہے اس لیے اس کے بعد عبادت کا ذکر کیا گیا۔

۱۱- کسی کی نہایت درجہ تعظیم کے لیے دل و جان سے نہایت درجہ کا تذلل اختیار کرنا اس کا نام عبادت ہے لہذا جو تذلل اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری یعنی بلا اختیار کے ہو وہ عبادت نہیں کہلائے گا اور اسی طرح جو تذلل کسی کے جبر اور قہر اور زور سے ہو وہ بھی عبادت نہ کہلائے گا اور جس تذلل سے تعظیم مقصود نہ ہو وہ استہزاء اور تمسخر کہلائیگا اور لائق عبادت اور مستحق بندگی وہی ذات ہوگی، جو نہایت درجہ کی عظمت اور جلال اور نہایت درجہ خوبی اور کمال اور انتہائی انعام و اکرام اور انتہائی جود و نوال کے ساتھ متصف ہو کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی درجہ اور مرتبہ عقل اور خیال میں نہ آسکے۔ اور جو انتہائی عظمت و جلال کے ساتھ موصوف نہ ہو اس کے سامنے انتہائی تذلل اختیار کرنا سراسر بے موقع اور بے محل ہے اسی وجہ سے قرآن کریم نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ اور کسی چیز کو بے محل رکھنے کا نام ظلم ہے۔ خداوند ذوالجلال کو اگرچہ کسی کی عبادت اور بندگی کی ذرہ برابر حاجت نہیں۔ مگر مقتضائے حکمت یہ ہے کہ صاحب نقصان صاحب کمال کے سامنے تذلل اور پستی اختیار کرے ورنہ کمال اور نقصان کی مساوات لازم آئے گی جو سراسر خلاف حکمت ہے ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک دنیا کے تمام عقلاء اور عالم کے تمام حکماء اس پر متفق رہے ہیں کہ ہر صاحب کمال کی تعظیم اور اس کا احترام عقلاً واجب اور فرض ہے یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ناقص کامل کی تعظیم کو اس لیے ضروری نہ سمجھے کہ اس ناقص کو اپنے زعم میں اس کامل کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ احتمال خداوند ذوالجلال میں جاری نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ مخلوق کا خالق سے مستغنی ہونا ناممکن اور محال ہے ممکن کا وجود واجب الوجود کے سہارے سے ہے۔ ؎

پناہ بلندی و پستی توئی ✽ ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

اسی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص وجود باری یا توحید باری کا منکر ہو وہ ناجی نہیں

جبلی فطری ہے ، اگرچہ اس کو کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ اس لیے کہ وجود باری اور توحید باری کا مسئلہ فطری اور عقلی اور بدیہی ہے اور عقلاء عالم کا اجماعی ہے۔ بعثت انبیاء پر موقوف نہیں بعثت پہلے ہی ہو چکی ہے لہٰذا اب کوئی عذر مسموع نہیں۔

اور اسی وجہ سے کہ عبادت اختیاری تذلل کا نام ہے حضرات فقہاء نے عبادت کے لیے نیت کا ہونا بالاجماع شرط قرار دیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ کمال محبت کے ساتھ کمال ذلت کا نام عبادت ہے۔ کمال عظمت کے ساتھ کمال محبت بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہے جس درجہ کی محبت اور عظمت ہوگی اسی درجہ کی عبادت ہوگی۔ عظمت کے ساتھ جب تک محبت نہ ہو عبادت نہیں کہلائے گی اور ایاک جو نعبد کا مفعول ہے اس کی تقدیم حصر کے لیے ہے یعنی خاص تیری ہی بندگی کرتے ہیں کسی اور کی نہیں نیز تقدیم مفعول میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عابد کی نظر اپنی عبادت پر نہ ہونی چاہیے بلکہ معبود پر ہونی چاہیے نیز عبادت سے فقط معبود کی رضا اور خوشنودی مقصود و مطلوب ہونی چاہیے۔

خلاف طریقت بود کاولیا ٭ تمنا کنند از خدا جز خدا

گر از دوست چشمت باحسان اوست ٭ تو در بند خویشی نہ در بند دوست

اور نعبد صیغہ جمع ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم سب تیری بندگی کرتے ہیں بجائے اَعْبُدُ کے صیغہ جمع لانے میں التزام جماعت کی طرف اشارہ ہے نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ بندگی کرنے والا اپنی عبادت پر ناز نہ کرے بلکہ یہ سمجھے کہ عبادت کرنے والا صرف وہی ایک نہیں بلکہ بے شمار بندگی کرنے والوں میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ابتداء سورت میں طرز کلام غائبانہ تھا۔ اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں بجائے غائبانہ کے حاضرانہ طرز کلام اختیار کیا گیا اور اس طرح غیبت سے خطاب کی طرف انتقال کیا گیا وجہ اس کی یہ ہے

۱۔ کہ شروع سورت میں حمد و ثناء کا ذکر تھا اور تعریف اور ثنا غائبانہ زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ غائبانہ حمد زیادہ اخلاص کی علامت ہے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں عبادت کا ذکر ہے اور عبادت اور خدمت حضوری میں ہوتی ہے۔

۲۔ نیز نمازی نے جب نماز شروع کی تو شروع نماز میں بمنزلہ اجنبی کے آکر کھڑا ہو گیا اور خداوند ذوالجلال کی غائبانہ حمد و ثناء شروع کی یعنی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہا یعنی اسم ظاہر کے ساتھ اس کی حمد و ثناء کی اور اسم ظاہر حکم میں غائب کے ہے اور جب حمد و ثناء میں کمال کو پہنچی تو جو حجابات درمیان میں تھے وہ اٹھ گئے اور بعد قرب سے اور اجنبیت یگانگت سے بدل گئی اور یہ شخص اس قابل ہو گیا کہ خداوند ذوالجلال کے حضور بصیغہ خطاب عرض معروض کر سکے

۳۔ نیز اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے بعد ہدایت کے سوال کا ذکر ہے اور سوال اور درخواست حضوری ہی میں زیادہ بہتر اور مناسب ہوتی ہے۔ اس لیے کہ جب غنی کے سامنے سوال کیا جائے تو کی

اور کریم اُس کے ذکر کرنے سے شرماتا ہے۔

اور إِيَّاكَ نَعْبُدُ کے بعد إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کو اس لیے ذکر فرمایا کہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت پر قوت اور قدرت بدون اس کی اعانت اور توفیق کے حاصل نہیں ہو سکتی اور توفیق کا طلب کرنا یہی استعانت ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت کے لیے بندہ کی حول اور قوت کافی نہیں جب تک خدا کی اعانت حاصل نہ ہو۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ غرض یہ کہ إِيَّاكَ نَعْبُدُ کے بعد إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ کا ذکر کرنا عجب اور غرور کو زائل کرتا اور نخوت اور کبر کو فنا کرتا ہے۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ میں فرقہ جبریہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ جبریہ بندہ کو جماد کی طرح مجبور محض بتاتے ہیں۔ إِيَّاكَ نَعْبُدُ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے کیونکہ عبادت کے معنی اختیاراً تذلل کے ہیں۔ فی الجملہ بندہ کے لیے اختیار ثابت ہوا اور جبر محض کی نفی ہوئی۔ اور إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ میں فرقہ معتزلہ کے رد کی طرف اشارہ ہے۔ ارباب اعتزال بندہ کو اپنے افعال کا خالق اور فاعل مستقل قرار دیتے ہیں۔ إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ سے اس فرقہ کا رد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اگرچہ عبادات اور بندگی اپنے اختیار سے کرتا ہے لیکن جماد کی طرح مجبور محض اور اختیار سے عاری اور کورا نہیں مگر ایسا فاعل مستقل بھی نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کی اعانت سے مستغنی اور بے نیاز ہو جائے۔ بندہ فاعل مختار ضرور ہے مگر اپنے اس ارادہ و اختیار میں ہر لحظہ اور ہر لمحہ اسکی اعانت اور امداد کا محتاج ہے۔ فافہم ذلک فانہ دقیق و لطیف وسیأتی تفصیل ذلک ان شاء اللہ تعالیٰ۔

سوال دربارہ استعانت بغیر اللہ

اس آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگی جائے حالانکہ قرآن و حدیث میں جا بجا اس کا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو، بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر یہ طبیب اور دوا سے استعانت اور استمداد نہیں تو اور کیا ہے۔ لہذا یہ بتلایا جائے کہ وہ کون سی استعانت ہے جو غیر اللہ سے جائز ہے اور کون سی کفر اور شرک ہے۔

جواب

جاننا چاہئے کہ غیر اللہ سے مطلقاً استعانت حرام نہیں استعانت بغیر اللہ بعض صورتوں میں کفر اور شرک ہے اور بعض صورتوں میں جائز ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ اگر سوائے خدا تعالیٰ کے

کے کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر یا بعد عطاء الٰہی اور تفویض خداوندی اس کو قادر مختار جان کر اس سے مدد مانگے تو بلاشبہ کفر اور شرک ہے یا اس شخص کو تاثیر اور فاعلیت میں مستقل بالذات یا مستقل بالعرض تو نہیں سمجھتا لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا نہیں کرتا لیکن دوسروں کو اسکے استقلال کا وہم ہوتا ہے تو یہ استعانت بالغیر ناجائز اور حرام ہوگی۔ اور بعض صورتوں میں کفر اور شرک کا اندیشہ ہے۔ جیسا آئندہ تفصیل سے معلوم ہوگا۔

پہلی صورت جبکہ غیر اللہ کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھے اسکے شرک ہونے میں تو کسی کو بھی کلام نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ غیر کو قادر بالذات تو نہیں سمجھتا لیکن قادر بعطائے الٰہی سمجھتا ہے کہ حق تعالیٰ نے قدرت اور اختیار عطا کر دیا ہے کہ جو امور طاقت بشریہ سے باہر ہیں۔ ان میں جس طرح چاہے تصرف کرے اور جسکو چاہے دے اور جسکو چاہے نہ دے جیسے بادشاہ اپنے وزراء اور حکام کو کچھ اختیارات عطا کر دیتا ہے اور وہ بعد عطائے اختیارات مستقل سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر بادشاہ کے علم اور ارادہ کو دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح معاذ اللہ۔ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات انبیاء اور اولیاء کو عطا کر رکھے ہیں اور وہ بعد عطاء الٰہی مستقل ہو گئے ہیں۔ مشرکین عرب ملائکہ اور اصنام کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى مشرکین انکو مستقل بالذات نہیں سمجھتے تھے بلکہ انکو فاعل مستقل بعطاء الٰہی سمجھتے تھے۔ اور یہ کہتے تھے کہ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ خدا ہی کا دیا ہے قرآن کریم میں جابجا اس عقیدہ کو باطل کیا گیا کما قال تعالیٰ۔ وَيَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وقال تعالیٰ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِنْدَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ۔ یہ نادان یہ نہیں سمجھتے کہ ملوک دنیا کے اختیارات کا کسی طرف منتقل ہونا یا عطا کیا جانا نہ اختیاراً ممکن ہے اور نہ اضطراراً۔ کفار بغیر عطاء الٰہی کسی چیز پر انکو قادر نہیں سمجھتے تھے۔ وقال تعالیٰ قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا وقال تعالیٰ قُلْ لَا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعًا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ۔ ان آیات میں بالذات نفع اور ضرر کے مالکیت اور اختیار کی نفی نہیں اس لیے کہ کوئی نفع اور ضرر کے بالذات مالک اور مختار ہونے کا مدعی تھا اور نہ کوئی عاقل اسکو تسلیم کر سکتا ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نفع و ضرر کا بالذات مالک ہو مشرکین بھی اسکے قائل تھے کہ اصل مالک اور خالق وہی اللہ ہے۔

تیسری صورت کہ جب اس غیر کو نہ مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض لیکن معاملہ اس کے ساتھ مستقل بالذات کا سا کرے۔ مثلاً اسکو یا اسکی قبر کو سجدہ کرے یا اسکے نام کی نذر مانے تو یہ بھی حرام اور شرک ہے لیکن یہ شرک اعتقادی نہیں بلکہ عملی ہے۔ اسکا مرتکب حرام کا مرتکب سمجھا جائیگا۔ دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوگا۔ چوتھی صورت کہ جب استعانت بالغیر میں اس غیر کے استقلال کا ایہام

ہوتا ہو جیسے روحانیات سے مدد مانگنا، اگرچہ یہ شخص مستقل نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چونکہ ارواح کو فاعل مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیے ارواح سے مدد مانگنا قطعاً حرام ہوگا۔ حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں تردد اس میں ہے کہ اس شخص کو دائرۂ اسلام سے خارج کیا جائے یا نہیں یہ فعل چونکہ شرک کا مظہر اتم ہے اس لیے دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے خلاصہ کلام یہ کہ اول کی دو صورتیں قطعاً کفر و شرک ہیں اور ان کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور اخیر کی دو صورتیں قطعاً حرام ہیں تردد اس میں ہے کہ ایسے شخص کو کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج مانا جائے یا نہیں لیکن اگر ایسی ہستی سے مدد مانگے کہ جس سے مدد مانگنا کفار اور مشرکین کے شعار سے ہو تو ایسی صورت میں اگر کوئی مفتی اور متقی زُنّار باندھنے والے کی طرح اس پر بھی ظاہر کے اعتبار سے کفر اور شرک کا فتویٰ دے اور کافر ہونے کا حکم لگائے تو کچھ مضائقہ نہیں، چونکہ وہ شخص شعار کفر و شرک سے ہے اس لیے اس کی نیت کا اعتبار نہ کیا جائیگا البتہ امور عادیہ جو طاقت بشریہ کے تحت داخل ہوں اور کارخانۂ عالم اسباب ان کے ساتھ مربوط اور متعلق ہو اور کسی شخص کو ان کے فاعل مستقل ہونے کا وہم بھی نہ ہوتا ہو جیسے روٹی کی امداد سے بھوک رفع کرنا اور پانی کی امداد سے پیاس رفع کرنا تو یہ استعانت بلا نکیر جائز ہے بشرطیکہ اعتماد محض اللہ پر ہو اور غیر کو محض ایک ذریعہ اور وسیلہ اور عون الٰہی کا ایک مظہر سمجھے جیسے نل محض پانی کے آنے کا راستہ ہے اسی طرح اسباب فیض خداوندی کے راستے ہیں اصل دینے والا وہی ہے اور مشرک یہ سمجھتا ہے کہ یہ نل ہی مجھ کو پانی دے رہا ہے اس لیے نل ہی سے پانی مانگتا ہے اور نل ہی کی خوشامد کرتا ہے حتیٰ جو شخص دوا کو محض ایک وسیلہ سمجھے اور طبیب کو محض معالج جانے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن اگر دوا کو مستقل مؤثر سمجھے اور طبیب کو صحت بخشنے والا جانے تو یہ شرک ہوگا جاننا چاہیئے کہ اسباب شرعیہ کا بھی وہی حکم ہے کہ جو اسباب عادیہ کا حکم ہے صرف فرق اتنا ہے کہ اسباب عادیہ کا سبب ہونا عادۃ سے معلوم ہوا اور اسباب شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوا پس جس طرح اسباب عادیہ سے استعانت اور استمداد جائز ہے اسی طرح اسباب شرعیہ مثل دعا اور رقیہ صبر اور نماز وغیرہ سے بھی استعانت جائز ہے اس لیے کہ ان امور کا اسباب ہونا شریعت سے معلوم ہوا۔ اور امور غیر عادیہ میں اگرچہ غیر کو مظہر عون الٰہی سمجھے اور اصل اعتماد بھی اللہ ہی پر ہو مگر امور غیر عادیہ کا سبب ہونا ثابت نہیں من جانب اللہ بالفرض اگر ثابت بھی ہو تو قطعی اور یقینی نہیں اس لیے امور غیر عادیہ میں استعانت بغیر اللہ کفر اور شرک تو نہ ہوگی مگر بدعت ضلالت ضرور ہوگی حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں

دریں جا باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہے	اس جگہ جاننا چاہیئے کہ غیر اللہ سے استعانت
کہ اعتماد بر آں غیر باشد و او را مظہر عون	اس وقت حرام ہے کہ جب اعتماد اور
الٰہی نداند حرام است و اگر التفات	بھروسہ اس غیر پر ہو اور اس غیر کو امداد
محض بجانب حق است و او را یکے	الٰہی کا مظہر نہ سمجھے، اور اگر التفات اور

از مظاہر عون او دانستہ و نظر بکارخانہ اسباب و حکمت او تعالیٰ در آں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود و در شرع نیز جائز و روا است و انبیاء و اولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند و در حقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لاغیر۔

(فتح العزیز صفحہ ۸)

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں۔

استعانت با چیزے است کہ توہم استقلال آں چیز در وہم و فہم ہیچ کس از مشرکین و موحدین نمی گزرد، مثل استعانت بچوب و نمدات در دفع گرسنگی و استعانت بآب در دفع تشنگی و استعانت بسایہ درخت و مانند آں در دفع گرمی و در دفع مرض بادویہ و عقاقیر و در تحصیل امور معاش با امیر و بادشاہ کہ در حقیقت مظاہر عون الٰہی است و موجب تذلل نیست یا با اطباء و معالجان کہ بسبب تجربہ و اطلاع زائد از ما طلب مشورہ است و استقلال متوہم نمی شود پس ایں قسم استعانت بلا کراہت جائز است زیرا کہ در حقیقت استعانت نیست و اگر استعانت است استعانت بخدا است و یا بچیزے است کہ توہم استقلال او در ادراک مشرکین یا گزرد مثل استعانت

نظر صرف خدا ہی پر ہو۔ اور اس غیر کو اعانت الٰہیہ کا محض مظہر جان کر کارخانہ اسباب پر نظر کرتے ہوئے اس غیر سے ظاہری طور پر مدد چاہے تو خلاف عرفان نہیں اور شریعت میں بھی جائز ہے اور حضرات انبیاء اور اولیاء نے بھی غیر اللہ سے اس قسم کی استعانت کی ہے اور چونکہ نظر صرف حق تعالیٰ پر ہے اس لئے یہ استعانت بالغیر نہیں بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

استعانت اور استمداد یا تو ایسی چیز سے ہے کہ موحدین اور مشرکین کو بھی اس کے مستقل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا جیسے بھوک دفع کرنے کے لئے نمد اور اناج سے مدد حاصل کرنا اور پیاس دفع کرنے کے لئے پانی اور درختوں سے مدد حاصل کرنا اور راحت آرام حاصل کرنے کے لئے درخت کے سایہ سے مدد حاصل کرنا اور بیماری کے دفع کرنے کے لئے دواؤں اور جڑی بوٹیوں سے مدد لینا معاشی امور میں امیر اور بادشاہ سے مدد چاہنا کہ جو درحقیقت اعانت خداوندی کے مظہر ہیں ہے موجب تذلل نہیں، یا اطباء اور معالجین سے ان کے تجربہ اور زیادتی واقفیت کی بنا پر مشورہ لینا ان صورتوں میں استقلال کا وہم بھی نہیں ہوتا پس اس قسم کی استعانت بلاکراہت جائز ہے اس لئے کہ یہ استعانت حقیقۃً نہیں محض ظاہری استعانت ہے حقیقۃً استعانت خدا تعالیٰ ہی سے ہے یا ایسی چیز کے ساتھ استعانت ہے کہ جس کا مستقل بالذات ہونا مشرکین کے ذہنوں

یا ارواح و روحانیات فلکیہ یا عنصریہ یا ارواح سائرہ مثل بھوانی و شیخ سدو و زین خاں وامثال آنہا استعانت عین شرک است و منافی ملت حنفی (فتح العزیز ص ۱۲)	یہی جگہ لیے ہوئے ہے جیسے ارواح سے یا روحانیات فلکیہ اور عنصریہ سے استعانت کرنا یا ارواح سائرہ یعنی چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے بھوانی اور شیخ سدو و زین خاں اس قسم کی استعانت عین شرک ہے اور ملت حنفیہ اسلامیہ کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔

ہم کو راہ راست دکھا اور اس پر چلا اور منزل مقصود تک پہنچا

۱۔ ہدایت کے معنی لطف اور مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنے کے ہیں اسی وجہ سے یہ لفظ حقیقۃً ہمیشہ خیر کے موقع پر مستعمل ہوتا ہے اور فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ میں بطور تہکم اور بطریق استہزاء آیا ہے۔

۲۔ ہدایت کا استعمال تین طریقے سے ہوتا ہے اگر ہدایت سے کسی شئی کی نشان دہی اور رہنمائی مراد ہو تو لفظ الیٰ کے ساتھ متعدی ہوگا۔ اور اگر ہدایت سے منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو لام کے ذریعے سے متعدی ہوگا۔ اور اگر راستہ کا قطع کرانا اور منزل مقصود تک پہنچانا مراد ہو تو بلا واسطہ متعدی ہوگا جیسا کہ اس آیت میں بلا واسطہ متعدی ہے اس لیے ہم نے اس کے ترجمہ میں دکھانا، چلانا اور پہنچانا تینوں چیزوں کا ذکر کیا۔

۳۔ حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں پائی جائیں۔

(۱) مستقیم یعنی سیدھا ہو۔ (۲) اور موصل الی المقصود ہو یعنی مقصد تک پہنچانے والا ہو (۳) اقرب سے زیادہ قریب اور نزدیک ہو۔ (۴) اور وسیع اور کشادہ ہو۔ (۵) اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہ ہو۔ جس راستہ میں یہ پانچوں باتیں پائی جائیں اسکو صراط کہتے ہیں جب تک یہ پانچ باتیں نہ پائی جائیں اس وقت تک صراط کا اطلاق نہیں کیا جائیگا۔

اس جگہ صراط کی صفت مستقیم ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کیلیے سب سے قریب راستہ یہی ہے اس لیے کہ اقلیدس کا قاعدہ ہے کہ جب دو نقطوں میں مختلف اور متعدد خطوط ملائے جائیں تو تمام خطوط میں سب سے قریب اور سب سے چھوٹا خط یہی خط مستقیم ہوگا اور سیدھا ہی راستہ منزل مقصود تک پہنچاتا ہے نیز خط مستقیم متغیر نہیں ہوتا اور غیر مستقیم متغیر ہو جاتا ہے اور اسی ایک رستہ کا تمام عالم کے مرور اور عبور کے لیے کافی ہونا اس کے وسیع ہونے کی دلیل ہے اور خدا

جو تو نے اپنے تمام انعام والے بندوں پر متفرقاً نازل فرمائے ہیں ہم پر مجتمعاً نازل فرما۔ آمین

نیز لفظ صراط کو اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کی طرف مضاف کرنے میں سالکین راہ حق کو راہبر ولی منزل کی آخرت کے لیے ایک عظیم الشان تسلیہ ہے کہ وہ سفر اور راستہ کی تنہائی سے ہرگز نہ ڈریں نبیین اور صدیقین اور شہداء اور صالحین انکے رفیق سفر ہیں۔ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِیْقًا۔

نیز مقام سوال میں منعم کے انعامات واحسانات کا تذکرہ اجابت اور قبول میں خاص اثر رکھتا ہے اسی طرح سوال ہدایت کے وقت حق جل وعلا کے انعام عام کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اے رب العالمین اور اے ارحم الراحمین تو نے اپنی رحمت واسعہ سے بہت بندوں پر ہدایت کا انعام فرمایا ہم کو بھی اس نعمت عظمیٰ سے سرفراز اور اس پر استقامت نصیب فرما۔ اور ہم گنہگاروں کو بھی اپنے لطف عمیم سے اہل انعام کے زمرہ میں داخل فرما۔ آمین۔

مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ سے وہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہ راست کو چھوڑ دے اور علم صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے اس نوع کے کامل ترین افراد یہود ہیں کہ باوجود توریت کے عالم ہونے کے کتمان حق اور استکبار اور اتباع ہوی جیسے امراض میں مبتلا رہے۔

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ہمیشہ معاندانہ رویہ رکھا جان بوجھ کر قتل انبیاء اللہ کے مرتکب ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر ابد تک ذلت و مسکنت کی مہر لگا دی گئی غضب اور لعنت کا طوق انکی گردنوں میں ڈالدیا گیا۔ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ۔

اور ضَآلِّیْنَ سے وہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے بھٹک کر غلط راستہ پر جا پڑا۔ اس نوع کے کامل ترین افراد نصاریٰ ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

وَاَضَلُّوْا كَثِیْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِیْلِ۔	بہتوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

یہود اور نصاریٰ کے کامل ترین افراد ہونے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغضوب علیہم کی تفسیر یہود سے اور ضالین کی تفسیر نصاریٰ سے فرمائی۔ اسکا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مغضوب علیہم اور ضالین کے مصداق صرف یہود اور نصاریٰ ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ ان دو قسموں کے تحت میں ہر قسم کے گمراہ اور کافر اور فاسق و فاجر عاصی اور مبتدع علی اختلاف المراتب داخل ہیں مگر یہود مغضوب علیہم کے کامل ترین فرد اور نصاریٰ ضالین کے اولین مصداق ہیں سلف صالحین یہ فرمایا کرتے تھے کہ اس امت کے علماء میں سے جو بگڑا وہ یہود کے مشابہ ہوا اس لیے کہ وہ اپنی اغراض کی وجہ سے کلمات الٰہیہ کی تحریف اور کتمان ما انزل اللّٰه اور تلبیس الحق بالباطل اور اہل علم و فضل کے حسد میں گرفتار ہوا کہ یہود کے اخلاق ہیں اور اس امت کے عباد اور زہاد میں سے جو بگڑا وہ

نصاریٰ کے مشابہ ہوا۔ اس لیے کہ اس نے اپنی عبادت میں بجائے شریعت غرّا اور سنت پیغمبر کے ہوائے نفس کا اتباع کیا اور نصاریٰ کی طرح تعظیم مشائخ میں یہ حد درجہ کا غلو کیا کہ اعتقاداً نہ سہی عملاً تو ضرور ان کو رب اور ان کی قبور کو مساجد بنالیا۔ بعض مرتبہ چونکہ نعمت ہی علم و عمل کے فساد کا باعث ہوتی ہے اکثر عیش اور تنعم ہی میں پڑ کر انسان خدا کو بھول جاتا ہے اور احکام الٰہی کو پس پشت ڈال دیتا ہے اس لیے الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے بعد غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کا اضافہ مناسب ہوا کہ اے رب العالمین اپنی نعمتوں پر حمد و شکر کی توفیق عطا فرما خدا نخواستہ ایسا نہ ہو کہ تیرے انعام کے بعد غرور اور تکبر میں مبتلا ہو کر سیدھے راستے سے بھٹک جائیں اور تیری لعنت و غضب کے مستحق بنیں اور اپنی نعمت کو اطاعت کا ذریعہ بنا معصیت کا سبب نہ بنا۔

آیت موصوفہ میں صرف انعام کو اپنی جانب منسوب فرمایا۔ غضب اور ضلال کو اپنی جانب منسوب نہیں فرمایا اس میں ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ انعام محض اس کا فضل ہے بلا کسی استحقاق کے بندوں پر مبذول فرماتا ہے۔ مگر غضب ابتداءً نازل نہیں فرماتا بلکہ ان کی نافرمانی اور دیدہ و دانستہ عہد شکنی کے بعد اور علی ہٰذا گمراہ جب ہوتے ہیں کہ جب صراط مستقیم کو چھوڑ کر غلط راہ اختیار کر لیتے ہیں۔

نیز ادب الٰہی کا اقتضاء یہ ہے کہ جب افعال احسان و رحمت کا ذکر ہو تو صراحۃً اللہ جل جلالہ کی طرف اس کی اسناد ہونی چاہیے۔ اور جب افعال جزاء اور عقوبت کا ذکر ہو تو پھر فاعل کا حذف اور فعل کا مبنی للمفعول لانا مناسب ہے مثلاً ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا۔

الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔

جس نے مجھ کو پیدا کیا وہی مجھ کو راہ دکھاتا ہے اور وہی مجھ کو کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

خلق اور ہدایت اور اطعام اور اسقاء اور شفاء ان تمام افعال کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ مگر مرض کو طبعی مکروہ ہونے کی وجہ سے ادباً اپنی جانب منسوب کیا اور یہ کہا۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ۔

جب میں بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

اور یہ نہیں کہا

وَاِذَا اَمْرَضَنِيْ فَهُوَ يَشْفِيْنِ

کہ جب وہ مجھ کو بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو وہی مجھ کو شفا دیتا ہے۔

اور مومنین جن نے کہا۔

وَأَنَّا لَا نَدْرِي أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ	اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کیا گیا یا ان کے رب نے ان کے ساتھ خیر اور بھلائی کا ارادہ کیا ہے۔

یہاں ارادۂ شر کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کیا اور صیغہ مجہول کے ساتھ اس کو ذکر کیا۔ یعنی شَرٌّ أُرِيدَ کہا اور أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا میں ارادۂ رشد کو رب العزت کی جانب منسوب کیا۔

اور حضرت خضر علیہ السلام نے فَأَرَدْتُ أَنْ أَعِيبَهَا (میں نے ارادہ کیا اس کشتی کو عیب دار بنادوں) میں عیب اور ارادۂ عیب دونوں کو اپنی جانب منسوب کیا اور

فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۔	تیرے رب نے ارادہ کیا وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچیں اور قدرت کی مہربانی سے اپنا خزانہ نکالیں۔

اس آیت میں ارادۂ رحمت کو رب العالمین کی جانب منسوب کیا اور وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي (میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا) کہہ کر اس کو اور مؤکد کر دیا۔

اور اسی طرح

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ اور وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ۔	روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں سے صحبت تمہارے لیے حلال کر دی گئی۔ ان محرمات کے سوا اور عورتیں تمہارے لیے حلال کر دی گئیں۔

یہاں اس خاص احلال کو چونکہ اللہ جل جلالہ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب تھا اس لیے دونوں جگہ أُحِلَّ کو مبنی للمفعول ذکر کیا گیا۔

اور وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا میں یہ مانع نہ تھا اس لیے اس احلال اور تحریم کی اسناد صراحۃً اللہ کی طرف کر دی گئی۔

نیز منعم حقیقی صرف وہی تبارک وتعالیٰ ہے کما قال تعالیٰ۔ وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ اس لیے انعام کو اللہ کی طرف منسوب کیا گیا، اور غضب خدا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ انبیاء اور علماء و صالحین کی طرف سے بھی خدا کے نافرمان اور سرکش بندوں پر ہو سکتا ہے۔

نیز مغضوب علیہم کے فاعل کا حذف اہل غضب کی تحقیر اور تذلیل کی طرف مشیر ہے اور انعام کے فاعل کی تصریح اہل انعام کے تشریف وتکریم کی طرف مشیر ہے، مثلاً کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ

الذی اکرمہ السلطان و خلع علیہ (بادشاہ نے اس شخص کا اکرام کیا اور اس کو خلعت عطا کیا) برنسبت ھٰذا الذی اُکرِم و خُلِعَ علیہ (اس شخص کا اکرام کیا گیا اور اس کو خلعت دیا گیا) کے بدرجہا بلیغ ہے اور ذکر فاعل کی وجہ سے یہ پہلا کلام جس قدر مورد مدح و ثناء اور تعریف و تکریم پر دلالت کرتا ہے دوسرا کلام اس دلالت میں اس کے پاسنگ بھی نہیں۔

نیز حذف فاعل کچھ اعراض اور ترک التفات پر دلالت کرتا ہے جو اہل غضب کے مناسب ہے، اہل انعام کے مناسب نہیں اس لیے انعام کا فاعل ذکر کیا گیا اور غضب کا فاعل حذف کیا گیا اور چونکہ انعام کی ضد غضب ہے ضلال انعام کا مقابل نہیں بلکہ رشد اور ہدایت کا مقابل ہے اس لیے اہل انعام یعنی اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کے بعد متصلاً ہی اہل غضب یعنی غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ کا ذکر فرمایا اور اہل ضلال کو بعد میں ذکر کیا کیونکہ ایک ضد کے بعد دوسری کا ذکر کلام میں ایک خاص شان اور خاص تناسب پیدا کر دیتا ہے۔

اور اہل غضب کی تقدیم کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ یہود برنسبت نصاریٰ کے اسلام سے زیادہ دور ہیں۔ اس لیے کہ نصاریٰ نے صرف ایک نبی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی اور یہود نے دو پیغمبروں کی یعنی مسیح ابن مریم اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی حق تعالیٰ شانہ نے غیر المغضوب علیہم کو لفظ غیر کے ساتھ ذکر فرمایا اور حرف لا کے ساتھ یعنی لا المغضوب علیہم نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ حرف لا فقط ماقبل کی نفی کے لیے آتا ہے اس صورت میں کلام کے یہ معنی ہوتے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا نہ اہل غضب کا۔ اور لفظ غیر ماقبل کی نفی اور مغایرت دونوں پر دلالت کرتا ہے مطابق آتا ہے کہ مغایرت پر صراحۃً اور نفی ماقبل پر ضمناً اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ اے اللہ ہم کو اہل انعام کا راستہ بتلا جن کا راستہ اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے بالکل مغایر اور مباین ہے خود اہل انعام اور ان کا راستہ غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکلیہ پاک ہے۔ اہل فہم خود دیکھ لیں کہ یہ معنی برنسبت پہلے معنی کے کس قدر لطیف ہیں اور کیا یہ لطافت بجائے لفظ غیر کے حرف لا لانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کلا ہرگز نہیں۔

نیز لفظ غیر کے لانے میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کا یہ زعم کہ ہم ہی اہل انعام ہیں جیسا کہ وہ کہتے تھے۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ۔ غلط ہے بلکہ اہل انعام ان کے سوا اور غیر ہیں۔ کما قال تعالیٰ

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔	آج میں نے تمہارے لیے دین کو کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

اور وَلَا الضَّآلِّیْنَ میں حرف عاطف یعنی واؤ کے ہوتے ہوئے پھر حرف لا کا اس لیے اعادہ

فرمایا تاکہ اہل انعام کے راستہ کا اہل غضب اور اہل ضلال کے راستہ سے فرداً فرداً علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم ہو جائے وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے اگر حرف لا کو حذف کر کے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَالضَّآلِّيْنَ کہا جائے تو مجموعہ فریقین کے راستہ سے اہل انعام کے راستہ کا مغایر ہونا معلوم ہوگا، اہل انعام کے راستہ کا ہر ایک سے علیحدہ علیحدہ مغایر ہونا معلوم نہ ہوگا، اور ظاہر ہے کہ مجموعہ من حیث المجموع کی مغایرت ہر واحد کی مغایرت کو مستلزم نہیں۔ ہاں ہر واحد کی مغایرت مجموعہ من حیث المجموع کی مغایرت کو بالاولویت مستلزم ہے فافهم ذٰلک واستقم۔

اسرارِ مجموعہ سورت

۱۔ اس سورت میں دس چیزیں مذکور ہیں۔ پانچ چیزیں خدا تعالیٰ کے متعلق ہیں اور پانچ بندوں کے متعلق ہیں۔ خدا تعالیٰ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ الوہیت۔ ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت۔ مالکیت۔ بندہ کے متعلق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ عبادت۔ استعانت۔ طلب ہدایت۔ طلب استقامت۔ طلب نعمت۔

بندہ کی یہ پانچ صفتیں اسی ترتیب سے خدا تعالیٰ کی پانچ صفتوں سے متعلق ہیں اور معنی کلام یہ ہیں کہ اے خدا! ہم خاص تیری عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ تو ہمارا الٰہ یعنی معبود ہے اور خاص تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اس لیے کہ تو ہی تمام جہانوں کا مربی اور پرورش کرنے والا ہے اور تجھ ہی سے ہدایت کی درخواست کرتے ہیں۔ اس لیے کہ تو رحمن ہے تیری رحمت اور مہربانی عام ہے اور تجھ ہی سے استقامت کی التجا کرتے ہیں اس لیے کہ تو رحیم ہے تیری خاص رحمت خاص اہل ایمان اور اہل ہدایت ہی پر مبذول ہے اور تجھ ہی سے انعام کے امیدوار ہیں۔ اس لیے کہ تو ہی جزا اور سزا کا مالک ہے ایسی کامل نعمت ہم کو عطا فرما کہ جو غضب اور ضلال کے شائبہ سے بالکل پاک ہو (تفسیر کبیر ص ۱۵۱ جلد ۱)

۲۔ نیز بندہ جب مقام مناجات میں کھڑا ہوا اور خدا کی صفات کمال بیان کرتا ہوا مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تک پہنچا تو بے اختیار سیر الی اللہ کا شوق دامنگیر ہوا۔ ارادہ سفر کا مصمم کیا تو سفر کے لیے عبادت کا توشہ لیا، اور استعانت، امداد خداوندی کی سواری پر سوار ہوا اور مراحل کے طے ہو جانے کے بعد راستہ معلوم کیا۔ جب سیدھا راستہ معلوم ہو گیا تو رفقاء طریق کی فکر ہوئی کہ جن کی رفاقت اور معیت سے راستہ سہولت سے قطع ہو اور راہزنوں یعنی اہل غضب اور اہل ضلال کا کوئی خدشہ اور خطرہ باقی نہ رہے۔ (تفسیر عزیزی ص [illegible])

۳۔ جن علوم کی حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے دعوت دی وہ تین علم ہیں۔ علم شریعت۔ علم

طریقت، علم حقیقت اور پھر علم شریعت کی دو قسمیں ہیں۔ اول علم عقائد، دوم علم احکام۔ سو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ میں الٰہیات یعنی خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا بیان ہے اور اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ الخ میں ہدایت اور ضلالت سعادت اور شقاوت کا بیان ہے اور چونکہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے انبیاء وصدیقین، شہداء اور صالحین مراد ہیں اس لیے اس آیت میں مباحث نبوت ورسالت کی طرف اشارہ ہے اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں علم احکام کی طرف اشارہ ہے۔ علم طریقت جس میں نفس اور قلب کے امراض اور مجاہدات سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کے تین مرتبے ہیں، پہلا مرتبہ توحید فی العبادۃ ہے کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہ کرے۔ دوسرا مرتبہ توحید فی الاستعانت ہے یعنی سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگے۔ تیسرا مرتبہ استقامت ہے یہ سلوک کا اعلیٰ مرتبہ ہے کہ طریق عبودیت اور جادۂ اخلاص ومحبت پر قدم ایسا ٹھیک جم جائے کہ ذرہ برابر ادھر ادھر ہٹنے نہ پائے ان مراحل اور مقامات کے طے ہو جانے کے بعد درجہ ہے مکاشفات اور تجلیات کا کہ قلب پر سحائب الہام کی بارش ہونے لگے اور علوم اور معارف اسرار اور لطائف منکشف ہونے لگیں۔ یہ علم حقیقت ہے اللہ تعالیٰ جس پر چاہے اپنا انعام فرمائے۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ میں اسی علم کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ

اس سورت کے ختم پر آمین کہنا مسنون ہے اور لفظ آمین اسم فعل ہے یعنی یہ کلمہ در اصل تو اسم ہے مگر معنی میں فعل کے ہے یعنی افعل (ایسا ہی کر) کے معنی میں ہے جیسے رُوَيْدَكَ اور حَيَّهَلْ اور هَلُمَّ۔ اسماء افعال ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ جو ہم نے تجھ سے مانگا ہے وہی کر دے یعنی اہل انعام کے راستہ پر چلا اور اہل غضب اور اہل ضلال سے ہم کو الگ رکھ اور لفظ آمین بالاتفاق سورۂ فاتحہ کا جزء نہیں بلکہ جس طرح عام دعاؤں کے بعد آمین کہنا سنت ہے اسی طرح الحمد کے بعد بھی آمین کہنا بالاتفاق سنت ہے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ آمین آہستہ کہنا بہتر ہے یا آواز سے کہنا بہتر ہے امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے کہ آہستہ کہنا بہتر ہے اور یہی امام ابوحنیفہ اور امام محمد اور سفیان ثوری کا قول ہے کیونکہ آمین دعا ہے اور دعا کے آہستہ مانگنے کا حکم قرآن کریم میں صراحۃً موجود ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ اور صحیح حدیثوں میں فقولوا آمین یعنی آمین کہنے کا حکم آیا ہے جس سے جہر ثابت نہیں ہوتا ورنہ فقولوا التحیات للہ الخ اور فقولوا ربنا لک الحمد (متفق علیہ) میں بھی جہر کا قائل ہونا پڑے گا حالانکہ امت کا کوئی عالم اس کا قائل نہیں۔ دلائل کی تفصیل فتح الباری اور شروح ہدایہ میں دیکھیں۔

صلوٰۃِ مُسلمین اور صلوٰۃِ نصاریٰ کا تقابل

کلام الٰہی کے دقائق و اسرار کا تو کون احاطہ کر سکتا ہے۔ بڑے سے بڑے فہیم اور ذکی اور صاحب فہم ثاقب کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہ مختصر سورت یعنی سورہ فاتحہ جس کے معارف و لطائف کا ایک نمونہ ہدیۂ ناظرین کیا گیا ہے اس کے وہ اسرار و معارف جو اللہ رب العزت کے علم میں ہیں وہ تو درکنار اعاظم اسلام اور حضرات مفسرین نے جو اس مختصر سورت کے حقائق و معارف بیان فرمائے ہیں۔ ہم انہیں کے استیعاب اور استقصاء سے عاجز اور درماندہ ہیں۔ جس کی تصدیق علماء اسلام کے تفاسیر سے بخوبی ہو سکتی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ سورۂ فاتحہ جیسی سورت نہ توریت میں اتاری گئی اور نہ زبور میں اور نہ انجیل میں (اخرجہ الترمذی وصححہ)

اسی وجہ سے ہر نماز میں اس سورت کا پڑھنا لازم قرار دیا گیا۔ اس وقت ہم انجیل کی وہ عبارت ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جس کو نصاریٰ اپنی نمازوں میں پڑھتے ہیں۔ تاکہ دونوں کے موازنہ اور مقابلہ سے اہل اسلام کے ایمان اور ایقان میں اضافہ ہو اور نصاریٰ کے لیے اگر وہ خدا سے ڈریں اور غرور و تکبر سے کام نہ لیں تو اس کے لیے موجب ہدایت ہو۔

انجیل متی باب ششم آیت نہم میں ہے کہ اس طرح نماز پڑھا کرو۔

اَبُوْنَا الَّذِیْ فِی السَّمٰوٰتِ لِیَتَقَدَّسْ اِسْمُکَ لِتَاْتِ مَلَکُوْتُکَ

اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک ہو، تیری بادشاہت آئے تیری

لِتَکُنْ مَشِیْئَتُکَ کَمَا فِی السَّمَآءِ وَعَلَی الْاَرْضِ خُبْزَنَا کَفَافَنَا اَعْطِنَا

مشیت جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ایسے ہی زمین پر بھی ہو ہماری روز کی روٹی

الْیَوْمَ وَاغْفِرْ لَنَا خَطَایَانَا کَمَا نَغْفِرُ نَحْنُ لِمَنْ اَخْطَأَ اِلَیْنَا وَلَا تُدْخِلْنَا

آج ہمیں دے اور ہماری خطاؤں کو معاف کر جیسا کہ ہم اپنے خطاکاروں کی خطائیں معاف

فِی التَّجَارِبِ لٰکِنْ نَجِّنَا مِنَ الشِّرِّیْرِ اٰمِیْنَ۔

کرتے ہیں اور ہم کو آزمائش میں نہ ڈال بلکہ برے لوگوں سے بچا آمین۔ یعنی قبول فرما۔

ارباب فہم و بصیرت اگر سورۂ فاتحہ کے بعد اس عبارت پر ایک نظر ڈالیں تو ان کو فوراً منکشف ہو جائیگا کہ اس عبارت کو سورۂ فاتحہ کیساتھ وہ نسبت بھی نہیں جو ثریٰ (خاک) کو ثریا سے ہے صحیفۂ ادعیہ سے تقدیس اسم اور اتیان ملکوت کو طلب کرنا محض لاطائل اور تحصیل حاصل ہے وہ صحیفہ ہے قدوس اور سلام اور جبکہ مقتدر اور عزیز و حکیم ہے جس کی ملک ملکوت ہے قدوس و حکیم کی شان میں یہ لفظ

کہنا کہ چاہئے کہ تیرا نام پاک ہو اور تیری بادشاہت آئے سراسر خلاف ادب ہے

اور یہ کہنا کہ (لتکن مشیتک کما فی السماء علی الارض) چاہئے کہ تیری مشیت جیسے آسمان میں ہے ویسے ہی زمین میں بھی ہو، یہ بھی سراسر خلاف ادب ہے کیا اس کی مشیت سبع سموات اور سبع ارضین میں جاری اور ساری نہیں؟ ورنہ کیا کوئی ذرہ اس کی قدرت اور مشیت سے مستثنیٰ ہے؟ معاذ اللہ۔ بلیٰ إنه على كل شيء قدير۔ وما تشاؤن إلا أن يشاء الله ولا حول ولا قوة إلا بالله۔ اور یہ کہنا کہ آج کی روٹی کے سوال کو ہدایت اور صراط مستقیم کے سوال (جو دنیا اور آخرت کی صلاح اور فلاح اور سعادت دارین کو علی وجہ الاتم شامل ہے) اس سے کیا نسبت؟ اور پھر اس غفور رحیم اور لیس کمثلہ شیء سے یہ سوال کرنا کہ ایسی مغفرت عطا فرما جیسا کہ ہم اپنے گنہگاروں اور خطاکاروں کی مغفرت کرتے ہیں کھلی ہوئی سفاہت۔ دوسری گستاخی ہے اس کی کامل وعظیم اور وسیع وعلیم مغفرت کو اپنی ناقص اور محدود اور برائے نام مغفرت کے ساتھ تشبیہ دینا اور دوسرے یہ اپنے خطاکاروں کو خدا کے خطاکاروں کے ساتھ مماثل جاننا اور تیسرے اپنی نافرمانی کو خدا کی نافرمانی کے ہم پلہ قرار دینا کیا یہ کھلی ہوئی گستاخی نہیں!

الحمد للہ رب العالمین اللہ اس حنان ومنان کے تمام آلاء ونعم میں سے صرف آج کی روٹی کا سوال کرنا اور رب غفور اور ارحم الراحمین سے اپنی ناقص اور محدود مغفرت کے مماثل مغفرت طلب کرنا نصاریٰ کی ہم درخواست کو خوب واضح کرتا ہے۔ عبری میں لفظ آمین مروج ہے جو اہل اسلام سے مسروقہ ہے سوائے اہل اسلام کے دنیا میں کوئی بھی آمین کو نہیں جانتا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

سورۂ بقرہ مدنی ہے اس کی دو سو چھیاسی آیتیں ہیں اور چالیس رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا۔

الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ

الم اس کتاب میں کچھ شک نہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۂ بقرہ کی تفسیر

اس سورۃ کو سورۂ بقرہ اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں ذبحِ بقرہ کا واقعہ مذکور ہے جو حق جل وعلا کی الوہیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ ایک مقتول کا نعش ایک مذبوحہ گائے کا ایک ٹکڑا لگا دینے سے زندہ ہو جانا فقط اس فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ کے ارادہ اور مشیت کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا کسی مادہ اور طبیعت کے اقتضاء کو اس میں اصلاً دخل نہ تھا علاوہ ازیں یہ واقعہ منکرین حشر اجساد کے لیے ایک عظیم الشان حجت ہے کہ وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں اور خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بھی مردوں کو اسی طرح زندہ فرمائے گا جس طرح اس مقتول کو زندہ فرمایا نیز یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اعتبار سے ایک معجزہ تھا جو اُن کی نبوت اور رسالت کی تصدیق کے لیے من جانب اللہ ظاہر کیا گیا تھا غرض یہ کہ بقرہ کا یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت و رسالت اور احیاء موتی اور قیام قیامت تینوں کی دلیل ہے اور یہی تین امور قرآن کریم کے اعظم مقاصد ہیں۔ نیز اس واقعہ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ صراطِ مستقیم کا اقتضاء یہی ہے کہ بغیر تفتیش اور تفحص کے انبیاء کرام کی اطاعت کی جائے جس چیز کا حضرات انبیاء حکم دیں اس کو بے چون و چرا قبول کیا جائے۔ حضرات انبیاء کے حکم کے بعد تفتیش میں پڑنا شک اور نفاق کی علامت ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے پیغمبر پر اطمینان ہوتا تو اس تفتیش کے خلجان میں نہ پڑتا

لہ سورۂ بقرہ اور سورۂ فاتحہ کے باہمی ربط کی طرف اشارہ ہے فافہم ذلک واستقم ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

اور حضرات انبیاء کی اطاعت سے انحراف ضلال مبین (کھلی گمراہی) ہے۔ اور ان حضرات سے بغض رکھنا موجب
غضب اور لعنت ہے اعاذنا اللہ تعالیٰ من ذلک آمین۔ نیز دنیا کی محبت ہی تمام فتنہ اور فساد
کی جڑ ہے جب دنیا کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے تو خدا اور آخرت کی محبت بھی دل سے نکل جاتی ہے
اللہ جل جلالہ کی ہدایت اور انبیاء کرام کی نصیحت جب ہی نفع دیتی ہے کہ دل میں خدا کا خوف اور ڈر
ہو۔ جب خدا کا خوف دل میں ہوتا ہے تب ہی صراط مستقیم اور راہ حق کی تلاش اور خداوند ذو الجلال
کے غضب اور لعنت سے بچنے کی فکر ہوتی ہے ورنہ جس فاسق اور بدبخت کا دل خدا کے خوف سے
خالی ہے اس کے حق میں انبیاء کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔ نیز سورۂ فاتحہ میں ہدایت اور صراط
مستقیم کا ذکر تھا اور سورۂ بقرہ میں شروع ہی سے ہدایت اور صراط مستقیم کا ذکر فرمایا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ۔ ابتداء ہی میں ہدایت کا ذکر فرمایا اور پھر یہ بتایا کہ صراط مستقیم کیا ہے۔
وہ ایمان اور تقویٰ اور اعمال صالحہ کی راہ ہے پھر یہ بتلایا کہ یہ ہدایت کی نعمت کس کو نصیب ہوئی
اور کون اس دولت و سعادت سے محروم رہا۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ تک اس فریق کا ذکر فرمایا جس کو ہدایت نصیب ہوئی اور جو ظاہرًا
اور باطنًا اللہ کی ہدایت اور صراط مستقیم پر چلنے والے تھے۔ اور پھر اہل غضب اور اہل ضلال کے دو
فریقوں کا ذکر فرمایا ایک کافرین کا جو ظاہرًا اور باطنًا صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے تھے۔ دوسرے
منافقین جو ظاہرًا صراط مستقیم پر تھے اور باطنًا غضب اور ضلال کی راہ پر تھے۔ اور چوتھی قسم یعنی جو
ظاہرًا تو غضب اور ضلال کی راہ پر ہو اور باطنًا صراط مستقیم پر ہو یہ قسم عقلًا اور شرعًا ناممکن ہے اس لیے
اس قسم کو ذکر نہیں فرمایا۔ نیز سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ شانہ کی ربوبیت اور رحمانیت اور رحیمیت
کا ذکر تھا اس لیے سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں صحیفۂ ہدایت کا ذکر فرمایا کہ جس سے بڑھ کر کوئی تربیت
اور رحمت نہیں پھر كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ۔ الخ میں اس
ظاہری ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا جس کا تمام نوع انسانی سے تعلق ہے اور يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا
میں تمام لوگوں کو اپنی عبادت اور بندگی کا خطاب عام فرمایا۔ بعد ازاں اس خاص ربوبیت اور اس خاص
رحمت کا ذکر فرمایا کہ جو دو خاص فرقوں سے متعلق تھی۔ ایک فرقہ بنی اسرائیل دوم فرقہ بنی اسماعیل پھر
مسئلہ ملت اسلام اور قبلۂ اسلام کا ذکر فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ ملت ابراہیمی اور قبلۂ ابراہیمی کا
اتباع ہی صراط مستقیم ہے اور اس راہ سے انحراف سراسر سفاہت اور حماقت ہے اور آیت لَيْسَ
الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

۱؎ اس میں اس ربط کی طرف اشارہ ہے کہ قصہ کی ابتداء [illegible] مغضوب علیہم اور
ضالین کے ساتھ کیا ربط ہے ۱۲ عفا اللہ عنہ۔ ۲؎ یعنی ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۱۲ منہ۔

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ میں جو ٹھیک سورۂ بقرہ کے نصف پر ہے صراط مستقیم کی تفصیل فرمائی کہ صراط مستقیم اللہ اور یوم آخرت اور ملائکہ اور انبیاء پر ایمان لانا ہے گویا کہ یہ آیت اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ کی تفسیر ہے کہ غیب سے یہ چیزیں مراد ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں بعد ازاں اخیر سورت تک احکام کا سلسلہ چلا گیا اخیر سورت میں اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ الآیۃ میں پھر صراط مستقیم کی حقیقت اور ایمان بالغیب کی کیفیت کو واضح فرمایا اور مغفرت اور رحمت اور نصرت کی دعا پر سورت کو ختم فرمایا خلاصۂ کلام یہ کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں بھی ہدایت اور صراط مستقیم اور رحمت اور ربوبیت کا ذکر فرمایا اور درمیان میں بھی اور اخیر میں بھی گویا کہ یہ تمام سورت سورۂ فاتحہ کی تفسیر اور تشریح ہے۔

الٓمّٓ

اس قسم کے حروف جو سورتوں کے ابتداء میں ذکر کیے جاتے ہیں ان کو حروف مقطعات کہتے ہیں اس لیے کہ یہ کلمات حروف تہجی کی طرح جدا جدا پڑھے جاتے ہیں اس لیے مقطعات (جدا جدا) کہلاتے ہیں انکے بارہ میں حضرات مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔

۱۔ خلفاء راشدین اور جمہور صحابہؓ اور تابعینؒ کے نزدیک یہ حروف متشابہات میں سے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ان کی مراد معلوم نہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ — ان متشابہات کی حقیقت سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

(۲) بعض سلف اور جمہور متکلمین اور خلیل اور سیبویہ کے نزدیک حروف مقطعات اُن سورتوں کے نام ہیں جنکے شروع میں یہ مذکور ہیں جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل مذکور ہیں یہ حروف مقطعا اُس تفصیل کا اجمال ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کا نام الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ کتاب موصوف کے تمام مفصل مضامین کا اجمال ہے جس طرح مرکبات کا مفید معنی ہونا انکے اجزاء یعنی کلمات مفردہ کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے اسی طرح کلمات مفردہ کا مفید معنی ہونا حروف تہجی کے مفید معنی ہونے پر موقوف ہے جس قدر کلام میں ترکیب ہوگی اسی درجہ معنی میں بھی ترکیب ہوگی یہی وجہ ہے کہ مرکبات اضافیہ اور مرکبات توصیفیہ کے معنی میں اتنی ترکیب نہیں جتنی کہ مرکبات تامہ خبریہ کے معنی میں ترکیب ہے ترکیب لفظی کے اختلاط سے ترکیب معنوی میں بھی اختلاط آگیا

مرکبات انشائیہ اگرچہ فی حد ذاتہ مرکبات ہیں مگر

مرکبات تامہ خبریہ کے لحاظ سے فی الجملہ بسیط ہیں اور اسی نسبت
سے ان کے معنی میں بھی بساطت اور اجمال ہے مگر حروف ہجائیہ مادۂ کلمات ہونے کی وجہ سے
انتہا درجہ کے بسیط ہیں پس اسی نسبت سے ان کے معنی میں بھی انتہا درجہ کی بساطت اور غایت درجہ
کا اجمال ہوگا جن کا بغیر تعلیم الٰہی اور بدون تائید غیبی کے سمجھنا ناممکن اور محال ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے "فوز الکبیر" میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے۔ علامہ آلوسیؒ
فرماتے ہیں کہ حروف مقطعات کے اسرار اور رموز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد انہی حضرات پر
منکشف ہوتے ہیں جو من جانب اللہ خاص طور پر علوم نبوت کے وارث بنائے گئے بلکہ کسی وقت
حروف مقطعات خود بخود ان وارثین علوم نبوت کے سامنے اپنے اندرونی اسرار اور معانی بولنے
لگتے ہیں جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر سنگریزے تسبیح پڑھتے تھے اور صحابہ
کرام اپنے کانوں سے سنگریزوں کی اس تسبیح کو سنتے تھے۔ اور گوہ اور ہرن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے
کلام کرتے تھے باقی ہم جیسوں کا حروف مقطعات کی حقیقت سمجھنے سے قاصر رہنا ہرگز اس کی دلیل نہیں ہو
سکتا کہ نفس الامر اور واقع میں یہ حروف معانی اور حقائق سے عاری ہیں۔ (روح المعانی) حدیث
میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظہر ہے اور ایک بطن ہے یعنی ظاہری معنی کے علاوہ اس آیت
کے کچھ باطنی اور معنوی اسرار اور لطائف بھی ہوتے ہیں جنکو ارباب باطن ہی سمجھتے ہیں اور وہ باطنی
اسرار، مدلول لفظی کے ماتحت ہوتے ہیں مخالف نہیں ہوتے ہیں بلکہ باطنی اسرار کے حق اور باطل ہونے
کا معیار ہی یہ ہے کہ وہ آیت کے ظاہری مدلول کے مطابق ہوں نہ کہ مخالف کیونکہ شرط یہ ہے کہ وہ
باطنی معنی ظاہری مدلول کے ماتحت ہوں اور ظاہر ہے کہ ماتحت ہو کر مافوق کا مخالف کیسے ہو سکتا
ہے۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حروف مقطعات ظاہر کے اعتبار سے مجہول الکنہ اور غیر معلوم المراد ہوں اور
باطن کے اعتبار سے ارباب باطن کے نزدیک معلوم المراد ہوں۔

۲۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ حروف مقطعات۔ حروف تہجی کے اسماء
ہیں اور ظاہر ہے کہ کلام کا مادہ اور عنصر یہی حروف تہجی ہیں انہی سے مل کر کلام بنتا ہے۔ قرآن کریم
کی بعض سورتوں کو ان حروف سے شروع کرنے میں اعجاز قرآن کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قرآن جس
کے کلام الٰہی ہونے کا تم لوگ انکار کرتے ہو وہ انہی حروف سے مرکب ہے جن سے تم اپنے کلام
کو ترکیب دیتے ہو پس اگر یہ قرآن خدا کا کلام نہیں تو تم اس جیسے کلام کے بنانے سے کیوں عاجز ہو پھر
اس ذاتی اعجاز کے علاوہ اس پر بھی تو نظر کرو کہ ان مقطعات کا پیش کرنے والا شخص امی ہے جس نے
نہ کبھی کسی مکتب کا دروازہ جھانکا اور نہ کسی استاذ اور کاتب کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور
تم فصحاء اور بلغاء اور ادباء اور خطباء ہو اور اس نبی امی نے جن حروف کو پیش کیا ہے ان میں
ایسے دقائق اور نکات کی رعایت کی گئی ہے کہ جن کی بڑے سے بڑا ادیب اور ماہر عربیت بھی رعایت

نہیں کر سکتا۔ ؎

صد ہزاران دفتر اشعار بود ٭ پیش حرف اُمّیش آں عار بود

مثلاً یہ کہ قرآن مجید کی انتیس سورتوں میں جو شمار کے اعتبار سے حروف تہجی کے برابر ہیں یہ چودہ حروف لائے گئے ہیں جو حروف تہجی کا نصف ہیں۔ نیز حروف کی تمام اقسام یعنی مہموسہ اور مجہورہ۔ شدیدہ اور رخوہ۔ مطبقہ اور منفتحہ وغیرہ وغیرہ میں سے ہر قسم کے نصف نصف حروف لائے گئے ہیں تفصیل کے لیے کشاف اور بیضاوی کی مراجعت فرمائیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حروف مقطعات کی تفسیر میں علماء کے اقوال مختلف ہیں اس ناچیز کا گمان یہ ہے کہ یہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ پر سب درست ہیں حروف مقطعات حسب طریقہ کے اعتبار سے حروف تہجی کے اسماء ہیں جیسا کہ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اور یہی خلیل بن احمد اور سیبویہ اور دیگر ائمہ عربیت کا مذہب ہے اور بنا بر خصوصیت کے اعتبار سے متشابہات اور خداوند ذوالجلال کے مخفی اسرار ہیں جن کے معانی سے عام طور پر لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی اور نہ ان میں اس کی استعداد ہے اس لیے ان پر ایمان لانا لازم ہے اور ان کی تحقیق اور تفتیش کرنا ممنوع ہوا اور اگر یہ شبہ کیا جائے کہ جب حروف مقطعات کو سر الٰہی مانا گیا تو قرآن معلوم المعنی نہ رہے گا تو پھر نزول سے کیا فائدہ؟ جواب یہ کہ نزول قرآن کا فائدہ۔ فہم معانی میں منحصر نہیں بلکہ بہت سے مقامات ایسے ہیں کہ جہاں مکلفین سے فقط ایمان لانا مطلوب ہے اسی طرح حروف مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے من جانب اللہ ہونے کا یقین کریں تاکہ بندوں کا کمال انقیاد ظاہر ہو ؎

زبان تازہ کردن باقرار تو ٭ نینگیختن علت از کار تو

یہ حضرات مفسرین اور محدثین (یعنی اہل قال) کا مذہب ہے اور حضرات صوفیہ (یعنی اہل حال) یعنی جو حضرات محققین صوفیاء اور مقربین من اللہ ہیں ان کا مسلک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ اپنے خصوصی بندوں کو حروف مقطعات کے معانی اور اسرار سے بذریعہ الہام کے مطلع فرما دیتے ہیں۔ مفسرین (یعنی اہل قال) اور صوفیہ (یعنی اہل حال) میں حقیقی نزاع نہیں محض لفظی نزاع ہے۔ مفسرین جو علم اور ادراک کی نفی کرتے ہیں وہ عوام کے اعتبار سے ہے اور اس نفی سے علم یقینی کی نفی مراد ہے علم ظنی اور وجدانی کی نفی مراد نہیں اور صوفیہ (یعنی اہل حال) جو حروف مقطعات کے معانی کے علم اور ادراک کے قائل ہیں وہ خواص کے لیے قائل ہیں نہ کہ عوام کے لیے اور پھر خواص کو بھی جو علم ہوتا ہے وہ ظنی اور وجدانی ہوتا ہے قطعی اور یقینی نہیں ہوتا اور عجب نہیں کہ حروف مقطعات ذوالوجوہ ہوں کسی پر کوئی معنی اور کسی پر کوئی معنی منکشف ہوں۔ مثلاً کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ حروف مقطعات اسماء الٰہی ہیں اور کسی پر یہ منکشف ہوا ہو کہ یہ اسماء سور ہیں جس کسی نے جو کچھ کہا وہ اپنے ذوق کشف اور مشاہدہ کے لحاظ سے کہا اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم کو عربی زبان میں اتارا عربی

زبان کے اعتبار سے حروف مقطعات حروف تہجی کے اسماء ہیں۔ سورتوں کے شروع میں طرح طرح کے لطائف اور معارف اور قسم قسم اعجاز کی رعایت کے ساتھ ان کو لایا گیا ہے لہذا ائمہ عربیت اور علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا یہ قول محققین اور متکلمین کے قول سے ہرگز منافی اور مخالف نہیں علامہ زمخشری اور بیضاوی کا قول لسانی ہے عربیت کے قواعد پر مبنی ہے اور محققین (کمفسر الآلوسی) کا قول کہ حروف مقطعات متشابہات سے ہیں ظاہر شریعت پر مبنی ہے اور محققین (کصاحب الروح) جیسا اولیاء اللہ اور عارفین کا قول باطن شریعت پر مبنی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ہر آیت کے لیے ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر ظاہر اور ہر باطن کے لیے کچھ وجوہ ہوتے ہیں کوئی عالم کسی وجہ کو اختیار کرلیتا ہے اور کوئی کسی وجہ کو۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ والحمد سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

یہی کتاب حقیقت میں کتاب ہے کہ تمام کتب الہیہ اور صحف سماویہ کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے اور اسی وجہ سے اسکا اتباع تمام کتب سماویہ کا اتباع ہے اور اسکا انکار تمام کتب الہیہ کا انکار ہے کتاب کا اصل لغت میں جمع کرنے کے معنی میں آتا ہے اس لیے اس کے مناسب معنی بیان کیے گئے اور ذٰلِكَ اسم اشارہ اس لیے لایا گیا کہ اسی طرف اشارہ ہو جائے کہ اس کتاب کی جامعیت محسوس اور مشاہد ہے۔ ارباب معنی تو علوم اور معارف کی روشنی میں اسکی جامعیت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اور اصحاب لفظ فصاحت اور بلاغت کے آئینہ میں اسکی جامعیت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ؎

بہار عالم حسنش دل وجان تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

اور بجائے لفظ هٰذَا کے جو اشارہ قریب کے لیے مستعمل ہوتا ہے لفظ ذٰلِكَ کو استعمال فرمایا جو اشارہ بعیدہ کے لیے وضع ہوا ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی بے مثال جامعیت اور عجیب وغریب حقائق ومعارف اور اسرار وحکم اور دقائق اور لطائف پر مشتمل ہونے کی وجہ سے نظر وفکر کی جولانگاہ سے بہت ہی دور اور بلند اور برتر ہے۔ یعنی قرآن اگرچہ باعتبار صورت کے حاضر وقریب ہے مگر اسرار وحقائق کے اعتبار سے ہمارے فہم وادراک سے بہت بعید ہے۔ اسی لیے بجائے هٰذَا کے ذٰلِكَ اسم اشارہ بعید لایا گیا۔

لَا رَيْبَ فِيْهِ

اور اس کتاب کے کامل اور بے مثال ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے تمام مطالب مدلل اور

(ف ۱) اس روایت سے ذٰلک اسم اشارہ بعید لانے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہو گئی کہ ذٰلک کا اشارہ اس کتاب کی طرف ہے کہ جس کی انبیاء سابقین خبر دیتے چلے آئے تھے۔ یعنی یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر کتب سابقہ میں دی گئی ہے۔

(ف ۲) یہ خصوصیت قرآن کریم ہی کی ہے کہ اس کے تمام مضامین عقل سلیم کے مطابق اور سب کے سب یقینی ہیں تقلیدی اور ظنی نہیں کہیں ریب و تردد کی گنجائش نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس کتاب کے مضامین اور مطالب اس درجہ عقلی اور یقینی ہوں کہ اس میں کہیں شک اور شبہ کی گنجائش نہ ہو تو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں کیا شک اور شبہ ہو سکتا ہے توریت اور انجیل کو دیکھئے کہ اصل میں سے محرف ہیں تثلیث اور الوہیت مسیح اور کفارہ کے مضامین عقلاً اس درجہ بدیہی نہیں کہ عقل کو ان میں کوئی شک اور تردد ہو بلکہ عقل قطعاً انکو لغو اور باطل سمجھتی ہے توریت میں العیاذ باللہ حضرات انبیاء کا بت پرستی کرنا اور جھوٹ بولنا اور العیاذ باللہ حضرت لوط علیہ السلام کا اپنی بیٹیوں سے زنا کرنا مذکور ہے اسکو کون عقل باور کر سکتی ہے۔ وید اور دساتیر میں جابجا عناصر اور کواکب پرستی کے مضامین مذکور ہیں جن سے عقل نفرت کرتی ہے لنگ اور بھگ (فرج) کی پوجا کا ذکر ہی عقل کے لیے باعث صد عار و ننگ ہے۔ شرک اور بے غیرتی کی بھی حد ہو گئی کہ شرمگاہ کو بھی پرستش سے نہ چھوڑا۔

مولانا عبدالحق صاحب حقانی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں صفحہ ۱۱ جرجس گبن جو کہ انگلستان کا بڑا مشہور مورخ اور منطقی ہے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے

محمد کا مذہب شرک و شبہات سے پاک ہے محمد کے پیغمبر نے جوں اور انسانوں اور ستاروں کی پرستش کو اس معقول دلیل سے رد کیا ہے کہ جو شئی طلوع ہوتی ہے غروب ہو جاتی ہے اور جو حادث ہے وہ فانی ہے اور جو قابل زوال ہے وہ معدوم ہو جاتی ہے الخ ان بڑے بڑے حقائق کو پیغمبر نے مشہور کیا الخ ایک حکیم جو خدا تعالیٰ کے وجود اور اس کی صفات پر یقین رکھتا ہو وہ مسلمانوں کے عقائد پر دستخط کر سکتا ہے کہ وہ عقائد ہماری ادراک اور قوائے عقل سے بڑھ کر ہیں وہ اصول کہ جن کی بنا عقل اور وحی پر ہے محمد کی ثبات سے استحکام کو پہنچی انتہی ملخصاً اور سیل باوجود سخت تعصب کے اپنے ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں اقرار کرتا ہے کہ تھوڑے سے دنوں میں جو محمد کا دین مشرق و مغرب روئے زمین پر پھیل گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مذہب کے جملہ امور وہ امور ہیں کہ جن کو عقل بہت جلد تسلیم کر لیتی ہے جو لوگ تلوار کے زور سے اس دین کا پھیلنا خیال کرتے ہیں وہ بڑی غلطی پر ہیں۔ انتہی ملخصاً۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَ

راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو جو یقین کرتے ہیں بن دیکھے اور درست

يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

کرتے ہیں نماز کو اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔

صفاتِ مومنینِ مخلصین

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ یہ کتاب ہدایت ہے متقیوں کے لیے جن درجہ کا تقویٰ ہے اسی درجہ کی ہدایت ہے یہ جملہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ کی دوسری دلیل ہے یعنی کتاب حقیقت میں یہی ہے اس لیے کہ اول تو اس میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش نہیں دوم یہ کہ یہ کتاب خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ایک نور مبین اور مشعل ہدایت ہے جب تک دل میں خدا کا خوف نہ ہو اس وقت تک راہِ ہدایت نظر نہیں آتی یا یہ کہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ لَا رَيْبَ فِيهِ کی دلیل ہے یعنی اس جامع کتاب میں اس لیے شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ کتاب تو مشعل ہدایت ہے لوگوں کے شبہات اور توہمات کی ظلمتوں اور تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے اتاری گئی ہے ہر بات اسکی میزان عقل میں تلی ہوئی ہے ہر بیان اسکا شافی اور کافی مدلل اور مبرہن ہے۔ اوہام پرستوں کے لیے سیف قاطع ہے۔ بھلا ایسی کتاب میں کہاں شک اور شبہ کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم نے چند سال میں جو لوگوں کو ہدایت کی طرف کھینچا توریت انجیل اس کی نظیر کیا عشر عشیر بھی نہیں پیش کر سکتی۔ چند ہی روز میں عرب جیسے وحشی ملک کو خدا پرستی کا گہوارہ بنا دیا۔ عرب کے اندر سے یکلخت شیخ جہالت کا پروانہ بن گئے حواریین کی بے وفائی کے خود نصاریٰ معترف ہیں کہ حضرت مسیح کو چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہودا نے تیس درہم رشوت لیکر حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیا۔ سورۂ فاتحہ میں بندوں کی جانب سے خدا کی حمد و ثنا کا ذکر تھا۔ سورۂ بقرہ میں اسکے برعکس خدائے عزوجل کی جانب سے عباد متقین کی مدح و ثنا کا ذکر ہے۔ سبحان اللہ خود اپنی رحمت اور فضل سے ایمان اور تقویٰ کی صفت عطا فرمائیں اور پھر خود ہی اسکی توصیف فرماتے ہیں۔ اللهم لا نحصي ثناء عليك انت كما اثنيت على نفسك۔

لغت میں تقویٰ کے معنی صیانت اور حفاظت کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں ان چیزوں

سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے مضر و نقصاں ہوں خواہ از قبیل عقائد و اخلاق ہوں یا از قبیل اقوال و اعمال و احوال ہوں۔ اور چونکہ مضر کے درجات مختلف ہیں اسی اعتبار سے تقویٰ کے درجات بھی مختلف آئے ہیں۔

پہلا مرتبہ

یہ ہے کہ کفر سے توبہ کرکے اسلام میں داخل ہو اور اپنے کو عذاب دائمی کی مضرت سے بچالے۔ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى میں تقویٰ سے یہی معنی مراد ہیں۔

دوسرا مرتبہ

یہ ہے کہ اپنے نفس کو ارتکاب کبائر اور اصرار علی الصغائر کی مضرت سے محفوظ رکھے کہ قال تعالیٰ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا۔ اہل شریعت کی اصطلاح میں جب تقویٰ کا لفظ بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتے ہیں اور کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا ۔ وَكَبِيْرَهَا ذَاكَ التُّقٰى

چھوٹے اور بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دے۔ یہی تقویٰ ہے۔

وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فَوْقَ اَرْ ۔ ضِ الشَّوْكِ يَحْذَرُ مَا يَرٰى

طرح راہ میں سفر کر جس طرح کہ خاردار جنگل میں گذرنے والا سنبھل سنبھل کر چلتا ہے

لَا تَحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً ۔ اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھو بڑے پہاڑ چھوٹے چھوٹے سنگریزوں سے بن جاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب سے تقویٰ کی حقیقت دریافت کی تو یہ جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین کیا آپ کبھی کسی پُرخار راستے سے بھی گزرے ہیں فرمایا کیوں نہیں، ابی بن کعب نے کہا کہ اے امیر المؤمنین پھر آپ نے اس وقت کیا کیا، فرمایا کہ میں نے دامن چڑھائے اور بچا بچا کر قدم رکھا کانٹوں سے بچنے کے لیے اپنی تمام جد و جہد کو خرچ کر ڈالا۔ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یہی تقویٰ ہے یعنی حق جل و علا کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کے لیے اپنی پوری

ے یہ قید اس لیے لگائی کہ اگر دنیوی ذلت و مضرت سے ڈر کر معصیت کو چھوڑا تو وہ تقویٰ نہیں خدا کے ڈر سے گناہ کو چھوڑنے کا نام تقویٰ ہے ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ

ہمت اور طاقت کو خرچ کر دینے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ — یقیناً خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور اس کی نافرمانی سے بچنے والا ہے۔

تیسرا مرتبہ

یہ ہے کہ قلب کو ہر اس چیز سے محفوظ کر لیا جائے جو خدا تعالیٰ سے غافل کرتی ہو اور يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ۔ اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اس آیت میں تقویٰ کا یہی مرتبہ مراد ہے۔ خدا کا خوف ہی ہدایت کا معیار اور ہر قسم کے فوز و فلاح کا سرچشمہ ہے اسی لیے حضرت نوح اور حضرت ہود اور حضرت صالح اور حضرت لوط اور حضرت شعیب علیہم الصلوٰۃ والسلام نے سب سے پہلے اپنی قوم کو یہی نصیحت فرمائی۔ أَلَا تَتَّقُونَ کیا تم کو خدا کا خوف نہیں۔ اور فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اس لیے کہ بغیر خدا کے خوف کے کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی کما قال تعالیٰ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ۔ یعنی نصیحت وہی قبول کرے گا جو خدا سے ڈرتا ہوگا۔

حق جل و علا نے دوسرے موقع پر بجائے هُدًى لِلْمُتَّقِينَ، هُدًى لِلنَّاسِ یعنی ہدایت ہے انسانوں کے لیے، ارشاد فرمایا جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں وہ درحقیقت انسان نہیں انسانیت اور آدمیت کا اقتضاء یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے ڈرے اور جو اس منعم حقیقی سے نہیں ڈرتا وہ انسان نہیں بہائم کے مثل ہے بلکہ بہائم سے بدتر قال تعالیٰ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔

سفر آخرت کے لیے تقویٰ ہی کا توشہ اور تقویٰ ہی کا لباس کام آنے والا ہے کما قال تعالیٰ

وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ۔ — سفر کے لیے توشہ لے لو پس تحقیق سب سے بہتر توشہ تقویٰ ہے۔

جس طرح بغیر زادِ راہ کے مسافر کا دنیاوی سفر ناممکن ہے اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے اور جس طرح ایک معمولی ذات کے سامنے برہنہ اور عریاں گزرنا خلاف حیا اور خلاف شرم ہے اسی طرح اس عظیم الشان شہنشاہ سے جو ایک لمحہ کے لیے بھی بے خبر اور غافل نہیں اور جس سے کچھ مخفی نہیں رہتی لباس تقویٰ سے برہنہ اور عریاں گزرنا کس درجہ بے حیائی اور بے شرمی نہ ہوگا۔ اعاذنا اللہ منہ

ذالک امین

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ۔ یعنی متقی وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں ایمان بالغیب متقیوں کا خاص شعار ہے یہ کلمہ اَلْمُتَّقِیْنَ کی صفت ہے یا یوں کہو کہ پرہیزگاروں کی تعریف بیان فرماتے ہیں کہ پرہیزگار وہ ہیں جو خدا پر اور خدا کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور عبادت گزار ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ المتقین میں تمام بری باتوں کے ترک کی طرف اشارہ تھا۔ اب امور خیر کا ذکر فرماتے ہیں چونکہ اجزاء انسانی میں سب سے اعظم اور اشرف جزء قلب ہے۔ اس لیے سب سے پہلے عمل قلب یعنی ایمان کا ذکر فرمایا جو درستی اعتقاد کا نشان ہے اور آئندہ آیت وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ میں اعمال بدنیہ کا ذکر فرمایا جو درستی اعمال کی نشانی ہیں۔

ایمان اور کفر کی تعریف

لغت میں ایمان کے معنی تصدیق اور تسلیم کے ہیں۔ اور اصطلاح شریعت میں۔ ایمان اسکو کہتے ہیں کہ جو چیز۔ محمد نبی۔ اللہ کی طرف سے لیکر آئے ہیں اسے اعتقاد اور بھروسہ پر دل سے سچی تصدیق کرنا یعنی دل سے اسکو سچا جاننا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا یہ تو ایمان ہے اور دین کی کسی ایک چیز کو نہ ماننا اور انکار کرنا کفر ہے۔

تشریحات

۱۔ تصدیق قلبی سے محض علم اور معرفت مراد نہیں۔ تصدیق اور چیز ہے اور علم اور معرفت اور چیز ہے اور علم کے معنی جاننے کے ہیں۔ اور معرفت کے معنی پہچاننے کے ہیں اور تصدیق کے معنی ماننے کے ہیں اور ایمان نام ماننے کا ہے جاننے کا نام ایمان نہیں۔ کفار مکہ دلائل نبوت کو دیکھ کر یہ جانتے تھے کہ آپ نبی ہیں اور علماء یہود آپکو خوب پہچانتے تھے کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کی انبیاء کرام بشارت دیتے چلے آئے آپکی جو علامتیں توریت اور انجیل میں لکھیں وہ تمام علامتیں اپنی آنکھوں سے آپ میں دیکھتے تھے۔

یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ یہود اپنے بیٹوں کی طرح حضور کو پہچانتے تھے۔

مگر مانتے نہ تھے اس لیے ایمان سے بے بہرہ تھے۔ ایمان محض جاننے اور پہچاننے کا نام نہیں بلکہ اپنے اختیار اور ارادہ اور رضاء و رغبت سے ماننے کا نام ایمان ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا۔ — آپ کی نبوت کا محض تکبر کی وجہ سے انکار کرتے ہیں مگر دل ان کے یقین کیے ہوتے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ محض علم کا نام ایمان نہیں بلکہ ایمان کی حقیقت تسلیم اور اذعان ہے جیسا بالفاظ دیگر ایمان جاننے اور پہچاننے اور یقین کرنے کا نام نہیں بلکہ ماننے کا نام ایمان ہے۔

۲۔ ایمان کی تعریف میں نبیؐ کے بھروسہ اور اعتماد کی قید اس سے نکالی گئی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ کی باتیں محض نبی کے کہنے سے اور محض نبیؐ کے اعتماد اور بھروسہ پر مانے مثلاً کوئی شخص توحید اور رسالت دونوں کا اقرار کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ میں توحید خداوندی کا فلاسفہ کی طرح محض دلائل عقلیہ کی بناء پر قائل ہوں، رسول اللہ کے کہنے سے توحید کا قائل نہیں تو ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں ایسی توحید فلاسفۂ یونان کی توحید ہے اہل ایمان کی توحید نہیں جیسا کہ عارف جامی شواہد النبوت کے پہلے ہی صفحہ میں حمد و نعت کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"نخستین رکن از ارکان اسلام اقرار بکلمۂ شہادت است و حقیقت ایمان تصدیق بمضمون آں و آں مشتمل بر دو امر است یکے اقرار بوحدانیت حق سبحانہ تعالیٰ و گرویدن بآں و دوم اقرار نبوت و رسالت محمد صلی اللہ علیہ وسلم و گرویدن بآں۔ و امر اول وقتے معتبر است کہ مقتبس از مشکوٰۃ نبوت باشد اگر مجرد دلائل عقلی اکتفا کنند چوں فلاسفہ و از مشکوٰۃ نبوت نگیرد مفید نجات نیست" انتہیٰ کلامہ۔

۳۔ دین کی باتوں کا ماننا وہی معتبر ہے کہ جب ان کو اسی طرح مانا جائے کہ جس طرح اور جس حیثیت سے ان کا دین ہونا ثابت ہوا ہے مثلاً کوئی شخص نماز کو شعار اسلام اور فریضۂ دین مانتا اور تسلیم کرتا ہے مگر یہ کہتا ہے کہ صلوٰۃ سے مطلق دعاء اور خشوع و خضوع مراد ہے اور نماز کی فرضیت بہیئت مخصوصہ یعنی بطریق قیام و قعود اور رکوع و سجود تسلیم نہیں کرتا تو ایسا شخص قطعاً دائرۂ ایمان سے خارج ہے یا مثلاً زکوٰۃ کی فرضیت کو تسلیم کرے مگر یہ کہے کہ زکوٰۃ سے محض تزکیہ اور تطہیر مراد ہے یہ خاص نصاب اور مال کی خاص مقدار ضروری نہیں تو ایسا شخص مؤمن نہیں، ملحد اور زندیق ہے اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق اس شخص کو کہتے ہیں جو شریعت کے الفاظ کو بحال اور برقرار رکھے اور اس کی حقیقت کو بدل دے یہ ایمان نہیں بلکہ دین کا تمسخر و مذاق ہے اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ۔ — اور جب کہا جاتا ہے منافقوں سے کہ ایمان لاؤ جیسا کہ یہ لوگ یعنی صحابہ ایمان لائے۔

اسی طرف مشیر ہے کہ ایمان میں وہی تصدیق اور اذعان معتبر ہے جو صحابہ کرام کے قبول اور تسلیم اور ان کی تصدیق اور اذعان کے برنگ ہو، یہ نہیں کہ نام تو وہی ہو اور حقیقت کچھ اور ہو۔

۴۔ اصل ایمان تو تصدیق قلبی ہے اور زبانی اقرار حقیقت ایمان کی حکایت ہے اگر حکایت محکی عنہ

کے مطابق ہے تو خیر، ورنہ سوائے مکر و فریب کے کوئی شئے نہیں، محض ایک جھوٹ ہے جو صدق اور راستی کے لباس میں نمودار ہے۔

۵۔ حضرات متکلمین فرماتے ہیں کہ ایمان کی اصل حقیقت تو تصدیق قلبی ہے اور اقرار لسانی، دنیوی احکام کے جاری کرنے کے لیے شرط ہے کیونکہ زبان دل کی ترجمان ہے بغیر زبان کے دل کا حال کیسے معلوم ہو تصدیق قلبی چونکہ ایک پوشیدہ چیز ہے ہر شخص اس کو نہیں جان سکتا اس لیے بطور علامت اقرار لسانی اس کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ ظاہری احکام جاری ہو سکیں ورنہ اگر کوئی شخص گونگا ہو یا کسی کے اکراہ اور زبردستی سے محض زبان سے کلمۂ کفر کہے اور دل میں تصدیق موجود ہو تو کافر نہیں یا تصدیق قلبی کے بعد مر جائے اور زبانی اقرار کی نوبت نہ آئے تو اس کے ایمان میں کوئی خلل نہیں۔

حضرات محدثین اگرچہ اقرار باللسان اور عمل بالارکان کو جزو ایمان قرار دیتے ہیں لیکن ایمان کی اصل اور جڑ تصدیق قلبی ہی کو بتاتے ہیں اور یہ تصریح فرماتے ہیں کہ ایمان بغیر عمل صالح کے ناقص ہے کفر نہیں، حضرات متکلمین اور حضرات محدثین میں محض صوری نزاع ہے حقیقی اور معنوی نزاع نہیں۔

امام غزالی قدس اللہ سرہٗ فیصل التفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ میں ایمان اور کفر کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں

الکفر ھو تکذیب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی شیء مما جاء بہ والایمان تصدیقہ فی جمیع ما جاء بہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی چیزوں میں سے کسی ایک چیز کی بھی تکذیب کر دینے کا نام کفر ہے اور تمام امور میں آپ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔

امام غزالی قدس سرہٗ کی اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ ایمان کے لیے فقط ایک دو امر کی تصدیق کافی نہیں، تمام امور میں رسول اللہ کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ ہاں کفر میں تمام امور کی تکذیب ضروری نہیں، ایک شئی میں بھی رسول کی تکذیب کفر ہے۔

مسئلہ تکفیر اہل قبلہ

یہ مسئلہ مشہور ہے کہ اہل قبلہ کی تکفیر جائز نہیں۔ سو اس کی حقیقت یہ ہے کہ شریعت کی اصطلاح میں اہل ایمان اور اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام متواترات اور ضروریات دین پر ایمان رکھتے ہوں گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی، جیسا کہ معتزلہ اور خوارج کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے دائرۂ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے فقط قبلہ کی طرف نماز پڑھنے سے اہل ایمان اور اہل قبلہ کے زمرہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا جب تک رسول کی تمام باتوں کی تصدیق نہ کرے

کما قال عز وجل۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔

نیکی اور بھلائی اسی میں نہیں کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی جانب پھیر لو لیکن نیکی اور بھلائی یہ ہے کہ ایمان لائے اللہ پر اور یوم قیامت پر اور تمام فرشتوں پر اور اللہ کی ہر کتاب پر اور تمام پیغمبروں پر

اہل اصطلاح شریعت میں اہل قبلہ وہی لوگ ہیں جو تمام ضروریات دین کی تصدیق کرتے ہوں اور کسی امر دینی کے مکذب اور منکر نہ ہوں اور ضروریات دین سے وہ امور مراد ہیں کہ جو شریعت میں ایسے معلوم اور مشہور ہوں کہ خواص و عوام سب انکو جانتے اور پہچانتے ہوں۔ جیسے توحید اور رسالت اور جو شخص ضروریات دین میں سے کسی ایک امر کا بھی انکار کردے کہ جس کا دین سے ہونا قطعی[1] اور یقینی طور سے ثابت ہے تو وہ شخص قطعاً دائرۂ ایمان اور زمرۂ اہل قبلہ سے خارج ہے اگرچہ وہ شخص قبلہ رو ہو کر دن میں ہزار مرتبہ نمازیں ادا کرتا ہو۔ قال تعالیٰ۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝

کیا تم لوگ کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے ہو، ایسے شخص کی جزا سوائے اسکے کچھ نہیں کہ دنیا میں رسوائی ہو اور قیامت کے دن سخت سے سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں اور جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ فقط بعض احکام کو مان لینا کافی نہیں جب تک تمام احکام کی تصدیق نہ کرے۔ ایسے ہی لوگوں کی بابت آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ

ایسے ہی لوگوں نے حیات دنیا کو اخروی حیات کے عوض میں خرید لیا ہے۔ پس ان پر سے نہ عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انکی کوئی مدد کی جائے گی اور البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور انکے بعد پے درپے رسول بھیجے اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے ہوئے نشانات دیئے اور روح القدس سے ان کی تائید کی تو کیا جب کبھی ایسے

[1] جو بغیر کسی شبہ کے قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو [illegible]

اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَا يُؤْمِنُونَ ۝

کبھی کوئی رسول تمہارے پاس تمہاری خواہشات کے خلاف کچھ لیکر آیا تو تم نے سرکشی کی۔ پھر کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ نہیں بلکہ اللہ نے انکے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی ہے پس وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں خاص کفر پر لعنت فرمائی ہے وہ یہی کفر ہے کہ جب انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام من جانب اللہ ایسی چیز لیکر آئے جو نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو یہود بے بہبودنے اس کے ماننے سے سرکشی کی اور حضرات انبیاء کی تکذیب کی۔

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ فلاسفہ یونان جو سماوات و کواکب کے فنا و فساد کے قائل نہیں وہ قطعاً کافر ہیں جیسا کہ امام غزالی نے اپنے رسائل میں اس کی تصریح کی ہے اس لیے کہ یہ لوگ نصوص قطعیہ اور اجماع انبیاء کرام کے منکر ہیں کما قال تعالیٰ۔ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَاِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ[1] وقال تعالیٰ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ[2] وقال تعالیٰ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ اَبْوَابًا[3] مجدد صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

نیما تقرر کہ مجرد تفوہ بکلمۂ شہادت در اسلام کافی نیست تصدیق جمیع ما علم مجیئہ من الدین بالضرورۃ باید (مکتوبات ص۲۲۲ ج ۱)

نہیں جانتے کہ محض کلمہ شہادت پڑھ لینا مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ان تمام امور کی تصدیق ضروری اور لازمی ہے کہ جن کا دین سے ہونا قطعی اور یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہو۔

البتہ جو امور ظنی طور پر ثابت ہوئے ہیں ان کی تصدیق جزو ایمان نہیں اور نہ انکار کفر کے درجہ تک پہنچاتا ہے۔ ہاں جو امور احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں اور تواتر کے درجہ کو نہ پہنچے ہوں ان کے انکار سے اگرچہ کفر لازم نہیں لیکن گمراہی یقیناً ہے اور کفر کا اندیشہ ہے اور یہ گمراہی کا حکم بھی اس شخص کے لیے ہے جو کسی ایسے خاص امر کا انکار کردے جو خبر واحد سے ثابت ہوا ہو اور جو شخص سرے ہی سے حدیث کا منکر ہو اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اقوال و افعال کو حجت نہ سمجھتا ہو وہ بلا شبہ

---

۱ یعنی جب سورج بے نور ہو جائیگا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ ۲ جب آسمان پھٹ جائے گا۔
۳ اور آسمان کھل جائیگا تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔

کا فر ہے اور جو اس کے کفر میں شبہ کرے وہ بھی کافر ہے کما قال تعالیٰ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَن يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝	تحقیق جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ اور اس کے رسولوں کے ساتھ اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعضوں سے منکر ہیں اور چاہتے ہیں کہ بیچ بیچ میں ایک راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور کسی میں فرق نہیں کیا۔ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کا ثواب عطا کریں گے اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے ہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور رسول کے درمیان تفریق کرنا اللہ کے کلام کو حجت کہنا اور پیغمبر کی حدیث کو حجت نہ سمجھنا قطعاً کفر ہے اور جو شخص ایسا عقیدہ رکھے وہ پکا کافر ہے۔ قال تعالیٰ۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝	قسم ہے تیرے پروردگار کی لوگ ہرگز مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم اور منصف نہ بنائیں۔ اور پھر آپ کے فیصلہ کے بعد ذرہ برابر قلب میں کوئی انقباض نہ پائیں اور برضا و رغبت آپ کے فیصلہ کو اچھی طرح تسلیم کرلیں۔

معلوم ہوا کہ ایمان محض اقرار کرنے کا نام نہیں بلکہ شرط یہ ہے کہ پیغمبر کے حکم اور فیصلہ پر دل و جان سے راضی ہو اور بہ تمام رضا و رغبت اس کو تسلیم کرے۔ اور اگر کسی ایک بات کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کردے تو قطعاً کافر ہے۔ کفر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ توحید و رسالت ہی کا انکار کرے جب ہی کافر ہو۔ جو حکم بھی دین کا نبی سے قطعی طور سے ثابت ہوا ہو اس کا انکار کفر ہے مثلاً جو شئی کی حلت یا حرمت نص قرآنی یا حدیث متواتر سے ثابت ہو جیسے زنا اور لواطت اس کا انکار بھی

کما قال تعالیٰ:

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُولُهٗ۔	ان لوگوں سے ضرور جہاد و قتال کرو جو نہیں ایمان لاتے اللہ پر اور یوم آخرت پر اور نہ حرام سمجھتے ہیں اس چیز کو جسے اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

ایمان کیلئے کفر سے برات اور بیزاری شرط ہے

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ و نفعنا بعلومہ ذکر کیا تھا۔ آپ اپنے ایک طویل مکتوب میں جو عقائد اسلامیہ کی تحقیق میں قلم مبارک سے نکلا ہے فرماتے ہیں۔

ایمان عبارت از تصدیق قلبی است آنچہ از دین بطریق ضرورت و تواتر بما رسیدہ است و اقرار لسانی نیز رکن ایمان گفتہ اند کہ احتمال سقوط دارد و علامت این تصدیق تبری است از کفر و بیزاری از کافری و آنچہ در کافری است از خصائص و لوازم آں ہمچناں بستن زنار و شکل آں و اگر عیاذاً باللہ سبحانہ باوجود این تصدیق تبرا از کفر نماید مصدق دو دینین است کہ حکم ارتداد متضمن است و فی الحقیقت حکم منافق است لا الی ہؤلاء و لا الی ہؤلاء پس در تحقیق ایمان از تبری کفر چارہ نبود و ادنائے آں تبری قلبی است و اعلائے آں تبری قلبی و قالبی ہر دو تبری عبارت از دشمنی است با دشمنان حق جل و علا، و آں دشمنی متعلق بقلب	ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ دل سے ان چیزوں کی تصدیق کی جائے جو دین سے بطریق بداہت اور تواتر ہم تک پہنچی ہیں۔ علماء نے اقرار لسانی کو بھی ایمان کا جزء اور رکن کہا ہے مگر یہ ایسا رکن ہے کہ بعض حالات میں مثلاً اجبار اور اکراہ کی حالت میں ساقط ہو جاتا ہے اور اس تصدیق کی علامت یہ ہے کہ کفر اور کافری اور کفر کے تمام خصائص و لوازم جیسے زنار باندھنا، ان سب سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرے اور اگر کوئی شخص باوجود دعوی ایمان کے معاذ اللہ کفر سے تبری اور بیزاری ظاہر نہ کرے تو وہ دو متضاد دینوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو واضح ارتداد سے واقف ہے اور درحقیقت ایسا شخص منافق کے حکم میں ہے نہ ادھر نہ ادھر، پس ایمان کے ثابت کرنے کے لیے کفر سے تبری اور

انہوں نے اپنی قوم سے یہ کہہ دیا کہ ہم بالکل بری اور بیزار ہیں تم سے اور ان تمام چیزوں سے جن کی تم سوائے خدا کے پرستش کرتے ہو ہم تمہاری تکذیب کرتے ہیں یعنی ہم اللہ کے مومن اور تمہارے کافر ہیں اور ظاہر ہو گئی ہمارے اور تمہارے درمیان عداوت اور بغض ہمیشہ کے لیے یہاں تک کہ ایمان لاؤ تم اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ پر۔"

یہ آیتیں سورۃ ممتحنہ کی ہیں۔ بظاہر یہ سورت اسی مسئلہ کی تحقیق کے لیے نازل ہوئی جیسا کہ اس کے شان نزول سے ظاہر ہے۔ تفصیل کے لیے اس سورۃ کی تفسیر مطالعہ کریں۔ وقال تعالیٰ۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَن يَكْفُرُوا بِهِ ۚ

کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو زبان سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئی مگر باوجود اس دعوے کے حالت یہ ہے کہ اپنا مقدمہ شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ ان کو اللہ کی طرف سے یہ حکم تھا کہ شیطان کو ہرگز نہ مانیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق کے بعد طاغوت کے ساتھ کفر اور اس کی تکذیب بھی ضروری اور لازم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سوتے ہوئے بیدار ہو جائے اگر وہ دس بار بسم اللہ اور دس بار سبحان اللہ اور دس بار اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَكَفَرْتُ بِالطَّاغُوتِ۔ (تصدیق کی میں نے اللہ کی اور تکذیب کی میں نے طاغوت یعنی شیطان کی) پڑھے تو وہ ہر خوفناک چیز سے محفوظ رہے گا۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط عن ابن عمرؓ
(حصن حصین ص [illegible])

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منشا نبوی یہ ہے کہ خدائے عزوجل کی تصدیق اور اس کے دشمنوں کی دشمنی اور برأت اور بیزاری قلب میں اس درجہ راسخ ہو جائے کہ غفلت کے وقت میں بھی اس سے ذہول اور غفلت نہ ہو۔ وقال تعالیٰ۔

فَلَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا قَالُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَحْدَهُ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهِ مُشْرِكِينَ فَلَمْ يَكُ يَنفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا ۖ

پس جب ہمارے قہر کو دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے خدا وحدہٗ لا شریک لہٗ پر اور اس چیز کے منکر ہوئے جس کو خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے پس یہ ایمان ان کو نفع بخش نہ ہوا کیونکہ قہر کو دیکھ کر ایمان لائے

معلوم ہوا کہ اگر مشاہدۂ عذاب سے پہلے شرک اور مشرکین سے تبری اور بیزاری کا اظہار کرتے تو مفید اور نافع ہوتا۔ ناظرین غور کریں کہ کافروں نے مشاہدۂ عذاب کے وقت فقط ایمان پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان کے ساتھ خدا کے دشمنوں کی تکذیب اور ان سے تبری اور بیزاری کو بھی ظاہر کیا معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ کفر اور کافروں سے تبری اور بیزاری بھی ضروری ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں جا بجا مہاجرین کی جو مدح اور ثنا فرمائی ہے وہ بھی اسی تبری اور کفر سے بیزاری کی بدولت ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی محبت میں کفر سے اس قدر بیزار ہوئے کہ اپنے وطن مالوف اور آباؤ و اجداد، بیوی اور بچے، خویش اور اقارب، دوست احباب سب ہی کو چھوڑ دیا۔ اور علیٰ ہٰذا اصحاب کہف کا سوائے ہجرت اور اعتزال عن الکفار کے کوئی اور عمل ایسا منقول نہیں کہ اس کی جانب اس منقبت کبریٰ کو منسوب کیا جا سکے اصحاب کہف کو یہ تمام درجات و فضائل صرف دشمنان حق سے ہجرت کی بدولت حاصل ہوئے۔

غلبۂ اعداء اور ہجوم دشمن کے وقت سپاہیوں کا معمولی نقل و حرکت بھی بہت وقعت رکھتی ہے بخلاف زمانۂ امن و سکون کے کہ اس وقت کی غیر معمولی نقل و حرکت بھی کسی شمار میں نہیں۔ زمانۂ جنگ میں معمولی وفاداری کا اظہار بھی حکومت کی نظر میں غیر معمولی شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ عنفوان شباب کی عبادت زمانۂ پیری کی عبادت سے ہزار درجہ افضل اور بہتر ہے اس لیے کہ زمانۂ شباب میں اعداء دین یعنی نفس امارہ اور شیطان لعین کا غلبہ اور ہجوم ہوتا ہے۔ شیاطین اور شہوات کا لشکر ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہوتا ہے دشمنان دین کے مقابلہ کی وجہ سے زمانۂ شباب کی عبادت پر قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ دینے کا وعدہ آیا ہے۔

ایمان کی صورت اور اس کی حقیقت

حضرات صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایمان کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ تصدیق بالقلب اور اقرار باللسان ایمان کی صورت ہے اور اطمینان نفس یعنی نفس کا مطمئن ہو جانا یہ ایمان کی حقیقت ہے اطمینان نفس سے مراد یہ ہے کہ مقتضائے شریعت، مقتضائے طبیعت بن جائے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ	تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی طبعی خواہش میری لائی ہوئی شریعت کے تابع نہ ہو جائے۔

اس حدیث میں ایمان سے یہی اطمینان نفس مراد ہے یعنی نفس اس درجہ مطمئن ہو جائے کہ اتباع شریعت

اس حدیث سے زنا اور سرقہ کی اجازت مقصود نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اے لوگو تم کسی طرح تو لا الٰہ الا اللہ کہہ کر کفر اور شرک کے دائرہ سے نکل آؤ، زنا اور سرقہ اگرچہ فی حد ذاتہ کتنے ہی بڑے عیب نہ ہوں مگر کفر اور شرک کے سامنے سب ہیچ ہیں۔ بخار اور زکام اگرچہ فی حد ذاتہ مرض اور بیماری ہے مگر سل اور جذام کے مقابلہ میں عافیت ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس جگہ بخار کی طرح زنا اور سرقہ کا مرض ہونا بیان فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا۔ لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن[1] اور اذا زنی العبد خرج منہ الایمان[2] اور جس جگہ زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے مقابلہ میں ذکر فرمایا وہاں یہ ارشاد فرمایا من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ وان زنی وان سرق۔ یعنی زنا اور سرقہ کو کفر اور شرک کے ساتھ وہی نسبت ہے جو بخار اور زکام کو سل اور جذام کے ساتھ ہے۔

ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے حالات دریافت کیے تو اس میں یہ بھی دریافت کیا کہ کوئی شخص آپ پر ایمان لانے کے بعد آپ کے دین سے بیزار ہو کر مرتد بھی ہو جاتا ہے؟ ابوسفیان نے کہا نہیں، اس پر ہرقل نے کہا

وکذلک الایمان حین تخالط بشاشتہ القلوب۔	ایمان کی یہی خاصیت ہے کہ جب اس کی مسرت دلوں میں رچ جاتی ہے تو وہ پھر کسی طرح نکل نہیں سکتی۔

اس جگہ بشاشت سے وہی اطمینان قلب اور انشراح صدر مراد ہے جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یہی حقیقی ایمان ہے کہ جس کے بعد مرتد ہونا ناممکن ہے۔ چنانچہ حضرات صوفیہ کا ارشاد ہے۔ اِنَّمَا رَجَعَ مَنْ رَجَعَ مِنَ الطَّرِیْقِ۔ جز ایں نیست کہ جو شخص واپس ہوتا ہے وہ راستہ ہی سے واپس ہوتا ہے، منزل مقصود پر پہنچ جانے کے بعد واپسی ناممکن ہے: اور اسی دعا ماثورہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ۔ (اے اللہ تجھ سے ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ جس کے بعد ارتداد نہ ہو سکے) میں اسی ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ ورنہ ایمان صوری کے بعد مرتد ہونا ممکن ہے۔ وہ ایمان جس کے بعد ارتداد ناممکن ہو وہی ایمان ہے کہ جس سے نفس مطمئن ہو جائے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ اِیْمَانًا لَّا یَرْتَدُّ وَ یَقِیْنًا لَیْسَ بَعْدَہٗ کُفْرٌ اٰمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ۔

[1] حالت ایمان میں زانی زنا نہیں کرتا۔ [2] جب بندہ نے زنا کیا تو اس سے ایمان نکل گیا۔

ایمان کے وجودی مراتب

علامہ نیسابوری تفسیر غرائب القرآن میں فرماتے ہیں کہ ایمان کے تین وجود ہیں۔ ایک وجود عینی دوسرا وجود ذہنی تیسرا وجود لسانی۔ اصل ایمان وجود عینی یعنی وجود خارجی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جب بندہ اور خدا تعالیٰ کے درمیان حجابات مرتفع ہو جائیں تو اس وقت مومن کے دل میں ایک نور حاصل ہوتا ہے۔ یہی نور ایمان کا وجود عینی ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ۔	اللہ تعالیٰ دوست ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو تاریکیوں سے نور کی طرف۔

جب کوئی جدید حجاب مرتفع ہوتا ہے اتنا ہی یہ نور کامل اور قوی ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسلام کے متعلق اس کو شرح صدر ہو جاتا ہے اور نبی کریم اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا نور اس کے نزدیک آفتاب سے زیادہ روشن اور جلی ہو جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ۔	جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک نور پر ہے۔

اور یہی نور قیامت کے دن پل صراط پر اہل ایمان کی رہنمائی کرے گا۔ کما قال تعالیٰ۔

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ۔	ان کا نور سامنے اور داہنی جانب دوڑتا ہوگا۔

ایمان کا نور عینی جو اہل ایمان قیامت کے دن آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اور جو شخص دنیا میں نور ایمان سے محروم رہا وہ قیامت کے دن بھی نور ایمان سے محروم رہے گا۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ۔	جسے اللہ نے نور نہیں دیا پھر اس کے لیے کہیں نور نہیں۔

قیامت کے دن تو سب ہی کو ایمان کا نور ہونا معلوم ہو جائے گا لیکن اس دار دنیا میں بھی جب کبھی کسی عارف اور صاحب بصیرت کو رویائے صالحہ یا کشف سے ایمان منکشف ہوا تو وہ نور ہی کی شکل میں منکشف ہوا۔

اور اس نور کا مطالعہ اور تصور یہی ایمان کا وجود ذہنی ہے اور زبان سے توحید و رسالت کا اقرار یہ ایمان کا وجود لسانی ہے۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ایمان کا محض لسانی وجود بغیر نور کے مفید در

سیراب نہیں ہو۔ پیاسے کے لیے آب زلال کا فقط تعلق اور تصور کافی نہیں جب تک کہ اس سے سیراب نہ ہو۔ اللھم اشرح صدورنا بالاسلام ونور قلوبنا بنور طاعتک آمین یا رب العالمین۔

بالغیب

یعنی جو چیزیں عقل اور حواس سے پوشیدہ ہیں جیسے جنت اور جہنم اور ملائکہ وغیرہ محض اللہ اور اس کے رسول کے فرمانے سے ان سب چیزوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور ان کو حق جانتے ہیں۔ اور جو لوگ ان امور غیبیہ کے منکر ہیں وہ ایمان اور ہدایت سے محروم ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے شاعر نے کہا ہے

ہمچو آں کرمے کہ در سنگے نہان است ۱؎ زمین و آسمان او ہمان است

اور ایمان بالغیب کو تقویٰ کی علامت اس لیے قرار دیا کہ محسوسات کی تصدیق ایمان اور تقویٰ کی علامت نہیں اس لیے کہ جو چیز ظاہری یا باطنی حواس سے محسوس اور مدرک ہو اس کی تصدیق اختیاری نہیں بلکہ اضطراری ہے اور شرعاً وہی تصدیق معتبر ہے جو ارادہ اور اختیار سے ہو۔

غیب سے کیا مراد ہے

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ بظاہر غیب سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر حدیث جبریل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ۔ ملائکہ۔ کتب الٰہیہ۔ رسل۔ یوم آخرت۔ تقدیر۔ ایمان بالغیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے کتاب اور رسول اگرچہ ظاہر کے لحاظ سے محسوس ہیں غیب نہیں لیکن کتاب کا منزل من اللہ ہونا اور پیغمبر کا مرسل من اللہ اور فرستادۂ خدا ہونا ایک غیبی امر ہے اس اعتبار سے کتب اور رسل بھی ضرور غیب میں داخل سمجھے جائیں گے اور صحابہ کرام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ایمان بالغیب ہی کہلائے گا۔ اس لیے کہ رسول کی ذات اگرچہ محسوس اور مشاہد ہے مگر وصف رسالت اور فرستادۂ خدا ہونا یقیناً غیب ہے جس کو کسی نے آنکھوں سے نہیں دیکھا اور ایمان کا اصل تعلق اسی وصف رسالت کے ساتھ ہے۔

بعض اہل علم نے غیب اور غائب میں فرق بتایا ہے وہ یہ ہے کہ

اَلْغَائِبُ مَا لَا یَرَاکَ وَلَا تَرَاہُ — غائب تو وہ ہے کہ نہ وہ تجھ کو دیکھے
وَالْغَیْبُ مَا لَا تَرَاہُ وَیَرَاکَ۔ — اور نہ تو اس کو دیکھے اور غیب وہ ہے

۱؎ اس کیڑے کی مانند جو پتھر میں پوشیدہ ہے اور وہی اس کا زمین و آسمان ہے۔

کہ تو اسکو نہ دیکھتا ہو اگرچہ وہ تجھ کو دیکھتا ہو۔

اسی وجہ سے حق تعالیٰ پر غیب کا اطلاق درست ہے غائب کا اطلاق درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ ہر شے کو دیکھتا ہے کوئی شئ اس کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔

لطیفہ

بعض شیعہ کہتے ہیں کہ بالغیب سے مہدی موعود اور امام غائب مراد ہیں جن کا شیعہ انتظار کر رہے ہیں۔ واہ واہ

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ

اور قائم اور درست رکھتے ہیں نماز کو یعنی خشوع اور خضوع اور تمام آداب کے ساتھ نماز کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔ سورۂ لقمان میں ہے۔

هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ	ہدایت اور رحمت ہے ان نیکی کرنے
الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ	والوں کے لیے جو نماز کو قائم کرتے ہیں

اس آیت میں اَلَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ کو المحسنین کی صفت گردانا ہے اور غالباً جبرئیل امین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ما الاحسان (احسان کیا چیز ہے) کہہ کر اسی احسان کی حقیقت دریافت کی ہے جو آیت مذکورہ میں مذکور ہے جس کا جواب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدیں الفاظ ارشاد فرمایا کہ

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ	یعنی نماز اور عبادت کا احسان یہ ہے
تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ	کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا
تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ	تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے
	تو یہی خیال رکھ کہ وہ تجھ کو دیکھ رہا ہے

مطلب یہ ہے کہ تعظیم کا دارومدار دیکھنے پر نہیں بلکہ اس کے دیکھنے پر ہے کما قال اللہ تعالیٰ۔ اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى کیا نہیں جانتا کہ اللہ اس کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ دربار میں بادشاہ کی تعظیم سب ہی پر فرض ہے خواہ کوئی بادشاہ کو دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو۔ قریب ہو یا بعید ہو۔

يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ میں اسی قسم کی نماز مراد ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے عباد متقین کی عبادت اور بندگی کو جب کبھی مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے تو يقيمون الصلوٰة کے ساتھ فرمایا ہے مصلین کا لفظ صرف ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جن کی نماز میں ماسوا ہیئت اور محض ظاہری قیام و قعود کے علاوہ اور کچھ نہ تھا چنانچہ ایک جگہ مقام مذمت میں ارشاد ہے۔ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ

وَلَا صَلّٰى یعنی جس شخص نے نہ تصدیق کی اور نماز کو قائم کرنا اور ٹھیک طرح سے ادا کرنا تو درکنار اس نے تو کبھی نماز کی ہیئت اور صورت بھی نہیں بنائی۔

بعض علماء کے نزدیک اس مقام پر صلوٰۃ سے مطلق نماز مراد ہے فرض ہو یا نفل۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ فرض نماز مراد ہے۔ اس لیے کہ فلاح جو کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں مذکور ہے وہ فقط فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے تو آپ نے فرمایا اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے کہا کیا اور بھی کوئی نمازیں پانچ کے علاوہ مجھ پر فرض ہے آپ نے فرمایا نہیں۔ اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور صوم کے متعلق دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ وَاللّٰهِ لَا اَزِيْدُ عَلٰى هٰذَا وَلَا اَنْقُصُ مِنْهُ خدا کی قسم اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کروں گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

اَفْلَحَ الرَّجُلُ اِنْ صَدَقَ فلاح پا گیا اس شخص نے اگر سچ کہا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ

اور ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے کچھ حصہ ہمارے لیے خاص کر لیتے ہیں جسے وقتاً فوقتاً ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

لفظ رزق سے اس جگہ عام معنی مراد ہیں۔ جو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ اور ہر قسم کے انفاق فی سبیل اللہ کو شامل ہے بعض اہل علم نے باطنی اور معنوی رزق یعنی علم نافع کے انفاق کو بھی اس آیت شریفہ کے عموم میں داخل فرمایا ہے۔

حق تعالیٰ شانہ نے سب سے اوّل ایمان کا ذکر فرمایا جو تمام اعمال صالحہ کی جڑ ہے پھر نماز کا ذکر فرمایا جو عبادات بدنیہ میں سب سے افضل ہے پھر عبادات مالیہ زکوٰۃ اور صدقات کا ذکر فرمایا یا یوں کہو کہ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ میں متقین کے حسن اعمال کا ذکر تھا اور وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ میں حسن اخلاق کا ذکر ہے اور مِمَّا میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی مال کا بعض حصہ خرچ کرتے ہیں مسرف اور فضول خرچ نہیں اور مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ کو اپنے عامل یعنی يُنْفِقُوْنَ پر تقدیم کچھ اہتمام اور اختصاص کی طرف مشیر ہے یعنی ان کے مال کا کچھ حصہ ہمیشہ تصدق اور انفاق فی سبیل اللہ کے لیے مخصوص رہتا ہے۔

ف جاننا چاہیے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی سات قسمیں ہیں۔

سه یہ مما رزقنٰھم کو تقدیم کے نکتہ کی طرف اشارہ ہے۔ تفصیل کشاف میں ہے۔ ۱۲

(۱) زکوٰۃ صدقۂ عشر۔
(۲) صدقۂ فطر۔
(۳) خیرات و صدقات جیسے فقراء کو دینا اور مہمانوں کی ضیافت اور حاجتمندوں کو قرض دینا۔
(۴) وقف جیسے بناء مساجد و مدارس اور کنواں اور مہمان سرائے اور مسافر خانہ۔
(۵) مصارف حج۔
(۶) مصارف جہاد۔
(۷) نفقات واجبہ جیسے نفقۂ عیال اور نفقۂ زوجہ اور نفقۂ محارم۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ

اور جو یقین کرتے ہیں جو کچھ اترا تجھ پر اور جو اترا تجھ سے

اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝

پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں۔ انہوں

اُولٰۗىِٕكَ عَلٰي هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۤ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ

نے پائی ہے راہ اپنے رب کی اور وہی

الْمُفْلِحُوْنَ ۝

مراد کو پہنچے

قال تعالیٰ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ... الیٰ ... اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ اور وہ متقی لوگ ایسے ہیں جو ایمان لاتے اس کتاب پر جو تیری طرف نازل ہوئی اور ان کتابوں پر جو تجھ سے پہلے نازل ہوئیں اس سے مومنین اہل کتاب مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہ اسی لیے اس جگہ والذین کو مکرر لائے کہ یہ متقین کا دوسرا گروہ ہے اور پہلی آیت میں اہل عرب اور امیین کا ذکر تھا و بالاخرۃ ھم یوقنون اور متقین کے یہ دونوں گروہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں آخرت کا تذکرہ اور استحضار متقین کا خاص شعار ہے بخلاف کافروں کے کہ وہ ہر وقت دنیا ہی کی فکر میں رہتے ہیں اور آخرت سے غافل ہیں یعلمون ظاھرا من الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غفلون ایسے ہی لوگ ہدایت پر قائم ہیں جو ان کو خدا کی توفیق اور فضل سے ملی ہے کیونکہ

صفات کافرین

قال تعالیٰ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا[1] ...... الی ..... عَذَابٌ عَظِيمٌ

یہاں تک گروہ اتقیاء کا ذکر فرمایا کہ جو قرآن کریم کی ہدایت سے متمتع اور منتفع ہوئے اب گروہ اشقیاء کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو اپنی شقاوت اور فساد فطرت کی وجہ سے اس چشمۂ ہدایت سے منتفع نہیں ہوئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ تحقیق جن لوگوں نے کفر کیا یعنی جو لوگ اللہ کے علم میں کافر ہیں ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے وہ ایمان نہ لائیں گے آپ اس قسم کے لوگوں کے ایمان نہ لانے سے رنجیدہ اور ملول نہ ہوں قرآن کی ہدایت اور آپ کی تبلیغ اور دعوت کا قصور نہیں بلکہ ان کی فاسد اور بگڑی ہوئی استعداد اور فطرت کا قصور ہے اصل کافر وہی ہے کہ جس کا خاتمہ اور موت اللہ کے علم میں کفر پر مقدر ہو چکا ہو جیسے ابوجہل اور ابولہب واشباہم۔ اور جس شخص کا خاتمہ ایمان پر ہونے والا ہے وہ فی الحال محض ظاہر کے اعتبار سے کافر ہے حقیقت اور انجام کے اعتبار سے مومن ہے۔

گر عزازیل را تمام ایماں بہ رفت   لیک مومن بود ناکسش وا لعنت

جو لوگ محض ظاہر کے اعتبار سے کافر تھے ان میں سے بہت سے مشرف باسلام ہوگئے اور بہت سے رہ گئے لیکن جو اللہ کے علم میں کافر تھے ان میں سے کوئی ایمان نہیں لایا۔ ایسے کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

گزشتہ آیات میں اہل انعام کا ذکر تھا یعنی جن کو حق تعالیٰ نے ایمان اور ہدایت اور تقویٰ کی نعمت سے سرفراز فرمایا اب اہل غضب اور اہل ضلال کا ذکر فرماتے ہیں۔ ان دو آیتوں میں خالص کافروں کا ذکر ہے اور اس کے بعد تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر ہے۔

حرف تحقیق یعنی کلمہ اِنَّ کا استعمال اکثر ان مواقع میں ہوتا ہے کہ جہاں مخاطب کو کسی قسم کا کوئی تردد ہو۔ مگر کبھی کبھی ایسے موقع پر بھی استعمال ہوتا ہے کہ جہاں متکلم یا مخاطب کے گمان کے خلاف کوئی شئ ظاہر ہو جیسے حضرت مریم کی والدہ کا بطور حسرت یہ فرمانا۔

رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ۔   اے پروردگار تحقیق میں نے تو یہ لڑکی جنی ہے۔

---

[1] یہ آیت نازل ہوئی ان کے حق میں جن کی موت کفر پر اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم میں جانی تھی جیسا کہ عتبہ وشیبہ و ابوجہل و ولید بن مغیرہ (موضح القرآن)

خلافِ اُمید لڑکی کی ولادت کو بطورِ حسرت حرفِ اِنَّ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور مثلاً نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی قوم سے یہ امید تھی کہ وہ میری تصدیق کریں گے جب خلافِ امید انہوں نے تکذیب کی تو بطورِ حسرت یہ فرمایا۔

رَبِّ إِنَّ قَوْمِي كَذَّبُونِ ۔ — اے پروردگار تحقیق میری قوم نے تو میری تکذیب کی۔

اسی طرح اس جگہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امید کے خلاف کفار کے نہ ایمان لانے کو حرفِ اِنَّ کے ساتھ ذکر فرمایا کہ اے ہمارے نبی آپ ان کافروں کے ایمان کی امید نہ رکھیں۔ ان کے حق میں آپ کا ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے یہ ایمان نہ لائیں گے اور سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ۔ اس لیے فرمایا کہ کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے لیکن آپ کے حق میں برابر نہیں آپ تو ماجور من اللہ ہیں۔ آپ کو تبلیغ اور دعوت کا اجر ہر حال میں ملے گا اس آیت سے یہ مقصود نہیں کہ آپ ان کو تبلیغ اور ہدایت نہ فرمائیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین اور ملول نہ ہوں۔

کفر کی تعریف

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر میں ایمان کے ساتھ کفر کی حقیقت بھی امام غزالی سے نقل کرچکے ہیں لیکن امام رازی نے جو کفر کی تعریف فرمائی ہے وہ زیادہ واضح ہے اور کفر کی تمام اقسام کو حاوی اور جامع ہے وہ یہ ہے۔

اَلْكُفْرُ عَدَمُ تَصْدِيقِ الرَّسُولِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا عُلِمَ بِالضَّرُورَةِ مَجِيئُهُ بِهٖ (تفسیر کبیر ص ج ۱) — یعنی کفر کے معنی یہ ہیں کہ رسول اور پیغمبر کی اس چیز میں تصدیق نہ کرنا جس کا بدیہی اور قطعی طور پر دین سے ہونا معلوم ہو چکا ہے۔

یہ جو کفر کی یہ تعریف یعنی عدمِ تصدیق الرسول، تکذیب اور ترکِ تصدیق دونوں کو شامل ہے اور امام غزالی نے جو تعریف کی ہے یعنی تکذیب الرسول وہ بظاہر اس شخص کے کفر پر صادق نہ آئے گی کہ جو نہ تصدیق کرتا ہے اور نہ تکذیب حالانکہ وہ شخص بالاجماع کافر ہے نبی کی تصدیق نہ کرنا ہی کفر ہے خواہ تکذیب کرے یا نہ کرے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کفر کی تعریف بجائے تکذیب کے ترکِ تصدیق کے ساتھ کی جائے تاکہ کفر کی دونوں صورتوں پر صادق آسکے۔ کما قال اللہ تعالیٰ۔

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللهِ وَ — جو اللہ اور اس کے رسول کی تصدیق نہ کرے

وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا۔ — تو ہم نے ایسے کافروں کے لیے دہکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔

اس آیت شریفہ میں نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا۔ وقال تعالیٰ۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ — کافروں نے کہا ہم ہرگز اس قرآن کی تصدیق نہ کریں گے۔

سورۂ صافات میں ہے کہ اہل جنت اہل نار سے یہ کہیں گے۔

بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ — بلکہ تم تصدیق کرنے والے نہ تھے۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى۔ — اس کافر نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی۔

بلکہ خود یہی آیت یعنی اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ امام رازی کی تائید کرتی ہے اس لیے کہ اس آیت میں نہ ایمان لانے والوں اور نہ تصدیق کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے۔

اقسام کفر

علماء نے کفر کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

۱۔ کفر تکذیب۔ یعنی انبیاء و رسل کو جھٹلانا کما قال تعالیٰ۔

وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ — کافروں نے کہا یہ ساحر اور جھوٹا ہے۔

اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ۔ — ان قوموں میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا پس میرا عذاب ان پر ثابت ہو گیا۔

(۲) کفر استکبار۔ تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے حکم کو نہ ماننا اور اس کے قبول سے انکار کر دینا۔

اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۔ — ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور تھا وہ کافروں میں سے۔

(۳) کفر اعراض۔ یعنی پیغمبر کی نہ تصدیق کرے اور نہ تکذیب بلکہ اعراض اور روگردانی کرے کما قال تعالیٰ۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ۔ — اور کافر جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس سے اعراض کرتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر صاحب معرضون کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ دھیان نہیں کرتے یعنی حق کی نصیحت کی طرف توجہ اور التفات نہیں کرتے۔ وقال تعالیٰ۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ — کہہ دیجئے کہ اطاعت کرو اللہ کی اور اس

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۔ کے رسول کی۔ اور اگر روگردانی کریں تو بیشک اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔

اس آیت میں روگردانی کرنے والوں کو کافر بتایا گیا ہے اور اس قسم کی بہت سی آیتیں ہیں۔

(۴) کفر ارتیاب یعنی پیغمبر کے نہ صادق ہونے کا یقین ہے نہ کاذب ہونے کا بلکہ شک اور تردد ہے یہ بھی کفر ہے جیسا کہ وَقَدْ كَفَرُوا بِهِ ۔ کی علت حق تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی ہے۔ إِنَّهُمْ كَانُوا فِي شَكٍّ مُّرِيبٍ (یعنی بیشک تھے وہ شک میں متردد)

(۵) کفر نفاق۔ یعنی زبان سے اقرار اور قلب سے انکار کرے اور وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ آمَنَّا بِاللَّهِ وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِينَ ۔ سے دور تک اسی کفر نفاق کا بیان ہے۔

حق جل شانہ کا یہ ارشاد خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ ۔ پہلے جملہ کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا اور نہ ڈرانا اس لئے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرد اور عناد اور سرکشی کے سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے جو ان کا بینائی آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کے سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے ہیں نہ آنکھ کے راستہ سے ہدایت پہنچ سکتی ہے اور نہ کان کے راستہ سے لہٰذا اب کوئی صورت نہیں کہ ہدایت ان کے دلوں تک پہنچ سکے۔ دل کا دروازہ اگر کھلا ہوا ہوتا تو پھر شاید ہدایت اندر داخل ہو جاتی مگر وہ بند کر دیا گیا یہ دنیا میں ہوا۔ اور آخرت میں ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے جو نفاق کی سزا اور ثمرہ ہے۔

نکتہ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ اور عَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۔ میں کلمۂ علیٰ کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ قلوب اور اسماع ہر ایک کی مہر جداگانہ اور مستقل ہے۔ جمہور علماء مفسرین و متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ آیت شریفہ میں ختم اور غشاوہ سے مراد نہیں کہ حق تعالیٰ نے حقیقۃً ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ یہ متکبرین اور معاندین اور ہوا پرست اور دشمنان حق و ہدایت اپنی طبعی زیغ اور جبلی کجروی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے ہیں کہ اخلاق ذمیمہ اور رذائل ان کے دلوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو چکے ہیں کہ ہر فساد اور منکر ان کو مستحسن نظر آتا ہے اور حق جل و علا کی ہر نافرمانی ان کو لذیذ معلوم ہوتی ہے ان کی حالت نجاست کے کیڑے کی طرح ہے کہ جس کو گندگی سے طبعی رغبت ہوتی ہے اور خوشبو سے اس کو طبعی نفرت ہوتی ہے اور بسا اوقات یہ نجاست کا کیڑا عطر کی تیز خوشبو کو برداشت بھی نہیں

کر سکتا اور بعض اوقات فطری خوشبو سے مرغوب ہوتا ہے یہی حالت ان کافروں کی ہے کہ کفر کی نجاست پر فریفتہ ہیں اور حق اور ہدایت کے عطر سے انکو نفرت ہے۔

حق تعالیٰ نے کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح مہر اور پردہ بیرونی اشیاء کے دخول اور نفوذ سے مانع ہوتے ہیں اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان اور ہدایت کو انکے دلوں تک نہیں پہنچنے دیتی اور اندرونی کفر کو اندر سے باہر نہیں نکلنے دیتی اور نہ ان کے کان کسی حق بات کی طرف التفات کرتے ہیں اور نہ ان کی آنکھیں کسی امر حق کو دیکھنا چاہتی ہیں ایسے لوگوں کو ڈرانا اور نہ ڈرانا برابر ہے۔

تو ۔۔۔ امام حسن بصری یہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ختم اور غشاوہ (مہر اور پردہ) ظاہر اور حقیقت پر محمول ہے کافروں کے دلوں پر حقیقۃً ایک مہر ہے اور حقیقۃً انکی آنکھوں پر ایک پردہ ہے جو مجہول الکیفیت ہے اور ہماری نگاہوں سے مستور ہے، اللہ کے فرشتے اس ختم اور غشاوہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی مہر اور پردہ کو دیکھ کر یہ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کافر کبھی ایمان نہیں لائیں گے اور ان پر لعنت کرتے ہیں جس طرح قلوب مومنین پر نقش ایمان لکھا ہوا دیکھ کر ان کے لیے دعا اور استغفار کرتے ہیں کما قال تعالیٰ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ یہی لوگ ہیں جن کے دل میں اللہ نے ایمان لکھ دیا ہے پس جس طرح مومنین کے دلوں پر ایمان کی کتابت حقیقت ہے اسی طرح کافروں کے دلوں پر مہر اور آنکھوں پر پردہ بھی حقیقت ہے اگرچہ کتابت ایمان کی طرح اس کی کیفیت مجہول ہے ملائکۃ اللہ جس طرح قلوب مومنین پر کتابت ایمان کا حسّاً اور عیاناً مشاہدہ کرتے ہیں اسی طرح وہ قلوب کافرین پر مہر اور ان کی ابصار پر پردہ کا بھی حقیقۃً معاینہ کرتے ہیں۔ (تفسیر کبیر صفحہ ۱۱۱ ج ۱)

واخرج البزار والبیہقی فی
الشعب وضعفہ عن ابن عمر
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
قال الطابع معلق بقائمۃ العرش
فاذا انتہکت الحرمۃ وعمل
بالمعاصی واجتری علی اللہ بعث
اللہ الطابع فطبع علی قلبہ
فلا یعقل بعد ذلک شیئا
(تفسیر در منثور صفحہ ۲۳۹ تفسیر سورۃ
نساء تحت تفسیر قولہ تعالیٰ

امام بزار اور امام بیہقی شعب الایمان
میں عبداللہ بن عمرؓ سے روای ہیں اور
امام بیہقی نے اس کی سند کو ضعیف بتلایا ہے
کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا
مہر لگانے والا فرشتہ عرش کا پایہ پکڑے
کھڑا رہتا ہے جب کوئی شخص اللہ کے
حکم کی بے حرمتی کرتا ہے اور گناہوں
کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور خدا
کے مقابلہ میں گستاخ اور دلیر ہو جاتا ہے
تو خدا تعالیٰ اس مہر لگانے والے فرشتے

بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ	کا حکم دیتے ہیں وہ فوراً اس گستاخ
	اور بیباک کے دل پر مہر لگا دیتا ہے
٭ ٭ ٭	جس کے بعد وہ کسی حق کو قبول نہیں کرتا۔
٭ ٭ ٭	(تفسیر در منثور صفحہ ۲۹ جلد ۱)

اور احادیث صحیحہ اس معنی کی تائید کرتی ہیں چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مومن جب کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک سیاہ نقطہ اس کے قلب پر لگ جاتا ہے پس اگر توبہ کر لی اور اس گناہ سے باز آگیا تو دل کو صیقل کر دیا جاتا ہے اور اگر کوئی اور گناہ کیا تو وہ نقطہ اور بڑھ جاتا ہے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اسکے دل کو گھیر لیتا ہے اور یہی وہ رَین (زنگ) ہے جس کی حق تعالیٰ نے كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ میں خبر دی ہے رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح۔

پس جس طرح ہم ظاہری سیاہی اور سفیدی اور زنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ایسے ہی ناظر باشجرا انوار قلوب بنی آدم کی سیاہی اور سفیدی اور زنگ کا معائنہ کرتے ہیں مجاہد فرماتے ہیں کہ رَین یعنی زنگ کا درجہ ختم اور طبع سے کم ہے اور ختم اور طبع کا درجہ اقفال سے کم ہے اور اقفال سب سے زیادہ سخت ہیں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا یعنی ان کے دلوں پر قفل ہیں۔

امام قرطبی[1] فرماتے ہیں کہ حدیث رین اور مجاہد کا قول اس امر کی دلیل ہے کہ آیت میں جس ختم کا ذکر ہے وہ امر حقیقی ہے (تفسیر قرطبی صفحہ ۱۸۹ جلد ۱)۔

عن ابن عمر قال قال رسول اللہ	عبداللہ بن عمر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم اذا	سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے
کذب العبد تباعد عنہ	یہ ارشاد فرمایا کہ بندہ جب جھوٹ بولتا
الملک میلا من نتن	ہے تو اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے
ما جاء بہ رواہ الترمذی۔	فرشتہ ایک میل دور چلا جاتا ہے۔ (ترمذی)

٭

و عن جابر قال کنا مع النبی	حضرت جابر راوی ہیں کہ ہم ایک سفر میں

[1] امام قرطبی حدیث رین کو نقل کر کے فرماتے ہیں قلت وفی قول مجاهد هذا وقوله علیه السلام ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وهی القلب - دلیل علی ان الختم یکون حقیقیا والله اعلم تفسیر قرطبی صفحہ ۱۸۹ جلد ۱۔

صلی اللہ علیہ وسلم فارتفعت ریح منتنة فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتدرون ما ھذہ الریح ھذہ ریح الذین یغتابون المؤمنین رواہ احمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، یکایک ایک بدبو اٹھی آپ نے ارشاد فرمایا جانتے ہو یہ کیسی بدبو ہے پھر فرمایا یہ بدبو ان لوگوں کے منہ سے آرہی ہے جو اس وقت مسلمانوں کی غیبت کر رہے ہیں (مسند احمد)

ہم اگر قصور بصیرت کی وجہ سے کذب اور غیبت کے رائحۂ کریہہ اور اس کی بدبو کا احساس نہ کرسکیں تو ہمارا یہ عدم احساس معاذ اللہ ملائکہ کرام اور انبیاء و مرسلین کے عدم احساس کی ہرگز ہرگز دلیل نہیں بن سکتی۔

اسی طرح اگر ہم اپنی بد باطنی اور قصور بصیرت سے قلوب کافرین کی مہر اور ان کی آنکھوں کا پردہ نہ دیکھ سکیں تو ملائکۃ اللہ کے نہ دیکھنے کی کیسے دلیل ہوسکتی ہے ؎

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم ٭ چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ ختم اور طبع حق جل شانہ کی جانب سے ابتداءً نہ تھا بلکہ ان کے اعراض اور استکبار اور تکذیب اور انکار کی پاداش اور سزا میں تھا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِآيَاتِ اللَّهِ وَقَتْلِهِمُ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَقَوْلِهِمْ قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ طَبَعَ اللَّهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا

پس بسبب ان کے عہد توڑ دینے اور آیات الٰہی کے انکار کر دینے اور انبیاء کو دیدہ و دانستہ ناحق قتل کرنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل پردہ میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے مہر لگا دی ہے پس یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے مگر ان میں کے بہت تھوڑے۔

وقال تعالیٰ فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ۔

پس جب انہوں نے کجروی اختیار کی اور حق سے انحراف کیا تو اللہ نے انکے دلوں کو بالکل حق سے پھیر دیا اور اللہ نہیں توفیق دیتا حد سے نکلنے والوں کو۔

وقال تعالیٰ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔

آیات مذکورہ میں اس امر کی تصریح ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ ختم اور طبع ان کے نقض میثاق

اور قتل انبیاء اشرار اور تبدیل اور تحریف کی پاداش اور سزا تھی ان کی وجہ دلیری اور علی الاعلان نافرمانی کی ان کو یہ سزا ملی کہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم کر دیے گئے اور مہر لگا کر ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی۔ اور معرفت اور ہدایت کی سب راہیں ان پر بند کر دی گئیں اب وہ نہ حق کی باتوں کو سمجھ سکیں گے اور نہ حق سن سکیں گے۔ اور نہ دیکھ سکیں گے: اس لیے اب ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا سب برابر ہے۔

اور اگر بالفرض حق تعالیٰ جل شانہٗ ابتداءً ہی کسی کے دل پر مہر لگا دیں اور اپنی توفیق اور ہدایت سے محروم کر دیں تب بھی ذرا برابر کوئی ظلم نہیں جیسا کہ عطاء بن ابی رباح سے منقول ہے کہ میں ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے یہ سوال کیا کہ اگر حق تعالیٰ مجھ سے اپنی ہدایت کو روک لیں اور گمراہی اور بدبختی کو میرے لیے مقدر فرما دیں تو کیا یہ ظلم نہ ہوگا حضرت ابن عباسؓ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر خدا تعالیٰ نے تیری کسی مملوک شئی کو روک لیا ہے تو بے شک تجھ پر ظلم کیا اور اگر حضرت نے اپنی مملوک شئی کو روک لیا ہے تو وہ اس کی ملک ہے اس کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ وقال تعالیٰ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ.

اسی طرح ہدایت بھی اسی کی ملک ہے اور اسکی رحمت ہے جس سے اپنے وفاداروں اور اطاعت شعاروں کو نوازتا ہے اور متکبرین اور سرکشوں کو اس سے محروم کرتا ہے۔ (کتاب [illegible] علی [illegible] ابن القیم ص [illegible])

حق تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے لوگوں کو مختلف الاستعداد بنایا کسی کو غنی اور کسی کو فقیر کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت کسی کو بینا اور کسی کو نابینا کسی کو صحیح سالم تندرست اور کسی کو معذور اور اپاہج اور گونگا اور بہرا۔ جس کسی کو جو کمال اور خوبی عطا کی وہ محض اسکا فضل ہے اس پر کسی کا کوئی حق اور قرضہ نہیں اور جس کو نہیں دیا اس پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح اس نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ سے کسی کی طبیعت میں کفر اور عصیان اور انکار اور سرکشی کی استعداد رکھی اور کسی کی فطرت میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد رکھی اور اپنے احکام کو ان استعدادوں کے ظہور کا ذریعہ بنایا حکم کے بعد استعدادوں کا ظہور ہوا۔ جس میں عصیان اور انکار کی استعداد تھی اس نے نافرمانی کی اور جس میں اطاعت اور فرمانبرداری کی استعداد تھی وہ حکم خداوندی سنتے ہی سربسجود ہو گیا جیسے بیج میں برگ و بار سب نہاں ہوتے ہیں اور جب وقت آتا ہے تو سب باہر نکل آتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس نے بندوں کو مختلف الاستعداد کیوں بنایا سو یہ سوال بالکل مہمل ہے وہ مالک مطلق اور فعال لما یرید ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔

مرا ز عشرہ آنچہ از بیم تو گفتہ بہ زبان جز بہ تعلیم تو
زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیزیدن علت از کار تو

حق تعالیٰ نے جس زمین کو چاہا ایسا عمدہ بنایا کہ جو تخم اس میں ڈالا جائے وہ سوگنا ہو جائے اور کسی زمین کو شور اور ناقابل زراعت بنا دیا کوئی فلسفی اور سائنس دان اس کی وجہ نہیں بیان کر سکتا کہ خدا تعالیٰ نے زمین کی صلاحیتوں اور استعدادوں میں یہ فرق کیوں رکھا وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ؎

یک زمین پاک و آب شور است ہم این فرشتہ پاک و آں دیو است و دد
ہر دو گوں زنبور خوردند از محل لیک شد زاں نیش و زیں دیگر عسل
ہر دو گوں آہو گیا خوردند و آب زیں یکے سرگیں شد و زاں مشک ناب
ہر دو نے خوردند از یک آبخور ایں یکے خالی و آں پر از شکر
صد ہزاراں ایں چنیں اشباہ بیں فرقشاں ہفتاد سالہ راہ بیں
ایں خورد گردد پلیدی زو جدا واں خورد گردد ہمہ نور خدا

لطائف و معارف

۱. (قلب) ۱. لغت میں اس صنوبری گوشت کے ٹکڑے کا نام ہے جو سینہ کے بائیں جانب ایک خول جگہ میں رکھا ہوا ہے اور یہی عضو قلب روح حیوانی کا منبع اور سرچشمہ ہے اسی میں روح حیوانی پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ بدن کی حس و حرکت موقوف ہے اور جو شریانوں کے ذریعہ تمام اعضاء میں پہنچتی ہے مگر اصطلاح شرع میں اس لطیفہ ربانی کو قلب کہتے ہیں جو اس عضو قلب میں من جانب اللہ رکھا ہے اور انسان کی انسانیت اسی سے وابستہ ہے اور اسی کی وجہ سے احکام شرعیہ کا مکلف اور مخاطب بنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَہِیْدٌ۔ اور اسی لطیفہ ربانی کو قرآن کریم میں کہیں نفس سے تعبیر کیا گیا ہے۔

کما قال تعالیٰ۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۔ اور کہیں روح کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ۔ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ۔ اس قسم کی آیات میں روح سے وہی لطیفہ انسانی مراد ہے جو انسان کا جوہر اور حقیقت ہے اور یہ لطیفہ انسانی عالم امر سے ہے اور الہام ربانی کا محل اور مورد ہے اس لطیفہ پر جب صیقل لگ گئی تو اصحاب دل اہل کشف اور الہام کے سبب درجات سے بلند ہو گئے۔

(۲) السمع: سمع کے معنی کان کے ہیں جو ایک عضو ہے اور کبھی اس کا اطلاق قوت سامعہ پر بھی آتا ہے آیت میں یہی معنی مراد ہیں اس قوت پر جب مہر لگ گئی تو کان کے ذریعہ سے جو ہدایت دل تک پہنچ جاتی تھی اسکا دروازہ بند ہوگیا۔

(۳) الابصار: جمع بصر کی ہے آنکھ کی روشنی کو بصر کہتے ہیں جس طرح دل کی روشنی کو بصیرت کہتے ہیں۔

(۴) ختم اور غشاوہ: ختم کے معنی مہر کرنا تاکہ وہ چیز بند ہو جائے اور چیزیں باہر سے اندر کی طرف نہ پہنچ سکیں۔ اور غشاوہ پردہ کو کہتے ہیں آنکھ پر غشاوہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ پردہ آنکھ کی شعاع کو باہر سے روک دے۔

(۵) معتزلہ کا گمان یہ ہے کہ کسی کے دل پر مہر لگا دینا ایک امر قبیح ہے اور اللہ تعالیٰ ہر قبیح سے پاک اور منزہ ہے اسی لیے معتزلہ قرآن کریم کی اس قسم کی تمام آیتوں کی تاویل کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ختم اور طبع کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف اسناد مجازی ہے۔ اہل حق کہتے ہیں کہ یہ اسناد حقیقی ہے قلوب بنی آدم اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں وہ اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے قلوب کو پلٹتی دیتا رہتا ہے اور پھیرتا رہتا ہے کبھی خیر کی طرف اور کبھی شر کی طرف کما قال تعالیٰ۔ وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ۔ اس قسم کی آیات سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمام قلوب اسی کی انگلیوں میں ہیں قلوب کی ہدایت اور ضلالت اور ان کی سعادت اور شقاوت اسکے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بغیر اسکی توفیق اور عنایت کے ایمان اور ہدایت ممکن نہیں۔ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ، وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ۔

تمام کائنات اسی کی پیدا کی ہوئی ہے اسی نے اپنی قدرت سے ان کو عدم کے پردہ سے نکال کر وجود کی مسند پر بٹھلایا ہے لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ عالم کا کوئی ذرہ بدون اسکے ارادہ اور مشیت کے حرکت کر سکے ایمان اور ہدایت کفر اور ضلالت سب اسی کی مخلوق ہیں تخلیق و تکوین کے اعتبار سے ہر چیز کی اسناد اسی کی طرف ہوگی اور اسناد حقیقی ہوگی۔

البتہ کسب اور حصول کے اعتبار سے بندوں کی طرف اسناد ہو سکتی ہے چونکہ یہ ختم اور تغشیہ بندوں کے اختیاری تمرد اور سرکشی کا نتیجہ اور اسی کی سزا ہے اس لیے متمردین اور معاندین کی تقبیح اور تشنیع کے لیے اسکو ذکر کیا لہٰذا موردِ مذمت اور مستحق ملامت صرف وہی لوگ ہوں گے جو اپنی استعدادوں کے طرف اور محل میں مہر اور سیاہی کا پیدا کرنا تو کمال ہے مگر اسکا استعمال قبیح اور مذموم

ہے اسی طرح روحانی زہر (کفر و ضلالت) اور روحانی تریاق (ایمان و ہدایت) کو پیدا کرنا تو کمال ہی کمال ہے مگر اس کو اپنے اختیار سے استعمال کرنے کا حکم دوسرا ہے۔ زمین اچھی ہو یا بری۔ شور اور بنجر ہو یا قابل اور زرخیز ہو پیدا کرنا تو دونوں ہی کا حکمت ہے مگر برائی کے ساتھ شور اور بنجر زمین ہی کو موصوف کیا جائے گا۔ پیدا کرنے والا تو ہر حال میں قابل حمد و ستائش اور لائق صد آفرین و تحسین ہے۔ کما قال تعالیٰ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالَّذِي خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا۔ جس زمین کو حق تعالیٰ نے شور اور بنجر بنایا اور انبات کی صلاحیتوں سے اسے محروم کر دیا تو خداوند ذوالجلال نے زمین کے اس ٹکڑے پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ اسی طرح خداوند علیم و حکیم نے اگر کسی کے دل پر مہر لگا کر اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اس کی زمین قلب کو ہدایت کی صلاحیتوں سے محروم کر دیا تو کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ حق یہ ہے کہ یہ ختم اور غشاوہ ان کی سرکشی اور عناد کی سزا ہے۔ یہ مُہر ان کو کفر پر مجبور نہیں کرتی اس مہر کا توڑنا ان کے اختیار میں ہے۔ حق کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں ابھی مہر ٹوٹتی ہے۔

حق جل شانہ نے گمراہی کے قفل پیدا کیے اور کافروں کے دلوں پر ڈال دیئے۔ کما قال تعالیٰ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ مگر اس علیم و حکیم نے ان قفلوں کے کھولنے کے لیے کنجیاں بھی پیدا کیں تاکہ اگر کوئی قفل ضلالت کو کھولنا چاہے تو کلید ہدایت اور مفتاح سعادت اس کے ہاتھ میں ہے اس سے بسہولت قفل کھل سکتا ہے۔ ہاں اگر کوئی بدنصیب کنجی کا استعمال نہ کرے تو قفل خود بخود تو کھلنے سے رہا۔

(۶) امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ کفر اور کافروں کے ساتھ حق تعالیٰ شانہٗ کو ذاتی عداوت ہے اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے اس حق جل و علا کے بالذات دشمن ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا عذاب دائمی ہے اور ان کی مغفرت ناممکن ہے اس لیے کہ صفت رافت و رحمت جو کہ صفات افعال میں سے ہے وہ ذاتی غضب اور ذاتی عداوت کے مقتضا کو ہرگز نہیں بدل سکتی۔ ایک صفت فعل کا مقتضا دوسری صفت فعل کے مقتضا سے تغیر اور تبدیل ہو سکتا ہے۔ مثلاً صفت احیاء سے صفت اماتہ کا مقتضا بدل سکتا ہے مگر مقتضائے ذات مقتضائے فعل سے نہیں بدل سکتا۔ اس لیے کہ مقتضائے ذاتی بلاشبہ مقتضائے فعلی اور اقتضاء صفاتی سے بدرجہا اعلیٰ و ارفع ہے۔ اس لیے قیامت میں کافروں کو اس کی صفت رافت و رحمت سے کوئی حصہ نہ ملے گا۔ کیونکہ وہ اس وحدہٗ لاشریک لہٗ کے بالذات دشمن ہیں اور حدیث قدسی میں جو سبقت رحمتی علی غضبی۔ (میری رحمت میرے غضب پر سابق ہے) وارد ہوا ہے اس سے ذاتی غضب مراد نہیں جو کفار و مشرکین کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ صفاتی اور فعلی غضب مراد ہے جو گنہگار مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے یعنی عصاۃ مؤمنین (گنہگار مؤمنین) کے ساتھ ذاتی عداوت اور ذاتی

مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ

آزار ہے پھر زیادہ دیا اللہ نے ان کو آزار اور ان کو

عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ

دکھ کی مار ہے اس پر کہ وہ جھوٹ کہتے تھے اور جب کہئے

لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ

ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں کہیں ہمارا کام تو

مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ

سنوارنا ہے سن رکھو وہی ہیں بگاڑنے والے پر نہیں

لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ

سمجھتے اور جب کہئے ان کو ایمان میں آؤ جس

النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ

طرح ایمان میں آئے سب لوگ کہیں کیا ہم اس طرح مسلمان ہوں جیسے مسلمان ہوئے بیوقوف سنتا ہے

اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَاِذَا لَقُوا

وہی ہیں بیوقوف پر نہیں جانتے اور جب ملاقات

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ

کریں مسلمانوں سے کہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے جاویں اپنے شیطانوں

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ

پاس کہیں ہم ساتھ ہیں تمہارے ہم تو ہنسی کرتے ہیں اللہ

يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾

ہنسی کرتا ہے ان سے اور بڑھاتا ہے ان کو ان کی شرارت میں بہکے ہوئے

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَتْ

وہی ہیں جنہوں نے خرید لی گمراہی ہدایت کے بدلے سو نفع نہ لائی

تِجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۶﴾

ان کی سوداگری اور نہ آئے راہ پر ۔

قبائح منافقین

قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ ... الخ ... وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ.

ربط ابتداء سورت میں حق تعالیٰ نے ان لوگوں کی مدح فرمائی جنہوں نے دل سے اللہ کی کتاب اور اس کے دین کو مانا اور زبان سے اس کا اقرار کیا۔ یہ اتقیاء کا گروہ تھا بعد میں اشقیاء کا حال ذکر کیا۔ اشقیاء میں دو گروہ تھے۔ پہلا گروہ وہ تھا جو دل اور زبان دونوں سے منکر تھے۔ ان کا ذکر ہو چکا۔ اب آئندہ آیات میں اشقیاء کے دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو کسی دباؤ اور مصلحت کی بناء پر زبان سے تو مانتے ہیں مگر دل سے نہیں مانتے۔ ایسے شخص کو اصطلاح شریعت میں منافق کہتے ہیں۔ کافروں میں سب سے بدتر یہی (قسم) ہے کہ جس نے کفر کے ساتھ جھوٹ کو جمع کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو اوس اور خزرج کے اکثر قبائل سچے دل سے اسلام میں داخل ہو گئے مگر بعض قبائل جو یہود سے تعلق رکھتے تھے وہ اسلام کی قوت اور شوکت کو دیکھ کر ظاہر میں مسلمان بنے تاکہ انکے جان و مال اور اہل و عیال محفوظ رہیں مگر اندرونی طور پر یہود اور مشرکین کے ساتھ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انکے بارہ میں یہ آیتیں نازل کیں اور ان آیتوں میں منافقین کے اخلاق ذمیمہ اور افعال قبیحہ کو بیان کیا۔

پہلی قباحت

یہ ہے کہ وہ اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اور عجب ہے کہ بعضے لوگ باوجود انسان ہونے کے کیسا ایسے کمینہ اور کج فہم ہیں کہ محض زبان سے لوگوں کو دھوکہ دینے کیلئے یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور یوم آخرت پر حالانکہ وہ کسی درجہ میں بھی مؤمنین نہیں یعنی اللہ اور یوم آخرت کی

(۳) جاننا چاہیئے کہ شیعوں کا تقیہ بھی کھلا ہوا نفاق ہے۔ اگرچہ وہ اس کو ایمان کہیں کما قالوا الا لا ایمان لمن لا تقیۃ لہ۔ اور کہیں نہیں منافق تو اپنے نفاق کو ایمان اور اخلاص ہی سمجھتا ہے۔

(۴) تفسیر ابن کثیر میں امام مالک سے منقول ہے کہ اس زمانہ میں ملحد اور زندیق حکم میں منافق کے ہے انتہی۔

(تشریح) جو شخص شریعت کے الفاظ تو یہی رکھے مگر معنی ایسے بیان کرے جس سے اصل حقیقت بدل جائے ایسے شخص کو قرآن کی اصطلاح میں ملحد اور حدیث کی اصطلاح میں زندیق کہتے ہیں ایسا شخص دعویٰ تو اسلام کا کرتا ہے مگر دل میں کفر مضمر ہے اور آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو دھوکا دیتا ہے وجہ یہ ہے کہ دل میں زیغ اور کجی کی بیماری ہے جو اس کو تاویلات فاسدہ پر آمادہ کرتی ہے اور جس قدر تاویلات فاسدہ زیادہ کرتے جاتے ہیں اتنی ہی ان کی دل کی بیماری میں زیادتی ہوتی جاتی ہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔

اور ان منافقین کا اپنے نفسوں کو دھوکا اور فریب دینا بالکل ظاہر ہے مگر ان کو اس لیے ظاہر نہیں ہوتا کہ فی قلوبہم مرض فزادہم اللہ مرضا۔ ان کے دلوں میں ایک خاص قسم کا مرض ہے جس سے ان کی قوت اور اکیہ ماؤف ہو چکی ہے اور یہ کتاب بلاشبہ پیغام شفاء اور نسخہ ہدایت تھی۔ اگر دلوں کو بغض اور عناد سے صاف کر کے اس نسخہ شفاء کو استعمال کرتے (شفایاب) ہو جاتے۔ مگر اس کتاب ہدایت کے ساتھ ان کا بغض اور عناد زیادتی مرض کا سبب بن گیا۔ پس اللہ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔ جو عضو اور جو حاسہ جس غرض اور جس مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے اس حاسہ سے اس غرض کے نہ حاصل ہونے کا نام مرض ہے۔ زبان کے حق میں نطق اور گویائی اور آنکھ کے حق میں نظر اور بینائی کا۔ اور جسم کے حق میں حرکت اور احساس کا دشوار ہو جانا یہ زبان اور آنکھ اور جسم کا مرض ہے علیٰ ہذا قلب کے حق میں اللہ جل جلالہ کی معرفت اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت کا دشوار ہو جانا کہ جس کے لیے یہ پیدا کیا گیا ہے۔ یہ قلب کا مرض ہے۔

ہر چہ جز عشق خدائے احسن است گر شکر خوردن بود جان کندن است

حالت مرض میں مرغ مسمن اور بہتر سے بہتر غذا بھی مفید نہیں ہوتی بلکہ اور مرض اور بیماری میں قوت اور شدت پیدا کر دیتی ہے۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود

اول ازالہ مرض کی فکر چاہیئے اس کے بعد مناسب غذا دینا ہے۔ اسی طرح باطنی اور روحانی مرض کو ایمان و ہدایت کی تلقین کوئی نفع نہیں دیتی بلکہ اور مرض میں اضافہ کر دیتی ہے۔

جو شخص صفراء کے مرض میں مبتلا ہے اس کو قند اور نبات بھی تلخ معلوم ہوتی ہے اور قند اور نبات کے استعمال سے اسکا صفراء اور زیادہ ہوجاتا ہے

وَمَنْ يَّكُ ذَا فَمٍ مُّرٍّ مَرِيْضٍ يَجِدْ مُرًّا بِهِ الْمَاءَ الزُّلَالَا

جس کے منہ کا مزہ تلخ ہو اس کو آب زلال بھی تلخ معلوم ہوتا ہے اسی طرح جو شخص کفر اور نفاق کے مرض میں مبتلا ہو اس کو ایمان کی حلاوت اور شیرینی کہاں محسوس ہوسکتی ہے کفر اور نفاق کے صفراء نے اس کی قوت ذائقہ کو تلخ بنا دیا ہے اس لیے اس کو ایمان اور ہدایت کی حلاوت محسوس نہیں ہوتی شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک آزار یہ تھا کہ جس دین کو دل نہ چاہتا تھا ناچار قبول کرنا پڑا اور دوسرا آزار اللہ نے زیادہ دیا کہ حکم کیا جہاد کا جن کے خیر خواہ تھے۔ ان سے لڑنا پڑا۔ (موضح القرآن)

وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ دعوائے ایمان میں جھوٹ بولتے تھے اور پھر طرفہ یہ کہ اس جھوٹ کو اپنا کمال سمجھتے ہیں۔ مردوں کی طرح اپنے عقیدہ کو کھول کر نہیں بیان کرتے۔ عورتوں کی طرح ڈرتے ہیں اسی وجہ سے منافق کھلے کافر سے بدتر ہے۔ اس لیے کہ کافر فقط کفر کرتا ہے مگر جھوٹ تو نہیں بولتا۔ اور نہ کسی کو دھوکہ دیتا ہے بخلاف منافق کے کہ وہ کفر بھی کرتا ہے اور زبان سے جھوٹ بھی بولتا ہے کہ مسلمان ہوں اور اہل ایمان کو دھوکہ دیتا ہے۔ کما قال تعالٰی وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وہ اس زمانہ میں زندیق ہے۔ (تفسیر ابن کثیر) یعنی زندیق وہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو اسلام کا کرے مگر دل میں کفر مضمر ہو۔

منافقین کی دوسری قباحت

قال تعالٰی وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ...... الی ...... وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۔

اور یہ منافقین اپنے باطنی مرض کی وجہ سے اس درجہ کو پہنچ گئے ہیں کہ فساد کو صلاح اور صلاح کو فساد اور مرض کو صحت سمجھنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد مت کرو تو یہ کہتے ہیں کہ جز این نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ منافقین کئی طرح سے فساد پھیلاتے تھے۔ کبھی مسلمانوں کے راز فاش کرتے۔ کبھی کافروں کو مسلمانوں کی مخالفت پر آمادہ کرتے اور کبھی کافروں کے اعتراضات ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے سامنے نقل کرتے تاکہ وہ مذبذب اور متزلزل ہوجائیں ان سب کو حق تعالٰی نے فساد سے تعبیر فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں نفاق خواہ دین کا ہو یا دنیا کا خود ایک مستقل فساد ہے۔ دورنگی اور دورویہ ہونے سے بڑھ کر کوئی فساد نہیں۔ ایسا شخص ہمیشہ فساد

پیدا ہوتا ہے اور کسی کا خیر خواہ نہیں ہوتا، مسلمان جب ان کو اس قسم کے فسادوں سے منع کرتے تو یوں ہی یہ سمجھتے کہ اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ۔ جزیں نیست کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ سب شیر و شکر ہو جائیں۔ آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ نئے دین کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے کہ ایک دوسرے کے درپے قتل و غارت اور ایذاء اور جنگ جو ہو گیا ہے وہ سب یک لخت ختم ہو جائے اور ملک اور ملت پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلۂ معاش و تجارت حسب سابق جاری ہو جائے۔ حق تعالیٰ شانہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ آگاہ ہو جاؤ کہ یقیناً یہی لوگ مفسد ہیں۔ کہ کفر اور ایمان اور شرک اور توحید کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور جس کفر و شرک کے فتنہ اور فساد کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا ہے یہ فتنہ پرداز۔ پھر اسی فساد کو دوبارہ اپنی جگہ پر لانا چاہتے ہیں۔ اور چونکہ قلبی مرض کی وجہ سے ان کا باطنی احساس یہاں تک مختل ہو گیا ہے کہ اصلاح اور فساد کے فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے اور یہ نہیں سمجھتے کہ دین حق فتنہ نہیں بلکہ کفر اور شرک ہی فتنہ اور فساد ہے اسی کے مٹانے اور اسی کی اصلاح کے لیے حضرات انبیاء مبعوث ہوئے اور کفر اور شرک ہی کے فتنہ کے استیصال کے لیے جہاد و قتال کرنا عین اصلاح ہے جہاد کو فساد بتانا یہی فتنہ اور فساد ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔

کافروں سے قتال و جہاد کرو یہاں تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

وقال تعالیٰ يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ۔

لوگ آپ سے ماہ حرام میں قتال کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک ماہ محرم میں ابتداءً قتال کرنا بہت بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کے دین سے لوگوں کو روکنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے مسلمانوں کو تنگ اور پریشان کر کے نکالنا ماہ حرام میں قتال کرنے کے جرم سے کہیں زیادہ ہے اور کفر اور شرک کا فتنہ قتل و خونریزی کے فتنہ سے بہت بڑا ہے۔

اگر کسی مریض کا ہاتھ پیر سڑ گیا ہو تو اس عضو کو کاٹ دینا اور اس کا داغ دے دینا ہی حاذق طبیب کے نزدیک اصلاح ہے ورنہ اگر اس عضو کو قطع نہ کیا گیا تو تمام بدن کے خراب ہونے کا

اندیشہ ہے۔ اسی طرح سے اگر اعداء اللہ سے جہاد و قتال نہ کیا جائے تو روحانی طور پر تمام عالم کے خراب ہونے کا اندیشہ بلکہ ظن غالب ہے۔ اب آئندہ آیت میں ان کی بے شعوری کی ایک دلیل بیان فرماتے ہیں کہ وہ اہل حق اور حق تعالیٰ کا اتباع کرنے والوں کو بے وقوف اور احمق سمجھتے ہیں۔

یہی حال ملاحدہ اور زنادقہ کا ہے کہ آیات اور احادیث میں تاویلات فاسدہ کر کے مسلمانوں کو فتنہ اور فساد میں ڈالتے ہیں اور بے عقلی سے اس فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

منافقین کی تیسری قباحت

قال تعالیٰ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ ... الی ... أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ جیسا کہ ایمان لائے وہ لوگ جو حقیقۃً انسان اور آدمی ہیں۔ انسان حقیقت میں وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان رکھتا ہو ورنہ وہ شخص تو ابن آدم بل ہم اضل کا مصداق ہے۔ ناس سے اس جگہ مطلقاً صحابہ کرام مراد ہیں یا علماء بنی اسرائیل مراد ہیں جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ اور تاریخ ابن عساکر میں ابن عباسؓ سے کما آمن الناس کی تفسیر اس طرح منقول ہے۔ کما آمن ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و علیؓ اور ان چار کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ ایمان وہی معتبر ہے جو خلفائے راشدین کے منہاج اور منوال پر ہو اور کما آمن الناس کے لفظ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور تصدیق اسی قسم کی معتبر ہے جس قسم کی صحابۂ کرام اور خلفاء راشدین نے تصدیق کی۔ ورنہ جو شخص ملائکہ اور جنت اور جہنم وغیرہ وغیرہ کی تصدیق اس معنی کے لحاظ سے نہ کرے کہ جس معنی سے صحابۂ کرام تصدیق کرتے تھے۔ بلکہ اپنی ہوائے نفسانی اور شیطان قرین کے القاء کیے ہوئے معنی کے لحاظ سے کرے تو وہ اصلاً معتبر نہیں بلکہ ایسی تصدیق تکذیب کے مترادف ہے اور ایسا ایمان بالکل کفر کے ہم معنی ہے۔ الحاصل جب منافقین سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایمان لاؤ کہ جیسا صحابۂ کرام ایمان لائے تو جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں جیسا کہ ایمان لائے بیوقوف کہ دین کے دیوانے بنے ہوئے ہیں اور زمانہ کے انقلابات سے نہیں ڈرتے ممکن ہے کہ دوسری طرف کا غلبہ ہو جائے دین کی محبت میں دنیاوی مصالح کو نظر انداز کر دیا۔ روافض اور خوارج بھی صحابۂ کرام کو احمق اور کافر اور منافق کہتے ہیں۔ سفیہ اس کو کہتے ہیں جو بھلے نفع اور ضرر کو نہ پہچانتا ہو۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم چونکہ آخرت کے نفع اور ضرر کے فکر میں اس درجہ سرشار اور منہمک

تھے کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کے کسی نفع اور ضرر کی ذرہ برابر پرواہ نہ رکھتے تھے۔ جو ایسے دانشمند تھے ان کو دیوانہ اور بیوقوف کہتے تھے۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ۔ اوست فرزانہ کہ فرزانہ نشد

منافقین کا مخلصین کو دیوانہ اور سفیہ کہنا یہی ان کے عقل اور سمجھدار ہونے کی دلیل ہے۔

؎ وإذا أتتك مذمتي من ناقص ۔ فهي الشهادة لي بأني كامل

ناقص العقل کا میری مذمت کرنا یہی میرے کامل العقل ہونے کی شہادت ہے اس لیے آگے ارشاد فرماتے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ کہ یہی لوگ احمق اور بیوقوف ہیں جنہوں نے باقی کو چھوڑ کر فانی کو اختیار کیا ہے۔ اور باطل کو حق سمجھتے ہیں۔ اور حق کو باطل اور ہدایت کو ضلالت سمجھتے ہیں۔ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الكيس من دان نفسه	عاقل اور سمجھدار وہ ہے کہ جس نے
وعمل لما بعد الموت	اپنے نفس کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار
والاحمق من اتبع نفسه	بنایا اور مابعد الموت یعنی آخرت کے
هواها وتمنى على الله	لیے عمل کیا اور احمق اور بیوقوف وہ
(رواه الترمذي وابن ماجه)	ہے کہ جس نے ہوائے نفسانی کا اتباع
	کیا اور اللہ پر آرزوئیں اور تمنائیں باندھیں
	(ترمذی شریف، ابن ماجہ)

علاوہ ازیں لیل و نہار آپ کے معجزات کا مشاہدہ کیا اور جو نعت اور صفت آپ کی آسمانی کتابوں میں دیکھی اور پڑھی تھی وہ ہو بہو آپ پر منطبق پائی اور پھر بھی ایمان نہ لائے اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی۔ اور یہ منافق ایسے احمق اور بیوقوف ہیں کہ وہ اپنی حماقت اور بیوقوفی کو بھی نہیں جانتے۔ جو احمق اپنی حماقت کو جانتا ہو وہ غنیمت ہے لیکن جو احمق اپنی حماقت اور سفاہت کو دانائی اور فراست سمجھتا ہو اس کا مرض لا علاج ہے۔ ان آیات میں یہ بیان فرمایا کہ منافقین اہل اخلاص کو زبان سے بیوقوف بتلاتے ہیں۔ آئندہ آیات میں یہ بتلاتے ہیں کہ فقط زبان سے نہیں دل سے بھی ان کو بیوقوف سمجھتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

منافقوں کی چوتھی قباحت

قال تعالیٰ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ... الیٰ ... وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

اور جب وہ منافقین ملتے ہیں اہل ایمان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب

اپنے شیاطین الانس یعنی اپنے رؤساء کے پاس تنہا ہوتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم تمہارے ساتھ ہیں سوائے اس کے نہیں کہ ہم تو مسلمانوں کے ساتھ تمسخر اور ہنسی کرتے ہیں تاکہ لوگوں پر مسلمانوں کی منافقت اور ہمارا قول ظاہر ہو کہ محض زبانی اقرار سے ہم کو وہ اپنے ایمان میں سچا سمجھتے ہیں۔ شیاطین سے منافقین کے پیشوا اور سردار مراد ہیں جو دین الٰہی کے مقابلہ میں ہر قسم کے فتنہ اور فساد کے سرغنہ بنے ہوئے تھے۔ شیطان لغت میں سرکش اور حد سے گزر جانے والے کو کہتے ہیں خواہ جنوں میں سے ہو خواہ انسانوں میں سے ہو۔ کما قال تعالیٰ شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ۔ اہل نفاق کو چونکہ ایمان سے دلی رغبت نہ تھی محض قتل سے جان بچانے کے لیے ایمان کا ظاہراً اقرار کرتے تھے اس لیے اٰمنّا کہنے میں کسی حرف تاکید کا استعمال نہ کیا۔ اور جب اپنے شیاطین اور ائمۃ الکفر کی معیت اور مسلمانوں کے استہزاء کو بیان کیا تو حرف انّ اور انّما اور جملہ اسمیہ سے اس کو مؤکد کیا۔ یہ تاکیدی کلمات انکار کی بنا پر نہیں بلکہ اظہار شوق و رغبت کے لیے تھے۔ کما فی المطول۔ گذشتہ آیت میں ان کے استہزاء اور تمسخر کو ذکر ہے اب سمجھو کہ یہ نادان کیا اہل ایمان کا استہزاء اور تمسخر کرتے ہیں ان کو یہ خبر نہیں کہ یہ لوگ خداوند علام الغیوب کے استہزاء اور تمسخر کا محل بنے ہوئے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ یہ کیا اہل ایمان اور اہل اخلاص کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں۔ اَللّٰہُ یَسْتَھْزِئُ بِھِمْ وَیَمُدُّھُمْ فِیْ طُغْیَانِھِمْ یَعْمَھُوْنَ۔ ان کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں تمسخر کرتا رہتا ہے اور ان کی سرکشی اور گمراہی میں ان کو ترقی دیتا رہتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اس میں سرگشتہ اور سرگرداں ہیں۔ دنیا میں تو اللہ تعالیٰ کا استہزاء یہ ہے کہ ان کو خوب مال و دولت دیا تاکہ خوب مغرور اور مست ہو جائیں اور پھر دفعۃً ان کو پکڑ لیا جائے۔ یہ لوگ اس مال و دولت کو نعمت سمجھتے ہیں اور حقیقت میں وہ عذاب اور لعنت ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

اَیَحْسَبُوْنَ اَنَّمَا نُمِدُّھُمْ بِہٖ مِنْ مَّالٍ وَّبَنِیْنَ نُسَارِعُ لَھُمْ فِی الْخَیْرٰتِ بَلْ لَّا یَشْعُرُوْنَ۔

کیا وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ جس مال اور اولاد سے ہم ان کی مدد کرتے ہیں اور ان کے لیے خیر اور بھلائی کے پیچھے سعی کرتے ہیں۔ نہیں بلکہ ان کو اس کا احساس نہیں (کہ یہ استدراج اور امہال ہے)

بعض سلف صالحین سے منقول ہے کہ کافر جب کوئی معصیت کرتا ہے تو اللہ جل شانہ عاجلاً اس کے لیے کوئی دنیوی نعمت پیدا فرماتے ہیں۔ اور وہ حقیقت میں بلاء عظیم اور لعنت یعنی مصیبت ہوتی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ

پس جب کہ وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو ہم نے ہر چیز کے

حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ	دروازے ان پر کھول دیئے یہاں
اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً	تک کہ جب وہ خوش ہو گئے ان چیزوں
فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ	سے جو ان کو دی گئی تھیں تو ہم نے ناگہانی
	طور پر انکو پکڑ لیا پس وہ ناامید ہو گئے

اور آخرت کا استہزاء اور تمسخر وہ ہے جو ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ قیامت کے دن ان کے لیے ایک جنت کا دروازہ کھولا جائے گا۔ جب وہ اس دروازے تک پہنچیں گے تو وہ دروازہ فوراً بند کر دیا جائے گا۔ اور ان کو آگ ہی میں دھکیل دیا جائیگا۔ اہل جنت انکی یہ حالت دیکھ کر ہنسیں گے کما قال اللہ تعالٰی۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ	پس آج کے دن اہل ایمان کفار پر ہنسیں گے
يَضْحَكُوْنَ عَلَى الْاَرَآئِكِ	اور تختوں پر بیٹھے ہوئے دیکھیں گے
يَنْظُرُوْنَ۔	(اخرجہ البیہقی فی الاسماء والصفات، درمنثور)

اور ایک استہزاء اور تمسخر قیامت کے دن یہ ہوگا کہ پل صراط پر اہل ایمان کے لیے ایک نور پیدا کیا جائیگا جب منافقین پہنچیں گے تو اہل ایمان اور اہل نفاق کے درمیان ایک دیوار قائم کر دی جائے گی۔

کما قال اللہ تعالٰی فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ۔

يَعْمَهُوْنَ۔ عمہ دل کی بینائی ضائع ہونے کو کہتے ہیں۔ جیسا کہ آنکھ کی بینائی جاتے رہنے کو عمی کہتے ہیں۔ قال تعالٰی فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ در اصل آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔

آئندہ آیت میں ان کے قابل استہزاء ہونے کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کیوں نہ قابل استہزاء ہوں۔ یہ لوگ تو ایسے بیوقوف اور نادان ہیں کہ انہوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۔ یہ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دل اندھے ہو گئے۔ نہایت خوشی اور رغبت سے گمراہی کو ہدایت کے عوض خرید لیا۔ اشتراء کے معنی خوشی اور رضامندی سے خریدنے کے ہیں۔ تجارت اور خرید و فروخت میں طرفین کی رضا شرط ہے۔

کما قال اللہ تعالٰی اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ لہذا اس مقام پر بجائے لفظ استبدال کے لفظ اشتراء لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے گمراہی

کو ہدایت کے عوض میں نہایت خوشی سے قبول کیا ہے۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ - پس نہ سود مند ہوئی ان کی تجارت اور وہ آخرت کی تجارت سے واقف بھی نہیں۔ آخرت کی تجارت یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اور جان و مال سے اس کی راہ میں کوئی دریغ نہ ہو۔

کما قال تعالیٰ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ۔ الا یہ لوگ تجارت میں نفع تو کہاں سے حاصل کرتے انہوں نے تو اصل سرمایہ ہی کو ضائع کر دیا۔ یہاں اصل سرمایہ سے فطرت سلیمہ اور قبول حق کی استعداد مراد ہے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ

ان کی مثال جیسے ایک شخص نے سلگائی آگ پھر جب روشن کیا اس کے

مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَّا

گرد کو لے گیا اللہ ان کی روشنی اور چھوڑا ان کو اندھیروں میں نظر

يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

نہیں آتا بہرے ہیں گونگے اندھے سو وہ نہیں پھریں گے۔

منافقین کی دو مثالیں

قال تعالیٰ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ... الیٰ ..... فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ۔

(ربط) حق جل شانہ جب منافقین کے قبائح بیان کر چکے تو مزید ایضاح کے لیے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تاکہ اچھی طرح ان کی سفاہت اور بے وقوفی واضح ہو جائے۔ جس کا ماقبل میں بیان ہوا۔

حق جل شانہ نے قرآن کریم میں بار بار ایمان اور ہدایت کو نور فرمایا ہے اور مردہ دلوں کے لیے حیات اور زندگی فرمایا ہے اور کفر اور ضلالت کو ظلمت اور تاریکی اور دلوں کی موت اور بہرہ

جاتا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے منافقین کے مناسب جنہوں نے ہدایت کے عوض میں ضلالت اور گمراہی کو اختیار کیا دو مثالیں بیان فرمائیں ایک ناری اور دوسری مائی اس لیے کہ نار وہ نور ہے اور ماء یعنی پانی مادۂ حیات ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ وَ جَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔

مثالِ اوّل منافقین

مثال ان منافقین کی کوتہ نظری اور غلط فہمی اور نور ہدایت کے بدلہ میں ظلمات ضلالت کو خرید کر خسارہ اٹھانے میں اس شخص کی سی ہے جس نے آگ روشن کی پس جب آگ نے اس کے آس پاس کو خوب روشن کر دیا تو نذر کرنے سے ان کی روشنی کو سلب فرمایا اور چھوڑ دیا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق اور باطل اور ہدایت اور ضلالت خوب واضح اور روشن ہو گئے وہ تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی لیکن منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نور فطرت اور نور بصیرت کو سلب فرمالیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو روشن اور منور کر دیا۔ مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آوے گی۔ کاش کہ نرے اندھے ہوتے تب بھی غنیمت تھا کیونکہ اندھا کسی کو پکار کر اس کی بات سن سکتا ہے مگر جب بہرا اور گونگا بھی ہو تو پھر راہ پر آنے کی کوئی امید نہیں۔ نابینا ہونے کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا بہرا ہونے کی وجہ سے کسی کی نصیحت بھی نہیں سن سکتا اور گونگا ہونے کی وجہ سے کسی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا۔ اسی طرح منافقوں کو نہ عقل کی آنکھ ہے کہ جس سے خود سیدھا اور غلط راستہ پہچانیں اور دیکھ سکیں اور نہ مرشد اور کسی اللہ والے کی طرف رجوع ہے کہ وہ ان کی دستگیری کرے اور ان کا راہنما بن جائے۔ اور نہ خود حق کی طرف کان لگاتے ہیں۔ پھر ایسے شخص کی راستہ پر آنے کی کیونکر امید ہو۔ هذا توضیح ما قاله الشاه عبد القادر الدهلوی فی موضح القرآن۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔ مترجم گوید حاصل مثل آنست کہ احوال منافقان بعد چند تردد چنانکہ روشنی آں جماعت دور شد۔ انتہی حاصل مطلب یہ ہے کہ ہدایت کے بعد گمراہی میں چلا جانا ایسا ہے جیسا کہ روشنی کے بعد اندھیرے میں جا پھنسنا۔

عبد اللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس آیت شریفہ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف فرما ہوئے تو کچھ لوگ اسلام میں داخل ہوئے اور بعد چندے منافق بن گئے تو ان کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص ظلمت اور تاریکی

ہی تھا اس نے آگ سلگائی اس کی روشنی سے آس پاس کی تمام چیزیں نظر آنے لگیں اور جو چیزیں بچنے کے قابل تھیں وہ اس کو معلوم ہو گئیں۔ یکایک وہ آگ بجھ گئی اور ان کے سامنے اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے۔ اب وہ حیران اور سرگرداں ہے کہ کس چیز سے بچے اور کس چیز سے نہ بچے۔ اسی طرح یہ منافقین پہلے سے کفر اور شرک کی ظلمتوں اور تاریکیوں میں تھے کہ اسلام لے آئے جس کی وجہ سے حلال و حرام خیر اور شر سب معلوم ہو گیا۔ اور یہ سمجھ گئے کہ کس چیز سے بچیں اور کس چیز سے نہ بچیں۔ اسی حالت میں تھا کہ منافق ہو گیا۔ اور مثل سابق پھر ظلمات کفر میں جا پھنسا اب اس کو حلال اور حرام خیر اور شر کی کوئی تمیز نہیں۔ (ابن کثیر)

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ نہایت صحیح ہے اوّل ایمان لا کر نور حاصل کیا۔ پھر نفاق کر کے اس نور کو ضائع کیا۔ اور ہمیشہ کے لئے حیرت میں پڑ گئے۔ اور دنیا میں جو ظلمت کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوتی ہے اس کو اس پریشانی اور حیرت سے کہ جو ان کو آخرت میں باطنی ظلمات کی وجہ سے پیش آئے۔ وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریا کے ساتھ ہے دنیا کی پریشانی محدود اور فانی ہے اور آخرت کی پریشانی غیر محدود اور غیر فانی ہے۔ امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ یہ لوگ کسی وقت میں بھی ایمان نہیں لائے ابتداء ہی سے منافق تھے کسی وقت بھی دل سے ایمان نہیں لائے یہ لوگ از اوّل تا آخر منافق رہے تو اس صورت میں آیت کا مطلب وہ ہوگا جو حضرت ابن عباسؓ اور ابو العالیہ اور ضحاک اور قتادہ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ منافقین نے محض زبان سے اللہ اور الاخر کا اقرار کیا اور محض ظاہراً اسلام لائے تو اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ اس کلمۂ طیبہ کی روشنی میں دنیا میں خوب امن سے رہے۔ جان و مال محفوظ رہا مسلمانوں کے ساتھ مال غنیمت میں شریک رہے جب تک زندہ رہے کلمۂ شہادت کی روشنی سے یہ دنیوی منافع حاصل کرتے رہے مرتے ہی ان کا یہ نور جاتا رہا اور عذاب سرمدی کے ظلمات میں جا پھنسے (ابن کثیر) کلمۂ توحید اور کلمۂ شہادت اگر اخلاص سے کہا جائے تو سبحان اللہ نورٌ علیٰ نور ہے۔ لیکن یہ کلمہ اگر نفاق سے بھی کہا جائے تب بھی اس میں ایک نور ہے اگرچہ وہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ناتمام اور ناکافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کلمہ سراسر حق ہے اگرچہ منافق اس کو اپنی حماقت سے حق نہ سمجھے۔ اور ہر حق میں نور اور روشنی ہے بہرحال منافق کو اس کلمۂ طیبہ کے اعتراف و اقرار کی وجہ سے ایک درجہ کا نور ضرور حاصل ہو جاتا ہے ظلمت اور تاریکی جو کچھ ہے وہ نفاق کی وجہ سے ہے۔ اور اس کلمۂ حق کی روشنی سے دنیاوی فوائد اور منافع حاصل کیے جس کو حق جل شانہٗ نے آگ کی روشنی سے تعبیر فرمایا ہے ہر منافق اور خود غرض کا طریق یہی ہے کہ ہر وقت اس کی نظر ماحول پر رہتی ہے اسی طرح ان منافقین نے ظاہری ماحول کو دیکھ کر فقط زبانی تو یہ کلمہ پڑھ لیا۔ وہ سمجھ گئے کہ مؤثر حول کو کافی سمجھا اور یہ نہ سوچا کہ ظاہری ماحول کو دیکھنا اَحول (بھینگا) کا کام ہے۔ چونکہ دنیاوی منافع چند روزہ ہوتے ہیں اس لیے اس کو تشبیہ اس جلانے والی آگ سے دی گئی جو تھوڑی دیر میں بجھ

تھی اور اسکا نفع جاتا رہا اور دائمی حیرت و حسرت نے اس کو آ گھیرا۔ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ۔ امام غزالی قدس اللہ سرہٗ مشکوٰۃ الانوار میں فرماتے ہیں کہ نور اس کو کہتے ہیں جو خود ظاہر اور منکشف ہو اور دوسرے کے لئے منکشف ہو۔ علامہ سہیلی روض الانف ص... میں فرماتے ہیں کہ ضیاء اس روشنی کو کہتے ہیں جو نور سے منتشر ہو، نور ضیاء کے لئے اصل مبداء اور سرچشمہ ہے یہی وجہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا۔ میں شمس کو ضیاء اور قمر کو نور فرمایا۔ اس لئے قمر کی روشنی میں وہ انتشار اور پھیلاؤ نہیں جو آفتاب کی روشنی میں ہے اور حدیث میں ہے کہ الصلوٰۃ نور و الصبر ضیاء نماز نور ہے اور صبر ضیاء ہے، نماز چونکہ عمود اسلام ہے اور فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے اس لئے اس کو نور فرمایا کیونکہ نماز اس صبر کی اصل اور جزو ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ضیاء فرمایا ہے۔ لفظ روشنی سے کنایہ ہی صبر کا سرچشمہ ہے صبر کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفس کو خدا کی اطاعت پر روکنا اور اس کی معصیت سے بچانا۔ اس لئے صبر اسلام اور ایمان کے احکام شرعیہ کو حاوی اور شامل ہے لہٰذا صبر میں بہ نسبت نماز کے بہت زیادہ وسعت اور انتشار ہے جو نماز کی محافظت اور پابندی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا اور چونکہ نور اصل اور مبدا ہے اور ضیاء اس کے تابع ہے۔ اس لئے حق جل و علا پر نور کا اطلاق درست ہے کما قال اللہ تعالیٰ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ اور ضیاء کا اطلاق جائز نہیں اس لئے کہ اس کا نور تمام روشنیوں کی اصل ہے اس کا نور کسی کے تابع نہیں۔ اھ کلامہ

حکماء نے نور اور ضیاء میں یہ فرق کیا ہے کہ جس روشنی میں حرارت اور گرمی ہو اس کو ضیاء کہتے ہیں اور جس روشنی میں ٹھنڈک ہو اس کو نور کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات اور شریعت کو نور فرمایا کما قال اللہ تعالیٰ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ۔ بیشک آیا تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک عظیم الشان نور اور ایک روشن کتاب۔ اور شریعت موسویہ کو احکام شاقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ضیاء فرمایا۔ کما قال تعالیٰ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ الْفُرْقَانَ وَضِيَآءً ۔ بیشک دی ہم نے موسیٰ کو حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب اور تیز روشنی اور اسی وجہ سے کہ نماز میں آنکھوں کی ٹھنڈک ہے اور صبر میں حرارت اور گرمی ہے نماز کو نور اور صبر کو ضیاء فرمایا۔

اور اس مقام پر حق تعالیٰ نے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ فرمایا اور ذَهَبَ اللّٰهُ بِضَوْئِهِمْ نہ فرمایا اس لئے کہ مقصود یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا اور روشنی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا، ہر طرف سے ظلمت اور تاریکی نے ان کو آ گھیرا۔ اگر اس مقام پر بجائے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ کے ذَهَبَ اللّٰهُ بِضَوْئِهِمْ کہا جاتا تو یہ معنی ہوتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ضیاء یعنی نور کی حرارت اور اس کے انتشار کو زائل کر دیا اور اصل نور باقی رہ گیا، اور یہ معنی مقصود کے خلاف ہیں۔

اس لیے کہ مقصود تو یہ ہے کہ نور ان سے بالکلیہ زائل ہو گیا، اور یہ مقصد نہیں کہ اصل نور تو باقی رہا فقط اس کی شدت اور اس کی تیزی زائل ہو گئی۔ فافہم ذٰلک فانہ دقیق و لطیف۔

ابتداء آیات میں چونکہ تذکرہ نار کا تھا اس لیے بظاہر اس کا اقتضاء یہ تھا کہ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ میں بجائے نور کے نار کا ذکر کیا جاتا اور اس طرح کہا جاتا ذَهَبَ اللّٰهُ بِنَارِهِمْ اللہ نے ان کی آگ کو بجھا دیا، لیکن بجائے نار کے نور کو اس لیے ذکر کیا گیا کہ نار میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک نور اور ایک حرارت اور احراق (جلانا) لہٰذا اشارہ اس طرف ہے کہ اس نار میں سے نور اور روشنی کو تو سلب کر لیا گیا اور حرارت اور احراق کو باقی چھوڑ دیا گیا۔

وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ۔ اور چھوڑا ان کو ایسی تاریکیوں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے۔ حدیث میں ہے کہ الایمان بضع و سبعون شعبۃ ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ایمان کا ہر شعبہ ایک نور اور مشعل ہے۔ علیٰ ہذا کفر اور نفاق کا ہر شعبہ ظلمت اور تاریکی ہے پس کفر اور نفاق کے شعبوں کے بقدر یہ لوگ ظلمات اور تاریکیوں میں مبتلا ہیں۔ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ۔ وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں پس یہ لوگ اب کسی صورت سے حق کی طرف نہیں لوٹیں گے اس لیے کہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی اور اندھیرے میں چھوڑ دیئے گئے تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس معطل ہو گئے لہٰذا اب نہ حق کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور نہ زبان سے کسی سے پوچھ سکتے ہیں پس ضائع کردہ نور ہدایت کی طرف کیسے لوٹ سکتے ہیں۔

تنبیہ یہ مثال ان منافقین کی ہے جن کے دلوں میں نفاق خوب راسخ ہو چکا ہے اب وہ کسی طرح ہدایت کی طرف رجوع کرنے والے نہیں جیسا کہ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری آنے والی مثال ان منافقین کی ہے جو ابھی متردد اور مذبذب ہیں کبھی اسلام کی طرف مائل ہوتے ہیں اور کبھی کفر کی طرف حیران ہیں کیا کریں۔

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ

یا جیسے مینہ برسے آسمان سے اس میں اندھیرے اور گرج

وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ

اور بجلی ڈالتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں مارے

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝۱۹

کڑک کے ڈر سے موت کے اور اللہ گھیر رہا ہے منکروں کو

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ

قریب ہے کہ بجلی اچک لے ان کی آنکھیں جس بار چمکتی ہے

مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ

ان پر چلتے ہیں اس میں اور جب اندھیرا ہوا کھڑے رہے اور اگر چاہے اللہ

لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ

لے جاوے ان کے کان اور آنکھیں بیشک اللہ ہر چیز

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰

پر قادر ہے

منافقین کی دوسری مثال

قال تعالیٰ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ ۔۔۔ الخ ۔۔۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

یا مثال ان منافقین کی گمراہی کو ہدایت کے بدلے خرید کر خسارہ اٹھانے میں ایسی ہے جیسے آسمان سے زوردار پانی برس رہا ہو۔ من السماء کا لفظ بڑھانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بارش آسمان کے تمام اطراف اور جوانب کو لیے ہے جس طرح پورے آسمان کو سماء کہتے ہیں اسی طرح آسمان کی جانب کو بھی سماء کہتے ہیں۔ نیز من السماء کے لفظ میں ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ اس بارش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کس کی مجال ہے کہ آسمان سے آنے والی چیز کو روک سکے۔ اس میں اندھیرے اور گرج اور

لہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ فرماتے ہیں۔ مترجم گوید حاصل مثل آں ست کہ منافقان در ظلمت فقدان افادہ اندر چوں مردمانیکہ شخصے در لجۂ بحر ایشاں را تفہیم میشود و آں فائدہ نکند مانند مسافران کہ در شب تاریک و ابر و باراں باشند و در برق روشنی قدم بردارند و باز بایستند۔ واللہ اعلم۔

بجلی ہے۔ جو لوگ کہ بارش میں چل رہے ہیں، خوف کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہے کہ انگلیوں کے
پورے سرے نہیں بلکہ پوری انگلیاں اپنے کانوں کے اندر تک سوراخ تک گھسائے دیتے ہیں۔ یہ ہولناک آواز
کی وجہ سے موت کے ڈر سے اور اس خوف کی شدت میں یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اللہ تو کافروں کا احاطہ کرنے
والا ہے کانوں میں انگلیاں دینا اس کے عذاب سے کسی طرح نہیں بچا سکتا۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی
آنکھیں اچک لے جب وہ برق ان کے لئے چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں وہ چلنے لگتے ہیں اور جب ان پر
اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران کھڑے رہ جاتے ہیں یعنی دین اسلام بمنزلہ باران رحمت کے ہے جو مردہ
دلوں کے لئے آب حیات سے کہیں بڑھ کر ہے اور سراسر رحمت ہی رحمت اور نعمت ہی نعمت ہے مگر
ابتداء میں کچھ مشقت اور سختی ہے جیسے بارش رحمت ہی رحمت ہے اور مردہ زمین کی حیات اور زندگی
ہے مگر اول میں کچھ کڑک اور بجلی بھی ہے۔ منافق اول کی سختی سے ڈر گئے اور وہ بڑے تمام مصائب
جو حقیقت میں ان کے تزکیہ نفس کے لئے تھیں ان سے گھبرا گئے اور جس طرح بجلی کی چمک سے روشنی
پیدا ہو کر راستہ نظر آجاتا ہے اور بادل کی کڑک سے دل کانپ جاتا ہے اسی طرح منافق جب دنیوی
منافع جیسے جان و مال کی حفاظت، مال غنیمت میں سے حصہ ملنا، ان منافع پر نظر کرتا ہے تو اسلام
کی طرف جھک جاتا ہے اور مثلاً جب جہاد کی سختی پر نظر کرتا ہے تو پھر اسلام سے بدک جاتا ہے
بہرحال جس طرح بجلی میں کبھی روشنی اور اجالا اور کبھی تاریکی اور اندھیرا۔ اسی طرح منافق کے دل میں کبھی
اقرار ہے اور کبھی انکار۔ کما قال تعالیٰ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ
اَصَابَهٗ خَيْرُ ِۨاطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ِۨانْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ

الحاصل ان آیات شریفہ میں دین اسلام کو باران رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اس
کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی
آیات کو رعد کے ساتھ اور فتوحات اسلام اور غلبہ دین حق کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے جب عذاب
سے ڈرانے والی آیتیں نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سننا نہیں چاہتے کانوں میں انگلیاں دیتے
ہیں اور جب کبھی غلبہ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف چلنے لگتے ہیں اور جب اغراض نفسانی کی
ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم آتا ہے تو پھر اسلام کی طرف چلنے سے رک جاتے ہیں۔ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ
وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اور اگر خدا چاہتا تو بغیر بجلی اور کڑک
ہی کے ان کے کان اور آنکھیں سب ہی لے جاتا۔ بیشک اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے، وہ کسی سبب
کا محتاج نہیں اور نہ اس کے لئے کوئی مانع ہے اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ ابھی اس
فریق کو پہلے فریق کی طرح بالکل اندھا اور بہرا نہیں بنایا اس فریق سے بھی ایمان کی امید بالکل قطع
نہیں ہوئی ہے شاید یہ ایمان لے آئیں بخلاف پہلے فریق کے کہ جن کی مثال مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي
اسْتَوْقَدَ نَارًا میں ذکر کی گئی ان کے ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں اس لئے کہ اللہ نے ان کے

نور کو بالکل سلب فرما لیا کما قال تعالیٰ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ اور وہ بہرے اور گونگے اور اندھے ہیں فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ وہ گمراہی سے ہدایت کی طرف لوٹنے والے نہیں اسی وجہ سے اس فریق کے لیے ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُورِهِمْ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ نے ان کے نور فطرت کو ابھی بالکل زائل نہیں فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ

لوگو بندگی کرو اپنے رب کی جس نے بنایا تم کو

وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۲۱﴾ الَّذِي جَعَلَ

اور تم سے اگلوں کو شاید تم پرہیزگاری پکڑو جس نے بنا دیا

لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ

تم کو زمین بچھونا اور آسمان عمارت اور اتارا

مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا

آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے میوے کھانا

لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۲﴾

تمہارا سو نہ ٹھہراؤ اللہ کے برابر کوئی اور تم جانتے ہو

تعلیم توحید

قال تعالیٰ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي ... الی ... وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(ربط) یہاں تک مومنین اور کافرین اور منافقین کے احوال علیحدہ علیحدہ بیان فرمائے اب اس آیت میں علی العموم سب کو خطاب فرماتے ہیں نیز وہ ہدایت جس کے لیے یہ کتاب نازل کی گئی وہ دو اصولوں پر منحصر ہے ایک توحید اور دوسرے رسالت اس لیے اول توحید اور عبادت کا مضمون ارشاد فرماتے ہیں جو تقویٰ اور پرہیزگاری کی جڑ ہے یعنی یہ کتاب متقین کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہے۔

لیکن تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کرو اسی وجہ
یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ــــ اعْبُدُوْا کے بعد لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ فرمایا۔ خلاصہ یہ کہ شروع سورت میں
اس کتاب کا متقین کے لیے موجب ہدایت ہونا بیان فرمایا تھا اب ان آیات میں تحصیل تقویٰ کا طریقہ بتلاتے
ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اے لوگو اگر واقع میں تم انسان ہو اور اپنی انسانیت کی حفاظت چاہتے ہو تو اپنے
پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا یعنی تم کو اور تمہارے اصول
(آباء و اجداد) کو پردۂ عدم سے نکالا اور وجود کا عجیب و غریب خلعت تم کو پہنایا تاکہ تم اس عظیم
ترین نعمت اور عجیب و غریب رحمت کا شکر کرو اور متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔ متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ
ہر وقت تم اس امر کو پیش نظر رکھو کہ وہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ اور ایک لحظہ کے لیے تم
اس کی تربیت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتے اسی نے تم کو اور تمہارے آباؤ اجداد کو جن سے
تم پیدا ہوئے ہو محض اپنی قدرت سے کتم عدم سے نکال کر وجود کا خلعت پہنایا ہے۔ اپنے امکان
کو سوچو تاکہ اس کا وجوب معلوم ہو۔ اپنی عاجزی اور درماندگی کو سوچو تو اس کا قادر مطلق ہونا معلوم ہو
اپنی ذلت اور خواری کو سوچو تو اس کا عزیز مطلق اور ذوالجلال والاکرام ہونا معلوم ہو۔ اپنے مملوک
ہونے کو دیکھو تاکہ اس کا مالک ہونا سمجھ میں آسکے۔ وعلیٰ ہذا القیاس غایت محبت اور نہایت تعظیم
و اجلال کے ساتھ انتہائی تذلل کا نام عبادت ہے مطلق محبت اور مطلق تعظیم اور مطلق تذلل کا نام
عبادت نہیں اسی وجہ سے اولاد کی محبت اور والدین اور اساتذہ کی تعظیم اور ان کی تواضع عبادت
نہیں کہلائے گی۔ تمام عالم عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا اور سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے
اسی عبادت کی دعوت دی۔ حضرت نوح، ہود، صالح اور شعیب وغیرہم علیہم الصلوٰۃ والسلام نے یہی
فرمایا۔ اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ ایک اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی
معبود نہیں۔ وقال تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ
لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۔ آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہ وحی
بھیجتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔ اس لیے اب آئندہ آیت میں معرفت
معبود کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ معبود وہ ہے جس نے آسمان اور زمین کو بنایا۔ اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ
الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ وہ پاک
ذات کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس
پانی سے تمہارے کھانے کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے نکالے پس خدا کے لیے اس کے مقابل
اور مماثل ہمتا اور شریک نہ بناؤ اور حال یہ کہ تم خوب جانتے ہو کہ تمہارا اور ان سب چیزوں کا پیدا
کرنے والا صرف ایک وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور ان تصرفات اور انتظامات میں کوئی اس کا شریک اور

سمجھو نہیں پس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو اور کسی دوسرے کو شریک نہ کرو یعنی یہ سارا عالم بمنزلہ ایک مکان کے ہے آسمان اس کی چھت ہے اور زمین اس کا فرش ہے اور شمس و قمر اور نجوم و کواکب اس گھر کے قمقمے اور چراغ ہیں۔ قسم قسم کے پھل اور الوان نعمت اس کے دستر خوان پر چنے ہوئے ہیں۔ عالم کے تمام شجر و حجر اور تمام چرند و پرند انسان کی خدمت کے لیے حاضر اور مسخر ہیں اور یہ مکان انسان کے رہنے کے لیے ہے پس جس خدا نے یہ تمام نعمتیں پیدا کیں وہی قابل پرستش ہے جب ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو اس کی عبادت اور بندگی میں دوسروں کو کیوں شریک کرتے ہو۔ ؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرمانبردار شرط انصاف نباشد کہ تو فرمان نبری

خلاصۂ کلام یہ کہ جو باران رحمت آسمان سے برس رہی ہے وہ بندہ کی زندگی اور حیات ہے اور رزق اسکی غذا ہے عاقل اور دانا کا کام یہ ہے کہ باران رحمت کو نعمت عظمیٰ سمجھے نہ یہ کہ اس سے بھاگے۔ اسی طرح اہل ایمان اور اہل اخلاص کو چاہیے کہ ہدایت خداوندی کی جو بارش آسمان سے ہو رہی ہے اس کو اپنی روحانی زندگی کا آب حیات سمجھیں۔ منافقوں کی طرح نہ اس سے بھاگیں اور نہ کانوں میں انگلیاں دیں۔ مسند احمد بن حنبل میں باسناد حسن حارث اشعری سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ جل شانہ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پانچ چیزوں کے متعلق حکم فرمایا کہ ان پر خود بھی عمل کریں اور بنی اسرائیل کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کریں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کو حکم کرنے میں کچھ تاخیر ہوئی تو عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے یحییٰ ان احکام کا یا تو خود آپ بنی اسرائیل کو جلد حکم کریں یا مجھ کو اجازت دیں کہ میں بنی اسرائیل کو ان پر عمل کرنے کا حکم کروں یحییٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپ نے سبقت کی تو مجھ کو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی عذاب نہ آ جائے یحییٰ علیہ السلام نے فوراً بنی اسرائیل کو مسجد اقصیٰ میں جمع فرمایا اور منبر پر تشریف فرما ہوئے اور یہ کہا کہ اللہ نے مجھ کو پانچ چیزوں کا حکم دیا ہے کہ خود بھی ان پر عمل کروں اور تم کو بھی ان پر عمل کرنے کا حکم کروں۔ پہلی بات یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کرو اور اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے اپنے خاص مال سے بغیر کسی کی شرکت کے ایک غلام خریدا وہ غلام دن میں جو کچھ کماتا ہے وہ بجائے آقا کے کسی اور کو دے دیتا ہے کیا کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا غلام ایسا ہو حاشا ہرگز نہیں اسی طرح سمجھو کہ حق تعالیٰ ہی تمہارا خالق اور رازق اور مالک ہے پس اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو (تفسیر حدیث کے لیے تفسیر ابن کثیر کی طرف رجوع کریں)

ف امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت شریفہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگر ہزار ہا طاعت اور عبادت بھی کرے تو وہ بلا بدل ثواب کا مستحق نہیں اس لیے کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے

کہ عبادت اس لیے واجب ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اوّل تو تم کو پیدا کیا اور پھر بے شمار نعمتوں سے سرفراز فرمایا، لہٰذا اس منعمِ حقیقی کا شکر بذریعہ عبادت کے تم پر واجب۔ اور ظاہر ہے بادشاہ کے انعام واکرام کے بعد اگر کوئی بادشاہ کا شکر کرے تو اس شکر کی وجہ سے وہ شخص اپنے کو کسی انعام کا مستحق نہیں سمجھتا بلکہ محض فریضۂ شکر سے عہدہ برآ ہو جانے کو غنیمت سمجھتا ہے اور یہ خوب سمجھتا ہے کہ میرا یہ شکر بادشاہ کے انعام واحسان کے مقابلہ میں ہیچ ہے اسی طرح حق تعالیٰ شانہٗ کے شکر کو سمجھو کہ بندہ کتنی ہی عبادت کرے۔ اسکی ایک نعمت کا بھی شکر نہیں ادا کر سکتا۔ استحقاق تو درکنار مگر اس نے محض اپنی رأفت ورحمت اور اپنے فضل عمیم سے ہماری ناقص عبادتوں پر بھی اجر اور ثواب کا وعدہ فرمایا ہے رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۔ اھ

حق جل شانہٗ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ معبود کی معرفت کے پانچ طریقے بتلائے یا یوں کہو کہ پانچ قسم کے دلائل بیان کیے دو تو نفس کے متعلقات میں سے ہیں اور تین آفاق سے متعلق ہیں اوّل خطاب فرمایا کہ تم اپنے نفسوں میں غور کرو کہ تم کو عدم کے بعد وجود کی نعمت عطاء کی۔ دوم یہ کہ تمہارے آباء واجداد کو وجود عطاء کیا۔ ان دونوں کو بیست کیا جس کو وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ سے ذکر فرمایا۔ سوم یہ کہ زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا چہارم یہ کہ آسمان کو تمہارے لیے چھت بنایا۔ پنجم یہ کہ آسمان اور زمین کی شرکت سے تمہارے رزق کے لیے قسم قسم کے پھل اور میوے پیدا کیے پس جس خداوند ذوالجلال نے یہ عجیب وغریب نعمتیں تم کو عطاء کی ہیں اس سے تم اس کی قدرت وعظمت کا اندازہ لگالو اور پھر تن من سے اس کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ اور کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو کیونکہ عبادت خالص اسی منعم حقیقی کا حق ہے۔

غرض یہ کہ اُعْبُدُوْا اس سورت میں پہلا حکم ہے اور وَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا پہلی نہی ہے اور یہی اسلام کی سب سے پہلی تعلیم ہے کہ صرف خدا کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور کسی کو اس کا شریک اور مثل نہ بناؤ حق تعالیٰ نے اس آیت میں عبادت کا حکم دیا اور ساتھ ہی ساتھ استحقاق عبادت کی وجہ اور دلائل بھی بیان کیے جو سب کے سب فطری اور عقلی ہیں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا

اور اگر ہو تم شک میں اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندے پر

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ

تو لے آؤ ایک سورۃ اس قسم کی اور بلاؤ جن کو حاضر کرتے ہو

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو پھر اگر

لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ

نہ کرو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو بچو اس آگ سے

وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

جس کے ایندھن ہیں آدمی اور پتھر تیار ہے منکروں کے واسطے

اثبات رسالت نبی کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم
بضمن اثبات حقیت قرآن عظیم

قال تعالیٰ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا ... الیٰ ... اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ

(ربط) گزشتہ آیات میں عبادت اور معرفت معبود کے طریقے بتلائے اور مختلف دلائل سے وجود صانع اور اس کی توحید کو ثابت کیا اور شرک کو باطل کیا اب ان آیات میں دلائل نبوت بیان کرتے ہیں جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی معرفت حاصل ہو۔ اور معرفت نبوت کا طریقہ معجزہ ہے اس لیے ان آیات میں نبی اکرم مصطفے صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ثابت کرنے کے لیے آپ کے سب سے اعلیٰ اور افضل معجزہ کو ذکر کرتے ہیں تاکہ آپ کی نبوت و رسالت میں منکرین کو کوئی شبہ باقی نہ رہے۔

ربط دیگر علاوہ ازیں گزشتہ آیات میں عبادت کا حکم فرمایا تھا اور ظاہر ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی عبادت مقبول ہے جو اس کی نازل کی ہوئی کتاب سے معلوم ہو۔ لہٰذا آئندہ آیات میں اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل ذکر فرمائی کہ اگر تم اس کتاب کو کتاب اللہ نہیں سمجھتے بلکہ معاذ اللہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف اور بناوٹی کتاب سمجھتے ہو تو اس کتاب کی ایک سورت جیسی مثل ایک سورۃ بنا کر پیش کرو چنانچہ فرماتے ہیں۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ اور اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں ذرہ برابر کوئی شک و تردد نہیں جیسا کہ ابتداء سورت میں ارشاد ہوا۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ

لَا رَیْبَ فِیْهِ لیکن اگر تم قصور فہم یا عناد کی وجہ سے اس کتاب کے بارہ میں جس کو ہم نے اپنے بندہ پر بتدریج نازل کیا۔ تم کسی شک اور خلجان میں مبتلا ہو گئے ہو تو تم بھی اسی طرح ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت جو فصاحت و بلاغت اور ہدایت و ارشاد اور علوم اور معارف میں اس کتاب کے مماثل اور مشابہ ہو لے آؤ قرآن کریم کا وقتاً فوقتاً ضرورت اور واقعات کے لحاظ سے بتدریج نازل ہونا یہی مخالفین کے شک کا زیادہ سبب تھا کہ اگر یہ کلام الٰہی ہے تو توریت و انجیل کی طرح دفعۃً کیوں نہیں نازل ہو گیا کما قال تعالیٰ وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَیْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً تدریج تو بشر کے کلام میں ہوتی ہے جیسا کہ شعراء اور خطباء وقتاً فوقتاً حسب موقع اور ضرورت اشعار اور خطبات کہتے ہیں تو حق تعالیٰ شانہ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ تم ان کافروں سے یہ کہہ دو کہ اگر تم اپنے زعم ناقص اور خیال باطل کی وجہ سے اس کتاب کے الٰہی ہونے میں متردد ہو تو تم بھی اسی طرح ایک ہی مرتبہ اس جیسی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورت بنا لاؤ۔ جو فصاحت و بلاغت اور حسن معانی اور لطائف اور احکام مسائل و معاد میں قرآن کا نمونہ ہو اور یہ قرآن اگرچہ بتدریج نازل ہوا ہے مگر اول تا آخر مربوط اور مسلسل ہے۔

کلام عرب میں تحقیق اور یقین کے لیے کلمہ اِذَا۔ اور شک اور تردد، ظن اور تخمین کے لیے کلمہ اِنْ مستعمل ہوتا ہے اس مقام پر بجائے وَاِذَا كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ کے وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ میں کلمہ اِنْ استعمال کرنے میں بظاہر اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ابھی اس میں بھی تردد ہے کہ تم کو اس کتاب کے کتاب الٰہی ہونے میں واقعی شک اور تردد ہے۔ یا دل سے تو تم اس کو کتاب الٰہی سمجھتے ہو اور بظاہر محض عناد کی وجہ سے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں شک اور تردد ظاہر کرتے ہو۔ اور ریب کی تنوین تحقیر کے لیے ہے جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کا شبہ کوئی قوی نہیں بلکہ ایک نہایت معمولی اور بے اصل اور حقیر شبہ ہے جو سراسر قصور فہم اور عناد پر مبنی ہے۔ اس عجیب و غریب بے مثل اور بے نظیر کتاب میں بھی اگر تردد اور شک کی گنجائش ہے تو پھر توریت و انجیل کے کتاب الٰہی تسلیم کرنے کا کوئی امکان ہی نظر نہیں آتا۔

جس شپرہ چشم کو عین نصف النہار کے وقت نور آفتاب میں شک اور تردد لاحق ہوتا ہو۔ وہ شب دیجور کی کواکب اور نجوم کا نور کہاں تسلیم کر سکتا ہے۔ رہا وید سو آج تک اس کا بھید کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ اس کی کیا مراد ہے اور اس کے کیا معنی ہیں۔ لہٰذا جس کتاب کا کوئی مفہوم ہی معلوم اور متعین نہ ہوا اس کے بارہ میں شک اور تردد کا سوال ہی عبث ہے عَلٰی عَبْدِنَا اپنے خاص بندہ پر۔ اس سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔ اس اضافت میں (یعنی ہمارے عبد کہنے میں) ایک

لہ اشارۃ الی ان الامر بالاتیان فی قولہ تعالیٰ فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ للتعجیز التکریر ۱۲ منہ

تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم وتکریم کی طرف اشارہ ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

لا تدعنی الا بیا عبدھا ۔۔۔ فانہ اشرف اسمائی

مت پکارا کر مجھ کو مگر اس محبوب کا عبد اور غلام کہہ کر کیونکہ یہ سب ناموں سے افضل نام ہے میرے

اگر یکبار گوید بندۂ من ۔۔۔ از عرش بگذرد خندۂ من

دوسرے اس اضافت میں آپ کے بلند ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی یہ کہ ہمارے نہایت ہی مطیع اور فرمانبردار بندہ ہیں اور علیٰ عبدنا میں کلمہ علیٰ کے لانے میں کہ کلام عرب میں استعلاء وغلبہ اور علو ظاہر کے لیے مستعمل ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ کلام الٰہی کے انوار وبرکات اور وحی ربانی کے تجلیات فوق سے اس خاص بندہ کو ہر طرف اور ہر جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں۔

بِسُوْرَةٍ۔ لفظ سورت قرآن کریم کی ہر سورت کو شامل ہے خواہ وہ طویل ہو یا قصیر جس طرح قرآن کی طویل سورتیں معجز ہیں اسی طرح چھوٹی سورتیں جیسے سورۂ اخلاص اور سورۂ کوثر اور سورۂ عصر بھی معجز ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ لوگ اگر فقط سورۂ والعصر میں تدبر اور تامل کریں تو ان کے لیے کافی اور وافی ہے الخ۔ بلکہ قرآن کا جملہ جملہ معجز ہے۔ تمام عالم کے فصحاء اور بلغاء مل کر بھی اگر چاہیں کہ قرآن کریم جیسا ایک جملہ بنا لائیں تو ناممکن اور محال ہے۔

اول حق تعالیٰ شانہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ تمام جن اور انس مل کر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے جیسا کہ سورۂ اسراء میں ہے۔[۱] اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ تمام قرآن کا مثل اگر نہیں لا سکتے تو دس سورتیں ہی اس جیسی بنا کر پیش کر دو۔ جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے۔[۲] اس کے بعد یہ ارشاد فرمایا کہ ایک چھوٹی سی چھوٹی سورت اس سورت کے مماثل بنا لاؤ۔ جیسا کہ سورہ یونس میں ہے[۳] اور یہ تمام اعلانات مکہ مکرمہ ہی میں کیے گئے اس لیے کہ یہ تمام سورتیں مکی ہیں یعنی سورۂ اسراء جس میں تمام قرآن کے مثل لانے کا ذکر ہے اور سورۂ ہود جس میں دس سورتوں کے لانے کا اور سورۂ یونس جس میں ایک سورت کے لانے کا ارشاد ہے یہ تمام سورتیں مکہ ہی میں نازل ہوئیں۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر پھر ایک سورۃ کے مثل لانے کا اعلان کیا گیا ہے جیسا کہ اس آیت یعنی وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ میں مذکور ہے اس لیے کہ یہ سورت یعنی بقرہ مدنی ہے

۱؎ کما قال تعالیٰ قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۔ ۱۲ ۔ ۲؎ کما قال تعالیٰ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ ۱۲

۳؎ کما قال تعالیٰ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ

اور ہجرت کے بعد سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی۔ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ۔ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَن تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ۔ اور اگر تم تنہا اس کے مثل سورت بنانے پر قادر نہیں تو اس کا علاج یہ ہے کہ تم سوائے خدا تعالیٰ کے اپنے تمام اعوان و انصار کو بلا لو اگر تم اپنے اس اعتقاد میں سچے ہو کہ یہ اللہ کا کلام نہیں تا کہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کر سکیں اور اس مشکل کو حل کر سکیں اور سب مل کر قرآن کے مثل کوئی کلام بنا سکیں۔ پس اگر تم سب مل کر بھی ایسا نہ کر سکو۔ یعنی اس کے مثل کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی نہ لا سکو اور ہم پیشینگوئی کیے دیتے ہیں کہ تم ہرگز نہ لا سکو گے۔ قرآن کا ایک اعجاز تو یہ تھا کہ کوئی اس کے مثل نہیں لا سکتا۔ دوسرا اعجاز یہ ہے کہ پہلے ہی پیشینگوئی کر دی گئی اور غیب کی خبر دے دی گئی کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکے گا۔ چنانچہ اس وقت سے تیرہ سو برس گزر گئے اور کوئی شخص اس کے مثل نہ لا سکا۔ بالفرض اگر کوئی شخص قرآن کا معارضہ کرتا تو ضرور منقول ہوتا اس لیے کہ ہر زمانہ میں قرآن کے مخالفوں کا عدد ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ اگر کسی نے قرآن کریم کا معارضہ کیا ہوتا تو اس کا مخفی رہنا ناممکن تھا۔

خلاصہ یہ کہ اگر تم اس کا مثل نہ لا سکو اور ہرگز نہ لا سکو گے تو پھر میری نبوت کی تصدیق کرو۔ اور اس کو کلام ربانی اور وحی رحمانی سمجھو۔ تم ذرا تو غور کرو کہ ایک یتیم بےکس اور امی جس کا سارا عرب مخالف اور دشمن ہو وہ ایسا عظیم الشان دعویٰ بغیر تائید الٰہی کیسے کر سکتا ہے کہ تمام جن اور انس اس کا مثل نہیں لا سکتے اور اگر تم اس کی تصدیق نہیں کرتے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ اس جگہ پتھر سے یا تو عام پتھر مراد ہیں یا گندھک کے پتھر مراد ہیں یا وہ بت مراد ہیں جن کو کافر پوجتے تھے۔ کما قال تعالیٰ۔ إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ یعنی تم اور وہ بت جن کو تم خدا کے سوا پرستش کرتے ہو سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ یہ جہنم اصل میں کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ البتہ گناہوں کا میل کچیل صاف کرنے کے لیے گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لیے جہنم میں رکھا جائے گا۔ پھر جو اصل ذات ہی سے نجاست آلودگی ہیں وہ تو دوزخ میں رہ جائیں گے اور جو اصل سے پاک ہیں یعنی مومن ہیں اور گناہوں کی عارضی نجاست ان پر لگ گئی (کما فی حدیث البخاری ان المؤمن لا ینجس) وہ پاک صاف ہونے کے بعد نکال لیے جائیں گے

ف اس آیت سے اور آئندہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے صاف ظاہر ہے کہ دوزخ ابھی موجود ہے جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ جنت اور جہنم ابھی موجود نہیں بلکہ قیامت کے دن موجود ہوں گی صریح غلطی پر ہیں اور یہ قول سراسر آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ اور اجماع امت کے خلاف ہے۔ علامہ زبیدی اتحاف شرح احیاء ص ۲۳ میں فرماتے ہیں کہ اسی پر تمام صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ حادی الارواح الی بلاد الافراح میں فرماتے ہیں۔

جنت تیار کی جا چکی ہے مگر اس میں کچھ خالی میدان ہیں جن میں بندوں کے اعمال صالحہ سے باغات اور محل تیار ہوتے ہیں مثلاً حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے مسجد بنا کرے اس کے لیے جنت میں ایک محل تیار ہو جاتا ہے یا جو شخص ایک مرتبہ سبحان اللہ ایک مرتبہ الحمد للہ ایک مرتبہ اللہ اکبر یا ایک مرتبہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہے اس کے لیے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے تفصیل کسی اور موقع پر کریں گے مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو رسول اللہ کی رسالت میں شک ہے اور ہماری وحی کو انسانی کلام جانتے ہو تو اٹھو اور معینوں سمیت مقابلہ میں آجاؤ مگر ہم پہلے ہی پیشگوئی کیے دیتے ہیں کہ تم سب مل کر بھی اس کا معارضہ نہیں کر سکتے پس اگر تم معارضہ نہ کر سکو اور تم پر اپنا عجز اور قصور واضح ہو جائے تو بہتری ہے کہ ایمان لے آؤ ورنہ سخت عذاب میں گرفتار ہو گے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ

اور خوشی سنا ان کو جو یقین لائے اور کام نیک کیے کہ ان

لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا

کو ہیں باغ بہتی نیچے ان کے نہریاں جس بار

رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ

ملے ان کو وہاں کوئی میوہ کھانے کو کہیں یہ وہی ہے جو

رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ

ملا تھا ہم کو آگے اور ان پاس وہ آویگا ایک طرح کا اور انکو ہیں

فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

وہاں عورتیں ستھری اور ان کو وہاں ہمیشہ رہنا

ذکر معاد یعنی قیامت کا بیان

بشارت مومنین صالحین

قال اللہ تعالیٰ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا .... الیٰ .... وَّھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

ربط

حق تعالیٰ شانہٗ کی یہ سنت ہے کہ جب کبھی ترغیب اور وعدہ اور بشارت کا ذکر فرماتے ہیں تو اس کے ساتھ ترہیب اور وعید اور انذار کو بھی ذکر فرماتے ہیں تاکہ خوف اور رجا سے مل کر ایمان میں ایک اعتدال کیفیت پیدا ہو جائے اسی سنت کے مطابق حق تعالیٰ نے ان آیات میں جب انذار اور کفار کی وعید کو ذکر فرمایا تو آئندہ آیات یعنی وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیۃ میں مومنین صالحین کے لئے بشارت کا ذکر فرمایا نیز وہ انذار اور تہدید اگرچہ دشمنوں کو تھی مگر عاشقان جاں نثار ہیں تو اس کے سننے کی بھی سہار نہیں وہ تو سن کر گھبرا جاتے ہیں، اس لئے ان کی تسلی اور دل تھامنے کے لئے بشارت ذکر فرمائی۔ تاکہ بشارت کی مسرت اور مخاطبت کی لذت سے وہ پریشانی بسہولت بہ شادمانی ہو جائے چنانچہ فرماتے ہیں اور خوشخبری دیجئے آپ ان لوگوں کو جو اس کتاب پر ایمان لائے اور اس کتاب کے منزل من اللہ ہونے کی تصدیق کی اور اس کتاب کی ہدایت کے مطابق نیک عمل کیے کہ ان کے لئے عجیب قسم کے باغات ہیں ہر ایک کا باغ ایسے ایمان اور عمل صالح کے مطابق ہوگا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی عثمان غنیؓ فرماتے ہیں کہ عمل صالح اس عمل کو کہتے ہیں جو خالص اللہ کے لئے ہو اور ریاء سے بالکلیہ پاک ہو کما قال تعالیٰ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ عمل صالح وہ عمل ہے جس میں چار چیزیں جمع ہوں۔

(۱) علم (۲) نیت (۳) صبر (۴) اخلاص (معالم التنزیل) ایمان کے بعد عمل صالح کا ذکر اس لئے فرمایا کہ بشارت کا پورا استحقاق جب ہے کہ جب ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ بھی ہوں۔ اس آیت میں متعلقات ایمان اور اعمال صالحہ کی تفصیل نہیں فرمائی صرف اجمال اتنا کہہ دیا کہ جو لوگ ایمان دار اور نیک کردار رہوں گے ہم انہیں ان کے وہم و خیال سے بڑھ کر انعام دیں گے۔

جنت لغۃً میں باغ کو کہتے ہیں لیکن اصطلاح شریعت میں ایک خاص مکان کا نام ہے جو نشأۃ آخرت میں ہمیشہ کے لئے ابرار و متقین کو عنایت ہوگا جیسا کہ جہنم اس مخصوص مکان کا نام ہے جس میں کفار کو ہمیشہ کے لئے اور گنہگار مسلمانوں کو چند روز کے لئے رکھا جائیگا۔ جنت اور جہنم پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں اور اس کی حقیقت کی تحقیق کے در پے نہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ نے جس قدر جنت اور جہنم کے احوال و اوصاف بیان کیے ہیں ان پر ان سے ایک حرف بھی زیادہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ عالم غیب میں قیاس نہیں چلتا۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ — جن کے نیچے سے نہریں نہایت تیزی سے بہتی ہیں۔

كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ جب کبھی دیئے جائیں گے ان باغوں میں سے کوئی پھل کھانے کے لئے تو یہ

کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو ہم کو پہلے دیئے گئے اور دیئے جائیں گے وہ ایسا پھل کہ جو شکل دیکھنے میں ایک دوسرے کے مشابہ اور ہم رنگ ہوگا۔ مگر ذائقہ میں مختلف ہوگا۔ عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر حضرات صحابہ سے منقول ہے کہ یہ تشابہ اور تماثل محض لون اور صورت کے اعتبار سے ہوگا۔ مزہ اور لذت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوگا۔ یہ اس لیے ہوگا کہ ہر لقمہ جدید مسرت اور نئی خوشی حاصل ہو۔ خلاصہ یہ کہ جنت کے میوے شکل اور صورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہوں گے مگر مزے میں جدا اور مختلف ہوں گے۔ اہل جنت جب کسی پھل کو دیکھیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ وہی پہلا پھل ہے مگر جب چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ اور ان کے لیے وہاں ایسی عورتیں ہوں گی جو ہر قسم کی ظاہری اور باطنی گندگی سے پاک ہوں گی۔

وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ۔ اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے یعنی یہ نعمتیں ہمیشہ رہیں گی۔ دنیا کی نعمتوں کی طرح ان کو زوال اور فنا نہیں۔ نعمت کتنی ہی عظیم الشان کیوں نہ ہو مگر زوال اور فنا کا اندیشہ اس کو مکدر کر دیتا ہے۔ جیسے کسی نے کہا ہے۔ ؎

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم جرس فریاد می دارد کہ بربندید محملہا

اس لیے ارشاد ہوا کہ تم مطمئن رہو۔ ہمیشہ تم انہیں نعمتوں میں رہو گے تنعم اور تلذذ کا مدار تین چیزوں پر ہے (۱) عمدہ مکان (۲) لذیذ کھانے (۳) حسین و جمیل عورتیں اس لیے حق تعالیٰ شانہ نے جَنّٰتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ میں عمدہ مکان کا اور كُلَّمَا رُزِقُوا الخ میں لذیذ کھانوں کا اور وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ میں حسین و جمیل ازواج کا ذکر فرمایا۔

ف انسان کے لیے تین چیزوں کا جاننا ضروری ہے (۱) کہاں سے آیا ہے (۲) اور کہاں رہتا ہے (۳) اور کہاں جاتا ہے۔ الَّذِي خَلَقَكُمْ میں اس طرف اشارہ ہے کہ تم عدم سے آئے ہو اور الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا الخ سے اس طرف اشارہ ہے کہ چند روز زمین میں قیام ہے اور فَاتَّقُوا النَّارَ سے اس طرف اشارہ ہے کہ عالم آخرت کو جانا ہے عذاب الٰہی سے بچنے کی کوشش کرو۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا

اللہ تو شرماتا نہیں کہ بیان کرے کوئی مثال ایک مچھر یا اس سے

فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ

اوپر پھر جو یقین رکھتے ہیں سو جانتے ہیں کہ وہ ٹھیک ہے

[illegible]

پ

مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ

ان کے رب کا کہا اور جو منکر ہیں سو کہتے ہیں کیا غرض

اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ

تھی اللہ کو اس مثال سے گمراہ کرتا ہے بہتیرے اور راہ پر

بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۟ۙ الَّذِیْنَ

لاتا ہے اس سے بہتیرے اور گمراہ کرتا ہے انہیں کو جو بے حکم ہیں جو

یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ ۪ وَ یَقْطَعُوْنَ

توڑتے ہیں عہد اقرار اللہ کا مضبوط کئے پیچھے اور توڑتے ہیں

مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ

جو چیز اللہ نے فرمائی جوڑنی اور فساد کرتے ملک میں

اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۟

انہیں کو آیا نقصان

قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے پر کافروں کا ایک شبہ اور اُسکا جواب

قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا ...... الیٰ ...... اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔

گزشتہ آیات میں اعجاز قرآن کی دلیل مذکور تھی یہاں منکرین کے ایک شبہ کا جواب مذکور ہے۔ شبہ کی تقریر یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں کہیں مکھی اور کہیں مکڑی کی مثال دی ہے اس پر کافروں نے یہ اعتراض کیا کہ یہ قرآن اگر اللہ کا کلام ہے تو اس میں ایسی حقیر اور خسیس چیزوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ ایسی خسیس اور حقیر چیزوں کا ذکر کلام الٰہی کی عظمت کے لائق نہیں یعنی اگرچہ ہم قرآن کا مقابلہ نہ کر سکیں لیکن اس کتاب میں ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا

مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ بیشک اللہ نہیں شرماتا اس بات سے کہ کوئی مثال بیان کرے کسی مچھر کی یا اس چیز کی جو حقارت میں مچھر سے بھی بڑھ کر ہو پس اہل ایمان خوب جانتے ہیں کہ یہ تمثیل بالکل حق ہے اور درست ہے ان کے رب کی طرف سے اس لیے کہ تمثیل سے ممثل لہ (جس کی مثال دی گئی ہے) کی توضیح اور تفصیل مقصود ہوتی ہے لہٰذا حقیر اور ذلیل چیزوں کی حقارت اور ذلت کی توضیح اور تشریح کے لیے اسکے مناسب مچھر، مکھی اور مکڑی اسی قسم کی حقیر و ذلیل چیزوں کی مثال ذکر کی جائے گی۔ تاکہ اس شئی کی حقارت اور ذلت واضح ہو جائے عزیز اور عظیم چیزوں کی مثال سے حقیر اور خسیس چیزوں کی حقارت اور ذلت کو کس طرح سمجھایا جا سکتا ہے مثال کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ مثال دینے والے کے مطابق ہو۔ بلکہ ممثل لہ کے مطابق ہونی چاہیئے حقیر کی مثال حقیر سے اور عزیز کی مثال عزیز سے دینی چاہیئے ورنہ ہر عاقل جانتا ہے کہ حقیر کو عزیز سے مثال دینا احمقوں کا کام ہے۔ توریت اور انجیل اور کلام حکماء میں اس قسم کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

قال اللہ تعالیٰ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔

اور البتہ تحقیق ہم نے بیان کی ہے لوگوں کے لیے اس قرآن میں ہر مثال تاکہ نصیحت پکڑیں۔

وقال تعالیٰ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ۔

یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ تفکر اور تامل کریں۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ جب میں قرآن کی کسی مثل کو سنتا ہوں اور اس کو نہیں سمجھتا تو میں اپنے اوپر روتا ہوں اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۖ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔

یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور نہیں سمجھتے ان کو مگر اہل علم۔

ربیع بن انس فرماتے ہیں کہ مچھر کی مثال اللہ نے دنیا کے لیے بیان فرمائی ہے مچھر جب تک بھوکا رہتا ہے زندہ رہتا ہے اور جب کھا کر موٹا ہو جاتا ہے تو مر جاتا ہے اسی طرح اہل دنیا جب دنیا سے خوب سیر اور سیراب ہو جاتے ہیں تو اللہ ان کو پکڑتا ہے پس وہ ہلاک ہوتے ہیں کما قال تعالیٰ۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً فَإِذَا هُم مُّبْلِسُونَ۔

پس جب بھول گئے وہ اس نصیحت کو جو ان کو کی گئی تھی تو کھول دیئے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے یہاں تک کہ جب وہ خوش ہو گئے اس سے جو ان کو دیا گیا

بس بڑھا یا اسکو بتنا ہاں میں وہ نا سمجھ کر
رہ گئے (تفسیر ابن کثیر)

خلاصہ یہ کہ اہل ایمان مثالوں کو حق سمجھتے ہیں کہ اشیاء کی خست اور حقارت بیان کرنے کے لیے یہ مثالیں لائی گئی ہیں۔ اور کافر اپنی حماقت سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی ان حقیر مثالوں سے کیا غرض ہے۔ اور کیا اس ذات والا صفات کی ایسی حقیر چیزوں کے متعلق بھی ہو سکتی ہے۔ اس آیت میں اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا، گمراہ کرتا ہے اس مثال سے بہتوں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتوں کو یعنی مقصود یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل، اہل ہدایت اور اہل ضلالت میں فرق ہو جائے۔ قرآن اور اس کی تمثیلات سبب حق اور ہدایت ہیں صحیح المزاج اور سلیم الطبع حضرات میں یعنی اہل ایمان جب ان تمثیلات کو سنتے ہیں اور ان میں تفکر اور تامل کرتے ہیں تو ان کی ہدایت میں اور اضافہ ہوتا ہے اور ان تمثیلات سے انکو صراط مستقیم اور حق کا راستہ خوب واضح ہو جاتا ہے اور جن کی روح کا مزاج بالکل فاسد اور خراب ہو چکا ہے ان کو ان تمثیلات سے کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کی گمراہی میں اور زیادتی ہو جاتی ہے۔ فاسد المزاج کو جس قدر بہتر غذا دی جائے گی اسی قدر اسکے فساد اور مرض میں اضافہ ہوگا۔

قرآن عزیز میں جس طرح ہدایت اور اضلال کو حق جل شانہ کی طرف منسوب کیا ہے اسی طرح ہدایت کو انبیاء و مرسلین اور علماء ربانیین اور ائمہ مجتہدین کی جانب اور اضلال کو شیاطین اور اعوان شیاطین کی جانب بھی منسوب کیا گیا ہے اس لیے ضروری ہوا کہ ہدایت اور اضلال کے معانی اور مراتب کو بیان کیا جائے تاکہ خدا کی ہدایت اور انبیاء و مرسلین کی ہدایت میں فرق معلوم ہو اور جو اضلال حق تعالیٰ جل شانہ کی جانب منسوب ہے اس کی کیا حقیقت ہے اور جو اضلال شیاطین اور اعوان شیاطین کی جانب منسوب ہے اسکی کیا ماہیت ہے۔

مراتب ہدایت

مرتبۂ اولیٰ ہدایت بیان۔ یعنی حق کو بیان کرنا اور واضح کرنا۔ اور لوگوں کو حق کی تعلیم اور دعوت دینا۔ اس معنی سے ہدایت اللہ کی طرف اور اس کے انبیاء و مرسلین اور ائمہ مجتہدین کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔

اللہ نے بھی حق کو بیان کیا اور اس کی طرف اپنے بندوں کو دعوت دی اور اس کے حکم سے انبیاء و مرسلین اور علماء نے بھی حق کو بیان کیا اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی اور اس کی طرف بلایا۔

قال تعالیٰ۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا۔ — تحقیق ہم نے انسان کو راستہ بتایا اگر شکر کرے یا ناشکری کرے۔

وقال تعالیٰ وَأَمَّا ثَمُودُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمَىٰ عَلَى الْهُدَىٰ۔ — اور ثمود کو ہم نے سیدھا راستہ بتایا لیکن انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی۔

اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو خطاب فرماتے ہیں

وقال تعالیٰ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا۔ — ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

ان تمام آیتوں میں ہدایت بمعنی بیان مراد ہے اور یہ ہدایت اللہ رب العزت کے ساتھ مخصوص نہیں، انبیاء اور علماء کی طرف بھی اس کی اسناد ہو سکتی ہے نیز یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مومن و کافر سب کے لیے ہے۔

مرتبۂ ثالثہ ہدایت توفیق۔ یعنی خدا کا اپنے فضل و کرم سے بندہ کے لیے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کو اس کی خواہش اور طبعی میلان کے ایسا موافق بنا دینا کہ اس کی اطاعت لذیذ اور شیریں معلوم ہو اور اس کی معصیت حنظل سے بھی زیادہ تلخ معلوم ہو نیز خیر کے اسباب اور دواعی کو اس کے لیے جمع کر دینا اور اس کے تمام موانع اور عوارض کو یک لخت ختم کر دینا، یہ ہدایت اللہ جل جلالہ کے ساتھ مخصوص ہے اس ہدایت پر نہ کوئی ملک مقرب قادر ہے نہ کوئی نبی مرسل کما قال تعالیٰ۔

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ — تحقیق آپ جس کو چاہیں راہ پر نہیں چلا سکتے۔ لیکن اللہ جس کو چاہے راہ پر لائے۔

اس آیت میں اللہ کے لیے جس ہدایت کو ثابت کیا گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس ہدایت کی نفی کی گئی وہ یہی ہدایت بمعنی التوفیق ہے اور وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ میں جس ہدایت کو نبی کریم کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ ہدایت بمعنی ابانت و ارائۃ الطریق ہے نبی کا کام یہی ہے کہ حق کو بیان کرے اور لوگوں کو حق کی تعلیم دے اور اس کی طرف بلائے مگر خدا تعالیٰ کی اطاعت کو ہوائے نفسانی کے مطابق بنا دینا۔ اور خدا کی محبوبیت اور بندگی کی حلاوت اور شیرینی کسی کے دل میں اتار دینا یہ سوائے اس علیم مقتدر کے کسی کے قبضہ میں نہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے لا یوفق عبد حتی یوفقہ اللہ۔ بندہ خود بخود توفیق نہیں پاتا یہاں تک کہ خدا اس کو توفیق دے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے کے وقت یہ پڑھتے تھے۔ اللّٰھم لولا انت ما اھتدینا ولا تصدقنا ولا صلینا فانزلن سکینۃ علینا۔ اے اللہ اگر تیری توفیق نہ ہوتی تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ اور نہ صدقہ کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔ پس تو ہم پر سکینت اور طمانیت

توفیق الٰہی اور یہ ہدایت اہل ایمان کے ساتھ مخصوص ہے، حق تعالیٰ اس نعمت کبریٰ اور دولت عظمیٰ سے اپنے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی رضا اور خوشنودی کے متلاشی ہیں، نعمت الٰہیہ کی معرفت کی جانب گامزن رہتے ہیں ایسے اہل التفات کو یہی دولت بخشتے ہیں، کما قال تعالیٰ

يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ.	جو اللہ کی رضا مندی کا تابع ہو اس کو اللہ تعالیٰ سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لاتے ہیں اور سیدھے راستہ پر اس کو چلاتے ہیں۔

مراتب اضلال

اضلال ہدایت کا مقابل ہے جس طرح ہدایت کے دو معنی ہیں اسی طرح اضلال کے بھی دو معنی ہیں۔

معنی اوّل اضلال کے ایک معنی یہ ہیں کہ خدائے عزوجل کی معصیت کی دعوت دینا اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کو قبیح کرکے بتلانا اور اس کی نافرمانی کو مزین اور مستحسن کرکے ظاہر کرنا اور حق کو باطل کے ساتھ ملتبس کرنا۔ حق تعالیٰ نے اسی اضلال کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا ہے۔ انہ عدو مضل مبین۔ وقال تعالیٰ

وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ	اور شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے خوبصورت بنا کر دکھایا ہے اس طرح سے ان کو سیدھے راستے سے روکا۔

اور ایک مقام پر اسی اضلال کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے۔

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ	اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور ان کو سیدھا راستہ نہ بتایا۔

اور ایک جگہ سامری کی طرف منسوب کیا۔

وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ	سامری نے انکو گمراہ کیا۔

اسی معنی کر اضلال ہمیشہ شیاطین اور اعوان شیاطین اور ائمۃ الکفر کی طرف منسوب ہوتا ہے، حق سبحانہ وتعالیٰ کی جانب کبھی اس اضلال کی اسناد نہیں کی جاسکتی۔ وہ قدوس حکیم اس سے پاک اور منزہ ہے کہ وہ معاذ اللہ اپنے بندوں کو خیر سے ہٹا کر شر کی طرف بلائے۔

نیز

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ

تحقیق اللہ تعالیٰ تو حکم کرتا ہے انصاف کا اور بھلائی کا اور صلہ رحمی کا اور منع کرتا ہے تم کو بے حیائی اور نامعقول بات اور سرکشی سے اللہ تعالیٰ تم کو سمجھاتے ہیں شاید تم یاد رکھو۔

معنی ثانی اضلال کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ اپنی توفیق اور لطف و رحمت سے کسی کو محروم فرما دیں۔ توفیق اور لطف سے اس شخص کو محروم فرماتے ہیں جو اللہ کی آیتوں کی تکذیب اور انبیاء و مرسلین کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کرے یا قتل کرے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ

اللہ نہیں ہدایت کرتا اس شخص کو جو حد سے تجاوز کرنے والا اور جھوٹا ہو۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔

اللہ نہیں ہدایت کرتا حد سے گذرنے والوں کو۔

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظَّالِمِينَ۔

اور گمراہ کرتا ہے اللہ ظالموں کو۔

یہ اضلال حقیقت میں ان کے اسراف، تکذیب، ظلم اور تعدی کی سزا ہے حق تعالیٰ شانہ کی طرف یہی اضلال منسوب ہوتا ہے اور یہ آیت یعنی يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا جس کی اس وقت تفسیر کی جارہی ہے۔ اس میں ہدایت اور اضلال کے دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی خدا اپنی خاص ہدایت اور توفیق اور لطف و رحمت سے بہت سے بندوں کو سرفراز فرماتا ہے جو اس حق جل و علا کے کلام کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کی تمثیل کو حق اور عین ہدایت جانتے ہیں۔ اور اس کے کلام اور تمثیل کا استہزاء اور تمسخر نہیں کرتے۔ اور بہتوں کو ان تمثیلات سے گمراہ کرتا ہے یعنی اپنے توفیق اور لطف و رحمت سے محروم کرتا ہے مگر محروم ان لوگوں کو کرتا ہے جو اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حدود سے نکل جاتے ہیں اور خدا سے پختہ عہد کرکے توڑ ڈالتے ہیں جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ: الخ

اور نہیں گمراہ کرتا اللہ تعالیٰ ان تمثیلات سے مگر نافرمانوں کو نافرمانی اور سرکشی کی نحوست سے عقل ماری جاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق کو باطل سمجھنے لگتا ہے اور گمراہ ہوتا ہے۔ اطاعت سے خارج ہونے والوں کو فاسق کہتے ہیں۔ فاسق کا لفظ کافر اور مؤمن عاصی دونوں کو شامل ہے لیکن کافر کا فسق مؤمن عاصی کے فسق سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ مگر اس آیت میں فاسق سے کافر ہی مراد ہے۔ قرآن کریم میں فاسق کا لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ۔ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ هُمُ

---

(۱) اگر ہدایت و ضلال کی اور زیادہ تفصیل درکار ہو تو امام رازی قدس اللہ سرہ کی تفسیر کبیر کی طرف مراجعت کریں۔

الفٰسقون - اس آیت میں منافقین کو فاسقین کہا گیا ہے اور بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ - اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا ۔ ان دونوں آیتوں میں فاسق سے مومن عاصی مراد ہے کافر فاسق تو حدود ایمان سے ہی خارج ہوتا ہے - اور مومن عاصی حدود ایمان سے خارج نہیں ہوتا مگر حدود طاعت سے خارج ہو جاتا ہے اسی لئے حق تعالیٰ شانہ' ان اشیاء حقیرہ کی تمثیل سے صرف انہی لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں جو بدکار اور نافرمان ہیں - اور ان لوگوں کو جو خدا کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑتے ہیں عہد سے اس جگہ وہ عہد مراد ہے جس کی حق تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کی زبانی تاکید کی کہ خدا کو ایک جانو اور ایک مانو اور اسکے پیغمبروں کی تصدیق کرو اور بعض کا قول یہ ہے کہ عہد سے وہ عہد مراد ہے جو حق تعالیٰ نے توریت میں یہودیوں سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا - اور بعض کا قول ہے کہ عہد سے عہد الست مراد ہے یا یوں کہو کہ عہد سے عام مراد ہے خواہ وہ عہد الست ہو یا توریت و انجیل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد ہو - اور توڑتے ہیں اس چیز کو جسکا اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس آیت کے عموم میں ان تمام حقوق کا قطع داخل ہے جنکے وصل کا خدا نے حکم دیا ہے - قطع رحمی اور خدا اور اس کے پیغمبروں سے قطع تعلق کرنا یہ بھی اس میں شامل ہے اور فساد کرتے ہیں زمین میں جو قول اور عمل اور جو حرکت اور سکون خدا کی رضامندی کے خلاف ہو وہ سبب فساد اور فتنہ ہے - یہ لوگ وہی ہیں جو خسارہ اور نقصان اٹھانے والے ہیں - دنیا میں آخرت کی تجارت کے لیے آئے تھے نفع تو کیا حاصل کرتے اصل راس المال یعنی عقل اور فطرت سلیمہ کا جو سرمایہ ان کے پاس تھا اسکو بھی ضائع اور برباد کر دیا - اور صلاح اور رشد اور ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا اور منعم حقیقی کو چھوڑ بیٹھے اور دین سے اپنا تعلق قطع کر لیا - اس سے بڑھ کر اور کیا خسارہ اور نقصان ہوگا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ

تم کس طرح منکر ہو اللہ سے اور تھے تم مردے پھر اس نے تم کو جلایا

ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

پھر تم کو مارتا ہے پھر جلاوے گا پھر اسی پاس لوٹ کر جاؤ گے۔

استعجاب بر کفر و نافرمانی و تذکیر انعامات ربانی اور مبدأ و معاد کی یاد دہانی

قال تعالیٰ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ ...... الی ...... ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

حق جل شانہ جب دلائل توحید ورسالت ومعاد بیان کر چکے اور عبادت کا حکم دے چکے تو اب
آئندہ آیات میں اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ ایسے قدیر وعظیم اور رحیم وکریم پروردگار سے سرکشی سراسر
تعجب خیز ہے ان انعامات واحسانات کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ تم شکر کرتے نہ کہ کفر، حیرت ہے کہ ان
انعامات اور احسانات کے بعد تم کو کفر پر جرأت کیسے ہوئی اور اس توبیخ اور عتاب میں دوسرے
عنوان اور دوسرے رنگ میں اسی دلیل سابق کا اعادہ فرمایا پھر اسی سلسلۂ تذکیر میں اولاً نعم عامہ کو بیان
فرمایا یعنی ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا تعلق عام بنی آدم سے ہے۔ اور ثانیاً نعم خاصہ کو بیان فرمایا یعنی
ان نعمتوں کا ذکر کیا جن کا خاص بنی اسرائیل سے تعلق ہے اور دور تک سلسلۂ کلام چلا گیا چنانچہ ارشاد
فرماتے ہیں۔ کس طرح اور کیسے تم اللہ جل شانہ کے ساتھ کفر کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے۔ پس اس
نے تم کو حیات اور زندگی عطا کی اور پھر تم کو موت دے گا اور پھر قیامت کے وقت تم کو دوبارہ زندہ
کرے گا پھر تم سب حساب وکتاب کے لیے اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے تاکہ دنیاوی زندگی میں تم
نے جو کچھ کیا ہے تم کو اس کی جزا اور سزا ملے۔ پہلی آیت (وکنتم امواتا فاحیاکم) میں وجود
صانع کو ثابت کیا کہ خدا وہ ہے جس نے تم کو عدم سے نکال کر وجود عطا کیا اور نیست سے ہست
کیا اور دوسری آیت (ثم یحییکم) میں حشر ونشر کو ثابت کیا اور ساتھ ساتھ دلیل عقلی بھی بیان
[illegible]
[illegible]

اور اصل۔ کنتم امواتا فاحیاکم۔ میں وجود صانع کی دلیل بیان فرمائی کہ تم کو خدا کا
انکار نہ کرنا چاہیے کیونکہ تم پہلے مردہ اور معدوم تھے اللہ تعالیٰ نے تم کو وجود عطا کیا اور جو خود
بخود موجود ہو اور دوسروں کو وجود عطا کرے وہی خدا ہے اور ثم یحییکم سے حیات
ثانیہ کی بحث اور دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس قادر مطلق نے پہلی مرتبہ تم کو چھوٹے چھوٹے ذروں
اور حقیر وذلیل نطفوں اور خونوں کے لوتھڑوں اور مٹی کے ٹکڑوں سے پیدا کیا اور احسن تقویم کا خلعت
تم کو پہنایا کیا اس کی نسبت تمہارا یہ گمان باطل ہے کہ وہ دوبارہ بکھرے ہوئے ذرات کو جمع کر
کے تم کو حیات عطا نہیں کر سکتا۔ تعجب اور حیرت کی بات ہے کہ تمہیں خدا کی قدرت کے انکار
سے شرم نہیں آتی۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ

وہی ہے جس نے بنایا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر

اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ
چڑھ گیا آسمان کو تو ٹھیک کیا انکو سات آسمان اور وہ

بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾
ہر چیز سے واقف ہے

ذکر تخلیق سامان حیات جسمانی

قال تعالیٰ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ ... الیٰ ... وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ.

حق تعالیٰ نے نعمت حیات کا ذکر فرمایا اب ان آیات میں سامان حیات کا ذکر فرماتے ہیں جس پر حیات اور زندگی کا بقاء موقوف ہے اول حیات جسمانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی تمہاری اس ظاہری اور جسمانی حیات کے بقاء کے لیے زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور پھر زمین سے ملبوسات ومشروبات اور لذیذ مطعومات اور قسم قسم کے ملبوسات تمہارے لیے پیدا کیے اس کے بعد حیات روحانی کے سامان کا ذکر فرمایا یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا کیا اور منصب خلافت پر سرفراز فرمایا اور ہدایت کے علوم عطا فرمائے۔ اور انبیاء ومرسلین کا سلسلہ جاری فرمایا۔ انبیاء ومرسلین اللہ کی طرف سے جو ہدایت اور رشد کے علوم اور معارف لیکر آتے ہیں وہی لوگوں کی روحانی حیات کا سامان ہوتے ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ	اے ایمان والو حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا جبکہ وہ تم کو ایسی شیٔ کی طرف بلائے کہ جو تم کو روحانی اور معنوی حیات اور زندگی عطا کرے۔

چنانچہ فرماتے ہیں۔ وہی ایک پاک ذات ہے کہ جس نے پیدا کیا تمہارے منافع اور فوائد کے لیے جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب حتی کہ سمیات اور نجاسات بھی نفع سے خالی نہیں جب نہ بچ سکے کسی چیز سے منافع یعنی نفع حاصل کرنا اور چیز ہے اور کھانا اور چیز ہے۔ انتفاع کی اجازت اور اباحت سے کھانے کی اجازت اور اباحت لازم نہیں۔ پھر وہ رب العزت توجہ ہوا آسمانوں کی تخلیق وتکوین کی طرف پھر ٹھیک ٹھاک کر کے سات آسمان بنائے کہ نہیں ان میں کوئی اونچ نیچ اور شگاف اور دراڑ نہیں اور وہ پروردگار ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے کہ کیوں اور کس کے لیے پیدا کیا۔ امام جلیل اور کبیر حافظ

علامہ ابن کثیر قدس اللہ سرہٗ وزمخشری فرماتے ہیں کہ اس آیت اور حٰم سجدہ کی آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول زمین پیدا کی گئی، اور پھر آسمان پیدا کیے گئے، اور تعمیر کا طریقہ بھی یہی ہے کہ نیچے سے بنانا شروع کرتے ہیں جب تحتانی حصہ مکمل ہو جاتا ہے تب چھت ڈالتے ہیں اور علماء کا اس بارے میں کوئی نزاع اور اختلاف نہیں یعنی سب علماء کی یہی رائے ہے صرف قتادہ سے ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ قتادہ کا گمان یہ ہے کہ آسمان پہلے پیدا کیے گئے جیسا کہ بظاہر سورۃ والنازعات کی اس آیت سے متبادر ہوتا ہے۔

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ	کیا تم بنانے میں مشکل ہو یا آسمان، اسے آسمان
بَنٰىهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا	بنایا اور اس کی بلندی کو بہت اونچا کیا پھر
وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا	اس کو صاف کیا اور اس کی رات کو تاریک
وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا	بنایا اور پھر اس میں سے کھول کر دھوپ
اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَ	نکالی اور اس کے بعد زمین کو بچھایا اور
مَرْعٰىهَا۔	اس سے اسکا پانی اور چارا نکالا۔

اس آیت میں آسمان کی پیدائش کو زمین کی پیدائش سے پہلے ذکر فرمایا ہے جو بظاہر سورۂ بقرہ اور حٰم سجدہ کی آیات سے متعارض معلوم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس تعارض کے متعلق دریافت کیا گیا تو یہ جواب ارشاد فرمایا کہ اول زمین پیدا کی گئی اور پھر آسمان (جیسا کہ سورۂ بقرہ اور حٰم سجدہ کی آیات سے ظاہر ہے) اور آسمان بنانے کے بعد زمین کو بچھایا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زمین کا محض مادہ تو آسمان سے پہلے پیدا کیا گیا، مگر زمین حالت موجودہ پر آسمان بنانے کے بعد بچھائی گئی۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین اسی حالت موجودہ پر آسمان سے پہلے پیدا کی گئی اور پھر آسمان بنائے گئے تاکہ ان کے ذریعہ سے زمین پر بارش ہو اور پھر اس بارش سے وہ اشجار و اثمار اور فواکہ و طیبات زمین سے نمودار ہوں جن کا مادہ قدرت ازلیہ نے زمین میں ودیعت رکھا ہے۔ پس زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کا یہ مطلب ہے کہ آسمان بننے کے بعد زمین سے فواکہ اور ثمرات اور قسم قسم کے لذائذ و طیبات کو اگایا۔ خود قرآن نے زمین کو آسمان کے بعد بچھانے کی یہی تفسیر کی ہے کما قال تعالیٰ۔

۱؎ سورۂ حٰم سجدہ کی وہ آیت جس سے زمین کا پہلے پیدا ہونا معلوم ہوتا ہے یہ ہے قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْ ـــــ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ۝ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ، الآیہ ۳۰

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذَٰلِكَ دَحَاهَا ۔ أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا ۔

اور زمین کو آسمان کے بعد بچھایا یعنی اس میں سے اسکا پانی اور چارہ نکالا۔

اور اسی جواب کو علماء سلف اور خلف نے اختیار کیا ہے خلاصہ یہ کہ زمین کے پھیلانے سے ان اشجار و نباتات کا اگانا مراد ہے جو زمین میں بالقوہ موجود ہیں اسی معنی کر زمین کا بچھانا آسمان بنانے کے بعد ہوا باقی زمین بحالت موجودہ آسمان سے پہلے پیدا کی گئی۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو مجھ کو بنانا ہے زمین میں ایک نائب

قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ

بولے کیا تو رکھے گا اس میں جو شخص فساد کرے وہاں اور کرے خون اور

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي

ہم پڑھتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو کہا مجھ کو

أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا

معلوم ہے جو تم نہیں جانتے اور سکھلائے آدم کو نام سارے

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ

پھر وہ دکھائے فرشتوں کو کہا بتاؤ مجھ کو نام

هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ

ان کے اگر ہو تم سچے بولے تو سب سے نرالا ہے ہم کو معلوم

لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ

نہیں مگر جتنا تو نے سکھایا تو ہی ہے اصل دانا حکمت والا کہا

يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ

اے آدم بتا دے ان کو نام ان کے پھر جب اس نے بتا دیئے نام ان کے

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ

کہا میں نے نہ کہا تھا تم کو مجھ کو معلوم ہیں پردے آسمان اور

الْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

زمین کے اور معلوم ہے جو تم ظاہر کرتے اور جو تم چھپاتے ہو

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ

اور جب ہم نے کہا فرشتوں کو سجدہ کرو آدم کو تو سجدہ کر پڑے مگر

اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ڭ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَ

ابلیس نے قبول نہ کیا اور تکبر کیا اور وہ تھا منکروں میں کا اور

قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا

کہا ہم نے اے آدم بس تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں

رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

سے محظوظ ہو کر جس جگہ چاہو اور نزدیک نہ جاؤ اس درخت کے

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا

پھر تم بے انصاف ہو گے پھر ڈگایا ان کو شیطان نے اس سے

فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ

پھر نکالا ان کو وہاں سے جس آرام میں تھے اور کہا ہم نے تم سب اترو تم سب

لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ

ایک دوسرے کے دشمن ہو اور تم کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور کام چلانا

اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ

ایک وقت تک پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں پھر متوجہ ہوا

عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿٣٧﴾

اس پر بیشک وہی ہے معاف کرنیوالا مہربان

▽

ذکر تخلیق سامان حیات جسمانی و عطاء خلافت ربانی

قال تعالیٰ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ ۔۔ الیٰ ۔۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۔

گزشتہ آیات میں زمین و آسمان اور دیگر مخلوقات کی پیدائش کو بیان فرمایا کہ ہم نے ان تمام مخلوقات کو تمہارے نفع کے لیے پیدا کیا ہے۔ آئندہ آیات میں ان مخلوقات سے منتفع ہونے والی مخلوق یعنی انسان کا ذکر فرماتے ہیں۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق موجود تھی۔ ایک فرشتے دوسرے جن اور یہ دونوں قسمیں علوی اور سفلی یعنی ارضی اور سماوی اشیاء سے منتفع اور متمتع نہیں ہو سکتیں۔ فرشتوں کا نہ منتفع ہونا تو بالکل ظاہر ہے۔ فرشتوں کو نہ زن اور فرزند کی ضرورت اور نہ طعام و شراب اور نہ طعام و شراب کے لوازم یعنی شہوت اور غضب کی انکو حاجت۔

جنات اگرچہ بعض چیزوں سے منتفع اور متمتع ہو سکتے ہیں۔ مگر لطافت جسم اور غلبۂ ناریت کی وجہ سے بہت سے سامان حفاظت سے مستغنی ہیں۔ نہ انکو کسی مکان اور عمارت کی ضرورت اور نہ کسی قلعہ اور برج کی حاجت ہے اور نہ وہ اپنی حفاظت میں تیر و تلوار اور کسی قسم کے ہتھیار کے محتاج ہیں۔ پس اگر وہ عالم کی بعض اشیاء سے منتفع بھی ہیں تو وہ انتفاع ناتمام اور ناقص ہے علاوہ ازیں جنات کی قوت خیالیہ انکی قوت عقلیہ پر اس درجہ غالب ہے کہ جس چیز کا وہ خیال کر لیتے ہیں اس کو واقعی سمجھتے ہیں اس لیے ان کا انتفاع حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ خیالی ہے بخلاف انسان کے کہ وہ ان تمام چیزوں سے حقیقۃً اور علی وجہ الکمال منتفع ہو سکتا ہے اس لیے منصب خلافت کے لیے انسان ہی کو خاص کیا گیا۔ جسمانی حیثیت سے تمام عناصر اربعہ اور عالم سفلی کی تمام اشیاء سے نفع اٹھا سکتا ہے اور روحانی حیثیت سے عالم علوی کی تمام چیزوں سے منتفع اور متخلق باخلاق الٰہیہ اور متصف بصفات ربانیہ ہو سکتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اس وقت کو یاد کیجئے جب تیرے پروردگار نے حضرت آدم کی خلافت ظاہر کرنے کے لیے انکی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں سے یہ فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً تحقیق میں زمین میں اپنا ایک خلیفہ اور نائب بنانے والا ہوں جو میرا نائب ہو کر زمین پر حکومت کریگا اور زمین والوں پر میرے حکموں کو جاری اور نافذ کرے گا اور وہ خلیفہ بشر اور ایسے مرکب ہونے کی وجہ سے زمین کا انتظام کریگا۔ اور منافع ارضیہ سے متمتع ہوگا اور اس میں ایک روح آسمانی پھونکی گئی جس کی وجہ سے وہ آسمان والوں پر حکم چلائے گا؎

تنبیہ

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ۔۔۔ کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

حضرت آدم کی خلافت کا تذکرہ ملائکہ سے اس لیے فرمایا کہ کائنات ارضی اور سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ آسمان سے پانی کا برسانا۔ زمین سے اشجار و نباتات کا اگانا۔ گرم اور سرد ہواؤں کا چلانا وغیرہ وغیرہ۔ من جانب اللہ ان تمام چیزوں پر فرشتوں کا پہرہ ہے۔ اور یہ تمام امور فرشتوں ہی کی ماتحتی اور نگرانی میں ہیں۔ پس جب تک فرشتے اللہ کے خلیفہ کی اطاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام علی وجہ التمام نہیں چل سکتا۔ اسی لیے حق تعالیٰ شانہ نے اول فرشتوں کے سامنے حضرت آدم کا فضل و کمال ظاہر فرمایا اور پھر انکو سجدہ کا حکم دیا۔

سلاطین دنیا جب کسی کو منصب وزارت پر سرفراز کرتے ہیں تو حکومت کی تمام فوجیں اس کی ماتحتی میں دیدی جاتی ہیں اور وہ آکر سلامی دیتی ہیں۔ اسی طرح حق جل شانہ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو منصب خلافت پر سرفراز فرمایا تو اپنے تمام جنود و عساکر یعنی ملائکہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی اطاعت اور فرمانبرداری کا سجدہ کرا دیا۔ تاکہ خلافت کے کام میں کسی قسم کا کوئی خلل نہ پیش آئے اور چونکہ یہ تمام عالم بمنزلہ ایک شہر کے ہے اور فرشتے اسکے عامل اور کارکن ہیں اس لیے خلافت کا تذکرہ فرشتوں ہی سے فرمایا۔ کسی اور مخلوق سے ذکر نہیں فرمایا اس لیے کہ اور سب فرشتوں ہی کے ماتحت ہیں۔

حقیقت ملائکہ

اہل اسلام کے نزدیک ملائکہ اللہ کے محترم اور مکرم بندے ہیں جو نور سے پیدا کیے گئے ہیں؎۔ معاصی سے معصوم۔ خطاء اور نسیان سے محفوظ ہیں۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ۔ کھانے اور پینے سے پاک؎۔ تذکیر و تانیث سے منزہ اور مبرا ہیں۔ قرآن میں ملائکہ کے حق میں جو ضمیر مذکر کا استعمال ہے محض تعریف و تکریم کی وجہ سے ہے مذکر ہونے کی وجہ سے نہیں جیسے حق جل و علاء کے لیے ضمیر مذکر کا استعمال محض عظمت و اجلال کی وجہ سے ہے جس طرح بعض انسانوں کو حق تعالیٰ نے اپنی رسالت اور پیغمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے

۱؎ بخاری الی ما اخرجہ مسلم عن عائشۃ مرفوعا خلقت الملائکۃ من نور ۱۲ فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۶

۲؎ قال الحافظ فی قصۃ الملائکۃ مع ابراہیم وسارۃ ما یدل انہم لا یاکلون ۱۲ فتح الباری ص ۲۱۹ ج ۶

اسی طرح بعض ملائکہ کو رسالت پیغمبری کے لیے برگزیدہ فرمایا ہے کما قال تعالیٰ اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔

فرشتوں نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے بنے ہوگا تو اس میں اللہ تعالیٰ سے مختلف ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی جب ان خواہشوں کی مزاحمت ہوگی تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذات اور منافع میں اس کی مزاحمت کرے گا تو قوت غضبیہ جوش میں آجائے گی۔ اور مزاحمت کے لیے جنگ و جدال اور قتل و قتال کی نوبت آئے گی اس لیے فرشتوں کو یہ شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت اور اصلاح کے لیے ایسے شخص کو خلیفہ بنانا بظاہر خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے۔ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ فرشتوں نے کسی اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ محض حکمت دریافت کرنے کے لیے بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کیا کہ زمین میں آپ ایسے شخص کو خلیفہ بنانے چاہتے ہیں جو زمین میں فساد اور خونریزی کرے۔ حالانکہ ہم سب ہر وقت تیری ذات پاک کی ثنا کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہیں تاکہ حق تیری ذات اور صفات کا ادا ہو اور ہم خالص تیرے لیے تقدیس کرتے ہیں۔ یعنی ہم تیرے افعال کو اس بات سے پاک جانتے ہیں کہ تیرا کوئی فعل معاذ اللہ خلاف حکمت ہو یا معاذ اللہ اس میں عبث اور لغویت کا شائبہ ہو۔ بخلاف بنی آدم کے کہ اگر وہ تیری تسبیح و تقدیس بھی کریں گے تو ہمہ اوقات نہ ہوگا اور بیچ بیچ میں ہوائے نفس اور شرکت سے پاک نہ ہوں گی۔ اور یہ سوال کہ ملائکہ کو بنی آدم کا مفسد اور خونریز ہونا کیسے معلوم ہوا۔ سو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور عبداللہ بن مسعود اور دیگر حضرات صحابہ سے مروی ہے کہ جب اللہ نے یہ فرمایا اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً تو فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ وہ خلیفہ کیسا ہوگا تو اللہ رب العزت نے یہ فرمایا کہ اس خلیفہ کے ذریت ہوگی اور زمین میں فساد کرے گی اور ایک دوسرے پر حسد کرے گی اور ایک دوسرے کو قتل کرے گی تفسیر ابن جریر۔ اس پر ملائکہ نے یہ سوال کیا۔ اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا الخ اور ملائکہ کا یہ سوال محض حکمت دریافت کرنے کے لیے تھا کہ فساد اور خونریزی کرنے والوں کو پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ معاذ اللہ بطور اعتراض نہ تھا۔ اس لیے کہ ملائکہ کی تو یہ شان ہے کما قال تعالیٰ لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ۔ یعنی بغیر اذن الٰہی کے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے۔ وقال تعالیٰ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۔ خدا کے مکرم بندے ہیں۔ مقصد فقط یہ تھا کہ اس قسم کی مخلوق پیدا کرنے میں کیا حکمت ہے۔ اگر عبادت اور بندگی مقصود ہے تو ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ ہر وقت تیری عبادت اور بندگی میں سرشار رہتے ہیں اور تیری معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور بری ہیں۔ اس لیے حق جل شانہ نے جواب ارشاد فرمایا۔ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ تحقیق میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے یعنی تم کو معلوم نہیں کہ منصب خلافت کے لیے ایسی ہی مخلوق جامع مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع

ہو اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قویٰ سے مرکب ہوگا وہی عالم کے انتظام اور تدبیر و تصرف پر قادر ہوگا۔ کائنات ارضیہ کے حقائق اور منافع کو جانے سمجھے گا اور طرح طرح کی صنعتیں ایجاد کریگا تاکہ منافع ارضیہ قوت سے نکل کر فعلیت میں آجائیں اور ظاہر ہے کہ فرشتوں میں یہ استعداد اور صلاحیت نہیں۔

ہر کسے را بہر کارے ساختند

جاننا چاہیئے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک تو قوت شہویہ جس سے زنا وغیرہ صادر ہوتا جس کو فرشتوں نے مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا سے تعبیر کیا ہے۔ اور دوسری قوت غضبیہ جس سے قتل اور ضرب اور خونریزی ظہور میں آتی ہے جسکو ملائکہ نے وَیَسْفِكُ الدِّمَاءَ سے تعبیر کیا ہے۔ فرشتوں نے انسان کے یہ دو عیب ذکر کرکے اشارۃً ان دونوں عیبوں کی اپنے سے نفی کی اس لیے کہ مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا کے مقابلہ میں وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ کہا اور یَسْفِكُ الدِّمَاءَ کے مقابلہ میں وَنُقَدِّسُ لَكَ کہا۔ اس میں شک نہیں کہ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ بہت سے مفاسد کا سرچشمہ ہیں لیکن ان دو قوتوں میں منافع اور مصالح اور فوائد بھی نہایت عجیب و غریب ہیں ملائکہ نے قوت شہویہ اور غضبیہ کے مفاسد کو تو ذکر کیا لیکن ان دونوں قوتوں کے منافع اور فوائد سے ان کو ذہول ہوگیا فرشتوں کا خیال اس طرف نہ گیا کہ یہی قوت شہویہ جب اسکا رخ خداوند ذوالجلال کی طرف پھیر دیا جاتا ہے تو اس سے وہ ثمرات و نتائج ظہور میں آتے ہیں کہ انکو دیکھ کر فرشتے بھی عش عش کرنے لگتے ہیں یعنی جذبہ عشق خداوندی اور اس کی محبت کا جوش اور ولولہ خدا کی محبت اور اسکے عشق میں قلب کا بے چین اور بیتاب رہنا یہ وہ نعمت ہے کہ جس پر ملائکہ بھی رشک کرتے ہیں اس لیے کہ ملائکہ میں قوت شہویہ نہ ہونے کی وجہ سے عشق کا مادہ نہیں۔ اطاعت میں اگر فرشتوں کا پلہ بھاری ہے تو عشق اور محبت میں آدم اور بنی آدم کا پلہ بھاری ہے اور علیٰ ہذا جب قوت غضبیہ کا رخ خداوندی میں صرف کیا جاتا ہے تو اس سے بھی عجیب و غریب نتائج و ثمرات ظاہر ہوتے ہیں یعنی خدا کی راہ میں جانبازی اور سرفروشی اور اسکے دشمنوں سے جہاد و قتال۔ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ بدریین کی طرح وہ ملائکہ جو جنگ بدر میں شریک ہوئے ان ملائکہ سے افضل ہیں جو جنگ بدر میں شریک نہیں ہوئے جیسا کہ بخاری میں مذکور ہے اور خدا کی راہ میں شہید ہو جانا ایسی عظیم نعمت ہے کہ ملائکہ اس سے بالکلیہ محروم ہیں۔ نیز جب تک قوت عقلیہ کے ساتھ قوت شہویہ اور قوت غضبیہ نہ ہو تو تنہا قوت عقلیہ تجارت و زراعت اور صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت کے اصول اور قوانین مرتب نہیں کر سکتی جن پر نظام عالم کا دارومدار ہے۔ لہٰذا خلیفہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ قوت عقلیہ کے ساتھ قوت غضبیہ اور قوت شہویہ کا بھی حامل ہو نیز اگر جہاں گی

بیابانیں اور قباحتیں موجود نہ ہوں تو بعثت رسل اور انزال کتب و شرائع و احکام و اوامر و نواہی سب معطل و بیکار ہو جائیں۔

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است — دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

شیخ اکبر قدس اللہ سرہٗ فصوص الحکم میں فرماتے ہیں کہ ملائکہ نے جس اطلاق تسبیح و تقدیس کا دعویٰ کیا تھا ملائکہ کی تسبیح و تقدیس ان اسماء و صفات کے ساتھ مقید اور مخصوص ہے جن اسماء و صفات کا انکو علم دیا گیا ہے جیسا کہ قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا سے معلوم ہوتا ہے مگر ملائکہ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ کے ایسے اسماء بھی ہیں کہ وہاں تک ملائکہ کے علم کی رسائی نہیں اور اللہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ان اسماء و صفات کا علم عطا فرمایا خصوصاً وہ اسماء و صفات جنکا تعلق نعمت اور عذاب، موت اور ہلاکت، صحت اور مرض سے ہے جیسے رزاق اور منعم اور مصور محی اور ممیت ملائکہ ایسے اسماء و صفات کے ساتھ حق سبحانہ و تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس نہیں کرتے جنکا تعلق عالم اجسام سے ہے اس لیے ملائکہ کی تسبیح و تقدیس بنی آدم کی تسبیح کے لحاظ سے مطلق نہیں بلکہ مقید ہے انھیں کلام کا۔ علاوہ ازیں بنی آدم کی تسبیح و تقدیس شیطان اور نفس، قوۂ شہویہ اور قوۂ غضبیہ کے معارضہ اور مقابلہ کی وجہ سے زیادہ اکمل اور بہتر ہے بخلاف ملائکہ کے کہ ان کی تسبیح و تقدیس بمنزلہ سانس کے اضطراری ہے اور اختیاری تسبیح و تحمید اضطراری تسبیح و تحمید سے بہتر ہے۔

جواب تفصیلی بعد جواب اجمالی

گزشتہ آیات اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔ میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا اب آئندہ تفصیلی جواب ارشاد فرماتے ہیں جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت اور زیادتی بیان فرمائی تا کہ فرشتوں پر انکی فوقیت اور افضلیت ثابت ہو اور یہ ظاہر ہو جائے کہ جو شخص علوی اور سفلی کائنات کے اسماء و صفات سے واقف ہو وہی مستحق خلافت ہے یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا الخ اور سکھائے اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام مع ان کے خواص اور آثار کے اس لیے کہ جب تک کہ عالم کی تمام چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف اور خواص اور آثار اور طریقۂ استعمال معلوم نہ ہو تو انکا انتظام اور ان میں تصرف کیسے کر سکتا ہے۔ بعض نام جاننے سے نہ تو حضرت آدم کی فوقیت ثابت ہوتی اور نہ بعض نام جاننے سے انتظام ہو سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت کے روز اول اہل ایمان شفاعت کے لیے حضرت آدم کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ اور یہ کہیں گے۔

انت ابو الناس ــــ خلقک ــ آپ سب انسانوں کے باپ ہیں اللہ نے

اللہ بیدہ و اسجد لہ ملائکتہ و علمہ اسماء کل شئ۔	اپنے ہاتھ سے آپ کو پیدا کیا اور فرشتوں سے آپ کو سجدہ کرایا اور تمام چیزوں کے نام آپ کو سکھائے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے فرشتوں کو بھی بعض چیزوں کے نام کا علم تھا مگر ان کا علم انہیں چیزوں میں منحصر تھا جن کی خدمت پر وہ مامور تھے دوسری چیزوں سے ان کو کوئی تعلق اور سروکار نہ تھا۔ خلافت کے لیے علم تام اور عام چاہیے۔ بخلاف حضرت آدم کے کہ اللہ تعالیٰ نے انکو علم تام اور عام عطا فرمایا۔ مفردات اور مرکبات کے اسماء اور خواص اور آثار بتلائے صنعتوں اور حرفتوں کا علم عطا فرمایا۔ حفظان صحت اور معالجۂ امراض کے اصول و قواعد بتلائے۔ اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کو ان چیزوں کا علم نہیں دیا گیا لہٰذا وہ خلافت کا کام کیسے انجام دے سکتے ہیں۔ اسی لیے حضرت آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے اور اسی آیت میں وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ کے بعد جو لفظ کُلَّھَا بڑھایا گیا وہ اسی عموم کی تاکید ہے کیونکہ آدم اور فرشتوں میں یہی مابہ الامتیاز ہے کہ فرشتوں کو تمام اسماء کا علم نہیں اور حضرت آدم کو اسماء کی تعلیم بذریعہ الہام کے تھی کہ ان کے دل میں ڈال دیا کہ فلاں چیز کا فلاں نام ہے اور فلاں چیز کا فلاں نام ہے۔ اور اس تعلیم میں کلام اور صوت اور حرف درمیان میں نہ تھی بلا حرف اور صوت کے اور بغیر کلام ان کے دل میں ڈالا اور یہ تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی بلکہ بطریق القاء فی القلب تھی جیسے وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ میں تعلیم بواسطہ الفاظ کے نہ تھی۔ بلکہ القاء فی القلب کے ذریعہ سے تھی کہ ان کے دل میں زرہ بنانے کا طریقہ ڈال دیا۔ پھر جن چیزوں کے نام اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو سکھائے ان چیزوں کی صورتوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا پھر فرمایا تم مجھے ان چیزوں کے نام ٹھیک ٹھیک بتلا دو اگر تم اس بارہ میں سچے ہو کہ تم میں خلافت کی صلاحیت ہے اور تم خلافت کی خدمت انجام دے سکتے ہو۔ اس لیے کہ جب تک حقائق اشیاء اور ان کی صفات اور خواص اور آثار اور طریقۂ استعمال کا علم نہ ہو اس وقت تک ان میں تصرف اور ان کا انتظام ناممکن ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا تو پاک اور منزہ ہے ہم کو کسی شئ کا بھی علم نہیں مگر فقط اسی چیز کا جس کا تو نے ہم کو جتنا علم عطا کر دیا ہے بے شک حقیقت میں تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے تو اس سے منزہ ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلاف حکمت ہو ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور آدم کا علم ان کی استعداد کے مطابق ہے۔ استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم و حکمت پر مبنی ہے۔ آپ کو مطلق اختیار ہے جو استعداد چاہیں وہ پیدا کریں۔ فرشتوں پر جب یہ بات واضح ہو گئی کہ آدم علیہ السلام خلافت کی استعداد اور صلاحیت میں ہم سے بہتر اور برتر ہیں تو بصد عجز و زاری بارگاہ خداوندی میں یہ بولے۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ۔

فائدہ جاننا چاہیے کہ عرضہم کی ضمیر اسماء کی طرف باعتبار مسمیات کے راجع ہے ظاہر مقتضی

یہ تھا کہ ضمیر مؤنث کی لاتے اور یوں کہتے ثُمَّ عَرَضَهَا جیسا کہ ایک قراءت میں ثُمَّ عَرَضَهُنَّ ضمیر مؤنث کے ساتھ آیا ہے لیکن بجائے ضمیر مؤنث کے ذوی العقول کی ضمیر لائے یعنی ھُمْ کی ضمیر لائے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ عرض باعتبار وجود خارجی اور جسامت ظاہری کے نہ تھا بلکہ باعتبار وجود روحانی اور مثالی یا بطور وجود مثالی کے تھا اور اس وجود کے اعتبار سے تمام مخلوقات عاقل اور مدرک ہیں اور ذکر و تانیث سے منزہ ہیں۔ حق جل شانہ نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں کو ان تمام چیزوں کے نام مع خواص اور آثار کے بتلا دو۔ چونکہ اے آدم ہم نے تم کو ادیم ارض یعنی روئے زمین کی تمام اقسام کی مٹیوں سے ملا کر اور مختلف قسم کے پانیوں میں گوندھ کر بنایا ہے اور پھر برابر بنا کر تم میں روح پھونکی ہے جو جنس ملائکہ سے ہے اس لیے تم میں یہ استعداد اور صلاحیت ہے کہ تم ان چیزوں کے نام اور خواص و آثار بتلا سکو اس لیے کہ ساری استعدادیں اور صلاحیتیں تم میں جمع ہیں جسمانی حیثیت سے تم زمینی ہو اور روحانی حیثیت سے تم علوی ہو اس لیے تم علوی اور سفلی چیزوں کو جس قدر سمجھ سکتے ہو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ غرض یہ کہ تمہارے خمیر میں زمینی اور آسمانی دونوں قسم کی استعدادیں اور صلاحیتیں علی وجہ الکمال موجود ہیں پس ان چیزوں کے نام مع خواص و آثار کے فرشتوں کے سامنے بیان کرو تاکہ تمہارا فضل و کمال ظاہر ہو اور تمہاری فطرت میں جو عجیب و غریب استعدادیں اور صلاحیتیں ہم نے ودیعت کر رکھی ہیں وہ بروئے کار آجائیں اور فرشتوں پر یہ امر منکشف ہو جائے کہ یہ استعداد بشر کے ساتھ مخصوص ہے ملائکہ کو میسر نہیں پس جب بتا دئیے آدم نے ان تمام چیزوں کے نام جیسے تمام اور جیسے اچھا تھا۔ اور اس بیان میں کوئی غلطی بھی نہیں کی تو فرشتے حضرت آدم کے اس کمال علمی کو دیکھ کر حیران رہ گئے تو اسی وقت اللہ جل جلالہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ میں تمام آسمانوں اور زمینوں کی پوشیدہ چیزوں کو خوب جانتا ہوں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ اور جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو اس کو بھی خوب جانتا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ خلافت کے لیے ایسے حاوی اور کلی علم کی ضرورت ہے بغیر ایسے علم کے خلافت ناممکن ہے فرشتوں کا علم حاوی اور کلی نہیں جس خدمت پر وہ مامور ہیں فقط اسی کے قواعد اور ضوابط ان کو معلوم ہیں کسی دوسری خدمت اور نظام کا ان کو علم نہیں۔ اور نیز ملائکہ کی قدرت و مشیت ان کے اختیار اور مرضی کے تابع نہیں بلکہ حق جل شانہ کی مرضی کے تابع ہے بخلاف انسان کے کہ اس کی قدرت و مشیت خود اس کی مرضی کے تابع ہے انسان ہی کا علم اور قدرت حق تعالیٰ شانہ کے علم اور قدرت کا نمونہ ہے جو ضدین اور نقیضین سے متعلق ہو سکتا ہے نیز بہت سی چیزوں کا علم محض عقل سے نہیں ہو سکتا جب

۱؎ اور یہی وجہ ہے کہ حضرت آدم کو تمام روئے زمین کی مٹیوں سے بنایا ہے اسی لیے ان کی اولاد میں کوئی سرخ رنگ ہے کوئی گورا اور کوئی کالا ہیں اور کوئی نرم طبیعت کوئی تند خو اور کوئی نیک طبیعت اور کوئی بد طبیعت جیسا کہ مسند احمد ابو داؤد اور ترمذی کی ایک حدیث میں آیا ہے ۱۲

تک قوت شہویہ اور غضبیہ عقل کی معین اور مددگار نہ ہو اس لئے ایسی چیزوں کا نام وہی بتلا سکتا ہے جس میں قوت عقلیہ ادراکیہ کے علاوہ قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو اور مثل ہٰذا جنات کا علم بھی ناقص ہے اور علاوہ ناقص ہونے کے طبیعت ناریہ اور قوت خیالیہ کے غلبہ کی وجہ سے ناقابل اعتبار ہے اس لئے یہ خلافت انکے سپرد نہیں کی جاسکتی، خلاصہ کلام یہ کہ جب فرشتوں نے یہ عرض کیا کہ اَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا الخ تو حق تعالیٰ شانہٗ نے دو جواب ارشاد فرمائے ایک حاکمانہ اور ایک حکیمانہ حاکمانہ جواب تو یہ فرمایا کہ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ رموز مملکت خویش خسرواں دانند اور حکیمانہ جواب یہ ارشاد فرمایا - وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کہ آدم علیہ السلام کو اشیاء کے تمام اوصاف اور خواص اور اسماء کی تعلیم دی تاکہ وہ ان اشیاء میں تصرف کرنے پر قادر ہوں اس سے حضرت آدم کا بمقابلہ ملائکہ فضل و کمال ظاہر ہوا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ جو چیزیں آدم علیہ السلام کو بتلائی گئیں اگر فرشتوں کو بھی بتلا دیتے تو وہ بھی اسی طرح بتلا سکتے یہ تو ایسا ہوا کہ دو طلبہ کو شریک امتحان کریں اور ایک کو خلوت میں جواب سکھلا دیں اور دوسرے سے امتحان لیں جواب یہ ہے کہ یہ کہیں ثابت نہیں کہ خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو تنہائی میں اسماء وغیرہ بتلا دیئے تھے اور جب یہ ثابت نہیں تو یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے سامنے ہی بتلایا ہو اور یہی احتمال خدا تعالیٰ کے لطف کے اعتبار سے راجح ہے تو اب وہ مثال صحیح نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اب اس کی مثال ایسی ہے کہ استاد نے اقلیدس کی کسی شکل کی دونوں طلبہ کے سامنے تقریر کی مگر امتحان کے وقت ایک تو بوجہ مناسبت کے بتلا سکا اور دوسرا نہ بتلا سکا کیونکہ علم کے لیے استعداد کی ضرورت ہے اور یہ استعداد حضرت آدم علیہ السلام ہی میں تھی۔ مثلاً بھوک کی حقیقت جبرئیل علیہ السلام نہیں کہہ سکتے تو فرشتے باوجود سننے کے بھی اس لیے نہ بتلا سکے کہ ان میں اس کی استعداد نہ تھی حق تعالیٰ شانہٗ نے اس امتحان سے یہ بتلا دیا کہ تم میں وہ استعداد نہیں اور یہی شرط ہے خلافت کی رہا یہ شبہ کہ جب آدم علیہ السلام نے ان کو بھی بتلا دیا تو وہ ضرور سمجھ گئے ہونگے تو ان میں بھی استعداد ثابت ہوگی سو یہ شبہ لغو ہے کیونکہ بتلانے کیلئے مخاطب کا سمجھنا لازمی نہیں اس لیے اَنْبِئْهُمْ فرمایا، علّمھم نہیں فرمایا، تعلیم کے معنی سمجھا دینے کے ہیں اور اَنْبَاء کے معنی اخبار یعنی تقریر کر دینے کے ہیں گو مخاطب نہ سمجھا ہو اور یہ استعداد خاصہ بشریہ ہے اگر فرشتوں کو یہ استعداد عطا کر دی جائے تو فرشتے فرشتے نہ رہیں جیسے حس و حرکت خاصہ حیوان کا ہے اگر جمادات میں یہ صفت پیدا فرما دیں تو جماد، جماد نہ رہے گا بلکہ حیوان بن

جائیگا۔ لہٰذا اس سوال کا حاصل یہ ہوگا کہ فرشتوں کو بشر کیوں نہ بنا دیا سو ظاہر ہے کہ یہ سوال بے معنی ہے
جواب اسکا ظاہر ہے کہ اس صورت میں فرشتوں کے پیدا کرنے میں جو حکمت ہے وہ معطل ہو جائے گی۔
اور اگر یہ کہا جائے کہ اول ہی فرشتوں کو بشر بنا کر خلیفہ بنا دیتے تو یہ مسئلہ تقدیر کا ہے ہم نہیں کہہ سکتے
کہ انکو بشر کیوں نہیں بنایا اس کی نسبت صرف یہی کہا جائیگا۔

حدیث مطرب و می گو و راز دہر کمتر جو ۔ کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت این معما را

(ہذا کلہ ملخص من روح المعانی فی الفرج بعد الشدۃ ملخصاً از مسئلہ تبلیغ) خلاصۂ کلام یہ کہ جب حضرت آدم کی
فضیلت ظاہر ہو گئی تو فرشتوں کو ان کی تعظیم کا حکم ہوا چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۔ اور اے بنی آدم تم خاص طور پر اس احسان کو بھی یاد کرو کہ جس وقت
ہم نے تمام فرشتوں کو تمہارے باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا کہ سب مل کر آدم کو سجدہ کرو تاکہ تمہارے
باپ کی فضیلت اور فوقیت علی طور پر علی الاعلان ظاہر ہو جائے بادشاہ جب کسی کو اپنا خلیفہ بناتا ہے
تو ارکان دولت کو حکم دیتا ہے کہ اس کو نذریں پیش کریں اور فوج کو سلامی کا حکم دیتا ہے تاکہ سب
کو معلوم ہو جائے کہ اس خلیفہ کی فرمانبرداری کرنا ہوگی تو سب سجدہ میں گر گئے بعض روایات میں ہے کہ
سب سے پہلے اسرافیل علیہ السلام نے سجدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مرتبہ عطا فرمایا کہ تمام قرآن انکی پیشانی
پر لکھ دیا۔ رواہ ابن ابی حاتم وابو الشیخ وابن عساکر غرض یہ کہ سب فرشتے حکم الٰہی بجا لائے اور سب نے
آدم کو سجدہ کیا مگر ابلیس کہ اس نے حکم ماننے سے انکار کیا اور تکبر کیا اور اللہ کے علم میں وہ پہلے ہی سے
کافروں سے تھا اگرچہ ظہور اسکے کفر کا اب ہوا اس لئے کہ حکم خداوندی کے امتثال سے انکار کرنا ایک
کفر تو یہ ہوا دوسرا کفر یہ کیا کہ حکم خداوندی کو خلاف حکمت اور خلاف مصلحت سمجھا۔ تیسرا کفر یہ کیا کہ اپنے
تمرد اور سرکشی کو حکم خداوندی کے تعمیل سے بہتر سمجھا جیسے کہ اس زمانہ کے بعض ملحد شیطان
کو موحد اعظم کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جو خبیث ذات اپنے کو خداوند ذوالجلال کا ہمسر اور ہم رتبہ سمجھتی ہو وہ
تو مشرک اکبر ہے شیطان کو موحد اعظم کہنا یہ اس شخص کے نادان اعظم اور احمق اعظم ہونے کی
روشن دلیل ہے۔

ف ابلیس اصل میں جنات سے ہے مگر ابتدا میں ملائکہ کے ساتھ اختلاط رکھتا تھا۔ فساد
اور خونریزی کی وجہ سے جب جنات کو زمین سے نکال کر جزائر اور جبال میں منتشر
کیا گیا تو ابلیس ان میں بہت بڑا عالم اور عابد تھا۔ فساد اور خونریزی سے اپنا بے تعلق ظاہر کیا تو فرشتوں
کی سفارش سے پہنچ گیا اور فرشتوں میں رہنے کی اجازت ہوئی مگر دل میں یہ طمع تھی کہ کسی طرح زمین کی
فرمانروائی مجھ کو مل جائے اسی طمع میں خوب عبادت کرتا رہا جب حضرت آدم کی خلافت کا وقت آیا اور
تمام ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوا تو ابلیس اس وقت ناامید ہوا اور استکبار اور حسد نے اس کو حق جل شانہ

کے مقابلہ اور معارضہ پر آمادہ کیا اور ہمیشہ کے لیے ملعون و مطرود و رجیم و مردود ہوا۔

ابلیس اگرچہ ملائکہ میں سے نہیں کما قال تعالیٰ کَانَ مِنَ الْجِنِّ (اور تھا ابلیس جنات میں سے) مگر خطاب سجود میں بتبعیت ملائکہ بالاولیٰ داخل تھا۔ بادشاہ جب سپاہیوں کو حکم دیتا ہے تو سائیس اور فراش بدرجۂ اولیٰ اس حکم کے مامور ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ شیطان کو علاوہ ملائکہ کے سجدہ کا کوئی مستقل حکم کیا گیا ہو جیسے [۱] مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ سے متبادر ہے۔

فائدہ سجدہ کی دو قسمیں ہیں ایک سجدۂ عبادت یعنی کسی کو خدا اور معبود سمجھ کر سجدہ کرنا اس قسم کا سجدہ تمام ملتوں میں کفر ہے اور شرک ہے اس قسم کا سجدہ کسی ملت اور شریعت میں کسی وقت میں جائز نہیں رکھا گیا۔ دوسرا سجدۂ تحیت و تکریم یعنی بطور تعظیم کسی کے سامنے سر جھکانا جیسے ابتداء ملاقات میں سلام کرتے ہیں۔ اسی طرح خراج ساجدین بطور تسلیم یہ سجدۂ تحیت مشروع تھا۔ شریعت محمدیہ نے اب اس کو بھی ممنوع اور حرام قرار دیا ہے جیسا کہ آیات قرآنیہ اور احادیث متواترہ سے اس کی حرمت ثابت ہے۔ دونوں سجدوں میں فرق اتنا ہے کہ سجدۂ عبادت تو کفر ہے اور سجدۂ تعظیم حرام ہے کفر نہیں کیونکہ سجدۂ عبادت شرک اعتقادی اور سجدۂ تعظیمی شرک عملی ہے تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہ تھا اس لیے کہ سجدۂ عبادت سوائے خدا کے کسی کو کرنا کفر ہے اور اللہ تعالیٰ نے کفر کا حکم نہیں دیا بلکہ یہ سجدۂ تعظیم و سلام تھا جیسا کہ یوسف علیہ السلام کے قصہ میں ہے وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا۔

مناظرۂ عدو اللہ دربارۂ فضیلت خلیفۃ اللہ [۲]

ابلیس علیہ اللعنۃ الیٰ یوم القیامۃ نے جب سجدہ سے انکار کیا تو علت یہ بیان کی۔

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ	اے خدا میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا

اور آگ مٹی سے بہتر ہے اس لیے میں آدم سے بہتر ہوا مگر اس کا یہ دعویٰ کہ آگ مٹی سے بہتر ہے بالکل غلط ہے بلکہ عنصر ترابی کا عنصر ناری سے بہتر ہونا متعدد وجوہ اور دلائل سے ثابت ہے۔

(۱) آگ بالطبع مفسد اور مہلک ہے محرق اور اتلاف اس کا خاصہ ہے بخلاف تراب کے کہ وہ

---

[۱] یعنی تجھ کو سجدہ کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی جبکہ تجھ کو میں نے حکم دیا تھا۔ ۱۲ منہ

[۲] یہ مناظرہ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بدائع الفوائد صفحہ ۳۳ ج ۳ میں ذکر فرمایا ہے۔

نہ جلتی ہے اور نہ غرق۔

(۲) آگ کی طبیعت ہی خفت اور حدت اور طیش سے بھری ہوئی ہے بخلاف تراب کے کہ اس میں رزانت وقار و سکون اور ثبات ہے۔

(۳) زمین ہی حیوانات کے ارزاق و اقوات اور انسانوں کے لباس اور زینت اور تمام سامان معیشت کا معدن اور منبع ہے بخلاف آگ کے کہ وہ ان تمام نفع رسانیوں سے بالکل بیگانہ ہے۔

(۴) عنصر ترابی کی ہر حیوان کو ضرورت ہے کوئی حیوان زمین سے مستغنی نہیں بخلاف عنصر ناری کے کہ وحوش و بہائم تو اس سے بالکل مستغنی ہیں، انسان بھی بعض اوقات آگ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔

(۵) زمین میں کسی شے کا اگر ایک تخم بھی ودیعت رکھ دیا جاتا ہے تو زمین ایک تخم کو اضعافاً مضاعفہ بنا کر واپس کر دیتی ہے۔ آگ میں جو کچھ بھی رکھا جاتا ہے جلا کر سب کو خاکستر بنا دیتی ہے۔

(۶) حق تعالیٰ شانہ نے قرآن کریم میں بکثرت زمین اور زمین کے منافع کا ذکر فرمایا ہے کہ زمین کو ہم نے مہاد اور فراش بساط اور قرار احیاء اور اموات کا ماویٰ اور ملجا بنایا زندہ اس پر زندگی بسر کرتے ہیں اور مر کر اس میں دفن ہوتے ہیں اور بار بار زمین اور زمین کے عجائب میں تفکر اور تدبر کا حکم دیا۔ بخلاف آگ کے کہ اکثر و بیشتر اس کو موقع عتاب و عذاب اور مقام تخویف و ترہیب میں ذکر فرمایا صرف ایک دو جگہ یہ ارشاد فرمایا ہے۔ تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ کہ یہ آگ آخرت کی آگ کی یاد دہانی اور مسافروں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

(۷) حق سبحانہ و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بار بار زمین کا منبع برکات اور موجب خیر ہونا بیان فرمایا ہے کما قال تعالیٰ۔ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَكَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ۔ اس آیت میں برکت عامہ کا ذکر فرمایا۔ اور آیت وَ نَجَّیْنٰهُ وَ لُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا لِلْعٰلَمِیْنَ اور آیت وَ جَعَلْنَا بَیْنَهُمْ وَ بَیْنَ الْقُرَى الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا قُرًى ظَاهِرَةً اور آیت وَ لِسُلَیْمٰنَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِیْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا میں ان برکات کو ذکر فرمایا کہ جو زمین کے خاص خاص قطعوں کو حاصل ہیں۔ بہر حال زمین برکات عامہ اور برکات خاصہ دونوں کا معدن اور منبع ہے بخلاف آگ کے کہ وہ منبع برکات تو کیا ہوتی اس کے برعکس وہ تو برکات کی مٹانے والی اور فنا کرنے والی ہے۔

(۸) مساجد اور وہ بیوت کہ جن میں صبح و شام اللہ کا نام لیا جاتا ہے۔ ہر وقت اس کی عبادت اور بندگی سے معمور رہتے ہیں وہ سب زمین ہی پر واقع ہیں۔ تمام روئے زمین پر اگر سوائے اس بیت حرام کے جس کو خدا نے مبارک اور هُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ اور قِیٰمًا لِّلنَّاسِ فرمایا ہے اور کچھ

بھی نہ ہوتا تو یہ زمین کے شرف اور فضیلت کے لیے کافی اور وافی تھا۔

(۹) یہ چیزیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں اور آگ ان کی خدمت کے لیے ہے جب ضرورت ہوتی ہے تب آگ سلگائی جاتی ہے اور ضرورت ختم ہوتے ہی آگ کو بجھا دیا جاتا ہے تو آگ زمین کے لیے بمنزلہ ایک خادم کے ہے اور زمین بمنزلہ مخدوم کے ہے۔

علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نار تراب سے بہتر ہے تب بھی یہ استدلال فاسد ہے اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک شے کا مادہ دوسری شی کے مادہ سے مفضول اور کمتر ہو مگر وہ شی بہ حیثیت موجودہ دوسری شی سے افضل اور بہتر ہو مثلاً انبیاء و مرسلین نطفہ اور علقہ سے پیدا کیے گئے اور ملائکہ نور سے پیدا کیے گئے مگر خدائے عزوجل نے انبیاء و مرسلین کو ملائکہ مقربین پر فضیلت دی آدم علیہ السلام کو مسجود ملائکہ بنایا اور جبرئیل اور میکائیل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر وزیر بنایا اور ابوبکر و عمر کو زمین میں آپکا وزیر اور مشیر بنایا اور اگرچہ آدم کو ہم نے زمین کی خلافت اور اسکی عمارت کے لیے پیدا کیا ہے مگر سردست ہم نے ان کو حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ تاکہ بہشت کے محلات اور باغات اور پھلوں اور نہروں کو دیکھ کر دنیا میں اس کا نمونہ قائم کر سکو اور فقط سیر پر اکتفا نہ کرو بلکہ چند روز وہاں کی رہائش اختیار کرو اور فی الحال اسکو وطن اور سکونت بناؤ۔ تاکہ اس کی تعمیر کی کیفیت خوب ذہن نشین ہو جائے اور حضرت آدم کو جنت میں رہنے کا اس لیے حکم دیا گیا کہ وہ بہشت کے محلوں کی آرائش اور انکی زیب و زینت اور وہاں کے عمارات اور وہاں کی پوشاک کو خوب غور سے دیکھ لیں اور سمجھ لیں تاکہ دنیا کی عمارتوں کو اسی طریق پر چلا سکیں اور کھاؤ تم اس جنت سے خوب وسعت اور فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو تاکہ تمام ماکولات اور مشروبات کے خواص اور آثار، منافع اور مضار تم کو معلوم ہوں اور پھر اس علم کے مطابق دنیا کے ماکولات و مشروبات میں تصرف کر سکو اور زمین میں جو شجر اور ثمر تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں ان سے نفع اٹھا سکو۔ مگر باوجود اس عام اجازت کے بطور ابتلاء اور امتحان جس میں تمہارے لیے سراسر خیر ہی خیر ہے ہم تم کو بعض چیزوں کے استعمال سے منع بھی کرتے ہیں تاکہ تم لذائذ اور مرغوبات کے خوگر نہ ہو جاؤ اور وہ یہ کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا۔ درخت کے تعیین میں علماء کے اقوال مختلف ہیں کسی آیت یا حدیث صحیح سے ثابت نہیں کہ وہ کیا درخت تھا گیہوں کا تھا یا انجیر کا یا زیتون کا تھا یا انگور کا سلف اور خلف میں مشہور یہی ہے کہ وہ گیہوں کا درخت تھا اور اصل حقیقت خدا ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیا درخت تھا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس کا علم کچھ مفید اور نافع نہیں اور اس کا جہل کچھ مضر نہیں مقصود یہ کہ تم کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ تم اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

ف حضرت آدم اور حوا کو جس جنت میں رہنے کا حکم ہوا تھا اس سے وہی جنت الخلد

مراد ہے جسکا قیامت کے بعد متقین سے وعدہ ہے جیسا کہ قرآن کریم کے سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے پیشتر آیت وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ میں اسی جنت الخلد کا ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد حضرت آدم و حوا کو یٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ کا حکم ہوا اور الجنۃ کو معرف باللام ذکر فرمایا جسکا صاف مطلب یہی ہے کہ اس مقام پر الجنۃ سے معہود و معروف جنت مراد ہے جسکا سابق میں ذکر ہو چکا ہے پھر اس کے بعد جب حضرت آدم کے ہبوط کا ذکر فرمایا اور ہبوط کے معنی اوپر سے نیچے اترنے کے ہیں پھر ارشاد فرمایا وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدمؑ کو ابتداء میں جس جگہ رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ زمین کے علاوہ کوئی اور جگہ تھی، ورنہ اگر پہلے ہی سے زمین پر تھے تو پھر اس ارشاد کا کیا مطلب ہے کہ تم زمین پر اترو اور وہاں جا کر ٹھہرو۔

صحیح مسلم میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگ اول حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور یہ عرض کریں گے۔

یا ابانا استفتح لنا الجنۃ	اے ہمارے باپ آپ ہمارے لیے جنت
فیقول وھل اخرجکم	کا دروازہ کھلوائیے تو آدم یہ جواب دیں گے
من الجنۃ الا خطیئۃ	کہ تمہارے باپ کی لغزش ہی تو تم کو جنت سے
ابیکم۔	باہر لائی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم اسی جنت سے نکالے گئے تھے کہ جس جنت کا دروازہ مؤمنین کھلوانا چاہتے ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

احتج آدم و موسیٰ	عالم ارواح میں اللہ تعالیٰ کے سامنے
عند ربھما فحج آدم	حضرت آدم و موسیٰ علیہما السلام کا مناظرہ
موسیٰ قال موسیٰ انت آدم	ہوا، آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام
الذی خلقک اللہ بیدہ و	پر غالب آگئے موسیٰ کہنے لگے کیا آپ تو
نفخ فیک من روحہ و	وہی آدم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے
اسجد لک ملائکتہ و اسکنک	دست قدرت سے پیدا کیا اور اپنی خاص
فی جنتہ ثم اھبطت	روح تم میں پھونکی اور فرشتوں سے تم
الناس بخطیئتک	کو سجدہ کرایا اور اپنی جنت میں تم کو سکونت

الارض ـــــ الی الحین	عطا فرمائی اور پھر ہم نے لوگوں کو اپنی
الیہ بیٹ	خطاب سے جنت سے زمین کی طرف
	آتارا

یہ حدیث بھی اسی کی تائید کرتی ہے کہ یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ میں الجنۃ سے وہی جنت مراد ہے جو آسمان پر ہے جو ماوائے جنت سے زمین کا کوئی باغ مراد نہیں جیسا کہ بعض کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ آدم کو جس جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا تھا وہ دنیا ہی کے باغوں میں سے کوئی باغ اور گلستان باغ تھا یہ بالکل غلط ہے جیسے بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ آیت میں جنت سے کوئی دنیاوی باغ مراد ہے جہاں حضرت آدم و حوا آرام سے رہتے تھے اس باغ میں شیطان نے جا کر حضرت آدم و حوا کو دھوکہ دیا یہ قول بالکل غلط ہے اور وہ بالکل قابل التفات نہیں رہا یہ سوال کہ جنت میں جانے کے بعد وہاں سے نکلنا نہیں تو حضرت آدم جنت میں جا کر پھر کیسے نکلے جواب یہ ہے کہ قیام قیامت کے بعد جو جنت میں داخل ہوگا وہ کبھی جنت سے نہ نکالا جائے گا، اللہ نے دخول جنت پر جو خلود اور دوام کا وعدہ فرمایا اس دخول سے وہ دخول جنت مراد ہے جو قیام قیامت اور جزاء اور سزا کے بعد ہوگا۔ کیا احادیث صحیحہ سے یہ ثابت نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں جنت کی بھی سیر فرمائی اور صبح سے قبل ہی اس عالم میں تشریف لے آئے اسی طرح حضرت آدم کے دخول کو سمجھیے۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ حق جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خلافت سیکھنے کے لیے ہر قسم کی اشیاء سے تمتع اور انتفاع کے طریقے معلوم کرنے کے لیے اپنے حرم خاص یعنی جنت میں چند روزہ سکونت کے لیے حکم دیا اور تمام اشیاء سے تمتع اور انتفاع کی عام اجازت عطا فرمائی صرف ایک قسم کے درخت سے منع فرمایا۔ شیطان تاک میں تھا کہ ان سے کوئی گناہ اور لغزش صادر ہو سکے گناہ اور لغزش اسی وقت ہو سکتی ہے جب کوئی قید اور ممانعت ہو جب کسی چیز کی ممانعت ہی نہ ہو تو معصیت کیسے سرزد ہو۔ شیطان کو جب لا تقربا ہذہ الشجرۃ کی نہی اور ممانعت کا علم ہوا تو سمجھا کہ شاید اس راہ سے آدم پر میرا کوئی داؤ چل جائے اور اس طرح اپنے دشمن کو نکالنے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ حضرت آدم کے بہکانے اور پھسلانے کی فکر شروع کی۔ حضرت آدم اور حضرت حوا کے پاس گیا اور یہ کہا کہ تم اپنی اس تعظیم و تکریم پر مغرور نہ ہو۔ انجام کو بھی سوچو۔ انجام تمہارا موت ہے۔ حضرت آدم نے پوچھا کہ موت کیا ہے شیطان نے مردہ جانور کی صورت بنا کر نزع اور قبض روح کی طرح کی کیفیت اور شدت اور غرغرہ کی حالت ان کو دکھائی دیکھتے ہی گھبرا گئے اور خوف زدہ ہو کر پوچھا کہ اچھا اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر کیا ہے۔ شیطان نے کہا۔

هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى

کیا میں تم کو اس درخت کا نشان دوں نہ کہ اس کے کھانے سے موت اور فنا نہ آئے اور ہمیشہ اور دوام اور دائمی سلطنت اور لازوال بادشاہت حاصل ہو جائے۔

حضرت آدمؑ نے پوچھا وہ کونسا درخت ہے۔ شیطان نے وہی درخت بتایا جس کے قریب جانے سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو منع کیا تھا۔ حضرت آدمؑ نے کہا کہ یہ درخت تو فنا اور زوال کا ہے۔ بقاء اور دوام کا نہیں بلکہ رسوائی اور ملامت کا درخت ہے قرب اور وجاہت کے بجائے بعد اور ذلت کا موجب ہے اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے ہم کو اس کے قریب جانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اگر اس درخت میں یہ فائدے ہوتے تو وہ ارحم الراحمین ہم کو منع نہ فرماتا۔ شیطان نے کہا۔

مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۔

تمہارے پروردگار نے اس درخت سے اس لیے منع نہیں کیا کہ اس کا پھل تمہارے لیے موجب ضرر ہوگا بلکہ اس لیے منع کیا ہے کہ تم اس کے کھانے سے ہمیشہ زندہ رہنے والے یا فرشتے بن جاؤ گے جو ایک لمحہ کے لیے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوتے اور کھانے اور پینے اور زن و فرزند اور دنیا و مافیہا سے انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

پس اگر یہ حالت تم کو حاصل ہو جائے تو خلافت کا کام کیسے انجام پائے۔ دنیا کی خلافت کا کام تو زن و فرزند اور طعام و شراب اور کسب معاش کی فکر میں مشغولی سے انجام پا سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ زن و فرزند میں مشغول رہ کر خدا کے ساتھ مشغول نہیں رہ سکتا۔

حق تعالیٰ خائف تھا کہ تم سے خلافت کا کام لینا ہے اس لیے تم کو اس سے دور رکھا ہے اور اس درخت کے میوہ کا استعمال خداوند ذوالجلال کے قرب و اتصال کا موجب ہے اور جنت میں موت نہیں۔ تم کو محض آئین خلافت کے سکھلانے کے لیے چند روز بہشت میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد تم کو اپنی بارگاہ قرب سے علیحدہ کر کے دنیا میں بھیجے گا۔ وہاں جا کر تم اور تمہاری اولاد طرح طرح کی پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں گے اور انجام سب کا موت ہوگا اور خداوند

ذوالجلال کا قرب و وصال اور جمال کا یہ فلک لازوال دنیا میں جانے کے بعد اور خلافت ارضی کے ملنے کے بعد باقی نہیں رہ سکتا۔ حضرت آدمؑ اور حواؑ ابلیس کی ان دلفریب باتوں سے تردد اور اضطراب میں پڑ گئے۔ ظاہر ہے کہ ایک عاشق صادق حکومت اور سلطنت کو چھوڑ سکتا ہے مگر محبوب کی مفارقت اور جدائی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ عاشق صادق کے لیے تو صرف قرب کا خطرہ ہی فراق روح کا پیغام ہوتا ہے۔ ابلیس نے جب دیکھا کہ حضرت آدمؑ اور حواؑ تردد میں پڑ گئے تو ان کو یقین دلانے کے لیے بہت سی قسمیں کھائیں۔ کما قال تعالیٰ۔ وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ. کہ خدا کی قسم میں تمہاری خیر خواہی سے تم کو یہ مشورہ دے رہا ہوں کہ تم کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے جو بے ادبی اور گستاخی مجھ سے سرزد ہو چکی ہے اس خیر خواہی سے اس کی کچھ تلافی کر دوں تاکہ عمر بھر تم مجھ کو یاد کرو اور میرے شکر گزار رہو۔ حضرت آدمؑ کو یہ خیال ہوا کہ مخلوق کی یہ جرأت اور مجال نہیں کہ خداوند ذوالجلال پر جھوٹی قسم کھائے اور اس تاکید اکید کے ساتھ کہا گئے۔ اس لیے بظاہر یہ سچ ہوگا اور قرب اور وصال کے حصول کے شوق میں وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ کے حکم سے ذہول ہو گیا اور اس کی ممانعت کو بھی بھول گئے فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا پس شیطان نے آدمؑ اور حواؑ کو اس درخت کے کھانے سے اس طرح پھسلا دیا اور معلوم نہیں کہ حضرت حواؑ اور حضرت آدمؑ کے سامنے اس لعین نے کیا کیا دلفریب باتیں بنائی ہوں گی جن سے وہ دھوکہ میں آ گئے۔ اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت میں بجائے فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا کے فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا آیا ہے۔ کما فی الکشاف۔ اس قراءت میں لغزش کی ایک کیفیت کا بیان ہے کہ شیطان نے بذریعہ وسوسہ حضرت آدمؑ اور حواؑ کو لغزش دی فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ پس نکالا ان دونوں کو اس راحت اور آرام سے جس میں وہ تھے اور گناہ کی برائی ظاہر کرنے کے لیے ہم نے آدمؑ اور حواؑ سے کہا کہ اترو تم جنت سے اس حال میں کہ تم میں سے بعض بعض کا دشمن ہوگا۔ اور جنت نہ معصیت کا محل ہے نہ عداوت اور دشمنی کا۔ اس کے لیے تو دار دنیا ہی موزوں اور مناسب ہے دنیا ہی میں خدا کی نافرمانی اور ابلیس کی عداوت ممکن ہے خدا کی جنت اور ساتوں آسمان حق جل وعلا کی معصیت سے بالکلیہ پاک اور آپس کی عداوت سے بالکل منزہ ہیں۔

فائدہ اِهْبِطُوا کا خطاب حضرت آدمؑ اور حواؑ کو ہے جیسا کہ دوسری جگہ قُلْنَا اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بصیغہ تثنیہ وارد ہوا ہے مگر حضرت آدمؑ ابوالبشر اور حضرت حواؑ ام البشر ہونے کی وجہ سے تمام بنی نوع انسان کے قائم مقام ہیں اس لیے اس جگہ قُلْنَا اهْبِطُوا میں حضرت آدمؑ اور حواؑ کو صیغہ جمع کے ساتھ مخاطب فرمایا اور مزید برآں یہ کہ تم کو زمین پر ٹھہرنا ہے اور وہاں کے ساز و سامان سے ایک وقت معین تک تم کو متمتع اور منتفع ہونا ہے یعنی وہ انتفاع دائمی نہ ہوگا بلکہ ایک وقت معین تک ہوگا اور وہ وقت معین ہر شخص کے لحاظ سے تو موت ہے اور سارے عالم

کے انتظار رہے قیامت تک۔ حضرت آدم علیہ السلام اس خطاب مربیانہ عتاب کو سنتے ہی بے چین اور بے تاب ہو گئے فوراً بارگاہ خداوندی میں ایسے تضرع اور ابتہال کے ساتھ ملتجی ہوئے کہ سارے عالم کا تضرع اور ابتہال بھی اس کے پاسنگ نہیں ہو سکتا۔ حق تعالیٰ شانہ کی شان عفو اور مغفرت جوش میں آ گئی۔

اے خوشا چشمے کہ آں گریان اوست — وے ہمایوں دل کہ آں بریان اوست

در پئے ہر گریہ آخر خندہ ایست — مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

اور حضرت آدم کو توبہ اور معذرت کے کلمات تلقین فرمائے گئے۔ ابلیس کی معصیت چونکہ تمرد اور سرکشی کی بنا پر تھی اس لیے اس کو توبہ اور معذرت کی تلقین نہیں فرمائی۔ اور حضرت آدم کی معصیت سہو اور نسیان اور ذہول اور غفلت کی بنا پر تھی اس لیے ان کو بارگاہ خداوندی سے کلمات معذرت کا القاء اور الہام ہوا جو ان کی توبہ کی قبولیت کا سبب بنے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

پس حاصل کیے آدم نے اپنے رب سے الہام سے معذرت کے چند کلمے پس توجہ فرمائی ان پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور مغفرت سے۔ اور بیشک وہی توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ تواب کے بعد رحیم کی صفت ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ توبہ کا قبول کرنا اس پر واجب نہیں محض اپنی رحمت سے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے اور وہ کلمات یہ ہیں۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۔ جیسا کہ سورۂ اعراف میں ان کا ذکر ہے۔

فائدہ حضرت حوا چونکہ حضرت آدم کے تابع تھیں اس لیے اس جگہ ان کی توبہ کا ذکر نہیں فرمایا۔ اور سورۂ اعراف میں دونوں کی توبہ ذکر فرمائی۔ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا الخ یعنی دونوں نے کہا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا الخ اس پر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کے گناہ کو معاف کیا اور توبہ کو قبول فرمایا اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بن گئے۔ کما قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

فائدہ توبہ کے اصلی معنی رجوع کے ہیں اور اوب کے معنی بھی رجوع کے ہیں۔ تائب اور تواب اس کو کہتے ہیں کہ جو معصیت سے طاعت کی طرف رجوع کرے اور منیب اور اواب وہ ہے جو غفلت سے ذکر اور فکر کی طرف رجوع کرے کما قال تعالیٰ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ اور جب تائب کی اسناد حق تعالیٰ کی طرف کی جائے مثلاً تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا۔ کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے انتقام اور عقوبت سے عفو اور رحمت اور لطف و عنایت کی طرف رجوع فرمایا۔

فائدہ حضرت آدم کی توبہ قبول ہو جانے سے عیسائیوں کے عقیدہ کی تردید

ہو گئی کہ آدم کی معصیت کی وجہ سے ان کی تمام اولاد گناہ کے بوجھ میں لدی ہوئی تھی، عیسیٰ نے آکر تمام بنی آدم کو اپنی صلیبی موت سے گناہوں سے خلاصی دی، نصاریٰ کا یہ عقیدہ بالکل باطل ہے عقل اور نقل کے خلاف ہے۔

ازالۂ اشتباہ از لغزش سیدنا و ابینا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام و تحقیق مسلک علماء اسلام در بارۂ عصمت انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام

قبل اس کے کہ ہم اس سوال کا جواب دیں کہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے باوجود اول الانبیاء اور نبی معظم اور رسول محترم ہونے کے یہ زلت[1] (لغزش) کیسے صادر ہوئی، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مسئلہ عصمت انبیاء کی مختصر توضیح اور تشریح کر دی جائے اور عصمت و معصیت کی حقیقت سمجھا دی جائے۔

اصل مسئلہ سمجھ جانے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ کوئی اشکال نہ رہے گا، اہل حق کا یہ اجماعی عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام قولاً و فعلاً و عملاً اللہ کی نافرمانی سے معصوم ہوتے ہیں، صغیرہ اور کبیرہ سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ قصداً و ارادۃً ان سے حق جل شانہ کی نافرمانی ممکن نہیں، اگر قصداً ان سے حکم الٰہی کی مخالفت ممکن ہوتی تو حق جل شانہ مخلوق کو ان کی بے چون و چرا اطاعت اور متابعت کا حکم نہ دیتا، اور ان کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیتا اور انبیاء کرام کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنا قرار دیتا۔

قال تعالیٰ وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ۔	جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔
إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا	تحقیق جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں

[1] زلت یعنی لغزش بتقدیم زاء کے ساتھ ہے جس کے معنی بلا ارادہ و بلا اختیار قدم پھسل جانے کے ہیں، یہ لفظ زاء کے ساتھ ہے ذال کے ساتھ نہیں، ذلت بکسر ذال تو لفظ ذلت ہے جو عزت کی ضد ہے اور قرآن کریم میں فازلہما زاء کے ساتھ آیا ہے ذال کے ساتھ نہیں، خوب سمجھ لو کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ شیخ حافظ تورپشتی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: در امثال ایں مواضع کہ نسبت کردہ است ایشان را بزبان حق بود نسبت دادن آن با ایشان ما را روا نیست و لغزان ایشان را زبان دراز کردن و از آنکہ فرمانبرداری ایشان مقصود است و جایے کہ عصمت الٰہی نگہدار ایشان است وظیفۂ ما است کہ پیروی ایشان کنیم و اگر چیزی از ایشان صادر شود ... (المعتمد فی المعتقد ص ۱۲۳)

إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ۔ وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں خدا تعالیٰ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔

دست او را حق چو دست خویش خواند
تا ید اللہ فوق ایدیہم براند

اور ظاہر ہے کہ یہ اتباع نبوی اور اقتداء مطلق کا حکم جو آیات قرآنیہ سے ثابت ہے وہ کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ عقائد سے لیکر اعمال تک کوئی عقیدہ اور کوئی خلق اور کوئی حال اور کوئی عمل ایسا نہ ہو جس میں اقتداء نبوی ضروری نہ ہو جیسا کہ مقتضائے اطلاق یہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام کی ذوات بابرکات، قدسی صفات اور ملکی سمات ہوتی ہیں۔ انبیاء کرام کی اصل فطرت وہی ہوتی ہے جو ملائکہ کی ہوتی ہے۔ فطرت کے اعتبار سے انبیاء اور ملائکہ ایک سے ہیں فرق فقط لباس بشریت کا ہوتا ہے اور عصمت ملائکہ کا خاصہ لازمہ ہے اور انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں جیسا کہ حضرت آدم کا قصہ اس پر شاہد عدل ہے۔ ابلیس لعین اسی وجہ سے ملعون اور مطرود ہوا کہ اس نے حضرت آدم کی فضیلت اور برتری کو تسلیم نہیں کیا جس سے ثابت ہوا کہ حضرت آدم ملائکہ معصومین سے افضل اور برتر ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم معصوم سے افضل نہیں ہو سکتا۔

عصمت کے معنی

عصمت کے معنی یہ ہیں کہ ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی مداخلت سے پاک اور منزہ ہوں اور نفس اور شیطان یہی دو چیزیں مادۂ معصیت ہیں اور مادۂ معصیت سے پاک ہونے کا نام عصمت ہے اور معصوم وہ شخص ہے جو اپنے تمام اعتقادات اور خیالات اور ارادات اور مقامات اور احوال اور اخلاق اور عادات اور عبادات اور معاملات اور اقوال و افعال میں نفس اور شیطان کی مداخلت سے محفوظ ہو اور حفاظت الٰہی اس کی محافظ اور نگہبان ہو کہ ان سے کوئی ایسی شئ صادر نہ ہو جائے کہ ان کے دامن عصمت کو آلودہ کر سکے۔ حق جل شانہ کی نظر عنایت اور فرشتوں کی محافظت انکو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو کہ شیطان ان پر دست برد نہ چلا سکے اور صراط حق کے میلان سے بھی ان کی ذات بری ہو حق جل شانہ نے قرآن کریم میں انبیاء کرام کو مرتضیٰ اور مصطفین[1] الاخیار اور عباد مخلصین فرمایا ہے جس سے من کل الوجوہ ارتضاء اور اصطفاء اور اخلاص کامل مراد ہے اور مخلص وہ ہے کہ جو خالص اللہ کا ہو غیر اللہ کا اس میں شائبہ نہ ہو یعنی مادۂ شیطانی سے بالکلیہ پاک ہو لہٰذا ضروری ہوا کہ نبی صغائر اور کبائر دونوں سے معصوم ہو اس لیے کہ مادۂ شیطانیہ ہی صغائر اور کبائر

---

[1] كما قال تعالى وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ وَإِنَّهُمْ عِندَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ وقال تعالى حاكيا عن اللعين رَبِّ بِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ ـــ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ۔

کا منشا یہ ہے اور حق جل شانہ کے اس ارشاد اَللّٰہُ یَصْطَفِی مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ رُسُلًا ۔۔۔ یعنی رُسُلًا میں، لفظ مِن بیانیہ ہے اور لفظ رسول نکرہ لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ہر رسول کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور برگزیدہ بندہ ہو یعنی تمام اخلاق و عادات اور افعال و حرکات اور احوال و مقامات میں من کل الوجوہ حق تعالیٰ کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہو اور بوئے شرکت غیر سے خالص اللہ کا بندہ ہو اور ظاہر ہے کہ اس آیت میں بعض وجوہ سے پسندیدگی مراد نہیں اس لیے کہ بعض وجوہ سے تو ہر مسلمان خدا کا پسندیدہ بندہ ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ انبیاء کرام کے اصطفاء اور اجتباء اور ارتضاء سے من کل الوجوہ پسندیدگی اور برگزیدگی مراد ہے اور من کل الوجوہ پاک و صاف اور خدا کا پسندیدہ اور بلا شرکت غیر خالص حق تعالیٰ کا بندہ وہی ہو سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن نفس اور شیطان کی بندگی اور اطاعت سے بالکلیہ پاک ہو اور یہی مادۂ معصیت سے بالکلیہ طہارت و نزاہت کا نام عصمت ہے اور اصطفاء اور ارتضاء باب افتعال کے صیغے ہیں جو اپنے لیے ہوتا ہے۔ اکتیال اور اتزان اپنے لیے کیل وزن کرنے کو کہتے ہیں اور کیل اور وزن عام ہے خواہ اپنے لیے ہو یا غیر کے لیے۔ کما قال تعالیٰ وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ ۔۔۔ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْ وَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ اپنے لیے کیل کرنے کو اکتالوا یعنی باب افتعال کے صیغہ سے تعبیر کیا گیا اور دوسروں کے لیے تولنے کو کالوہم اور وزنوہم ثلاثی مجرد سے تعبیر کیا گیا ہے اسی قاعدہ لغویہ کی بنا پر اصطفاء اور ارتضاء کے معنی اپنے لیے پسندیدہ اور برگزیدہ بنا لینے کے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے وَاصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ پس عصمت کا حاصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام تمام اخلاق و حرکات و عادات و حالات و اقوال و افعال و عبادات و معاملات میں سرتاپا اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اور برگزیدہ ہوتے ہیں اور ظاہراً و باطناً دخل شیطانی اور حوادث نفسانی سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں ایک لمحہ کے لیے بھی عنایت ربانی و حمایت یزدانی سے علیحدہ نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرات انبیاء کی بے چون و چرا اطاعت فرض ہے اور ان کا ہر قول اور ہر فعل قابل قبول ہے اور ان کی اطاعت سے انحراف شقاوت ابدی اور خسران دارین کا موجب ہے حضرات انبیاء کرام سے اگر کسی وقت مقتضائے بشریت کوئی لغزش بطور سہو و نسیان صادر ہو جاتی ہے تو وہ باہر سے آتی ہے اندر سے نہیں آتی جیسے آب گرم میں حرارت خارجی اثر سے آتی ہے باقی پانی میں مادۂ حرارت کا نام و نشان نہیں پانی کی طبیعت میں سوائے برودت کے کچھ بھی نہیں یہی وجہ ہے کہ پانی کتنا ہی گرم ہو اگر آگ پر ڈال دیا جائے تو آگ فوراً بجھ جاتی ہے اسی طرح حضرات انبیاء کرام کا باطن مادۂ معصیت یعنی نفس و شیطان ہی سے بالکل پاک ہوتا ہے البتہ کبھی خارجی اثر سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے لیکن گریہ و زاری رحمت و تربیت الٰہی باہر سے آئے ہوئے غبار کو چہرۂ عصمت سے صاف کر دیتا ہے اور چہرۂ نبوت پہلے سے زیادہ صاف اور روشن ہو جاتا ہے جیسے سیدنا یوسف علیہ السلام

کے قصہ میں حق جل شانہٗ کا ارشاد ۔

كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين	اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے خالص بندوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے تاکہ یوسفؑ سے برائی اور بےحیائی یعنی صغیرہ اور کبیرہ کو اس سے دور رکھیں کیونکہ وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

اسی طرف مشیر ہے کیونکہ اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ سوء اور فحشاء کو یوسفؑ سے دور رکھیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یوسفؑ کو سوء اور فحشاء سے دور رکھیں۔ پھیرنا اور ہٹانا اور دور رکھنا اسکے حق میں ہوتا ہے جو آنا چاہتا ہو معلوم ہوا کہ سوء اور فحشاء حضرت یوسفؑ کی طرف آ رہا تھا جس کو حق تعالیٰ نے یوسفؑ کی طرف آنے سے روک دیا حضرت یوسفؑ ادھر جانا نہیں چاہتے تھے معاذ اللہ اگر حضرت یوسف کا میلان سوء اور فحشاء کی طرف ہوتا تو حق تعالیٰ اس طرح فرماتے كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَهٗ عَنِ السُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ یعنی ہم نے یوسف کو سوء اور فحشاء سے روکا اور بچایا معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تو سوء و فحشاء سے بھاگ رہے تھے مگر سوء اور فحشاء ان کے پیچھے لگا ہوا تھا جسکو دست قدرت نے روک دیا اور یوسف علیہ السلام کو بالکل بچا لیا کیونکہ یوسف علیہ السلام تو خالص اللہ کے بندے تھے ان کا قلب ارادۂ معصیت سوء اور فحشاء سے بالکلیہ پاک تھا زلیخا کی طرف سے یہ سوء اور فحشاء چلا مگر حق تعالیٰ کی رحمت اور عنایت نے اس کو خدا کے مخلص اور برگزیدہ بندہ تک پہنچنے نہ دیا۔

غرض یہ کہ خارجی اثر کی بنا پر حضرات انبیاء کرام سے بطریق سہو و نسیان جو لغزش ہو جاتی ہے تو محض صورت کے اعتبار سے اس پر عصیان یا معصیت کا اطلاق ہوتا ہے یا اُن کے مقام عالی اور مرتبہ علیا کے لحاظ سے اسکو عصیان کہہ دیا جاتا ہے۔

معصیت کے معنی

اور معصیت اور گناہ مطلق مخالفت حکم کا نام نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً اور قصداً ہو اور بوجہ نسیان اور غلطی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ موقع عذر میں یوں کہا کرتے ہیں کہ میں بھول گیا تھا یا میں سمجھا نہ تھا اگر باوجود نسیان اور غلط فہمی کے بھی کسی امر کی مخالفت کو معصیت اور گناہ اور جرم کہا جائے تو پھر موقع عذر میں یہ کہنا کہ میں بھول گیا تھا سراسر لغو ہوگا

معلوم ہوا کہ مطلق مخالفت کا نام معصیت نہیں بلکہ معصیت اس مخالفت کو کہتے ہیں جو عمداً ہو اور جو مخالفت سہو اور نسیان کی بنا پر ظہور میں آئے یا بتقاضائے غفلت یا بتقاضائے محبت کوئی مخالفت سرزد ہو جائے تو اسکو معصیت اور گناہ نہیں سمجھتے بلکہ اس کو زلّت اور لغزش کہتے ہیں جیسے کوئی

خود ہم اپنے کسی چھوٹے کو سر جانے بیٹھنے کو کہیں اور وہ ہمارے کہنے کو نہ مانے تو یہ سرکشی اور معصیت نہیں بلکہ عین ادب اور دلیل اطاعت ہے جیسے صلح حدیبیہ میں حضرت علیؓ کا لفظ رسول اللہ مٹا دینے سے انکار کر دینا اسی قبیل سے تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کا گیہوں کھا لینا بھول چوک کی بنا پر تھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا حضرت آدم، حق جل شانہٗ کی ممانعت لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کو بھی بھول گئے اور شیطان کی عداوت سے بھی ذہول ہو گیا اور حق تعالیٰ کا یہ ارشاد اِنَّهٗ عَدُوٌّ لَّكُمَا فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى یہ بھی یاد نہ رہا سہو ماجرا بھول سے ہو گیا اور بھول چوک کو گناہ اور جرم قرار دینا سراسر غلط ہے حضرت آدم اور حوا علیہما جنت پر نئے پیدا اور فرشتہ تھے اس لیے ابلیس کی قسم سے دھوکہ میں آ گئے اور یہ سمجھے کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا نیز حضرت آدم کا گیہوں کو کھا لینا بمقتضائے محبت خداوندی تھا۔ خلود اور قرب خداوندی کے شوق میں تھا جیسا کہ مَا نَهٰكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۔ اس پر دلالت کرتا ہے نیز مقتضائے فطرت بھی تھا اس لیے کہ جب شیطان نے یہ قسم کھائی وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ تو حضرت آدم کو یہ خیال بھی نہیں ہوا کہ خدا کا نام لے کر کوئی جھوٹ بولے گا وہ یہ سمجھے کہ بندہ خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا پس معلوم ہو گیا کہ حضرت آدم کا یہ فعل بارادۂ مخالفت نہ تھا اور نہ بتقاضائے ہوائے نفسانی تھا بلکہ بتقاضائے محبت و عظمت خداوندی تھا لہٰذا اس کو معصیت اور گناہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ کہا جائے گا کہ از قسم زلت و لغزش ہے یعنی ارادہ تو اطاعت اور قرب خداوندی کا تھا مگر دشمن نے ایسا دھوکہ دیا کہ قدم پھسل کر دوسری جانب جا پڑا اسی کو لغزش کہتے ہیں۔ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ اور فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ میں اسی طرف اشارہ ہے کہ یہ لغزش تھی جو بھولے سے ہو گئی ارادہ نافرمانی کا نہ تھا۔

پس جن آیات قرآنیہ میں اس فعل پر معصیت کا اطلاق کیا گیا ہے وہ محض ظاہری صورت کے اعتبار سے ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں یا ان کے مقام بلند اور رتبۂ عالیہ کی مناسبت سے اس کا نام عصیان رکھا گیا (حاشیہ شاہجہان پوری ص ۴۲ و ص ۴۳)

اور حسنات ابرار کے حق میں ترک اولیٰ ایسا ہے جیسا کہ دوسروں کے حق میں خطاء (حاشیہ ملا عبدالحکیم علی الخیالی ص ۲۶۱)

حضرات انبیاء کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ افضل اور اولیٰ سے چوک گئے اور بھولے سے غیر اولیٰ اور غیر افضل کے مرتکب ہو گئے اور اعداء کی خطاء کے معنی یہ ہیں کہ حق اور ہدایت سے چوک گئے اور باطل اور ضلالت میں مبتلا ہو گئے۔ حضرات انبیاء کرام باجماع امت ایسی خطاء سے معصوم ہیں بعض انبیاء کی خطاء اجتہادی کے یہ معنی ہیں کہ کسی وقت بھول چوک سے اولیٰ و افضل کے بجائے خلاف اولیٰ

اس ان سے صادر ہو جاتا ہے۔ اور بجائے عزیمت کے رخصت پر عمل کر لیتے ہیں۔

حضرت آدم کی زلّت اور لغزش کو اسی معنی پر محمول کرنا چاہئے اور یہ معلوم رہنا چاہئے کہ اگر بالفرض والتقدیر انبیاء کرام معاذ اللہ ہماری طرح اسیر حرص و شہوت ہوتے تو خدا تعالیٰ نے ہم پر ان کی بے چون و چرا اطاعت اور متابعت فرض نہ کرتا۔ اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو جو خلاصۂ موجودات اور زبدۂ کائنات ہیں ان کو انبیاء کرام کی اقتداء کا حکم نہ دیتا اور یہ ارشاد نہ فرماتا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ۔ (کذا فی المعتمد فی المعتقد للتوربشتی)

امام ابو منصور ماتریدیؒ فرماتے ہیں کہ نظر اور فکر کا اقتضاء یہ ہے کہ انبیاء کرام کے حق میں عصمت کا اعتقاد۔ ملائکہ کی عصمت کے اعتقاد سے زیادہ مؤکد اور اہم ہو[1] اس لیے کہ مخلوق انبیاء کرام کی اتباع اور متابعت پر مامور ہیں اور ملائکہ کی اطاعت پر مامور نہیں (المعتمد فی المعتقد للتوربشتی صفحہ ۴۳)

متعلقات عصمت

امام رازی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ عصمت کا تعلق چار چیزوں سے ہے اول عقائد، دوم تبلیغ احکام، سوم فتویٰ اور اجتہادات، چہارم افعال و عادات و سیرت و کردار۔

قسم اول یعنی عقائد کے متعلق اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ انبیاء کرام ابتداء ہی سے توحید اور ایمان پر مفطور ہوتے ہیں جب سے پیدا ہوتے ہیں اسی وقت سے ان کے قلوب کفر اور شرک سے پاک اور منزہ اور ایقان و عرفان سے لبریز ہوتے ہیں اور ان کے مبارک چہرے معرفت اور قرب الٰہی کے انوار و تجلیات سے ہر وقت جگمگاتے رہتے ہیں آج تک کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوا کہ حضرت حق جل شانہ نے اپنی نبوت و رسالت کے لیے کسی وقت میں ایسے شخص کو منتخب فرمایا ہو کہ اس عظیم الشان منصب کی سرفرازی سے پہلے کفر اور شرک کی نجاست میں ملوث اور آلودہ ہو چکا ہو ہرگز نہیں ہرگز نہیں اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰهِیْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِیْنَ۔ اسی طرف مشیر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام اگرچہ قبل از بعثت نبی نہیں ہوتے مگر خدا کے ولی اور مقرب ضرور ہوتے ہیں اور ایسے ولی اور مقرب ہوتے ہیں کہ دوسرے اولیاء اور مقربین کی ولایت اور قرب کو ان کی ولایت اور قرب کے ساتھ وہ نسبت بھی نہیں ہوتی کہ جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہوتی

[1] اصل عبارت یہ ہے امام ابو منصور ماتریدی رحمہ اللہ گفتہ است کہ نظر اقتضاء آں می کند کہ تاکید وجوب عصمت در حق انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام فرض تر از آں است کہ در حق ملائکہ زیرا کہ خلق بمتابعت انبیاء مامور اند و بمتابعت ملائکہ مامور نیستند (کذا فی المعتمد للتوربشتی صفحہ ۴۳)

سہواً اور نسیاناً ان سے صادر ہو جاتے ہیں، جو ظاہراً وہ معصیت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ان سے کسی حکم کی تشریع مقصود ہوتی ہے مثلاً نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ظہر یا عصر کی نماز میں سہو کا پیش آنا بظاہر غفلت معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں سجدۂ سہو کا حکم بتانا مقصود تھا اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا؟ اور علی ہذا لیلۃ التعریس میں آپ کی نماز نہ فوت ہوتی تو قضاء فوائت یعنی فوت شدہ نمازوں کی قضاء کا مسئلہ کیسے معلوم ہوتا اس اعتبار سے یہ سہو اور نسیان عین رأفت اور عین رحمت ہے اسی وجہ سے صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

یا لیتنی کنت سہو محمد۔ — کاش میں رسول اللہ کا سہو ہو جاتا یعنی حضور کا سہو میری یاد سے کہیں بہتر ہے

اور حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ پیغمبر کا نسیان حقیقت میں کسی حکمت پر مبنی ہوتا ہے حضرات انبیاء کو بمقتضائے بشریت سہو اور نسیان ضرور پیش آتا ہے اس لیے کہ انسان جب تک جامۂ بشریت میں ہے خواص بشریہ سے علیحدہ نہیں ہو سکتا بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی لگتی ہے مسرت اور فرحت بھی ہے اور رنج و غم بھی لاحق ہوتا ہے اور جسم بیمار بھی ہوتا ہے ناراض اور خفا بھی ہوتے ہیں۔ اور حق تعالیٰ شانہ کے اس ارشاد میں اسی طرف اشارہ ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ — آپ کہہ دیجئے کہ جز این نیست کہ میں تم جیسا بشر ہوں۔

یعنی باوجود نبوت و رسالت کے پھر میں بشر ہوں فرشتہ نہیں۔ تمہاری طرح کھاتا اور پیتا ہوں۔ اپنی حوائج ضروریہ کے لیے بازاروں میں بھی آتا جاتا ہوں۔ یہ سب بشریت کے لوازم اور خواص ہیں یہ نبوت و رسالت کے منافی نہیں۔ بہرحال سہو اور نسیان انسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ جس طرح دوسرے لوازم انسانیت مثلاً بھوک اور پیاس وغیرہ نہ نبوت و رسالت کے منافی ہیں اور نہ عصمت کے اسی طرح افعال و عادات میں سہو و نسیان بھی نبوت اور عصمت کے منافی نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرات انبیاء کے سہو اور نسیان کو دوام اور قرار یعنی بقاء اور استمرار نہیں۔ کبھی کبھی بمقتضائے بشریت سہو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ کسی نبی کو جب کبھی کوئی سہو ہوا تو وہ ایک ہی مرتبہ ہوا یعنی اس نوع کا سہو پھر اس کو عمر بھر کبھی پیش نہیں آیا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے لَا یُلْدَغُ الْمُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ مَرَّتَیْنِ۔ یعنی مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا۔ جن کے قلوب ایمان کی حلاوت اور شیرینی چکھ چکے ہیں وہ شیطان سے دو مرتبہ نہیں ڈسے جاتے ہاں جو حقیقۃً مومن نہیں محض نام کے مومن ہیں وہ دو مرتبہ نہیں بلکہ صدہا مرتبہ نفس اور شیطان سے ڈسے جاتے ہیں اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس درخت کو کھا لینا بھی اسی مقتضائے بشریت اور خاصۂ انسانیت یعنی سہو اور نسیان کا ثمرہ اور نتیجہ تھا چنانچہ

خود حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا. آدم بھول گئے حق تعالیٰ شانہٗ کی ممانعت اور شیطان کی عداوت کا اس وقت استحضار نہ رہا معصیت اور نافرمانی کا بالکل ارادہ نہ تھا، فقط شیطان کی قسم سے دھوکہ میں آگئے۔ حدیث میں ہے المؤمن غرٌّ كريمٌ مومن دھوکہ میں آ ہی جاتا ہے۔ وقال تعالیٰ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيمَا أَخْطَأْتُمْ بِهِ وَلَٰكِنْ مَا تَعَمَّدَتْ قُلُوبُكُمْ (ترجمہ: بھول چوک میں کوئی گناہ نہیں، لیکن گناہ اس میں ہے جس کا تمہارے دل بالقصد ارادہ کرلیں) اس آیت کے مطابق جب خطا اور نسیان میں کوئی گناہ ہی نہیں تو وہ عصمت کے منافی کیسے ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حالت صوم میں بھول کر کھا لینا مفسد صوم بھی نہیں۔ حضرت آدم کا قلب مطہر اور سینہ مبارک چونکہ حق جل وعلا کی عظمت اور جلال سے بھرا ہوا تھا اس لیے جب شیطان نے اللہ کی قسم کھا کر یہ کہا کہ إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّاصِحِينَ (میں یقیناً تمہارا خیر خواہ ہوں) تو حضرت آدم کو یہ وہم بھی نہ ہوا کہ کوئی بے حیا اور گستاخ حق تعالیٰ شانہٗ کا نام لیکر جھوٹی قسم کھا سکے گا۔ اس فریب کے سبب شیطان نے حضرت آدم کو لغزش میں ڈالا۔ قال تعالیٰ فَدَلَّاهُمَا بِغُرُورٍ (یعنی شیطان نے انکو دھوکہ اور فریب کے ساتھ پھسلا دیا) غرور کے لفظ سے خود معلوم ہوتا ہے کہ یہ معصیت دھوکہ سے ہوگئی ورنہ حضرت آدم کا ارادہ نہ تھا۔ وہ تو مزید قرب الٰہی کے مشتاق اور متلاشی تھے۔ دشمن نے طاعت کے بہانہ سے معصیت میں مبتلا کردیا مگر یہ معصیت فقط صورۃً اور صورۃً معصیت تھی حقیقت میں عظیم الشان نعمت اور بے پایاں رحمت تھی۔ مقصود یہ تھا کہ گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریقہ معلوم ہو جس طرح نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے سہو سے سجدۂ سہو کا حکم بتلانا مقصود تھا اگر آپ کو نماز میں سہو نہ پیش آتا تو امت کو سجدۂ سہو کا حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سہو سے توبہ اور استغفار کا طریقہ بتلانا مقصود تھا۔ کہ جب کبھی کسی سے کوئی گناہ صادر ہو تو فوراً اپنے باپ آدم کی طرح تضرع اور زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں رجوع کرے شیطان کی طرح سرکشی اور مقابلہ نہ کرے۔ بالفرض اگر حضرت آدم سے یہ معصیت نہ ہوئی ہوتی تو ہم گنہگاروں کو توبہ اور استغفار کا طریق کیسے معلوم ہوتا۔

عارف ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانی قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ قضا کے علم میں سعادت اور شقاوت دونوں ہی مقدر تھیں اسکی حکمت اسکو مقتضی ہوئی کہ سعادت کا بھی افتتاح ہو اور شقاوت کا بھی اس لیے سعادت کا افتتاح حضرت آدم کے ہاتھ سے کرایا اور شقاوت کا افتتاح ابلیس کے ہاتھ سے کرایا۔ اھ کلامہٗ۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص سنت حسنہ جاری کرتا ہے تو جتنا اجر و ثواب اس سنت پر عمل کرنے والوں کو ملتا ہے اسی قدر اجر و ثواب اس سنت کے جاری کرنے والے کو بھی ملتا ہے جب تک وہ سنت جاری رہے گی اس شخص کے اجر میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جس عاجزی توبہ اور استغفار، تضرع اور ابتہال اور بارگاہ خداوندی میں گریہ وزاری کی مبارک سنت جاری فرمائی تا قیام قیامت جس قدر بھی تائبین اور مستغفرین توبہ اور استغفار کرتے رہیں گے اسی قدر حضرت آدم کے درجات میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ حضرت آدم ہی تمام تائبین اور مستغفرین کے امام اور تمام متضرعین اور خاشعین کے قدوہ اور پیشوا ہیں۔

اور ابلیس نے اباء اور استکبار کی سنت سیئہ کو جاری کیا۔ قیامت تک جو شخص بھی حکم خداوندی سے اعراض و انکار کریگا۔ اس سے ابلیس کی ملعونیت اور مطرودیت میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا۔ اس لیے کہ وہ کافرین اور مستکبرین کا امام ہے اور احکام خداوندی پر اعتراض کرنے والوں کا پیشوا ہے۔ شیخ ابو العباس مرسی جو کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے شیخ ہیں بعض اوقات یہ فرمایا کرتے تھے کہ معاذ اللہ حضرت آدم نے خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ یہ معصیت اس بدبخت ذریت نے کی جو حضرت آدم کی پشت میں مستور تھی اس لیے کہ حضرت آدم کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں ان کی تمام صالح اور طالح ذریت سوار تھی۔

حافظ ابن قیم قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ جب کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو بظاہر اس کو ذنب اور معصیت میں مبتلا کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ ایک باطنی مرض یعنی عجب اور خود پسندی کا علاج ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ذنب اور معصیت میں مبتلا ہونا ہزاروں طاعتوں سے زائد نافع اور مفید ہوتا ہے اور صاحب بصیرت کے نزدیک یہ معصیت دافع ضرر اور صواب اور سلامتی کا مصداق ہوتی ہے جیسا کہ جانتے ہیں کہ بعض مرتبہ صحت اور عافیت اتنی مفید اور کارآمد نہیں جتنا مرض مفید اور کارآمد ہو جاتا ہے اس لیے کہ مرض کے آتے ہی طبیعت فوراً پرہیز اور علاج کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے اور طبیب حاذق کے مشورہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ تنقیہ اور مسہل کو شروع کر دیا جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند ہی روز میں تمام فاسد اور ردی مادہ خارج ہو کر طبیعت پہلے سے زائد صاف اور ٹھیک ہو جاتی ہے اس کے بعد پھر جب لذائذ و طیبات۔ فواکہ و مفرحات لطیف غذاؤں اور مقوی دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے تو اس قدر قوی ہو جاتا ہے کہ اس مرض سے قبل بحالت صحت بھی اتنا قوی نہ تھا۔

اسی طرح حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اس معصیت میں مبتلا ہو کر مسلسل تین سو سال تک توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری کرتے رہنا (جیسا کہ بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے) بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو گیا چنانچہ حق تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں۔

وَعَصٰىٓ اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى	آدم نے اپنے پروردگار کی حکم عدولی
ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ	کی ۔ پس [illegible] کی غیبی

فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ

قصور ہو گئی پھر خدا نے انکو برگزیدہ بنایا اور ان پر خاص توجہ فرمائی اور ان کی رہنمائی کی۔

کیا ہر معصیت سے انسان معاذ اللہ خدا کا مبغوض اور برگزیدہ بندہ بن جاتا ہے۔ حاشا ثم حاشا ہاں ایسی معصیت کے بعد خدا کے فضل و رحمت سے مجتبیٰ اور برگزیدہ بن سکتا ہے جس معصیت کے بعد آدم علیہ السلام جیسی ندامت اور شرمساری اور تضرع اور زاری ظہور میں آئے، ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ دار رضاہ ایک صحابی تھے حضرات صحابہ میں انکو کوئی خاص شان امتیازی حاصل نہ تھی، بمقتضائے بشریت زنا میں مبتلا ہو گئے۔ مگر بعد میں اس درجہ صمیم قلب اور اخلاص سے توبہ کی کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس توبہ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ماعز اسلمی کی توبہ تمام امت پر تقسیم کی جائے تو تقسیم سب کی نجات کے لیے کافی اور وافی ہوگی۔ زنا بیشک معصیت تھا مگر ماعز اسلمی کی مضطربانہ اور بیتابانہ ندامت اور شرمساری اور گریہ وزاری نے اس کو عند اللہ ایسا مقبول اور محبوب بنادیا کہ سارے عالم کی مغفرت و رحمت اس پر فدا اور قربان ہے۔ ماعز اسلمی کو زنا کے سبب سے جو عند اللہ تقرب حاصل ہوا وہ اب بڑے سے بڑے ولی کو نماز سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ خوب سمجھ لو کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ اس مثال سے معاذ اللہ یہ مقصد نہیں کہ حضرات انبیاء بھی اس قسم کے کبائر میں مبتلا ہوتے ہیں اس لیے کہ ہم اس ابتداء ہی میں بتلا چکے ہیں کہ انبیاء کرام کبائر سے بالکلیہ معصوم ہوتے ہیں۔ اس مثال سے صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ بعض مرتبہ زلّت اور معصیت کا صدور طاعت سے زیادہ نفع بخش ہوتا ہے اور وہ معصیت بجائے منقصت کے رفعت شان کا باعث ہو جاتی ہے۔

اسی طرح اس زلّت اور لغزش سے حضرت آدمؑ کی شان میں کوئی کمی نہیں آئی بلکہ توبہ اور استغفار کے مقرون ہو جانے کی وجہ سے انکی شان اور بلند ہو گئی۔ اور گویا کہ بزبان حال حضرت آدمؑ سے اس وقت یہ کہا جا رہا تھا۔

يا آدم لا تجزع من كاس زلل كانت سبب كيسك فقد استخرج منك داء عجب لا يصلح ان تجاورنا به والبست به حلة العبودية.	اے آدم تو اس لغزش کے پیالہ سے مت گھبرا کہ جو تیری ہوشیاری اور احتیاط کا سبب بنا اسی کی وجہ سے تجھ سے وہ عجب کی بیماری نکال دی گئی جس کے ساتھ ہماری مجاورت ناممکن ہے اب اس کے بعد تم کو عبودیت اور بندگی

ف اشارہ اس طرف ہے کہ غویٰ کے معنی گمراہ ہونے کے نہیں بلکہ عیش کا مکدر ہونا مراد ہے (لسان العرب مادہ غوایت)

کو علم اور صحت عطا کیا گیا۔

(شعر) لعل عتبك محمود عواقبه
وربما صحت الاجسام بالعلل
یا آدم ذنب تذل به لدیه
احب الینا من طاعة تدل
بها علینا یا آدم انین
المذنبین احب الینا
من تسبیح المدلین۔
(مدارج السالکین ص ۱۹۲ ج ۱)

ترجمہ شعر: امید ہے کہ تیرے عتاب کا انجام نہایت اچھا اور بہتر ہو گا اور بسا اوقات بیماریوں سے اجسام پہلے سے زیادہ تندرست ہو جاتے ہیں۔ اے آدم وہ گناہ جس سے تو ہمارے نزدیک ذلیل ہو وہ اس طاعت سے بڑھ کر محبوب ہے جس پر تو ناز کرے اور اے آدم گنہگاروں کی آہ و زاری ہمارے نزدیک نازو الوں کی تسبیح و تہلیل سے بڑھ کر محبوب ہے۔

مرکب توبہ عجائب مرکب است
بر فلک تازد بیک لحظہ زپست
چوں برآرند از پشیمانی انین
عرش لرزد از انین المذنبین

ولی اور رسول میں فرق

ولایت تقویٰ اور عبادت کی ایک منزل (ڈگری) ہے جو بندہ کی جد و جہد اور سعی اور اکتساب سے ملتی ہے اور نبوت و رسالت ایک عہدہ اور منصب ہے جو بدون حکم خداوندی کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ولایت بمنزلہ ایک سند کے ہے کہ جو امتحان سے فراغت کے بعد مل جاتی ہے اور نبوت و رسالت بمنزلہ عہدہ کے ہے محض قابلیت سے خود بخود کوئی وزیر اور سفیر نہیں بن جاتا جب تک شاہی فرمان نہ ہو۔ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اولیاء کی تعریف میں حق تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد وارد ہوا ہے اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ۔ اور رسول کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ۔ غرض حاصل ولایت اتقاء ہے (جو بندہ کا فعل ہے) اور اتقاء بمعنی الفاعل ہے اور ارتضاء بمعنی المفعول کو مستلزم نہیں۔ تیر اور تلوار سے ہر ایک بچنے کی اپنی سی تدبیر کرتا ہے مگر اس پر بھی کبھی زخمی ہو ہی جاتا ہے اور حاصل رسالت کا ارتضاء ہے کیونکہ من رسول بیان ہے من ارتضیٰ کا۔ معلوم ہوا کہ رسول اللہ کا مرتضیٰ ہوتا ہے اور ارتضاء فعل خداوندی ہے کیونکہ ارتضیٰ کا فاعل ضمیر راجع الی اللہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اطاعت سے راضی ہوتے ہیں اور معصیت سے ناخوش۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ

معلوم ہوا کہ رسول کے لیے من کل الوجوہ مرتضیٰ ہونا ضروری ہے اور من کل الوجوہ ارتضاء ربی حاصل معصومیت کا ہے۔ (ماخوذ از البیین صفحہ حصہ دوم)

فائدہ حق جل شانہ نے قرآن کریم میں انبیاء کی لغزشوں کو اس لیے بیان فرمایا ہے کہ ان حضرات کی شان اور مرتبہ معلوم ہو کہ یہ حضرات خدا تعالیٰ کے اس درجہ مقرب تھے کہ ذرا ذرا سی بات پر مواخذہ ہوتا تھا اور وہ خدا ذرا ذرا سی بات پر ایسے ڈرتے تھے جیسے کوئی مواخذہ سے لرزاں اور ترساں رہتے تھے حضرات انبیاء کی یہ لغزشیں ہی درحقیقت ان کی معصومیت کی دلیل ہیں جس شخص کا مرتبہ جس قدر بلند ہوتا ہے اسی قدر اس کی معمولی سی بات بھی غیر معمولی بن جاتی ہے۔

عصمتِ انبیاء اور حفاظتِ اولیاء میں فرق

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرام ہر وقت بارگاہ خداوندی میں مقیم رہتے ہیں کسی وقت حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور جلال ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء معاصی سے معصوم ہوتے ہیں اور اولیاء اللہ بارگاہ خداوندی میں آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقیم نہیں اس لیے اولیاء معاصی سے محفوظ تو ہوتے ہیں مگر معصوم نہیں ہوتے اور عصمت اور حفاظت میں یہ فرق ہے کہ اولیاء بسا اوقات مباحات اور جائز امور کو محض حظ نفس اور طبعی میلان اور خواہش کی وجہ سے کر گزرتے ہیں مگر حضرات انبیاء کسی وقت بھی طبعی میلان اور حظ نفس کے لیے مباح اور جائز امر کا ارتکاب نہیں فرماتے۔ ہاں جب کسی شئی کی منجانب اللہ اباحت اور اس کا خدا کے نزدیک جائز ہونا بتلانا مقصود ہوتا ہے تب اس مباح کو استعمال فرماتے ہیں تاکہ امت کو نبی کے کرنے سے اس فعل کا مباح اور جائز ہونا معلوم ہو جائے اور جس طرح نبی پر فرض کی تبلیغ فرض ہے اسی طرح فعل مباح اور امر جائز کی اباحت اور جواز کا بتلانا بھی فرض ہے یہی وجہ ہے کہ نبی کو ایک فعل مباح پر بھی فرض ہی کا ثواب اور اجر ملتا ہے اس لیے کہ نبی کے ذمہ مباح کی اباحت کا بتلانا بھی فرض ہے۔

اب ہم حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی عصمت کے کچھ دلائل ذکر کرتے ہیں جو زیادہ تر امام فخر الدین رازی قدس اللہ سرہ کی تفسیر کبیر سے لیے گئے ہیں۔

دلائل عصمت انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام

دلیل اوّل قال اللہ تعالیٰ مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ جس شخص نے رسول کی اطاعت کی

فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ — پس تحقیق اس نے اللہ ہی کی اطاعت کی۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ — اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

پہلی آیت میں رسول کی اطاعت کو اپنی ہی اطاعت قرار دیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم کی اطاعت کو عین اطاعت خداوندی نہیں کہا جا سکتا۔ اطاعت رسول اور اطاعت خداوندی میں اتحاد اور عینیت جب ہی ممکن ہے جب رسول حق جل وعلا کی معصیت کے شائبہ سے بھی بالکلیہ پاک ہو اور تاکید و تحقیق کے لئے کلمۂ قد کا اضافہ فرمایا تاکہ کوئی شخص اطاعت حق جل شانہ اور اطاعت رسول میں کسی قسم کی تفریق نہ قائم کرے کما قال سبحانہ وتعالیٰ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا۔

اور دوسری آیت میں رسول کی علی الاطلاق اطاعت کا حکم دیا ہے۔ اور اس پر رحمت کا وعدہ فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ غیر معصوم شخص کی اطاعت کا علی الاطلاق کسی طرح حکم نہیں دیا جا سکتا اور اسی وجہ سے کہ خلفاء اور امراء معصوم نہیں علی الاطلاق ان کی اطاعت کا حکم نہیں دیا بلکہ ان کی اطاعت کا یہ معیار مقرر ہوا۔

السمع والطاعة حق ما لم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة (بخاری) — امیر کی سننا اور اس کی اطاعت ضروری ہے جب تک معصیت کا حکم نہ کیا جائے۔ اور امیر جب معصیت کا حکم کرے تو پھر اس کی اطاعت نہیں۔

اور جن آیات میں نبی کی اطاعت کا حکم دیا ہے ان میں کسی جگہ مالم یؤمر بمعصیۃ (جب تک معصیت کا حکم نہ دیا جائے) کی قید نہیں اضافہ کی گئی جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی کا کوئی فعل معصیت ہوتا ہی نہیں تاکہ امراء اور خلفاء کی طرح ان کے اتباع میں یہ قید لگائی جائے اور علیٰ ہذا غیر معصوم شخص کی علی الاطلاق اطاعت بلا قید مذکور رحمت خداوندی کا سبب بھی نہیں ہو سکتی۔

دلیل دوم

نیز اگر انبیاء کرام معاصی سے معصوم نہ ہوں تو معاذ اللہ انبیاء کرام کا غیر مقبول الشہادۃ ہونا لازم آئے گا اس لئے کہ عاصی فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی شہادت مقبول نہیں لقولہ تعالیٰ۔ اِنْ جَاۗءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا۔ تو پھر قیامت کے دن بمقابلہ امم حضرات انبیاء کی شہادت کیسے مقبول ہوگی حالانکہ قرآن عزیز میں ہے کہ ہر نبی قیامت کے دن اپنی امت پر گواہی دے گا۔ کما قال تعالیٰ۔

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۔

پس کیا حال ہوگا جب کہ ہم بلائیں گے ہر امت میں سے گواہی دینے والا اور حال کا بیان کرنے والا اور تجھ کو ان سب پر گواہ بنائیں گے۔

دلیل سوم

نیز بصورت مفروضہ نبی کا مستحق عذاب الٰہی اور مستحق لعنت ہونا لازم آتا ہے جو ایک عاصی اور گنہگار کا حکم ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

(۱) وَمَنْ يَعْصِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ فَإِنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا ۔

جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو تحقیق اس کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

(۲) أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ ۔

خبردار اللہ کی لعنت ہے نافرمانوں پر

حالانکہ کوئی نبی کسی کے نزدیک مستحق عذاب اور مستحق لعنت نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جو شخص عذاب الٰہی اور لعنت خداوندی کا مستحق ہو وہ نبی اور رسول تو درکنار متقی اور صالح بھی نہیں ہو سکتا۔

دلیل چہارم

نیز حضرات انبیاء کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو حق جل شانہ کی اطاعت کی طرف بلائیں پس اگر وہ خود اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بندے نہ ہوں تو وہ اس آیت کے مصداق ہوں گے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔

کیا تم دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور اپنے آپ کو بھولتے ہو حالانکہ تم کتاب اللہ کو پڑھتے رہتے ہو پس کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ ۔

کیوں کہتے ہو وہ باتیں جو تم خود نہیں کرتے دوسروں کو کہنا اور خود نہ کرنا یہ اللہ کے نزدیک سخت مذموم اور اس کے غضب اور ناراضی کا سبب ہے۔

حالانکہ یہ بات ایک ادنیٰ واعظ اور معلم عالم کے لیے بھی مناسب نہیں حضرات انبیاء و مرسلین کی شایان شان کیسے ہو سکتی ہے۔

دلیل پنجم

نیز اگر انبیاء کرام سے کبائر و معاصی کا صدور جائز رکھا جائے تو پھر معاذ اللہ انبیاء کو معاصی پر تعزیر اور زجر و توبیخ اور ایذاء رسانی بھی جائز ہونی چاہیے جو خدائے عز و جل کے نافرمانوں کے لیے لازم اور ضروری ہے حالانکہ نبی کو کسی قسم کی ایذا اور تکلیف پہنچانا

دنیا اور آخرت کی لعنت اور عذاب الیم کا سبب ہے کما قال تعالیٰ۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ۔ — بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت ہو۔

(۲) وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ۔ — جو لوگ اللہ کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لیے نہایت ہی دردناک عذاب ہے۔

دلیل ششم نیز انبیاء کرام کا تمام گنہگاروں سے زائد مستحق عذاب ہونا لازم آئے گا۔ اس لیے کہ انبیاء کا مرتبہ سب سے بلند ہے اس لیے انبیاء سے معصیت کا صدور بھی بہت بڑا سمجھا جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ جاریہ پر بمقابلہ حرہ نصف حد آتی ہے اور ازواج مطہرات پر رجم اور غیر محصن پر مضاعف جلد ہے۔ اور ازواج مطہرات کے لیے ارشاد ہے۔

يَا نِسَاءَ النَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ۔ — اے نبی کی عورتو! تم میں سے جو صریح بے حیائی کا کام کرے تو اس کو دو چند مار ہوگی۔

اور ظاہر ہے کہ نبوت اور رسالت سے کوئی اعلیٰ اور ارفع مرتبہ نہیں پس اگر انبیاء سے بھی معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو پھر نبوت و رسالت کے منصب کے مناسب انہی کو سب سے زائد معذب اور معتوب اور مغضوب خداوندی ماننا لازم آئے گا۔ اور جب نبی ہی معاذ اللہ خدا کا معتوب اور مغضوب ٹھہرا تو پھر محبوب الٰہی کون ہوگا۔

دلیل ہفتم نیز معصیت کا صدور ہمیشہ اتباع شیطان ہی کی وجہ سے ہوتا ہے پس اگر نبی معصوم نہ ہو تو نبی کا متبع شیطان ہونا لازم آئے گا۔ کما قال تعالیٰ۔

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ۔ — اور ابلیس نے ان پر اپنے گمان کو سچ کر دکھایا سوائے تھوڑے سے ایمانداروں کے لوگ اسکے پیرو ہو گئے۔

حالانکہ ان کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ لوگ شیطان کے اتباع سے محفوظ رہیں۔

دلیل ہشتم نیز غیر نبی کا نبی سے افضل ہونا لازم آئے گا اس لیے کہ آیت بالا میں متبعین شیطان سے مؤمنین کے ایک فریق کو مستثنیٰ فرما دیا گیا ہے لہٰذا یہ فریق جو اتباع شیطان سے محفوظ ہے اگر حضرات انبیاء کا فریق ہے تو ان کا معصوم ہونا ثابت ہو گیا جو مراد

اور اگر حضرات انبیاء کے سوا کوئی اور جماعت ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ایک گروہ مؤمنین کا ایسا بھی ہے جو اتباع شیطان سے بری ہے مگر معاذ اللہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اتباع شیطان سے بری نہیں اور ظاہر ہے کہ جو شخص اتباع شیطان سے بری ہو گا وہ اس شخص سے یقیناً افضل ہو گا جو اتباع شیطان سے بری نہیں کما قال تعالیٰ۔ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ.

دلیل نہم

حق تعالیٰ شانہ نے بندوں کو دو قسموں پر تقسیم فرمایا ہے ایک حزب الشیطان یعنی شیطان کا گروہ کما قال تعالیٰ۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ۔ — یہ شیطان کا گروہ ہے آگاہ ہو جاؤ شیطان کے گروہ والے ہمیشہ خراب ہوتے ہیں۔

دوسرے حزب اللہ یعنی اللہ کا گروہ۔ کما قال تعالیٰ۔

أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ — یہ اللہ کا گروہ ہے اور آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ ہی کا گروہ کامیاب ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر نبی سے معاصی کا صدور روا رکھا جائے تو نبی کو معاذ اللہ بجائے حزب اللہ اور مفلحین کے حزب الشیطان اور خاسرین کی جماعت اور گروہ میں شمار کرنا لازم آئے گا۔

دلیل دہم

حق تعالیٰ شانہ نے خود ابلیس سے نقل فرمایا ہے کہ سب کے اغواء سے بجز مخلص بندوں کا گروہ مستثنیٰ ہے کما قال تعالیٰ۔

فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ۔ — قسم ہے تیری عزت کی سوائے عباد مخلصین کے سب کو گمراہ کروں گا۔

اور من کل الوجوہ عباد مخلصین کا مصداق صرف حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی ہیں جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم الصلوٰۃ والسلام کی شان میں ہے۔ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُم بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِينَ.

دلیل یازدہم

حق تعالیٰ شانہ نے جا بجا قرآن عزیز میں انبیاء کرام کو بلا کسی تخصیص کے مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا ذکر فرمایا ہے یعنی یہ ہی ہمارے منتخب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ کہیں بھی نہیں فرمایا کہ فلاں امر اور فلاں صفت میں یہ ہمارے برگزیدہ ہیں۔ یا فلاں وصف کے اعتبار سے یہ ہمارے منتخب بندے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ حضرات کسی خاص صفت یا کسی خاص فعل کے لحاظ سے برگزیدہ نہیں بلکہ تمام افعال و اقوال کے اعتبار سے

منتخب اور برگزیدہ ہیں کما قال تعالیٰ۔

وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ	اور تحقیق وہ ہمارے نزدیک منتخب اور چنے ہوئے اور نیک لوگوں میں سے ہیں

اور ظاہر ہے کہ جس کو من کل الوجوہ خدا کا برگزیدہ اور بہترین مصطفیٰ اور مجتبیٰ ہونا صدور معاصی کے بالکل منافی اور مباین ہے۔

دلیل دوازدہم نیز حق تعالیٰ شانہ نے حضرات انبیاء کی یہ شان ذکر فرمائی ہے۔

يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ	وہ بھلائیوں اور نیک کاموں میں نہایت تیز رو ہیں۔

اور الخیرات کو معرف بلام الاستغراق ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام سے سوائے خیر محض کے کسی امر کا صدور ہوتا ہی نہیں۔

دلیل سیزدہم ہر عاصی اور گنہگار کو شرعاً اور عرفاً ظالم کہنا جائز ہے اور قرآن عزیز میں بکثرت خدا کے نافرمانوں کو ظالم کہا گیا ہے لہذا اگر نبی سے بھی معاصی کا صدور جائز ہو تو نبی کو بھی معاذ اللہ ظالم کہنا جائز ہوگا۔ حالانکہ ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ کما قال تعالیٰ

لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ	میرا منصب ظالموں کو نہیں ملتا۔

کیونکہ اس آیت میں اگر عہد سے نبوت و رسالت مراد ہے تو صاف ظاہر ہے کہ گنہگار اور ظالم کبھی نبی اور رسول نہیں ہو سکتا۔ اور اگر ولایت یا امامت ہے تب بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ جب امامت اور ولایت بھی کو نبوت و رسالت سے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو دریائے عظیم کے ساتھ ہے جب وہی ظالم اور عاصی کو حاصل نہیں ہو سکتی تو نبوت و رسالت کا عظیم الشان اور جلیل القدر منصب کہاں حاصل ہو سکتا ہے۔

دلیل چہاردہم قال تعالیٰ

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ	جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک اور صاف کرتا ہے۔

پس جو نبی خود معصیت سے پاک نہیں تو وہ دوسروں کو کیسے مزکی اور پاک اور مطہر یعنی پاک اور صاف بنا دیتا ہے۔

دلیل پانزدہم نیز نبی تو منجانب اللہ امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور عملی نمونہ

شانہ کی اطاعت اور اخلاق خداوندی کا بہترین نمونہ ہوتا ہے تاکہ لوگ بے چون وچرا اس کا اتباع کریں اور اس کی ہر حرکت اور سکون اور اس کے ہر قول اور فعل کو اپنے لیے راہ عمل سمجھیں۔ کما قال تعالیٰ۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ وَذَكَرَ اللَّهَ كَثِيرًا	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں عمدہ نمونہ ہے ان کو دیکھ کر اللہ کی اطاعت کریں یہ اس کے لیے ہے جو اللہ سے اور یوم آخرت سے ڈرے اور اللہ کو بہت یاد کرے۔

اور اخلاق خداوندی اور اطاعت ربانی کا نمونہ اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے اسوۂ حسنہ وہی شخص ہو سکتا ہے جو حق جل وعلا کی معصیت اور نافرمانی سے بالکلیہ پاک اور منزہ ہو۔

دلیل شانزدہم کوئی شخص اگر نبی اور پیغمبر کی موجودگی میں کوئی کام کرے اور نبی اس فعل پر سکوت کرے تو نبی کا یہ سکوت بالاجماع اس فعل کے جواز کی دلیل سمجھا جاتا ہے پس جب نبی کا سکوت ہی اس فعل کو معصیت سے خارج کر کے جواز اور اباحت کی حد میں داخل کر دیتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نبی کا فعل معصیت سے خارج نہ ہو۔

دلیل ہفدہم بعض لوگوں نے جب اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا یہ آیت نازل ہوئی۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ	اے محمد آپ یہ فرما دیجیے کہ اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو۔ اللہ تم کو محبوب رکھے گا اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کریگا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ کے اتباع کو اپنی محبت کا معیار قرار دیا ہے اور پھر آپ کی اتباع پر دو وعدے فرمائے ہیں۔
ایک یہ کہ اگر تم ہمارے نبی کا اتباع کرو گے تو ہم تم کو محبوب بنالیں گے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے گناہوں کی مغفرت کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ کی محبت کا معیار ایسے ہی شخص کا اتباع ہو سکتا ہے جو معصوم ہو ورنہ ایک عاصی اور گنہگار کا اتباع محبت خداوندی کا معیار کیسے بن سکتا ہے اور نہ محبت الٰہی اور مغفرت ذنوب کا سبب ہو سکتا ہے۔

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي

ہم نے کہا تم اترو یہاں سے سارے پھر کبھی پہنچے تم کو میری

هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

طرف سے راہ کی خبر تو جو کوئی چلا میرے بتائے پر نہ ڈر ہو گا

يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا

انکو اور نہ انکو غم اور جو منکر ہوئے اور جھٹلائیں ہماری نشانیاں وہ

أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٣٩﴾

ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے

اعادۂ حکم ہبوط

قال تعالیٰ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ...... الی ...... هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۔

گزشتہ آیت میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ کا قبول ہونا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ توبہ قبول ہونے کے بعد بھی آدم علیہ السلام کو بہشت میں آنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ دنیا میں ہدایت اور حضرات انبیاء و مرسلین کی بعثت کا سلسلہ جاری کرنا ہے تاکہ اطاعت اور نافرمانی کا مادہ ظہور میں آجائے چنانچہ ہم نے انکو حکم دیا کہ تم فی الحال اسی جگہ رہو جہاں تم کو بہشت سے اتارا گیا ہے یعنی فی الحال دنیا ہی میں رہو سر دست بہشت میں جانے کی اجازت نہیں تم سب کے سب فی الحال اسی جگہ رہو اس لیے کہ اگر تم کو اسی وقت بہشت میں جانے کی اجازت دی جاتی تو سب کا اجتماع ایک جگہ نہ رہتا تمہارا یکجائی اجتماع مبدل بہ تفرقہ ہو جاتا کیونکہ حضرت آدم کی پیروی کرنے والوں کو جنت میں پہنچا دیا جاتا اور بدوں اور بدکاروں کو زمین میں چھوڑ دیا جاتا پھر دوزخ میں پہنچا دیا جاتا اور یہ تفرقہ مقصد اور غرض کے منافی ہے۔ اتارنے سے مقصود تکلیف احکام اور طاعت و فرمانبرداری کا امتحان ہے پس زمین میں اتارنے سے مقصد ہی یہ ہے کہ امر و نہی کے ذریعہ سے تمہارا امتحان کریں۔ پس اے اولاد آدم خوب سمجھ لو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے پس جو لوگ میری ہدایت کا اتباع کریں ان پر نہ آئندہ کا کوئی ڈر ہو گا کہ مثلاً یہاں سے نکالے جائیں اور نہ گزشتہ پر وہ مغموم و محزون ہوں گے مثلاً یہ حسرت کہ ہم سے فلاں راحت اور لذت فوت ہو گئی وہاں پہنچ کر ایسی لذتیں اور مسرتیں ہیں کہ دنیا کی ساری لذتیں اور مسرتیں انکے سامنے ہیچ ہو جائیں گی۔

ف پہلی بار ہبوط کا حکم جنت سے اترنے کے لیے تھا اور دوسری بار ہبوط کا حکم زمین

میں مقیم رہنے کے لیے ہے۔

ف خدا کی ہدایت پر چلنے والوں کو اس قسم کا خوف نہ ہوگا جیسا کہ مجرمین اور نافرمانوں کو ہوتا ہے کہ دیکھئے اب جرم کی اب کیا سزا ملتی ہے، اس آیت میں اسی قسم کے خوف کی نفی مراد ہے۔ باقی حق تعالیٰ شانہٗ کی عظمت اور جلال کا خوف وہ سب پر طاری ہوگا انبیاء و مرسلین بھی خدا کی عظمت اور جلال سے کانپتے ہوئے حاضر ہوں گے نیز اس آیت میں بالکلیہ خوف کی نفی نہیں کی گئی بلکہ خوف کے احاطہ اور استیلاء کی نفی کی گئی ہے کیونکہ کلمۂ علیٰ کلام عرب میں استیلاء اور احاطہ کے لیے مستعمل ہوتا ہے پس فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ کے یہ معنی ہوں گے کہ خوف ان پر غالب اور ان کو محیط نہ ہوگا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر خوف اگرچہ غالب نہ ہوگا مگر کسی نہ کسی قسم کا خوف ضرور ہوگا وہ خوف خدا کی عظمت اور جلال کا ہے نیز اس میں کافروں کی طرف تعریض بھی ہے کہ قیامت کے دن خوف ان کو محیط ہوگا۔ اور ڈر اور اندیشہ ہر طرف سے ان کو گھیرے ہوئے ہوگا۔ بخلاف اہل ایمان کے کہ ان پر خوف غالب نہ ہوگا۔ اور جو لوگ میری ہدایت سے منکر ہوئے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا ایسے ہی لوگ جہنم والے ہیں جو ہمیشہ اسی میں رہیں گے کبھی بھی اس سے نہ نکلیں گے کما قال تعالیٰ۔ وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ۔

ہبوط آدم علیہ السلام کے اسرار و حکم

گزشتہ آیت یعنی فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ میں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی توبہ اور اس کی اجابت کا ذکر تھا کہ ہم نے آدم کی توبہ قبول کی تو ممکن ہے اس سے یہ شبہ ہو کہ ہبوط اور زمین پر اترنے کا حکم لغزش کی وجہ سے تھا اور بعد قبول توبہ کے بعد وہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے اس لیے ہبوط کے حکم کا پھر اعادہ فرمایا۔ اگرچہ توبہ قبول ہوچکی مگر یہ حکم بحالہٖ باقی ہے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ ہبوط کا حکم لغزش کی وجہ سے نہیں تاکہ قبول توبہ سے اس کے منسوخ ہونے کا خیال یا شبہ کیا جائے بلکہ وہ حقیقت میں اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً کا وعدہ پورا کرنے کے لیے ہے زمین کی خلافت جس کا حضرت آدم سے وعدہ کیا گیا تھا وہ خود اس کو مقتضی ہے کہ ان کو زمین پر اتارا جائے حضرت آدم سے جنت کی خلافت کا وعدہ نہ تھا بلکہ زمین کی خلافت کا وعدہ تھا اس لیے ہبوط کا حکم قبول توبہ کے بعد بھی برقرار رہا۔ بعض عارفین سے یہ منقول ہے کہ جب حضرت حق جل شانہٗ نے حضرت آدم اور حوا کو یہ خطاب فرمایا۔ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ تو اسی خطاب میں خود اس طرف اشارہ تھا کہ حضرت آدم کی خطا میں مبتلا ہو کر جنت سے علیحدہ ہوں گے اور جنت کی یہ سکونت چند روزہ ہے دائمی نہیں جیسا کہ

وَ یٰۤاٰدَمُ اسْکُنْ اَنْتَ وَزَوْجُکَ الْجَنَّۃَ ۔ خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ جنت چند روز کے لیے دار سکونت ہے نہ کہ دار اقامت اس لیے کہ ہمیشہ رہنے والے کے لیے امر و نہی ظروف اور ملک الموت کے احکام نہیں جاری ہوتے اس کے علاوہ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اتارنے میں اور بھی بہت حکمتیں ہیں ۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کے اسماء حسنیٰ میں سے غفور اور رحیم، عفو اور حلیم، خافض اور رافع، معز اور مذل بھی ہیں ۔ اس لیے حق تعالیٰ شانہٗ کی حکمت بالغہ اس کو مقتضی ہوئی کہ کوئی دار اور محل ایسا ہونا چاہیے جس میں ان اسماء حسنیٰ اور صفات علیا کے آثار ظاہر ہوں جس کے لیے چاہے مغفرت کرے اور جس پر چاہے رحم کرے جس کو چاہے پست کرے اور جس کو چاہے بلند کرے، جس کو چاہے عزت دے جس کو چاہے ذلت دے اس لیے حضرت آدم اور ان کی ذریت کو جنت سے زمین پر اتارا تاکہ ان اسماء حسنیٰ کے آثار ظاہر ہوں جن کے ظہور کے لیے دار دنیا ہی مناسب ہے نہ کہ دار آخرت ۔

نیز حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پشت میں وہ لوگ بھی تھے جو جنت میں رہنے کے اہل نہ تھے ۔ حضرت آدم کی پشت بمنزلہ سفینہ کے تھی جس میں نیک و بد ہر قسم کے لوگ سوار تھے اس لیے دنیا میں اترنے کا حکم ہوا تاکہ خبیث کو طیب سے اور شقی کو سعید سے اور مومن کو کافر سے جدا اور الگ کیا جائے اور پھر خبیثین کو دار الخبیثین یعنی جہنم میں اور طیبین کو دار الطیبین یعنی جنت میں بسائے کما قال تعالیٰ ۔

لِیَمِیْزَ اللّٰہُ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ۔ تاکہ اللہ خبیث کو طیب سے جدا کر دے ۔

اور تاکہ ان اشقیاء اور خبیثین کے مقابلہ میں انبیاء و مرسلین اور عباد و صالحین کا سلسلہ جاری ہو ۔ دوستوں کا دشمنوں کے ذریعہ امتحان ہو جو حبیب اللہ کے مخلص بندے اس کی راہ میں جان و مال کو خرچ کریں ۔ اور اس کے دشمنوں سے اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال کریں جانبازی اور سرفروشی سے کسی قسم کا دریغ نہ کریں خدا کے دوستوں سے دوستی اور اس کے دشمنوں سے دشمنی کریں تو حق تعالیٰ شانہ ان کو درجات عالیہ اور اپنے قرب اور رضا و خوشنودی سے سرفراز فرمائے ۔

نبوت و رسالت، امامت اور خلافت شہادۃ فی سبیل اللہ اور حب فی اللہ اور بغض فی اللہ خدا کے دوستوں سے محبت اور موالات ۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت اور بیزاری اور دشمنی اور معاداۃ یہ تمام فضائل و کمالات زمین ہی پر اتارے جانے کے نتائج و ثمرات ہیں ۔ جنت میں یہ باتیں کہاں ممکن تھیں

ہبوط آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسرار و حکم کی اگر تفصیل درکار ہے تو حافظ شمس الدین ابن قیم قدس اللہ سرہٗ کی تصنیف لطیف یعنی مفتاح دار السعادۃ کا مطالعہ فرمائیں ۔ حافظ موصوف

مدارج السالکین میں فرماتے ہیں۔

يا آدم انما ابتليتك بالذنب لاني احب ان اظهر فضلي وجودي وكرمي على من عصاني۔ لو لم تذنبوا لذهب الله بكم ولجاء بقوم يذنبون فيستغفرون فيغفر لهم يا آدم اذا عصمتك وعصمت بنيك من الذنوب فعلى من اجود بحلمي وعلى من اجود بعفوي ومغفرتي وتوبتي وانا التواب الرحيم يا آدم لا تجزع من قولي لك اخرج منها فلك خلقتها ولكن اهبط الى دار المجاهدة وابذر بذر التقوى وامطر عليه سحائب الجفون فاذا استحصد واستغلظ واستوى على سوقه فتعال فاحصد يا آدم ما اهبطتك من الجنة الا لتتوصل اليّ في العمري وما خرجتك منها نفياً لك عنها ما اخرجتك عنها الا لتعود۔

اے آدم میں نے تجھ کو گناہ میں مبتلا کیا اس لیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فضل اور جود و کرم کو گنہگاروں پر ظاہر کروں حدیث میں ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے تو اللہ تعالیٰ تم کو فنا کر دیتا اور ایسی قوم کو پیدا کرتا جو گناہ کر کے خدا سے مغفرت طلب کرتے اور خدا ان کی مغفرت فرماتا اے آدم تجھ کو اور تیری ذریت کو اگر معصوم بنا دوں تو اپنا حلم اور عفو و کرم اور مغفرت و معافی کس پر ظاہر کروں حالانکہ میں تواب رحیم ہوں مجھ کو منظور ہے کہ گنہگار موجود ہوں تاکہ میں انکی توبہ قبول کروں اور ان پر رحم کروں۔ اے آدم میرے (اخرج منہا) کہنے سے گھبرا مت۔ اس لیے کہ جنت تو میں نے تیرے ہی لیے پیدا کی ہے لیکن اس وقت تم مجاہدہ اور ریاضت کے لیے زمین پر اترو جو تمہارے لیے بمنزلہ خانقاہ یا غار کے ہے اور زمین آسمان کے اعتبار سے بمنزلہ غار ہی کے ہے۔ اور یہاں تم تقویٰ کے تخم کی کاشت کرو اور چشم گریاں کی بارش سے اس کو سیراب کرو جب یہ دانہ قوی اور مضبوط ہو جائے اور اپنے تنے پر کھڑا ہو جائے تو اس کو کاٹ لو۔ اے آدم تجھ کو اس لیے جنت سے اتارا تاکہ تیرے درجات اور مدارج اور بلند ہوں۔ اور جنت سے چند روز

شعر

ان جری بیننا و بینک عتب
و تناءت منا و منک الدیار
فالوداد الذی عهدت مقیم
والعثار الذی اصبت جبار
(مدارج السالکین ص ۱۹۶ ج ۱)

کے لیے اس لیے نکالا تاکہ اس سے بہتر حالت میں جنت کی طرف لوٹ کر آئے۔

ترجمۂ شعر: اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں کوئی رنجش چل آئی ہے اور اگر ہمارے اور تیرے درمیان میں منزلوں کا فصل ہو گیا ہے تو کوئی پریشانی کی بات نہیں اس لیے کہ محبت و مودت کا تعلق اسی طرح باقی ہے اور جو لغزش تم سے ہو گئی ہے اس کا تدارک ہو سکتا ہے

فوائد مستنبطہ از قصۂ آدم صلی اللہ علی نبینا وعلیہ وبارک وسلم وشرف وکرم

ف ۱: قرآن کریم کے ظاہر سیاق و سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم اللہ کے نبی اور رسول مکرم تھے یعنی ایسے رسول تھے جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا چنانچہ حدیث میں ہے۔

اخرج الطبرانی و ابو الشیخ فی العظمۃ و ابن مردویہ عن ابی ذر قال قلت یا رسول اللہ ارأیت آدم أنبیا کان قال نعم کان نبیا رسولا کلمہ اللہ قبلہ قال یا آدم اسکن انت و زوجک الجنۃ۔

طبرانی اور ابو الشیخ نے کتاب العظمۃ میں اور ابن مردویہ نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا حضرت آدم نبی تھے؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہاں نبی بھی تھے اور رسول بھی جن سے اللہ نے بالمشافہ کلام فرمایا اور یہ کہا کہ یَآ اٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

و اخرج عبد بن حمید و الآجری فی الاربعین عن ابی ذر قال یا رسول اللہ من کان اولہم یعنی الرسل قال آدم قلت یا رسول اللہ انبی مرسل قال نعم خلقہ اللہ بیدہ

اور عبد بن حمید اور آجری نے اربعین میں ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یا رسول اللہ سب سے پہلے رسول کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ آدم ہیں میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ حضرت آدم کیا نبی مرسل تھے فرمایا کہ ہاں اللہ نے

وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ | ان کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا اور اپنی
وَسَوَّاهُ قِبَلَهٗ۔ | خاص روح ان میں پھونکی اور پھر ان
وکذا فی الدر المنثور صفحہ ۴۷ ج ۱ | کو ٹھیک بنایا۔

ف ۲ افعال خداوندی کے اسرار و حکم سوائے اس علیم و حکیم کے کسی کو معلوم نہیں ملائکہ مقربین کو بھی سوائے سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ کہنے کے کوئی چارہ نہ ہوا۔ عاقل کا کام یہ ہے کہ افعال خداوندی کے اسرار کے درپے نہ ہو۔ ملائکہ کی طرح سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا کہہ کر بے چون و چرا تسلیم کرے۔

گر ز عمرہ آں کہ از بیم تو | کنایہ زبان جز بہ تسلیم تو
زبان تازہ کردن باقرار تو | نینگیختن علت از کار تو

ف ۳ حضرت آدم کی پیدائش سے پہلے ہی ملائکہ کے سامنے حضرت آدم کی خلافت کا ذکر کرکے تعلیم مشورہ کی جانب اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ کام کرنے سے پہلے مشورہ کر لینا چاہیے۔ اگرچہ حق تعالیٰ مشورہ سے بے نیاز ہے۔

ف ۴ استحقاق خلافت کے لیے جب ملائکہ نے نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ کہہ کر تسبیح و تحمید و تقدیس کو پیش کیا تو حق جل شانہ نے ملائکہ کے تسبیح و تقدیس کے جواب میں حضرت آدم کا علمی کمال ظاہر فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم میں مشغول ہونا تسبیح و تہلیل سے افضل اور بہتر ہے مگر شرط یہ ہے کہ وہ علم اللہ کے نزدیک بھی علم ہو۔ اللہ کے نزدیک علم وہ ہے جس سے ہیبت و خشیت اور اس کی عظمت دل میں راسخ ہوتی ہو کما قال تعالیٰ

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ | جز ایں نیست کہ ڈرتے ہیں اللہ سے
الْعُلَمٰۗؤُا۔ | اس کے بندوں میں سے صرف علماء۔

معلوم ہوا کہ خدا کے نزدیک عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہو اور جو خدا سے نہیں ڈرتا وہ اللہ کے نزدیک عالم نہیں اگرچہ سارا عالم اس کو عالم کہے۔ مگر از روئے حق سراپا جہالت۔

ف ۵ ملائکہ کو سجدہ کا حکم دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام ملائکہ سے افضل ہیں۔ اس لیے کہ مسجود ساجد سے افضل ہوتا ہے۔

ف ۶ حدیث میں ہے کہ جب فرشتے صبح اور عصر کی نماز سے یا کسی مجلس ذکر سے لوٹ کر جاتے ہیں تو حق تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں دیکھا تو عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے چھوڑا۔ حکمت اس میں یہ ہے کہ فرشتوں نے ایک بار کہا تھا۔ اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ۔ اور گو یہ قول عام ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ سب ایسے ہی ہوں گے تو فرشتے جو بعض کے مورد تھے ان کے جواب کے لیے سالبہ جزئیہ کا ذکر کافی ہو گیا یعنی

ایک شخص یا ایک جماعت کا پیش کر دینا جو اللہ کی مشیت کا حامل ہو اُن کے موجبہ کلیہ توڑنے کے لیے کافی ہے یہ ضروری نہیں کہ سارے ہی مطیع ہوں قیامت تک اسی طرح متوالی و جلب ہوتا رہے گا۔

ف اعجاب اور استکبار اور اللہ جل جلالہ کے حکم پر اعتراض اور خود ستائی نے ابلیس کو ملعون اور مطرود بنایا اور اطاعت اور انقیاد اور رضا و تسلیم اور عجز اور انکساری اور ندامت اور شرمساری اور توبہ اور استغفار نے حضرت آدم کی شان کو بڑھایا۔

ف نیز اس قصہ سے معلوم ہوا کہ جنت پیدا ہو چکی ہے جیسا کہ اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے معتزلہ کہتے ہیں کہ جنت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔

ف کافر ہمیشہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے کبھی نجات نہ پائیں گے۔

ف غلطی سے خلاف حکم خداوندی عمل کا سر زد ہو جانا معصیت ہے اور حکم خداوندی کو غیر معقول اور خلاف حکمت سمجھنا یہ کفر ہے۔

(۱۱) فائدہ جلیلہ

ترک اطاعت اور ارتکاب معصیت میں فرق

سہل بن عبد اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترک امر یعنی امر الٰہی کا امتثال نہ کرنا اور حکم خداوندی کو نہ ماننا ارتکاب نہی سے زیادہ سخت ہے۔ ابلیس نے حکم الٰہی اور امر خداوندی یعنی حکم سجدہ سے انحراف کیا، ملعون و مردود ہوا اور آدم علیہ السلام نے ایک نہی کا ارتکاب کیا یعنی جس درخت سے کھانے کی ان کو ممانعت کی گئی تھی اس کو کھایا۔ بارگاہ خداوندی سے عتاب ہوا، حضرت آدم کو اس عتاب کی کہاں تاب تھی فوراً ہی توبہ اور استغفار کی اور عجز و نیاز اور گریہ و زاری کے ساتھ اپنے رب کریم سے عفو اور مغفرت کی درخواست کی اللہ نے اپنی رحمت سے توبہ قبول فرمائی اور اجتباء و اصطفاء سے سرفراز فرمایا۔

اوّل یہ کہ ترک امر کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے اس لیے زیادہ سخت ہے کہ ارتکاب نہی کا منشاء ہمیشہ غلبہ شہوت ہوتا ہے اور ترک امر کا منشاء ہمیشہ تکبر اور اعجاب (خود پسندی) ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے کہ جس کے قلب میں ذرہ برابر بھی کبر یعنی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ کبریائی میری رداء ہے اور عظمت میری ازار ہے جو شخص ان میں میری منازعت کرتا ہے میں اس کو کچل ڈالتا ہوں۔ بخلاف اس شخص کے کہ جو ایمان لانے کے بعد شہوات میں بہک جائے وہ ضرور جنت میں داخل ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ

جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں ضرور داخل ہوگا۔ اگرچہ وہ چوری اور زنا کرے۔

دوم ۔ یہ کہ اللہ کے نزدیک امتثال امر اور فعل مامور بہ یعنی حکم الٰہی کا بجا لانا بہ نسبت منہیات سے احتراز اور اجتناب کے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جیسا کہ حدیث میں ہے کہ سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک اپنے وقت پر نماز کا ادا کرنا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ خیر الاعمال یعنی سب سے بہتر عمل ذکر اللہ ہے۔ اسی وجہ سے حق جل شانہ نے جا بجا قرآن کریم میں اپنی محبت کو امتثال احکام اور اوامر کی بجا آوری پر معلق فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا. وقال تعالیٰ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ. وقال تعالیٰ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ وقال تعالیٰ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ. ان آیتوں میں اللہ نے اپنی محبت کو ان لوگوں کے لیے مخصوص فرمایا ہے جو اس کے ان احکام اور اوامر کو بجا لاتے ہیں۔ یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ احسان۔ عدل۔ و اقساط۔ صبر و تحمل یہ سب اللہ کے احکام ہیں۔ ان کی بجا آوری سے اس کی محبت حاصل ہوتی ہے اور محظورات اور منہیات کو حق جل شانہ نے جب کبھی ذکر فرمایا ہے تو محبت کی نفی کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ کما قال تعالیٰ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ وقال تعالیٰ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ. وقال تعالیٰ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ وقال تعالیٰ لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ. وقال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔

سوم ۔ یہ کہ اوامر و احکام کی تعمیل مقصود لذاتہٖ ہے اور منہیات سے بچنا مقصود بالذات نہیں بلکہ فعل مامور بہٖ کی تکمیل کے لیے ہے اس لیے کہ منہیات اور محظورات کا ارتکاب۔ عبادت اور بندگی اور احکام کی بجا آوری میں مخل ہے۔ چنانچہ حق جل شانہ نے تحریم خمر اور تحریم قمار کی علت یہ ذکر فرمائی ہے

یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ.	شراب اور قمار اللہ کے ذکر اور نماز سے تم کو روکتے ہیں پس کیا تم ان سے باز نہ آؤ گے۔

چہارم ۔ یہ کہ طاعات اور مامورات کی بجا آوری ہی روح کی غذا ہے بغیر ایمان و تسلیم اور بغیر اطاعت اور انقیاد کے روح کی حیات ناممکن ہے اور محظورات و منہیات سے بچنا بمنزلہ پرہیز کے ہے پرہیز اس لیے کرایا جاتا ہے تاکہ حیات اور قوت میں فتور نہ آئے۔ اصل مقصود حیات اور پرہیز حیات کی نگہبانی کے لیے ہے۔

پنجم ۔ یہ کہ عبادت جس کے لیے جن و انس کو پیدا کیا گیا۔ وہ امتثال اوامر اور احکام خداوندی

کی بجا آوری ہی کا نام ہے جن وانس کو فقط منہیات اور محظورات سے بچنے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ عبادت اور بندگی اور احکام خداوندی کی تعمیل کے لیے پیدا کیا گیا ہے (زنا اور سرقہ وغیرہ سے باز رہنے کا نام عبادت نہیں بلکہ جو حکم ان الحکم الا للہ نے دیا اس کو دل وجان سے بجا لانے کا نام عبادت اور بندگی ہے۔

ششم یہ کہ ایک حکم کی تعمیل سے دس گنا سے لیکر سات سو گنا بلکہ لا الی نہایۃ ثواب ملتا ہے اور نہی عنہ کے ارتکاب سے صرف ایک گناہ لکھا جاتا ہے اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ ترک امر اور عدم تعمیل حکم کا جرم ارتکاب نہی کے جرم سے کس قدر اعظم ہے۔

ہفتم یہ کہ طاعت اور عبادت اور احکام کی بجا آوری اور ان کا اجر و ثواب تمام تر صفت رحمت سے متعلق ہے، اور محظورات و ممنوعات کا ارتکاب اور ان پر سزا اور عقاب یہ سب صفت غضب اور انتقام سے متعلق ہے اور صفت رحمت صفت غضب پر سابق ہے غضب رحمت پر سابق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نزدیک رحمت عذاب سے اور عفو انتقام سے زیادہ محبوب ہے۔ قال تعالیٰ۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو لکھ لیا ہے یعنی لازم کر لیا ہے

مگر اس ارحم الراحمین نے غضب کو اپنے اوپر لازم نہیں فرمایا۔ وقال تعالیٰ۔

وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً	اللہ ہر چیز کو باعتبار رحمت کے گھیرے ہے

مگر غضب اور انتقام کے اعتبار سے محیط نہیں۔ رحمت اس کی دائمی ہے کبھی منقطع نہیں ہوتی مگر غضب دائمی نہیں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے روز فرمائیں گے۔

ان ربی قد غضب الیوم غضبا لم یغضب قبلہ مثلہ ولن یغضب بعدہ مثلہ۔	میرا پروردگار آج غضبناک ہوا ہے ایسا غضب ہوا کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضب ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ایسا غضب ہوگا۔

ہشتم یہ کہ طاعت وعبادت کے آثار جلد زائل نہیں ہوتے بخلاف منہیات و محظورات کے کہ ان کے آثار بہت جلد زائل ہو جاتے ہیں۔ معاصی اور سیئات کے آثار کبھی عفو اور مغفرت سے اور کبھی توبہ اور استغفار سے زائل ہو جاتے ہیں کبھی اعمال صالحہ اور مصائب سے ان کا کفارہ ہو جاتا ہے اور کبھی شفاعت سے اور کبھی اقارب و احباب کی دعاؤں سے ان معاصی سے درگزر کیا جاتا ہے اور اگر صمیم قلب اور اخلاص کے ساتھ توبہ کرے تو ان سیئات کو حسنات سے بدل

دیا جاتا ہے۔

نہم: یہ کہ نجات کا دار و مدار احکام کی بجا آوری پر ہے۔ اگر کوئی شخص تمام مناہی اور محظورات سے بچتا ہے مگر احکام خداوندی کو نہیں مانتا تو اس کی نجات ناممکن ہے اور اس کے برعکس اگر کوئی شخص احکام خداوندی کو تسلیم کرتا ہے مگر زنا اور چوری اور کسی فحشاء اور منکر سے پرہیز نہیں کرتا تو اس کی نجات ممکن ہے۔

دہم: یہ کہ امر اور احکام سے کسی فعل کا وجود مطلوب ہوتا ہے اور نہی سے کسی شے کا عدم اور ترک مقصود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ عدم میں کوئی کمال نہیں، کمال وجود اور ایجاد ہی میں ہے اسی وجہ سے شریعت کی نظر میں اوامر کا امتثال مناہی کے اجتناب سے زیادہ بہتر ہے اور حکم خداوندی سے سرکشی کرنا معاصی کے ارتکاب سے زیادہ جرم ہے تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ کذا فی کتاب الفوائد صفحہ ۱۱۵ للحافظ ابن القیم قدس اللہ سرہ۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے کیا

عَلَيْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَ

تم پر اور پورا کرو قرار میرا تو میں پورا کروں قرار تمہارا اور

اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ

میرا ہی ڈر رکھو اور مانو جو کچھ میں نے اتارا

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ وَ

سچ بتاتا تمہارے پاس والے کو اور مت ہو تم پہلے منکر اس کے اور

لَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا اور مجھ ہی سے بچتے رہو

ف مترجم گوید خدا تعالیٰ بنی اسرائیل را نعمتہائے خود یاد داد و مخبر ساخت کہ عہد ایں قوم ظاہر شدہ بعد ذکر زمانہ آنحضرت و تنبیہات دریں باب ایشاں خبر دادہ جدا گانہ و ایں عہد مذکور است در تورات قال اللہ تعالیٰ فاوفوا بعہد اللہ ۱۲ فتح الرحمن

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ

اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور یہ کہ چھپاؤ سچ کو

تَعْلَمُوْنَ ۝۴۲ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ

جان کر اور کھڑی کرو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور

ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝۴۳ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ

جھکو ساتھ جھکنے والوں کے کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام

وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا

کا اور بھولتے ہو آپ کو اور تم پڑھتے ہو کتاب پھر کیا

تَعْقِلُوْنَ ۝۴۴ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَ

نہیں سمجھتے اور قوت پکڑو محنت برداشت سے اور نماز سے اور

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ

البتہ وہ بھاری ہے مگر انہیں پر جن کے دل پگھلے ہیں جن کو خیال ہے کہ ان

اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۴۶

کو ملنا ہے اپنے رب سے اور ان کو اسی طرف الٹ جانا ہے

تذکیر اجمالی انعامات خاصّہ بر اسلاف یہود و الزام ایشاں با ایفاء عہود و نہی از دین فروشی و حق پوشی

یعنی ان نعمتوں کا بیان جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں۔

قال تعالیٰ: یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ ... الیٰ ... وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

لے یعنی در جمیع جماعت مصلیان باشید، واللہ اعلم۔ فتح الرحمٰن

(ربط) شروع سورت میں حق تعالےٰ نے متقین اور کافرین اور منافقین کے اوصاف اور احوال بیان کیے۔ بعد ازاں یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا۔ میں خطاب عام فرمایا اور کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں کیا پھر توحید اور رسالت اور قیامت کے دلائل بیان کیے تاکہ عبادت کرکے آخرت کی تیاری کرسکیں بعد ازاں اپنے انعامات کو بیان کیا جو تمام بنی آدم کو عام اور شامل ہیں اب عنان خطاب ایک خاص گروہ یعنی بنی اسرائیل کی طرف پھیرتے ہیں اور ان نعم خاصہ کو بیان کرتے ہیں جو خاص بنی اسرائیل پر مبذول ہوئیں اور منجملہ دیگر قبائل عرب۔ گروہ بنی اسرائیل کو اس لیے خطاب کے لیے مخصوص فرمایا کہ یہ سورت پہلی سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی اور مدینہ میں یہود ایک کثیر تعداد میں آباد تھے یہود کو اگرچہ اوس اور خزرج اور دیگر قبائل عرب کے مقابلہ میں عددی اکثریت حاصل نہ تھی لیکن یہود کو دیگر قبائل کے مقابلہ میں علمی تفوق اور امتیاز حاصل تھا یہ لوگ اہل کتاب اور اہل علم کہلاتے تھے اور خاندان نبوت سے تھے اور مشرکین عرب اُمّی اور ان پڑھ تھے اور اہل علم اگر حق کو قبول کرلیں تو عوام پر اسکا بہت اثر پڑتا ہے اس لیے اس رکوع میں خاص بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا اور اولاً ان نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا جو اس خاندان پر مبذول ہوئی تھیں۔ اور دوسرے رکوع سے ان کی تفصیل فرمائی جو دور تک چلی گئی اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل ان نعمتوں کو یاد کرکے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں اور اپنے رب کریم اور منعم قدیم کے الطاف وعنایات کو یاد کرکے ایفاء عہد کے لیے دل وجان سے تیار ہو جائیں کیونکہ توریت میں نبی آخرالزمان کی بشارتیں اور صفتیں مذکور تھیں اور نبی آخرالزمان پر ایمان لانے کے عہد کا بھی ذکر تھا اور علماء یہود اس سے بخوبی واقف تھے اس لیے مناسب ہوا کہ اولاً اہل علم کو اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے تاکہ اور لوگ بھی انکی تقلید سے راہ حق پر آجائیں اور انکا اتباع اوروں کے لیے حجت بن جائے اور بنی اسرائیل کے خطاب سے پہلے حضرت آدم کا قصہ ذکر کیا جس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ابلیس نے محض حسد اور تکبر کی وجہ سے حضرت آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو یعنی یہود کو خطاب کیا تاکہ متنبہ اور خبردار ہو جائیں کہ تم کو تکبر اور حسد کا انجام معلوم ہے لہذا تم کو چاہیے کہ تکبر اور حسد کی وجہ سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع سے اعراض نہ کرو

چنانچہ فرماتے ہیں اے فرزندان یعقوب یاد کرو تم میری ان خاص[1] نعمتوں کو جنکا میں نے خاص تم پر انعام کیا۔ اسرائیل یعقوب علیہ السلام کا نام ہے جو اسرا اور ایل سے مرکب ہے۔ اسرا کے معنے بندہ یا برگزیدہ کے ہیں اور ایل اللہ کا نام ہے لہذا اسرائیل کے معنی عبداللہ یا صفوۃ اللہ کے ہوں گے۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا۔ بجائے یا بنی یعقوب کے یا بنی اسرائیل فرمانے میں ایک خاص لطافت ہے۔ وہ یہ کہ اس لقب کی طرف مضاف کرنے سے یہ معنی ہو نگے کہ اے اولاد ہمارے مطیع اور فرمانبردار

---

[1] ہذہ ترجمۃ الاضافۃ التی فی قولہ تعالیٰ نِعْمَتِیَ فان الاضافۃ تفید الاختصاص فافہم ۱۲

اور برگزیدہ بندہ کی تم کو تو اتباع حق میں اپنے باپ کا نمونہ ہونا چاہیئے۔ جس طرح کہتے ہیں یا ابن الکریم افعل کذا اے کریم کے بیٹے ایسا کر۔ یا ابن الشجاع بارز الابطال۔ اے شجاع کے بیٹے بہادروں کا مقابلہ کر۔ یا ابن العالِم اطلب العلم۔ اے عالم کے بیٹے علم حاصل کر۔ پھر اس کے علاوہ تمہارے خاندان میں حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسٰی علیہ السلام تک چار ہزار نبی آئے۔ اس لیے تم کو پیغمبروں کی علامتیں خوب معلوم ہیں لہذا تم کو نبی کریم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے اکثر مناظرہ اور مکالمہ قریش کے ساتھ رہتا تھا۔ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود سے مناظرہ اور مکالمہ شروع ہوا۔ یہود جو کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے علماء کہلاتے تھے۔ تمام عرب کی نگاہیں ان پر لگی ہوئی تھیں کہ یہ لوگ اہل علم ہیں ان کے خاندان میں ہزاروں نبی ہوتے۔ انبیاء کی علامتوں سے خوب واقف ہیں۔ دیکھیں یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں یا تکذیب اس لیے حق تعالٰے شانہ نے اپنے خاص خاص انعامات کہ وقتاً فوقتاً بنی اسرائیل پر ہوتے رہے۔ یاد دلایا اس لیے کہ عام نعمتوں کا تذکرہ اتنا مفید اور مؤثر نہیں ہوتا۔ جتنا کہ خاص نعمتوں کا تذکرہ دل میں اثر رکھتا ہے اس لیے اولاً اجمالی طور پر حق جل شانہ نے اس رکوع میں بنی اسرائیل پر اپنے خاص انعامات کا ذکر فرمایا تاکہ شرما کر ایمان لائیں اس کے بعد دوسرے رکوع میں تفصیلی طور پر اپنے انعامات کا اور بنی اسرائیل کی شرارتوں کو ذکر فرمایا تاکہ لوگ انکی شرارتوں سے واقف ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ ان کا قول اور فعل قابل اعتبار نہیں۔

اور پورا کرو تم اس عہد کو جو تم نے مجھ سے کیا تھا میں بھی پورا کرونگا اس عہد کو جو میں نے تم سے کیا ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں اس عہد سے وہ مراد ہے جو سورۂ مائدہ کی اس آیت میں مذکور ہے۔ وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس عہد سے وہ عہد مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا کہ تمہارے بھائیوں میں سے یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ایک نبی برپا کروں گا۔ یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کا عہد مراد ہے۔ اور اہل کتاب سے اللہ کا عہد یہ تھا کہ تم میں سے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیگا اسکو دو اجر ملیں گے جیسا کہ سورۂ قصص کی اس آیت میں ہے اُولٰٓىِٕكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ۔ ایک اجر حضرت موسٰی یا حضرت عیسٰی علیہما السلام پر

ایمان لانے کی وجہ سے اور دوسرا اجر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی وجہ سے۔ پس
اے اہل کتاب تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور اس سے نہ ڈرو کہ ایمان لانے سے
تمہارے چیلے اور نذرانے بند ہو جائیں گے اور قوم تمہاری مخالف ہو جائے گی اور دبدبے اعزاز
واعزاز ہو جائے گی اور قوم تمکو اپنی جماعت سے نکال باہر کرے گی جس سے طرح طرح کے
نقصان اٹھانے پڑیں گے مجھ خالص مجھ سے ڈرو قوم تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بھلائی اور برائی سب
میرے ہاتھ میں ہے۔

ایمان لانے سے دنیا کے حقیر اور معمولی اور چند روزہ اور فانی ہی منافع فوت ہونگے مگر ایمان
نہ لانے سے خدا کی رضا اور خوشنودی اور آخرت کے دائمی بیش بہا منافع فوت ہو جائیں گے۔

لکل شیء اذا فارقتہ عوض — ولیس للہ ان فارقت من عوض

(جس چیز کو بھی چھوڑو اسکا عوض مل سکتا ہے مگر خدا کو چھوڑ کر اسکا عوض پانا ناممکن اور محال ہے۔
اس لیے رشوت و نذرانے سے بند ہو جانے اور دوسروں کے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا اور آخرت کے
نفع اور ضرر کا مالک صرف میں ہی ہوں۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ

اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی درانحالیکہ وہ کتاب اس توریت
کے کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس ہے۔ یعنی قرآن کریم اس وجہ سے
ایمان کے لائق ہے کہ قرآن کو اللہ نے نازل کیا ہے جیسے تم توریت پر اس وجہ سے ایمان لائے
کہ اللہ نے اسکو اتارا ہے اسی طرح یہ قرآن بھی اللہ کی اتاری ہوئی کتاب ہے کسی طرح اس پر بھی ایمان
لاؤ۔ علاوہ ازیں یہ کتاب اس توریت کی جو موسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام پر اتاری گئی تھی۔ اس کے منزل
من اللہ اور کتاب الہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے اس لحاظ سے بھی تم کو اس پر ایمان لانا چاہیے نیز
یہ کہ توریت میں نبی آخرالزمان کے مبعوث ہونے کی پیشین گوئی کا تم کو علم ہے لہذا تمکو چاہیے کہ
سب سے پہلے حضور پر نور پر ایمان لاؤ اور دیدہ دانستہ سب سے پہلے[1] قرآن کے منکر اور مکذب
یعنی جھٹلانے والے نہ بنو کہ قیامت تک قرآن کریم کی تکذیب کرنے والوں کا وبال تمہاری گردن پر
رہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے بعد پہلا فرقہ یہود کا ہے جو مدینہ اور خیبر میں رہتا تھا اور دوسرا فرقہ
نصاریٰ کا ہے جو زیادہ تر شام میں رہتا تھا۔ پس اگر یہود آنحضرت کی نبوت کا انکار کریں گے تو نصاریٰ
بھی انکی دیکھا دیکھی انکار کر بیٹھے اس لیے فرمایا۔ اے یہود تم پہلے کافر نہ بنو۔

---

[1] اشارۃ الی ان الضمیر فی قولہ بہ عائد الی القرآن الذی تقدم ذکرہ فی قولہ بما انزلت وھو اختیار ابن جریر وقیل الی محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ف | مشرکین مکہ اگرچہ اہل کتاب سے پہلے انکار اور تکذیب کر چکے تھے مگر وہ تکذیب جہالت و ناواقفی پر مبنی تھی دیدہ و دانستہ حق پوشی نہ تھی۔ اہل کتاب حق سے خوب باخبر تھے۔ دیدہ و دانستہ حق کو چھپاتے تھے اس لیے ارشاد ہوا۔ وَلَا تَكُونُوا أَوَّلَ كَافِرٍ بِهِ یعنی اے اہل کتاب سب سے پہلے تم حق پوشی کرنے والے نہ بنو اس لیے کہ کفر کی حقیقت حق پوشی ہے۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا وَإِيَّايَ فَاتَّقُونِ۔ اور میری آیتوں کے عوض میں ایک نہایت قلیل اور حقیر معاوضہ لینے پر آمادہ اور راضی نہ ہو جاؤ۔ آخرت کے عزت کو دنیا کے عزت سے بڑھ کر جانو اور کثیر اور باقی کے مقابلہ میں قلیل اور فانی کو ہرگز ترجیح نہ دو۔ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ساری ہی دنیا کا کل ساز و سامان ثمن قلیل ہے۔ حق تعالیٰ فرماتے۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ دراہم معدودہ کی طمع میں میری آیتوں میں تحریف اور تبدیل نہ کرو۔ اور خاص مجھ سے ہی ڈرو۔ عوام الناس سے مرعوب ہو کر حق سے اعراض نہ کرو۔

ف | ظاہر کا مقتضی یہ تھا کہ اس طرح فرماتے۔ لَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي مَتَاعًا قَلِيلًا۔ میری آیات کے بدلے میں تھوڑا سا سامان مت خریدو اس لیے کہ عرف میں سامان خریدا جاتا ہے ثمن اور قیمت نہیں خریدی جاتی لیکن بجائے اس کے وَلَا تَشْتَرُوا بِآيَاتِي ثَمَنًا قَلِيلًا فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ تمام دنیا کا ساز و سامان بمنزلہ قیمت کے ہے اور اصل مقصود آخرت ہے اور یہ مسلم ہے کہ معاملہ میں مقصود بالذات قیمت نہیں ہوتی۔ اصل مقصود سامان ہوتا ہے اور قیمت اور ثمن مقصود کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ پس اشارہ اس طرف ہے کہ تم نے اپنی نادانی اور غلط فہمی سے ثمن اور قیمت کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور باقی کو دے کر فانی کو خرید لیا۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔ اور حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ حق کو باطل کے ساتھ ملانا اور حق کو چھپانا کس قدر مذموم ہے خصوصاً جان بوجھ کر تو انتہائی رذالت ہے۔

گزشتہ آیت میں بنی اسرائیل کو یہ حکم تھا کہ تم خود گمراہی سے باز آؤ اور ایمان اور ہدایت کو قبول کرو۔ اس آیت میں یہ حکم ہے کہ دوسروں کو گمراہ نہ کرو۔ جن لوگوں کے کان کلمہ حق سے آشنا ہو چکے ہیں اور کلمہ حق ان کے کان میں پڑ چکا ہو تو گمراہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ حق اور باطل صدق اور کذب ہدایت اور ضلالت کو ان کے سامنے خلط ملط کر دیا جائے تاکہ حق کے قبول کرنے میں متردد ہو جائیں۔ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ میں اسی طرف اشارہ ہے اور جس شخص نے کلمہ حق سنا ہی نہ ہو اور رشد اور ہدایت سے بالکل بے خبر ہو اس کے گمراہ کرنے کا طریق یہ ہے کہ حق کو اس کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے کہ مبادا وہ حق بات سنکر اس کو قبول نہ کرلے۔ اور وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

یہاں تک اہل کتاب کو ایمان کی دعوت دی گئی۔ ایمان کے بعد سب سے زیادہ محبوب عمل اللہ کے نزدیک نماز ہے اس لیے اس آیت میں نماز کا اور پھر زکوٰۃ کا ذکر فرمایا کہ جان اور مال کی اطاعت میں لگے رہو یعنی اے بنی اسرائیل ایمان کے بعد نماز کو قائم اور درست رکھو یعنی محض کتمان حق اور تلبیس اور خلط حق سے باز رہنا نجات کے لیے کافی نہیں جب تک کہ احکام خداوندی پر عمل نہ ہو۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ ایمان کے بعد نماز کو قائم رکھو۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ الصلوٰۃ میں الف لام عہد کا ہے۔ یعنی ایسی نماز پڑھو کہ جیسی صحابہ کرام پڑھتے ہیں۔ منافقین کی سی نماز نہ پڑھو جو حقیقت میں نماز نہیں بلکہ فقط صورت اور ہیئت نماز کی ہے اور تطییب ظاہر اور انشراح صدر کے ساتھ زکوٰۃ دیا کرو۔ جس طرح سے لغت عرب میں اتیان سہولت سے آنے کا نام ہے۔ اسی طرح ایتاء سہولت سے دینے کا نام ہے اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا تو بہت امت محمدیہ کے ساتھ مخصوص ہے یہود نماز پڑھتے تھے مگر تنہا۔ اس لیے حکم ہوا کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھو اس لیے کہ نماز بھی ایک قسم کا جہاد ہے جس میں اجتماع ضروری اور لازمی ہے۔ اور محراب مسجد کا اور شیطان کا محل ہے اور قتال کے لیے صفوف کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے صفوف جماعت کے برابر رکھنے کی حدیثوں میں بہت تاکید آئی ہے۔

توبیخ عالم بے عمل

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ کیا تم دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا حکم کرتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھولے جاتے ہو حالانکہ تم کتاب یعنی توریت کو پڑھتے ہو جس میں عالم بے عمل کی مذمت جابجا مذکور ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں کہ دوسروں کو نیکی اور بھلائی کا راستہ بتانا اور دیدہ و دانستہ اپنے کو ہلاک اور برباد کرنا یہ عقل اور فراست نہیں بلکہ عین سفاہت اور عین حماقت ہے۔ تعجب ہے کہ تم دوسروں کے ساتھ تو احسان کرتے ہو مگر اپنے نفس کے ساتھ احسان نہیں کرتے حالانکہ وہ احسان کا زیادہ مستحق ہے اپنی بہبودی اور دوسروں کی خیرخواہی عقل کا اقتضاء ہے عقل کو عقل اس لیے کہتے ہیں کہ وہ انسان کو بری باتوں سے روکتی ہے اور اسی لیے عقل کے معنی لغت میں باندھنے کے ہیں۔ پس جب انسان نے اپنے ہی کو گمراہی سے نہ بچایا اور بری باتوں سے نہ روکا تو وہ کس طرح عاقل کہلا سکتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ عالم بے عمل کی مثال شمع کی سی ہے کہ دوسروں کو روشنی پہنچاتی ہے اور اپنے کو جلاتی ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ آیت یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو اپنے خویش اقارب کو جو ایمان لے آئے تھے ان کو یہ کہا کرتے تھے کہ تم دین اسلام پر قائم رہو محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے ہیں وہ حق ہے دوسروں کو ایمان اور اسلام کی ترغیب دیتے اور خود ایمان اور اسلام کو قبول نہ کرتے مطلب یہ ہوا کہ تم توریت کی تلاوت کرتے ہو اور اس میں نبی آخر الزمان کی بشارتیں پڑھتے ہو باوجود اس علم کے تم خود تو ایمان نہیں لاتے اور تمہارے اقارب اور احباب میں سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے اس کو ایمان اور اسلام پر قائم رہنے کی تاکید کرتے ہو تمہارا عجب حال ہے کہ باوجود کتاب کے پڑھنے اور اہل علم کہلاتے جاتے ہو کہ دوسروں کو تو نیک باتوں کا حکم کرتے ہو مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے۔

تنبیہ اس آیت شریفہ کا یہ مقصود نہیں کہ عالم بے عمل کسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کرے یا کسی کو راہ حق نہ بتلائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ خود بھی ضرور عمل کرے عالم ہو کر بے عمل نہ رہے بلکہ عالم باعمل بنے جب وہ دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے تو اسکو یہ سوچ لینا چاہیے کہ سب سے پہلے میرا نفس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا محتاج ہے۔

عالم پر دو چیزیں فرض ہیں، ایک ترک معصیت یعنی خود معصیت نہ کرنا۔ دوم یہ کہ دوسروں کو معصیت سے منع کرنا۔ اگر دونوں فرض نہیں بجالا سکتا تو دونوں کو چھوڑا بھی نہیں جا سکتا۔ ما لا یدرک کلہ لا یترک کلہ، طبیب اگر کسی مرض میں خود مبتلا ہو تو اسی مرض کے مریض کا معالجہ کر سکتا ہے لیکن خود اسکا مرض جب ہی زائل ہو گا جب وہ خود بھی دوا کا استعمال کرے دوسرے مریض کو دوا کا بتلانا بلاشبہ ضروری اور مستحسن ہے اور مریض کے لیے غایت درجہ مفید ہے مگر اس بدپرہیز طبیب کو فائدہ جب ہو گا کہ جب خود بھی دوا کا استعمال کرے محض دوسرے کو دوا بتلا دینا اس کے مرض کے ازالہ کے لیے کافی نہیں اور لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ میں انکار فقط قول حق اور امر بالمعروف کی طرف راجع نہیں بلکہ تقولون کی قید یعنی لا تفعلون کی طرف راجع ہے یعنی حق کہنے کے بعد اس پر عمل کیوں نہیں کرتے بلاغت کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی شئی کسی قید کے ساتھ مقید ہو تو نفی اور انکار فقط قید کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ علماء اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نبی برحق ہیں مگر حب مال اور حب جاہ آپ کے اتباع سے مانع تھے کہ اگر آپ پر ایمان لے آئیں گے تو ہمارے ہدیے اور نذرانے بھی بند ہو جائیں گے اور رؤساء اور امراء کی نظروں سے ہم گر جائیں گے اور جو عزت اور وجاہت ہم کو حاصل ہے وہ جاتی رہے گی آئندہ آیت میں اس کا علاج ارشاد فرمایا۔

اصلاح نفس کا طریقہ اور حب مال اور حب جاہ کا علاج

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ۔ اور اگر تم حب دنیا اور حب جاہ کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہو تو شہوات اور لذات سے پرہیز کرو اور اس کے معالجہ کے لیے یہ دوائیں استعمال کرو یعنی صبر سے مدد طلب کرو یعنی نفس کو صبر و قناعت کا خوگر اور ترک لذات اور شہوات کا عادی بناؤ تاکہ دنیا کی محبت دل سے زائل ہو۔ اور حق اور باطل میں تمیز کر سکو مرض کا ازالہ جب ہی ممکن ہے کہ اول مضرات سے پورا پورا پرہیز ہو اور پھر دوا کا استعمال ہو۔ اسی طرح باطنی امراض کے ازالہ کے لیے صبر بمنزلہ پرہیز کے ہے اور شکر بمنزلہ دوا کے ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ اَلْاِیْمَانُ نِصْفَانِ نِصْفٌ فِی الصَّبْرِ وَنِصْفٌ فِی الشُّکْرِ۔ ایمان کے دو حصے ہیں ایک صبر اور دوسرا شکر یعنی ایمان کی صحت اور سلامتی دو چیزوں پر موقوف ہے ایک صبر یعنی مضرات سے پرہیز کرنا اور دوم دوا شکر کے استعمال پر جب تک پرہیز کامل نہ ہو اس وقت تک دوا پورا نفع نہیں کرتی اس لیے اول پرہیز یعنی صبر کا حکم دیا اور پھر دوا کے استعمال کا حکم دیا یعنی نماز کا کہ حمد و ثنا تسبیح و تقدیس رکوع و سجود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے اعلیٰ درجہ کا شکر ہے۔

بر مراد نفس تا گردی اسیر صبر بگزین و قناعت پیشہ گیر

یعنی اگر تم کو اجر اور معاوضہ ہی مطلوب ہے تو شکست مرد دنیا اور دراہم معدودہ پر کیوں گرے جاتے ہو تو صبر کرو تاکہ بارگاہ خداوندی سے تم کو بے حساب اور بے شمار اجر ملے۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ اور اگر تم عزت اور وجاہت کے طالب ہو تو عزت اور وجاہت کو ان کے پاس کہاں ڈھونڈتے ہو۔ عزت کی گر تلاش ہے تو اس عزیز مقتدر کے پاس تو جس کی شان یہ ہے۔ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

پس اگر تم عزت کے متلاشی ہو تو تم اس ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ بے نیاز پر جبین نیاز کو خم کرو تاکہ دنیا اور آخرت کی عزتیں تم کو حاصل ہوں یعنی نماز پڑھو۔ نماز کی خاصیت ہی یہ ہے کہ وہ افتخار اور تکبر سے بچاتی ہے حق جل شانہ کی محبت اور عظمت کو اور دنیا کی نفرت اور آخرت کی رغبت کو دل میں راسخ کرتی ہے۔ مخلوق سے تعلق کو قطع کرتی ہے اور خالق ذوالجلال سے تعلق کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے مسند احمد اور سنن ابی داؤد میں حذیفہ بن الیمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو جب کوئی امر پیش آتا تو فوراً گھبرا کر نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اور مسند احمد اور سنن نسائی میں صہیب رومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم علیہ
الصلوٰۃ والتسلیم نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء کو جب پریشانی پیش آتی تو نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ عبداللہ
ابن عباس رضی اللہ عنہما ایک مرتبہ سفر میں تھے کہ بیٹے کی وفات کی خبر دی گئی تو سواری سے اترے
اور دو رکعت نماز پڑھی اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھا اور پھر فرمایا کہ ہم نے وہی کیا
جیسا اللہ نے ہم کو حکم دیا، اور یہ آیت تلاوت فرمائی وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (اخرجہ سعید
بن منصور وابن المنذر والحاکم وغیرہم) ضرورت اور پریشانی کے وقت جو نماز پڑھی جاتی ہے وہ صلوٰۃ
الحاجۃ کہلاتی ہے اس آیت میں اسی صلوٰۃ الحاجۃ کی طرف اشارہ ہے۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا
عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ

اور تحقیق وہ (یعنی صبر اور صلوٰۃ سے استعانت اور استقلال) البتہ بہت شاق اور گراں ہے مگر جن پر نہیں
جن کے دل خدا کی طرف سے جھکے جاتے ہیں، جن کو خیال ہے کہ وہ یقیناً خدا سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ
اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، یعنی صبر اور نماز حقیقت میں دشوار ہیں کہ جن کا بجا لانا مشکل ہے، ہاں
ان لوگوں پر جو خدا سے ملنے کی امید نہیں رکھتے نماز ان پر بہت شاق اور گراں ہے وہ اس کو محض
مشقت اور محنت خیال کرتے ہیں مگر ان خاشعین پر جو عذاب الیم سے ڈرتے ہیں اور ثواب عظیم
اور نعیم مقیم کی امید رکھتے ہیں ان پر نماز شاق اور گراں تو کیا ہوتی ان کے لئے تو آنکھوں کی ٹھنڈک اور
دلوں کی فرحت اور مسرت ہے۔

ف: جو علم اور ادراک ان علامات سے حاصل ہو جو نہ حسی ہوں اور نہ بدیہی لغت میں اس
کو ظن کہتے ہیں، کبھی وہ دلائل اور براہین کے انضمام سے جس میں قوت پیدا ہو جاتی ہے جزم اور یقین کی
حد تک پہنچ جاتا ہے اور کبھی اس درجہ ضعیف ہو جاتا ہے کہ شک اور وہم کے قریب پہنچ جاتا
ہے اس لئے لفظ ظن کبھی یقین کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے اور کبھی شک کے معنی میں اور کبھی گمان
غالب کے معنی میں، اس آیت میں اگر ظن سے یقین کے معنی مراد لئے جائیں جیسا کہ مجاہد اور ابو العالیہ
اور قتادہ وغیرہم سے منقول ہے تو آیت کے یہ معنے ہوں گے کہ نماز ان لوگوں پر شاق اور گراں نہیں جو
خدا سے ملنے کا یقین رکھتے ہیں اور اگر ظن کے معنی گمان اور خیال کے لئے جائیں تو یہ معنی ہوں گے کہ
جس شخص کو خدا کی ملاقات اور اس کی جزا اور سزا کا گمان اور خیال بھی ہو جائے تو اگر عقل سلیم رکھتا ہے
تو صبر اور نماز اور معاصی سے پرہیز اور طاعات خداوندی کا بجا لانا اس کو شاق اور گراں نہیں بلکہ سہل
اور آسان ہوگا جیسے کہ جن لذائذ وطیبات کے استعمال سے ضرر کا گمان اور خیال بھی ہو جائے اس سے
پرہیز کرنا اس کو دشوار نہیں معلوم ہوتا اور تلخ سے تلخ دوا کا استعمال کہ جس سے صحت اور شفا کی امید
ہو آسان اور سہل معلوم ہوتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ کے یہ معنی ہیں کہ وہ خاشعین نماز پڑھتے وقت یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اپنے پروردگار کو دیکھ

رہتے ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ "عبادت کر اللہ کی اس طرح کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے"۔ خلاصہ یہ کہ اگر تم کو نفس کا تزکیہ اور اس کی اصلاح مقصود ہے تو صبر اور نماز سے اس بارہ میں مدد حاصل کرو، اور اگر یہ طریق تم کو دشوار معلوم ہوتا ہے تو دوسرا طریق یہ ہے کہ تم نعمائے الٰہیہ کا مراقبہ کیا کرو اور سوچا کرو کہ حق تعالیٰ شانہ نے ہم پر کیا کیا نعمتیں برسائیں اور باوجود ہماری نافرمانیوں کے ہم پر کیا کیا احسانات ہوتے رہتے ہیں۔ اس تفکر اور مراقبہ کا اثر یہ ہوگا کہ قلب میں حق جل شانہ کی محبت کا ولولہ اور جوش پیدا ہوگا۔ اَلْاِنْسَانُ عَبْدُ الْاِحْسَانِ "انسان بندہ ہے احسان کا" جہاں یہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا مقصد حاصل ہوگیا۔ ؎

ہر آنکہ عشق یکے در دلش گرفت قرار
روا بود کہ تحمل کند جفائے ہزار
عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

اس لیے آئندہ آیت میں پھر ان نعمتوں کے یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں اور جن نعمتوں کو پہلے اجمالاً یاد دلایا تھا اب ان کو تفصیلاً بیان فرماتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ
اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان میرا جو میں نے تم پر
عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷ وَاتَّقُوْا يَوْمًا
کیا اور وہ جو میں نے تم کو بڑا کیا جہان کے لوگوں پر اور بچو اس دن
لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْــــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے ایک ذرہ اور قبول نہ ہو اس کی
شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸
طرف سے سفارش اور نہ لیں اس کے بدلہ میں کچھ اور نہ ان کو مدد پہنچے
وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْۗءَ
اور جب چھڑا دیا ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے دیتے تھے تم کو بڑی تکلیف

الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ أَبْنَاءَكُمْ وَيَسْتَحْيُونَ نِسَاءَكُمْ

ذبح کرتے تمہارے بیٹے اور جیتی رکھتے تمہاری عورتیں

وَفِي ذَٰلِكُمْ بَلَاءٌ مِنْ رَبِّكُمْ عَظِيمٌ ﴿٤٩﴾ وَإِذْ فَرَقْنَا

اور اس میں مدد ہوئی تمہارے رب کی بڑی اور جب پھاڑ دیا

بِكُمُ الْبَحْرَ فَأَنْجَيْنَاكُمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ وَ

تمہارے پیٹھنے کے ساتھ دریا پھر بچا دیا تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو اور

أَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿٥٠﴾ وَإِذْ وَاعَدْنَا مُوسَىٰ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً

تم دیکھتے تھے اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا

ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهِ وَأَنْتُمْ ظَالِمُونَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ

پھر تم نے بنا لیا بچھڑا اس کے پیچھے اور تم بے انصاف ہو پھر

عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٢﴾ وَ

معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی شاید تم احسان مانو اور

إِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿٥٣﴾

جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور معجزے شاید تم راہ پاؤ

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنْفُسَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا

بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ

یہ بچھڑا بنا کر اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان

ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ إِنَّهُ

یہ بہتر ہے تم کو اپنے خالق کے پاس پھر متوجہ ہوا تم پر بے شک

هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٥٤﴾ وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَن

وہی ہے معاف کرنے والا مہربان — اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم یقین نہ

نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ

کریں گے تیرا جب تک نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر لیا تم کو بجلی

الصّٰعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُم مِّنۢ

نے اور تم دیکھ رہے تھے — پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو

بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ

مر گئے پیچھے شاید تم احسان مانو — اور سایہ کیا ہم نے

الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۖ كُلُوا

تم پر ابر کا اور اتارا تم پر من اور سلویٰ کھاؤ

مِن طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِن

ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو اور ہمارا کچھ نقصان نہ کیا پر

كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا

اپنا ہی نقصان کرتے رہے — اور جب کہا ہم نے داخل ہو

هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا

اس شہر میں اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو محظوظ ہو کر

وَادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ

اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کر کر اور کہو گناہ اترے تو بخشیں ہم

خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِينَ

تمہارے قصور تمہاری اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو — پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو

ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى

بات سوائے اس کے جو کہدی تھی ان کو پھر اتارا ہم نے

الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا

بے انصافوں پر عذاب آسمان سے ان کی

يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا

بے حکمی پر اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو کہا

اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۖ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا

ہم نے مار اپنے عصا سے پتھر کو پھر بہہ نکلے اس سے بارہ

عَشْرَةَ عَيْنًا ۖ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۖ كُلُوْا

چشمے پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ کھاؤ

وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ

اور پیو روزی اللہ کی اور نہ پھرو ملک میں

مُفْسِدِيْنَ ﴿٦٠﴾

فساد مچاتے

تفصیل انعامات و عنایاتِ خداوندِ جلیل و شرح جنایات و تقصیرات قوم بنی اسرائیل و حکم مراقبۂ عنایات و ملاحظۂ جنایات کہ در حیا حکم اکسیر دارد

قال تعالیٰ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ ۔ الیٰ ۔ وَلَا تَعْثَوْا فِی

الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ.

(ربط) گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کو اجمالی طور پر اپنی نعمتیں یاد دلائیں اب آئندہ آیات میں ان کی تفصیل ہے جو دور تک چلی گئی اور تفصیل میں سب سے پہلی نعمت تفضیل کو ذکر فرمایا اس لیے کہ تفضیل علی العالمین سب سے افضل نعمت ہے پھر لطف یہ کہ اپنے الطاف و عنایات کے بعد ان کی جنایات اور تقصیرات کو ذکر فرمایا اس لیے کہ جب ایک طرف خداوند کریم کی عنایتوں کو دیکھیں گے اور دوسری طرف اپنی جنایات اور تقصیرات کو دیکھیں گے تو لامحالہ حق تعالیٰ سے شرمائیں گے اور اس وقت انکا یہ حال ہوگا اور قال بھی ہوگا۔ ؎

شکر نعمتہائے تو چندانکہ نعمتہائے تو عذر تقصیرات ما چندانکہ تقصیرات ما

اور حیاء ایمان کا ایک درمیانی اور مرکزی شعبہ ہے جس پر ایمان کے باقی شعبے گھومتے ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ اے بنی اسرائیل یاد کرو تم میری ان خاص خاص نعمتوں کو جنکا میں نے خاص تم پر انعام کیا اور پھر اپنی جنایتوں پر نظر کرو کہ کیا ان نعمتوں کا یہی حق تھا جو تم کر رہے ہو اور ہماری اس تذکیر اور یاد دہانی کی نعمت کو بھی یاد کرو کہ ہم نے تم کو خواب غفلت سے جگایا۔

انعامِ اوّل

وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ. اور سلسلہ انعامات میں سب سے پہلے اس بات کو یاد کرو کہ میں نے تمکو اس زمانہ میں جہان والوں پر فضیلت دی کہ دنیا کی بادشاہت کے ساتھ دین کی بادشاہت بھی تم کو دی یعنی تمہارے خاندان میں پیغمبری بھی دی کما قال تعالیٰ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا ۖ وَّ اٰتٰىکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ و قال تعالیٰ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ حضرت یعقوب علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمہارے ہی خاندان سے انبیاء مبعوث ہوتے رہے اور توریت اور انجیل اور زبور سب تمہارے ہی خاندان میں نازل ہوئی۔ تمہارا ہی خاندان نبوت و رسالت اور امامت اور حکومت کا مخزن رہا بالغرض یہ کہ اس وقت تک تم ہی کو تمام عالم پر بزرگی اور برتری اور فضیلت حاصل رہی اب وقت آیا کہ وہ نبی آخر الزمان ظاہر ہوں جن کی تمام انبیاء و مرسلین حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم الصلاۃ والسلام خبر دیتے چلے آئے لہذا اگر تم کو اپنی فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا منظور ہے تو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ اور دل و جان سے ان کی اطاعت اور امداد کرو۔ اور جس طرح قارون اور سامری نے حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت کرکے

خاندانِ یعقوب کے شرف کو ضائع کیا تم بھی قارون اور سامری کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرکے اپنی فضیلت اور بزرگی اور اپنے شرف اور منصب کو ضائع نہ کرو۔ اگر تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہو تو اپنی سابق فضیلت اور گزشتہ منصب پر قائم ہو بلکہ دوہرے اجر کا وعدہ ہے اور اگر تم ایمان لانے سے انحراف کرتے ہو تو سمجھ لو کہ تم اپنے منصب سے معزول ہو۔

حضرت یعقوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وقت سے اس وقت تک بنی اسرائیل کا منصب سب سے افضل اور اشرف تھے یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے گزشتہ زمانہ سے لیکر اس وقتِ خطاب تک بنی اسرائیل کا ان فضیلتوں میں کوئی شریک اور سہیم نہیں رہا اور یہ وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے گزشتہ فضیلت اور گزشتہ شرف کو یاد دلانا ہے تو اس نبی برحق کی دعوت کو قبول کرو لیکن افسوس ان لوگوں نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا اور مغضوب علیہم اور ضالین کے نام سے موسوم ہوئے اور جو لوگ ایمان لائے وہ خیر الامم کے لقب سے سرفراز ہوئے۔ اس تقریر سے یہ شبہ رفع ہوگیا کہ اس آیت سے بنی اسرائیل کا امت محمدیہ سے افضل ہونا لازم آتا ہے جواب یہ ہے کہ آیت میں اس وقت کی تفضیل کا ذکر نہیں گزشتہ زمانہ کی تفضیل کا ذکر ہے وقت خطاب مضمون کلام سے خارج ہے۔

آئندہ آیت میں ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ اگر تم کو یہ خیال ہے کہ باوجود نہ ایمان لانے کے قیامت کے دن ہم اپنے آباؤ اجداد کی شفاعت سے نجات پا جائیں گے تو سمجھ لو کہ قیامت کے دن نمرود اور فرعون سامری اور قارون کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی چنانچہ ارشاد ہے وَاتَّقُوا يَوْمًا لَّا تَجْزِي نَفْسٌ عَن نَّفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ۔ اور ڈرو تم اس دن سے

کہ ایک شخص دوسرے نفس کے کچھ بھی کام نہ آئیگا اور نہ کسی کی طرف سے کوئی سفارش اور نہ کسی کی طرف سے کوئی فدیہ لیا جائیگا اور نہ کسی کی کوئی مدد کی جائے گی۔ البتہ اہل ایمان کی مدد کی جائے گی انسان جب کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو شفاعت و سفارش فدیہ دیکر رستگار ہونا چاہتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اپنے اعوان و انصار کو جمع کرکے آمادۂ پیکار ہوتا ہے اور وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ سے یہی مراد ہے کہ تمہارا کوئی حامی اور مددگار بھی نہ ہوگا جو تم کو زور اور قوت کے ذریعہ سے عذاب سے چھڑا لے۔

ف: جو لوگ مال کی محبت میں زیادہ گرفتار ہوتے ہیں وہ یہ چاہا کرتے ہیں کہ جس طرح ممکن ہو سفارش سے کام چل جائے۔ مال نہ خرچ کرنا پڑے اور بعض عزت و وجاہت کے دلدادہ ہوتے ہیں ان کو مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے اس لیے حق جل شانہ نے اس مقام پر شفاعت کو فدیہ پر مقدم فرمایا اور اسی پارہ کے اخیر میں فدیہ کو شفاعت پر مقدم فرمایا حیث قال وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ

وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ تاکہ دونوں قسم کی طرف اشارہ ہو جائے۔

تنبیہ اس آیت شریفہ میں مطلق شفاعت کی نفی نہیں کی گئی بلکہ فرعون اور ہامان کی طرح انبیاء اللہ سے انحراف کرنے والوں کی شفاعت کی نفی مقصود ہے۔ شفاعۃ مومنین یعنی گنہگار مسلمانوں کی شفاعت جو دیگر آیات اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے اس کی نفی مقصود نہیں تفصیل اگر درکار ہے تو تفسیر کبیر کی مراجعت فرمائیں۔

نیز ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی شخص اپنی وجاہت سے سفارش نہ کر سکے گا اور آیت مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ میں لفظ اذن اس کی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ کی اجازت سے سفارش ہو سکے گی۔

انعام دوم وَاِذْ نَجَّیْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ ... الی ... مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِیْمٌ اور یاد کرو اس انعام کو جبکہ ہم نے تم کو قوم فرعون سے نجات دی جو تم کو سخت ترین عذاب کی تکلیف دیتے رہتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ غیور طبیعتیں سمجھ سکتی ہیں کہ عورتوں کا زندہ چھوڑنا بیٹوں کے ذبح سے سخت ہے اور اس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی آزمائش تھی تم نے دیکھ لیا کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی نے بھی دنیا میں ان مشکلوں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی سمجھ لو کہ آخرت میں جبکہ نفسی نفسی ہوگی کون تمہاری مدد کر سکے گا۔ فرعون نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا تھا کہ بیت المقدس سے ایک آگ نکلی ہے جس نے مصر کا احاطہ کر لیا ہے۔ ہر قبطی کے گھر میں داخل ہوتی ہے اور اس کو جلاتی ہے بنی اسرائیل سے کوئی تعرض نہیں کرتی۔ کاہنوں نے اس کی یہ تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیرے اور تیری قوم اور تیری سلطنت کے زوال کا باعث ہوگا اس لیے فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو لڑکا پیدا ہو اس کو قتل کر دیا جائے اس زمانہ میں نجوم کا بڑا چرچا تھا۔ اور نجومیوں کو خواب کی تعبیر کا بھی ملکہ تھا اسی زمانہ میں موسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے۔ خدا کی قدرت کا کرشمہ دیکھو کہ فرعون ہی کے گھر میں موسیٰ علیہ السلام کی پرورش ہوئی۔ ؎

در ببست و دشمن اندر خانہ بود حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

انعام سوم وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ اور اے بنی اسرائیل اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ ہم نے محض تمہاری وجہ سے دریا کو پھاڑا یعنی محض تمہارے صحیح سالم گزر جانے کی وجہ سے ہم نے پہلے اپنے ارادہ اور مشیت سے دریا کو شق کیا۔ اتفاقی طور پر یہ حادثہ نہ تھا پس تم کو نجات دی اور دشمن سے بھی نجات ملی اور خدا تعالیٰ کے علم و قدرت میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت میں جو شبہات تھے ان سے بھی تم کو نجات ملی۔ سارے شبہے رفع ہو گئے اور فقط تمہارے لئے

نجات دینے پر کفایت نہیں کی۔ بلکہ قوم فرعون کو جو تمہاری دشمن تھی غرق کیا۔ تاکہ آئندہ بھی دشمنوں کا خطرہ دل سے نکل جائے اور پھر غرق بھی ایسی حالت میں کیا کہ تم ان کو غرق ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے جس میں اب کسی قسم کے شک و شبہ کی بھی گنجائش نہ رہی تھی اور دشمن کو اپنی آنکھوں کے سامنے غرق ہوتے ہوئے دیکھنا یہ بہت ہی بڑی نعمت ہے اور ایسی نعمت کا تو بہت ہی شکر چاہیئے۔ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ یہ دن جس میں بنی اسرائیل کو نجات اور قوم فرعون کو غرق کیا گیا عاشورہ کا دن تھا اس نعمت کے شکر میں موسیٰ علیہ السلام نے اس روز کا روزہ رکھا۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو عاشورہ کا روزہ رکھتے دیکھا تو فرمایا کہ تم سے زیادہ موسیٰ کا حقدار میں ہوں۔ خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ کا حکم دیا فرعون سے نجات دینا تو نعمت تھا ہی لیکن دریا کو ان کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دینا ایک مستقل انعام تھا اس لیے فلق بحر کو علیحدہ ذکر فرمایا۔

انعام چہارم

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔ فرعون کے غرق ہونے کے بعد جب بنی اسرائیل مصر میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے توریت عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا اور یہ بھی وعدہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر چالیس شب کا اعتکاف فرمائیں موسیٰ علیہ السلام تو کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ سامری جو کہ منافق تھا اس نے بعد میں گوسالہ پرستی کا فتنہ کھڑا کر دیا جس کا مفصل قصہ آئندہ آئے گا۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اے بنی اسرائیل اور تم ہمارے اس انعام کو یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔ تیس ذی قعدہ کی اور دس راتیں ذی الحجہ کی۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے کما قال تعالیٰ۔

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا	تحقیق رات کا اٹھنا نفس کے روندنے اور پامال کرنے اور بات کے سیدھا نکلنے میں شدید مؤثر ہے۔

نیز سارے دنیا کی طرف حق جل جلالہ کا نزول اجلال شب ہی میں ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور صحیفے اور کتابیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوئی ہیں۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ۔ ہم نے قرآن کو مبارک رات میں اتارا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِىْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ علاوہ ازیں قرب الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں جیسا کہ ایک حدیث میں ہے۔

عَنْ عمرو بن عبسة رضي	عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

اللہ تعالیٰ عنہ انہ سمع النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اقرب ما یکون الرب من العبد فی جوف اللیل الآخر فان استطعت ان تکون ممن یذکر اللہ فی تلک الساعۃ فکن. رواہ الترمذی واللفظ لہ وابن خزیمۃ فی صحیحہ وقال الترمذی حدیث حسن صحیح غریب۔

کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حق جل شانہٗ بندہ کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اور نزدیک وسط شب میں ہوتے ہیں پس اگر تم سے یہ ممکن ہو کہ تو اس وقت میں اللہ کے ذکر کرنے والوں میں سے ہو تو ضرور ہو جا۔ اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا اور یہ لفظ ترمذی کی روایت کے ہیں اور ابن خزیمہ نے بھی اپنی صحیح میں اسکو روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن اور صحیح اور غریب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کے صحابہ کو قیام لیل کا حکم ہوا، یٰۤاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ، اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا، وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ، اور رات ہی میں آپ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَیْلًا۔ الآیۃ۔

عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب سفر کرتے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے کہ رات میں راہ جلد طے ہو جاتی ہے اسی طرح سیر الی اللہ بھی رات کو بہت جلد طے ہوتی ہے یہاں تک کہ جلد منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔ رہا یہ کہ چالیس کا عدد کیوں خاص کیا گیا سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اعداد کے مختلف مرتبے ہیں آحاد، عشرات، مئات، الوف، اور ان میں سے دس کا عدد فی حد ذاتہ فی نفسہ کامل اور مکمل ہے جیسا کہ حق جل شانہٗ کا ارشاد ہے۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ۔ (یہ دس کامل ہیں) پس جس چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اس عدد یعنی دس کو چار گنا کر لیا جاتا ہے چنانچہ حضرت آدم کی مٹی کا خمیر چالیس دن تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ بطن مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ (خون بستہ) پھر چالیس روز تک مضغہ یعنی پارہ گوشت، اسکے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے پس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح حق جل شانہٗ نے اپنی اسی قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے باطنی اور روحانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد خاص فرمایا۔ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِیْلًا۔

وروی عن ابن عباس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ

ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

نیز تم نے یہ نہ سمجھا کہ موسیٰ علیہ السلام جب تمکو فرعون کی عبادت سے روکتے تھے حالانکہ وہ کسی درجہ میں نفع و ضرر پر بھی قدرت رکھتا تھا تو اب بے عقل اور بے جان حیوان کی عبادت کیسے اجازت دے سکتے ہیں۔ غرض فرعون بیل کے بچہ سے تو بہتر ہی تھا اس فعل شنیع کا مقتضا تو یہ تھا کہ تم کو فوراً ہلاک کر دیا جاتا مگر ہم نے اپنی کمال رحمت اور غایت رأفت سے درگذر کیا جیسا کہ آئندہ آیت میں فرماتے ہیں۔

انعام پنجم | ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ پھر بخشدیا اس جرم عظیم کے بعد بھی ہم نے تم کو معاف کیا تاکہ تم احسان مانو کہ ہم نے اپنے فضل اور رحمت سے تم کو معاف کیا اور فرعون کی طرح ہلاک نہ کیا اور نہ یہ جرم قابل معافی تھا معاف کر کے اس جگہ یہ امر قابل غور ہے کہ تمکو اس جرم کے بعد بھی دنیا ہی میں زندہ رکھ کے نہیں چھوڑا۔

حکایت | بارگاہ خداوندی میں موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار تو نے مجھ پر بے شمار نعمتیں مجھ کو عطا فرمائیں اور ان پر شکر کا حکم دیا۔ تیری نعمتوں کا شکر خود ایک عظیم الشان نعمت ہے پھر کس طرح شکر کروں۔ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ بندہ کا یہ سمجھ لینا کہ جو نعمت بھی ہے وہ میری ہی طرف سے ہے یہی بس اس کے لیے کافی ہے۔ (خازن)

انعام ششم | وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ اور اے بنی اسرائیل اس انعام کو بھی یاد کرو جبکہ ہم نے موسیٰ کو کتاب یعنی توریت دی جو احکام الہی کی جامع[1] تھی اور جو حق اور باطل اور روا اور ناروا میں فرق کرنے والی تھی تاکہ تم راہ راست پاؤ۔ علامہ زمخشری کے نزدیک اس جگہ الکتاب اور الفرقان دونوں سے توریت ہی مراد ہے۔ اور یہ دونوں توریت کی صفتیں ہیں۔

اور بعض مفسرین کے نزدیک کتاب سے توریت مراد ہے اور الفرقان سے معجزات مراد ہیں کہ جن سے حق اور باطل کا فرق واضح اور نمایاں ہوتا ہے جب بنی اسرائیل نے سامری کے اغوا سے گوسالہ کی پرستش شروع کر دی تو بنی اسرائیل میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک حضرت ہارون علیہ السلام اور ان کے متبعین کا کہ خود بھی اس سے علیحدہ رہے اور دوسروں کو بھی منع کیا۔ دوسرا فریق سامری اور اسکے متبعین کا اور تیسرا فریق ساکتین کا کہ نہ خود گوسالہ پرستی کی اور نہ دوسروں کو منع کیا۔ پہلے فریق کو توبہ کی حاجت نہ تھی دوسرے اور تیسرے فریق کو توبہ کا اس صورت سے حکم ہوا کہ تیسرا فریق یعنی ساکتین دوسرے فریق یعنی سامری اور اس کے متبعین اور مرتدین کو قتل کریں تاکہ مقتول ہونے سے مرتدین کی توبہ ہو جائے اور قتل

---

[1] اشارۃ الی ان اصل الکتاب هو الجامع ای الکتاب الکامل الجامع للاحکام والفرقان عطف وانما اعلم ۱۲ منه

تکمیل اور تنظیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ قاتل یا تو اپنے کو اولیاء مقتول کے سپرد کرے کہ چاہیں قتل کریں اور چاہیں معاف کریں اسی طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مرتدین کی توبہ جب مقبول ہوگی کہ جب وہ اپنے کو قتل کے لیے سپرد کر دیں ۔ اھ (تفسیر کبیر) یہی تمہارے لیے ہر طرح سے بہتر اور نافع ہے تمہارے خالق کے نزدیک۔ جب تم نے اللہ کے حکم کی دل و جان سے تعمیل کی تو اللہ نے تم پر توجہ فرمائی اور تمہاری توبہ قبول کی اگرچہ تمہارا جرم فرعون سے بھی زیادہ سخت تھا اس لیے کہ وہ ابتداء ہی سے کافر تھا اور تم نے ایمان کے بعد کفر کیا اور مرتد ہوئے دین الٰہی کی بے حرمتی اور بے آبروئی کی۔ بے شک وہ بڑی ہی توبہ قبول فرمانے والا ہے اور بڑا ہی مہربان ہے کہ ایک گھڑی کی تکلیف برداشت کر لینے پر ہمیشہ کی عزت اور کرامت عطا فرماتا ہے۔ وہ حیات جس کی حقیقت لہو و لعب سے زائد نہیں اس کے بجائے حیات سرمدی اور ابدی سے سرفراز فرماتا ہے۔ ؎

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد　　　آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

واقعہ قتل کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے باذن الٰہی ستر آدمیوں کو کوہ طور پر لیجانے کے لیے منتخب فرمایا تاکہ گوسالہ پرستی کی معذرت کریں۔ سب نے روزہ رکھا اور غسل کیا اور عمدہ کپڑے پہنے جب کوہ طور پر پہنچے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ آپ بارگاہ خداوندی میں عرض کیجئے کہ ہمیں اپنا کلام پاک سنائے۔ تھوڑی دیر میں ایک ابر نمودار ہوا موسیٰ علیہ السلام اس میں داخل ہو گئے اور بنی اسرائیل پیچھے کھڑے رہے سب نے اللہ کا کلام سنا۔ جب کلام الٰہی ختم ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام ابر سے برآمد ہوئے اور دریافت کیا کہ تم نے کلام الٰہی سنا تو اس پر یہ کہا ہم تو کلام الٰہی ہونے کا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک علانیہ طور پر خدا کو نہ دیکھ لیں۔ آئندہ آیت میں اسی قصہ کی طرف اشارہ ہے۔

انعام ہشتم	وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَہۡرَۃً فَاَخَذَتۡکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ۔ اور یاد

کرو اے بنی اسرائیل اس وقت کو کہ جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم محض تمہارے کہنے سے ہرگز یقین نہ کریں گے کہ ہم نے جو کچھ سنا وہ اللہ جل جلالہ ہی کا کلام ہے ممکن ہے کہ بس پردہ کوئی اور کلام کرتا ہو جب تک کہ ہم خود اللہ کو علانیہ طور پر نہ دیکھ لیں اس طرح کہ ہمارے اور خدا کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ ہو بس آپکڑا تم کو اس گستاخی پر بجلی نے اور تم اس بجلی کو آتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بنی اسرائیل اس موقعہ پر دو وجہ سے غضب الٰہی کے مورد بنے۔ اول تو اس کہنے کی وجہ سے کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے کا ہرگز یقین نہ کریں گے اور محض تمہارے بھروسہ اور اعتماد پر اس کا کلام الٰہی ہونا تسلیم نہ کریں گے۔ یہی ایک گستاخی نزول عذاب کے لیے کافی تھی اس لیے کہ اللہ کے نبی پر اعتماد اور بھروسہ نہ کرنا اور حسن ظن کے بجائے اس سے بدظنی اور بدگمان ہونا یہ کچھ معمولی

گستاخی نہیں بلکہ نبی پر اعتماد نہ کرنا صریح کفر ہے۔ نبی ہی کے اعتماد پر اللہ کی باتوں کو ماننا ایمان ہے اور جو شخص نبی پر اعتماد نہیں کرتا آخر وہ یہ تو سوچے کہ نبی کے بعد پھر کس پر وہ اعتماد کرے گا۔ دوم یہ کہ گستاخانہ اور بے باکانہ طور پر یہ کہہ دینا کہ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً کہ ہم موسیٰ کی تصدیق جب کریں گے کہ جب اللہ کو علانیہ اور ظاہر طور پر دیکھ لیں بجائے ادب کے ساتھ یہ کہتے کہ اے موسیٰ کہ ہم دیدار الٰہی کے مشتاق اور آرزومند ہیں تو موجب غضب نہ بنتے اسکا جواب تو یہ ہوتا کہ تم ابھی اس نعمت کے قابل نہیں آخرت میں جب آلودگیوں اور کثافتوں سے پاک ہو جاؤ گے تب دیکھو گے غرض یہ کہ اس گستاخانہ اور بے باکانہ سوال کی وجہ سے عذاب الٰہی نے آگھیرا اور موسیٰ علیہ السلام کا رَبِّ أَرِنِي أَنْظُرْ إِلَيْكَ کہہ کر دیدار الٰہی کا سوال کرنا سو اول تو وہ سوال تھا یعنی عاجزانہ اور مؤدبانہ ایک استدعا اور درخواست تھی مطالبہ نہ تھا دوم یہ کہ وہ ایک والہانہ اور عاشقانہ استدعا اور نیاز تھی جو سراسر محبت اور اشتیاق پر مبنی تھی۔ معاذ اللہ بنی اسرائیل کی طرح تعنت اور عناد اسکا منشا نہ تھا۔ پھر موسیٰ علیہ السلام کی درخواست پر جس کا مفصل قصہ سورۂ اعراف میں آئیگا ہم نے تم کو زندہ کیا تمہارے مر جانے کے بعد یعنی حقیقۃً تم مر چکے تھے غشی اور سکتہ کی حالت نہ تھی اور نہ کوئی خواب تھا حقیقۃً مرنے کے بعد ہم نے تم کو اپنی رحمت سے دوبارہ زندہ کیا تاکہ تم شکر کرو کہ حق جل شانہ نے اپنی رحمت سے تمہارا قصور معاف فرمایا اور اپنی عبادت اور بندگی توبہ اور استغفار اور اعتذار کیلئے اور مہلت عطا فرمائی اور بعث بعد الموت کا نمونہ آنکھوں سے دکھلا دیا تاکہ بعث بعد الموت کے بارہ میں تمکو ذرہ برابر شبہ نہ رہے اور تم اس ایمان شہودی کا شکر ادا کرو۔ ایمان استدلالی میں تو تزلزل آسکتا ہے مگر ایمان شہودی میں تزلزل ممکن نہیں گویا کہ قیامت تم کو آنکھوں سے دکھلا دی گئی۔

انعام نہم وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ

جب بنی اسرائیل کو عمالقہ سے جہاد کرنے کا حکم ہوا تو بہت شاق اور گراں ہوا اور بالآخر یہ کہہ دیا کہ اے موسیٰ تم اور تمہارا رب جا کر جہاد اور قتال کرو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں اس جرم میں چالیس سال تک ایک میدان میں حیران و پریشان پھرنے کی سزا ملی اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ایک سفید ابر سایہ کے لیے بھیجا تاکہ دھوپ کی تکلیف نہ ہو اور کھانے کے لیے من و سلویٰ نازل فرمایا اور ایک نور کا ستون عطا فرمایا جو اندھیری راتوں میں چاندنی کا کام دیتا تھا اس آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور اے بنی اسرائیل سایہ کیا وادی تیہ میں ہم نے تم پر ابر کا۔ قتادہ سے منقول ہے کہ غمام اس ابر کو کہتے ہیں جو سفید ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ ابر نہایت ٹھنڈا اور پاکیزہ تھا ویسا ابر نہ تھا جو لوگوں میں معروف ہے بلکہ وہ اس قسم کا ابر تھا کہ جس میں بدر کے دن فرشتے نازل ہوئے اور جس میں قیامت کے دن حق جل و علا نزول اجلال فرمائیں گے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي

ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ ۔ ابر دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ جو بخارات یا دخان وغیرہ کے اجتماع سے ظاہر ہو دوسرا وہ جو عالم غیب اور عالم مثال سے بدون کسی سبب ظاہری کے ظہور میں آئے لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ ابر دوسری قسم کا تھا اور اسی طرح قیامت کے دن جو ابر ظاہر ہوگا وہ بھی اسی قسم کا ہوگا۔ اور اتارا ہم نے وادیٔ تیہ میں خزانۂ غیب سے تم پر من سلویٰ۔ من ایک شیریں چیز تھی۔ دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ تھی جو اوس کی طرح اترتی جسے ہر شخص اپنی ضرورت کے موافق چن لیتا اور سلویٰ ایک پرندہ کا نام ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں یا اور کوئی پرندہ ہے جو مشابہ بٹیر کے ہوتا ہے تمام لشکر کے گرد ہزاروں جانور جمع ہو جاتے اندھیرا ہونے کے بعد پکڑ لاتے اور کباب بنا کر کھا لیتے۔ مدت تک اسی طرح کرتے رہے۔

ف اطباء نے من یعنی ترنجبین کے بہت فوائد بیان کیے ہیں منجملہ ان کے یہ ہے کہ اسکو اگر پانی میں گھول کر پیا جائے تو بلغم اور سودا اور سوداوی وسواس اور دماغی ریاح فاسدہ کے لیے بہت مفید ہے عجب نہیں کہ بنی اسرائیل کے دماغوں کے تنقیہ کے لیے من تجویز کی گئی ہو تاکہ ان کے دماغ اس قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہو جائیں اور بٹیر کا گوشت دل کو نرم کرتا ہے یہ ان کی قساوت قلبی دور کرنے کے لیے تجویز کیا گیا ہو واللہ اعلم۔ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۔ اور کہا ہم نے ان سے کہ کھاؤ تم ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دیں یعنی یہ چیزیں محض تمہارے کھانے کے لیے اتاری ہیں ذخیرہ رکھنے کی ضرورت نہیں بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہ کی اور باوجود اس کے کہ خدا کی اس نعمت ورحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی خدا پر بھروسہ اور اعتماد نہ کیا۔ خائف ہو کر جو ذخیرہ رکھتے وہ سڑ جاتا۔ اللہ فرماتے ہیں اور ہمارا کچھ بھی نقصان نہیں کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔ یہ ایسا رزق تھا جس میں نہ دنیا کی مشقت تھی نہ آخرت کا حساب تھا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی فضیلت دوسرے حضرات انبیاء کے صحابہ پر ظاہر ہوتی ہے اس لیے کہ صحابہ نے دھوپ اور گرمی میں غزوات اور سرمایہ کے لیے سفر کیے مگر کبھی اس قسم کے خوارق کے خواہشمند نہ ہوئے کہ بنی اسرائیل کی طرح ہم پر من وسلویٰ نازل کی جائے۔ اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے ابر بھیجا جائے حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اگر دعا فرماتے تو فوراً پورا ہو جاتا۔

انعام دہم

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ ۔ الآیہ۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس مراد ہے اور یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل چالیس سال کے بعد میدان تیہ سے یوشع بن نون علیہ السلام کی معیت میں نکلے۔ جمعہ کی شام کو بیت المقدس فتح ہوا اور کچھ دیر کے لیے سورج رک گیا یہاں تک کہ یوشع بن نون علیہ السلام کو فتح حاصل ہوئی۔ اس وقت یہ حکم ہوا کہ تم اس شہر کے دروازہ میں سجدۂ شکر کرتے ہوئے

اور زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور اقرار کرتے ہوئے داخل ہو جیسے حق جل شانہٗ نے اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا۔

إِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی نصرت اور فتح آپہنچی اور آپ نے
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ	لوگوں کو دین اسلام میں فوج در فوج داخل
فِي دِينِ اللّٰهِ أَفْوَاجًا فَسَبِّحْ	ہوتا ہوا دیکھ لیا تو اس کے شکر میں اللہ کی
بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ	تسبیح اور تحمید اور استغفار کیجئے بیشک
كَانَ تَوَّابًا	اللہ تعالیٰ بڑا توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے لیے تشریف فرما ہوئے اور مکہ مکرمہ میں داخل ہونے وقت خشوع اور خضوع تواضع اور تذلل کے آثار آپ سے ظاہر اور نمایاں ہو رہے تھے۔ اسی شان سے مکہ میں داخل ہوئے اور فتح ہو جانے کے بعد غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی بعض علماء کے نزدیک یہ نماز صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کی نماز تھی۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ صلوٰۃ الفتح تھی یعنی فتح مکہ کے شکر کی نماز تھی۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایوان کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوئے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی آئندہ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اور یاد کرو اس وقت کو جب کہا ہم نے کہ داخل ہو اس قریہ میں پس کھاؤ پیو اس میں جہاں چاہو وسعت اور فراغت کے ساتھ اور داخل ہو اس کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے یہ شکر بدنی ہوا اور بخشش بخشش کہتے ہوئے۔ یعنی توبہ اور استغفار کرتے ہوئے اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہوئے داخل ہو یہ شکر لسانی ہوا اور ان دونوں عملوں کی روح خلوص قلبی ہے پس اگر ایسا کرو گے تو ہم تمہاری تمام خطاؤں کو بخش دیں گے اور اخلاص کے ساتھ نیکی کرنے والوں کے اجر میں بقدر ان کے اخلاص کے اور اضافہ کریں گے پس بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس طریقہ کے کہ جو ان سے کہی گئی تھی۔ بجائے سجدہ کے سرین کے بل داخل ہوئے اور حطۃ کے بجائے حَبَّةٌ فِي شَعْرَةٍ (گیہوں کا دانہ جو کے دانہ میں) ایک مہمل لفظ بطور تمسخر کے کہنے لگے پس نازل کیا ہم نے ان لوگوں پر جنہوں نے ظلم کیا تھا ایک عذاب آسمان سے اس وجہ سے کہ وہ حکم عدولی کرتے تھے یعنی اس وجہ سے کہ بجائے اس کے کہ نعمت کا شکر کرتے بے دینی کی اور توبہ اور استغفار کی جگہ تمسخر اور ہنسی کا طریقہ اختیار کیا اس لیے عذاب دیئے گئے اور بجائے عَلَيْهِمْ کے عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا کہنے میں اشارہ اس طرف ہے کہ یہ عذاب تمام بنی اسرائیل پر نازل نہیں کیا گیا۔ بلکہ خاص ان لوگوں پر نازل کیا گیا جنہوں نے حکم عدولی کی اور اللہ کے حکم کے ساتھ استہزاء اور تمسخر کیا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں رجز سے مراد طاعون ہے۔ اور سعد بن مالک اور اسامہ بن زید اور خزیمہ بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ طاعون رجز یعنی عذاب ہے جس سے پہلے لوگوں کو عذاب دیا گیا (رواہ النسائی) کہا جاتا ہے

کہ اس طاعون سے ایک ساعت میں ستر ہزار آدمی مرے۔

تفسیر انعام دہم وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ. الآیہ

(ربط) گزشتہ آیات میں آسمانی خوراک یعنی من وسلویٰ کا ذکر تھا اب ان آیات میں غیبی پانی اور غیبی چشموں کا ذکر فرماتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے عصا سے ظاہر ہوئے کھانے کے بعد پانی درکار ہوتا ہے اس لیے نہایت لطف یہ کہ جس طرح کھانا بطور خرق عادت عطا فرمایا اسی طرح پانی بھی بطور خرق عادت عطا فرمایا تاکہ خداوند ذوالجلال کی قدرت اور کلیم الٰہی کا اعجاز نبوت ورسالت ظاہر ہو کر قلوب کے لیے موجب سکینت وطمانیت ہو اور اس غیبی طعام وشراب کے استعمال سے قلب کی حالت درست ہو چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب موسیٰ علیہ السلام نے استسقاء کی دعا کی اور خاص اپنی قوم کے لیے خدا سے پانی مانگا یہ قصہ بھی میدان تیہ کا ہے۔ جب بنی اسرائیل پیاسے ہوئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ شانہ سے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی دعا مانگی۔ پس ہم نے کہا کہ اے موسیٰ اپنے عصا سے پتھر کو مارو۔ مارتے ہی فوراً ہی خوب رواں ہو گئے اور خوب بہ نکلے موسیٰ علیہ السلام کے مارنے سے بنی اسرائیل کے بارہ خاندان کے مطابق بارہ چشمے۔ تحقیق خوب جان لیا ہر گروہ نے اپنا اپنا گھاٹ اس آیت میں حق جل شانہ نے فَانْفَجَرَتْ فرمایا جس کے معنی خوب رواں ہو جانے کے ہیں اور سورۂ اعراف میں فَانْبَجَسَتْ فرمایا جس کے معنی رسنے اور تھوڑا تھوڑا پانی نکلنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس پتھر پر بارہ مرتبہ عصا مارتے جس سے ہر جگہ پر عورت کے پستان کے مثل ایک شی ظاہر ہوتی پھر اس سے پانی رسنا شروع ہوتا اس کے بعد وہ رواں ہوتا اور خوب بہتا۔ (معالم التنزیل) امام رازی فرماتے ہیں ممکن ہے کہ حسب ضرورت زیادہ بھی ہو اس وقت زیادہ بہتا ہو اور جب ضرورت کم ہوتی ہو تب تھوڑا بہتا ہو اور یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کا متعدد اعتبارات سے معجزہ تھا۔ اول تو پانی کا پتھر سے نکلنا۔ دوسرے یہ کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے اس قدر کثیر پانی نکلنا۔ تیسرے یہ کہ پانی کا بقدر حاجت نکلنا۔ چوتھے یہ کہ نفس عصا کے مارنے سے پانی کا بہہ پڑنا۔ پانچویں یہ کہ ضرورت پوری ہو جانے پر پانی کا بند ہو جانا۔ ان اعتبارات سے یہ واقعہ قدرت الٰہیہ کا ایک خاص نشان اور موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا اور اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے لیے ایک عظیم الشان نعمت تھی کہ جس کے بغیر حیات اور زندگی کا بقاء ناممکن ہے وہ بغیر کسی مشقت کے عطا فرمائی۔

ف موسیٰ علیہ السلام کی یہ دعاء استسقاء خاص اپنی قوم کے لیے تھی اس لیے صرف پتھر سے پانی جاری کیا گیا۔ بخلاف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاء کرام کے کہ انہوں نے خاص اپنی قوم کے لیے استسقاء کی دعا نہیں کی بلکہ تمام جہان کے لیے پانی مانگا اس لیے آسمان سے پانی برسایا گیا اور اس باران رحمت سے مومن اور کافر دوست اور دشمن سب ہی منتفع ہوئے۔

ف: موسیٰ علیہ السلام کا استسقاء کے لیے فقط دعا پر اکتفا فرمانا مسئلہ استسقاء میں امام اعظم قدس اللہ سرہ کے مسلک کی تائید کرتا ہے کہ استسقاء کے لیے خاص نماز ضروری اور لازم نہیں فقط دعا پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے نماز استسقاء سنت ہے واجب نہیں۔

اور کہا ہم نے بنی اسرائیل سے کھاؤ اور پیو تم اللہ کے خاص رزق سے جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر بغیر ظاہری اسباب کے توسط کے تم کو عطا فرمایا ہے اور دل وجان سے اللہ کا شکر کرو اور اللہ کا رزق کھا کر اس کی معصیت اور نافرمانی پر دلیر مت ہو اور زمین میں فساد مچاتے اور پھیلاتے نہ پھرو یعنی زمین پر اللہ کی معصیت نہ کرو۔

ف: لَا تَعْثَوْا عثی سے مشتق ہے جسکے معنی سخت فساد مچانے کے ہیں۔ یعنی مفسد اور فسادی تو تم پہلے ہی سے ہو مگر خیر اس فساد کو تم اپنی ہی ذات تک محدود رکھو اس میں اور کسی قسم کا اضافہ نہ کرو اور نہ لوگوں میں اسکو پھیلاؤ۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم نہ ٹھیریں گے ایک

طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنۢبِتُ

کھانے پر سو پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ نکال دے ہم کو جو اگتا ہے

الْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا

زمین سے زمین کا ساگ اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور

وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي

پیاز بولا کیا تم لیا چاہتے ہو ایک چیز جو ادنیٰ ہے بدلے

هُوَ خَيْرٌ ۚ اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَ

ایک چیز کے جو بہتر ہے اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے گا جو مانگتے ہو اور

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ

ڈالی گئی ان پر ذلت اور محتاجی اور کما لائے غصہ

مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

اللہ کا ۔ یہ اس پر کہ وہ تھے نہ مانتے حکم اللہ کے

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا

اور خون کرتے نبیوں کا ناحق ۔ یہ اس سبب سے کہ بے حکم

وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۔

ذکر شنائع بنی اسرائیل و بیان لعنت ایشان بانبیاء رب جلیل

شناعت اول کفران نعمت بنا بر دناءت و خساست

قال تعالیٰ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰي طَعَامٍ وَّاحِدٍ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔

(ارتباط) یہاں تک حق تعالیٰ شانہ نے اپنے انعامات اور احسانات کا ذکر فرمایا اب آئندہ بنی اسرائیل کی شرارتوں اور عادات شنیعہ اور انبیاء اللہ کے ساتھ ان کے تعنت اور عناد کو بیان فرماتے کہ جس قدر حق کی طرف سے ان پر نعمتیں برستی رہیں اسی قدر ان کے تمرد اور سرکشی میں اضافہ ہوتا رہا اور پھر اس سلسلہ میں سب سے پہلی شناعت جو ذکر فرمائی تو وہ کفران نعمت اور ان کی طبعی دناءت اور خساست کو ذکر فرمایا کہ جو خسیس کو نفیس پر ترجیح دینے کا باعث بنی اس لیے اب انعامات کے بعد ان کی شناعتوں اور شرارتوں اور حماقتوں کو بیان کرتے ہیں تاکہ گزشتہ انعامات کو یاد کر کے اللہ کی محبت اور اس کی اطاعت کی رغبت پیدا ہو چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب تم نے کمال بے ادبی سے موسیٰ علیہ السلام کا نام لیکر پکارا اور تم نے یہ کہا اے موسیٰ حالانکہ تم کو ادب یہ تھا کہ یا رسول اللہ اور یا نبی اللہ اور یا کلیم اللہ کہہ کر ان سے عرض و معروض کرتے۔ دوسری گستاخی تم نے یہ کی کہ یہ کہا کہ ہم ہرگز صبر نہ کریں گے یہ کلام بھی تمہاری اندرونی خباثت اور باطنی شرارت کی خبر دے رہا ہے کہ صبر اور تحمل کر سکتے تھے مگر قصداً ہرگز ایسا نہیں کریں گے ورنہ اگر حقیقۃً صبر کی طاقت ہی نہ تھی تو یہ کہنا تھا۔ لن نستطیع الصبر یعنی ہم میں صبر کی طاقت نہیں بلکہ مناسب تو یہ تھا کہ بصد شکر اللہ کی نعمت کو قبول کرتے اور پھر بصد ادب رب العزت سے یہ درخواست کرتے۔ رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا اے اللہ ہم تیرے عاجز اور ناتواں بندے ہیں ہم کو صبر اور تحمل

غضب کا غضب اس لیے ہوا کہ وہ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور خدا کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے تھے یعنی خود بھی اُن کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک بھی حضرات انبیاء کے قتل کی کوئی وجہ نہ تھی محض عناد اور سرکشی اسکا باعث ہوئی۔ انبیاء اللہ کا قتل ہمیشہ ناحق ہی ہوتا ہے لیکن جرم کی شدت بتلانے کے لیے بطور تاکید بغیر الحق کا لفظ ذکر کیا گیا جیسا کہ رب احکم بالحق اے پروردگار حق کے مطابق حکم دیجیے۔ اس آیت میں بالحق کا لفظ محض تاکید کے لیے ہے یہ مقصد نہیں کہ معاذ اللہ خدا کے حکم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حق اور ایک ناحق۔ اسی لیے کہ حق تعالیٰ شانہ کا حکم ہمیشہ حق ہی ہوتا ہے اسی طرح انبیاء اللہ کا قتل بھی ہمیشہ ناحق ہوتا ہے یہود کے جرم کی شدت بیان کرنے کے لیے بغیر الحق کا لفظ محض تاکید کے لیے بڑھایا گیا ہے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء کا قتل کبھی حق ہوتا ہے اور کبھی ناحق۔ یا بعنوان دیگر یوں سمجھیے کہ بغیر الحق سے ظلم اور تعدی مراد ہے یعنی سوائے ظلم اور تعدی اور سوائے جور و ستم اور سوائے تمرد اور سرکشی کے اور کوئی امر انبیاء کے قتل کا باعث نہ تھا حضرات انبیاء نے تو ان کو حق کی دعوت دی اور نصیحت کی اور فلاح دارین کی طرف بلایا اور ان لوگوں نے انکا ناحق مقابلہ کیا۔

خلاصہ یہ کہ یہ لوگ خدا کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو قتل کرتے تاکہ رشد و ہدایت کا سلسلہ ہی منقطع ہوجائے اور فیض علم کا دروازہ ہی بند ہوجائے اسی لیے ذلت و مسکنت اور غضب الٰہی کے مورد بنے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ سخت عذاب والا قیامت کے دن وہ شخص ہوگا کہ جس کو کسی نبی نے قتل کیا یا اس نے کسی نبی کو قتل کیا۔ یا کسی گمراہی کا پیشوا یا تصویر بنانے والا۔ (مسند احمد)

ف: عبداللہ بن عباس اور حسن بصریؒ فرماتے ہیں جن پیغمبروں کو حق جل شانہ نے کافروں سے جہاد اور قتال کا حکم دیا انہی سے دشمنوں کے مقابلہ پر فتح و نصرت کا وعدہ کیا۔ کما قال تعالیٰ۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وہ پیغمبر صَدَقَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ کے مصداق بنے وہ کبھی دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول نہیں ہوئے اس لیے کہ حق جل شانہ کا انکو جہاد کا حکم دینا پھر انکی صیانت اور حفاظت نہ فرمانا بظاہر شان حکمت کے مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے ایسے حضرات ہمیشہ منصور و مظفر رہے اور ان کے دشمن ہمیشہ خائب و خاسر ہوئے اور جن پیغمبروں کو جہاد و قتال کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ ان سے حق جل و علا نے کسی عصمت اور نصرت کا وعدہ فرمایا ان میں سے بعض کو جام شہادت پلایا۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ۔۔۔۔ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تاکہ ان کے درجات اور مراتب میں عزت اور وجاہت میں اور قرب الٰہی اور رفعت شان میں

اعانت ہوا اور ان کے دشمنوں پر ذلت اور مسکنت غوری اور رسوائی گرانی اور بیعولی کی مہر لگے گرانی
روح المعانی و جامع الاحکام للامام القرطبی ص ۴۳۲ ج ۱۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۔ یعنی آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل کی جسارت اور دلیری ان میں اس طرح پیدا ہوئی کہ وہ شروع ہی سے اللہ کی نافرمانیاں کی اور حدود سے تجاوز کرتے رہتے تھے یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ معصیت اور نافرمانی دلوں میں راسخ ہو گئی اور اس نے آیات الٰہیہ کی تکذیب اور انبیاء اللہ کے قتل پر آمادہ کر دیا لیکن اب بھی اگر تم صمیم قلب سے ایمان لے آؤ تو توبہ کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے توبہ کر لینے سے تمہارا ہر قسم کا کفر اور پیغمبروں کے قتل کا جرم بھی معاف ہو سکتا ہے اگر چاہتے ہو کہ ذلت سے نکل کر عزت میں آجاؤ تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کرو اور ایمان اور عمل صالح اختیار کرو۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ
چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى
یہ بات ہے کہ جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو لوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ

وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
اور صابئین جو کوئی یقین لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا
کام کیا نیک تو ان کو ہے ان کی مزدوری اپنے رب کے پاس اور نہ

خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾
ان کو ڈر ہے اور نہ وہ غم کھاویں

لہ قال ابن عباس رضی اللہ عنہ لم یقتل قط من الانبیاء الا من لم یؤمر بقتال وکل من امر بقتال نصر فعلی ہذا لا تعارض بین قولہ تعالیٰ ویقتلون النبیین بغیر الحق وقولہ تعالیٰ انا لننصر رسلنا وقولہ تعالیٰ ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ۱۲ روح المعانی ص ۲۸۱ ج ۱۔ جامع الاحکام قرطبی

ایمان لانا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک انبیاء اور ان کو اور صحف سماویہ پر ایمان نہ لائے
اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور آخرت کے احوال کی معرفت کا ذریعہ انبیاء اور صحف
الٰہیہ ہی ہیں اور وحی اور صحیفہ ربانی کا نزول فرشتہ کی وساطت سے ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایمان باللہ اور ایمان بیوم الآخرت موقوف ہے ایمان بالانبیاء اور ایمان بالملائکہ اور
ایمان بالکتب پر اس لیے ان میں بعض پر ایمان لانے کو علیحدہ بیان نہیں کیا گیا۔

ف صابئین ایک فرقہ ہے کہ جو کسی آسمانی دین اور شریعت کا قائل نہیں خدا اور بندہ کے درمیان
میں روحانیات کو واسطہ قرار دیتے ہیں کہ بندہ کو جو فیض بھی حاصل ہوتا ہے وہ روحانیات کے واسطہ
سے ہوتا ہے نبوت و رسالت کے سرے سے قائل نہیں۔ کہتے ہیں کہ پیغمبروں کی کوئی حاجت نہیں
تفصیل اگر درکار ہو تو تفسیر ابن کثیر وغیرہ کا مطالعہ کریں۔

علامہ شہرستانی نے ملل و نحل میں حنفاء اور صابئین کا ایک مناظرہ ذکر فرمایا ہے جو قابل
دید ہے اس ناچیز نے اپنے علم الکلام میں اسکا ترجمہ بھی کیا ہے جو کہ عنقریب شائع ہو چکا ہے وہاں
دیکھ لیا جائے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ صابئین کے بارہ میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور ان
کا مذہب کیا ہے۔

(۱) قول اول مجاہد اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ صابئین ایک قوم اور فرقہ ہے جسکا دین یہودیت اور
مجوسیت سے مل کر بنا ہے۔

(۲) قول دوم: قتادہ کہتے ہیں کہ وہ ایک قوم ہے جو فرشتوں کی عبادت کرتی ہے اور سورج
کی طرف منہ کر کے روزانہ پانچ نمازیں پڑھتی ہے اور قتادہ سے یہ بھی منقول ہے کہ دین پانچ ہیں جن
میں سے چار تو شیطان کے لیے ہیں اور ایک دین رحمٰن کے لیے ہے سو صابئین جو فرشتوں کو پوجتے ہیں اور
مجوس جو آتش پرست ہیں اور مشرکین جو بتوں کو پوجتے ہیں اور اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ۔ ان
سب فرقوں کے دین شیطان کے لیے ہیں۔

(۳) قول سوم: صابئین وہ گروہ ہے جو ستاروں کی عبادت کرتے ہیں امام رازی فرماتے ہیں
کہ یہی قول اقرب الی الصواب ہے اور اس فرقہ کے دو مذہب ہیں ایک تو یہ کہ خالق
عالم تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن اس نے حکم دیا ہے کہ ان ستاروں کی تعظیم کی جائے اور انکو نماز اور
دعا کا قبلہ ٹھیرایا جائے۔ دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے افلاک اور کواکب کو پیدا کیا پھر تمام عالم کے
خیر و شر صحت و مرض کے مدبر یہی کواکب ہیں اور یہی ان سب چیزوں کے خالق ہیں اس لیے بشر پر
انکی تعظیم اور عبادت فرض ہے کیونکہ عالم کے الٰہ اور معبود یہی ہیں اور یہی عالم کے مدبر ہیں۔ پھر یہ
کواکب اللہ کی عبادت کرتے ہیں کلدانیوں کا یہی مذہب تھا جنکے رد و ابطال کے لیے حضرت

ابراہیم علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ (تفسیر کبیر صفحہ ۳۸۱ ج ۱) امام قرطبی فرماتے ہیں کہ صابئین کے مذہب کا ماحصل یہ ہے کہ یہ لوگ موحد تھے مگر تاثیر نجوم کے قائل تھے اور کواکب کو مدبر عالم سمجھتے تھے اسی وجہ سے جب خلیفہ قادر باللہ نے صابئین کے متعلق ابوسعید اصطخری سے دریافت کیا تو ابوسعید نے انکے کفر کا فتویٰ دیا۔ (تفسیر قرطبی صفحہ ۴۳۴ ج ۱)

اور اہل لغت اس شخص کو صابی کہتے ہیں جو ایک دین سے خارج ہو کر دوسرے دین میں داخل ہو گیا ہو اسی واسطے اہل عرب مسلمانوں کو صابی کہا کرتے تھے کیونکہ یہ لوگ بابائی دین چھوڑ کر ایک نئے دین یعنی دین اسلام میں داخل ہو گئے اور اس فرقہ کو صابئین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دین موسوی اور دین عیسوی سے نکل کر فرشتوں اور کواکب کی عبادت میں مشغول ہو گئے تھے۔ مولانا عبدالحق صاحب تفسیر حقانی مصنفہ یوں لکھتے ہیں صابی ایک قدیم فرقہ تھا حضرت ابراہیم کے عہد میں اس فرقہ کو بڑا زور تھا شہر بابل اور نینوی کے لوگ یہی مذہب رکھتے تھے یہ معلوم نہیں کہ اس گروہ کی ابتدا کب سے ہوئی اسکا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ جو ہر مجرد ہے بندہ کی جو ذات ہے کسی طرح رسائی ممکن نہیں اس کی پرستش اسکے مظاہر کی پرستش ہے پھر اس کے دو گروہ ہو گئے ایک وہ جو ستاروں اور آفتاب اور ماہتاب اور عناصر کی پرستش کرتے تھے دوسرے وہ جو اصنام کو رب کا مظہر سمجھ کر پوجتے تھے اس لیے یونان میں زہرہ وغیرہ ستاروں کے نام کے معبد بنے ہوئے تھے۔ پھر آگے چل کر ان بت کی شاخیں ہو گئیں۔

ایران کے آتش پرست اور ہندوستان کے قدیم وید ماننے والے بھی اسی گروہ کی شاخ ہیں۔ پھر ہر ملک میں اور ہر زمانہ میں اس مذہب نے ایک نیا رنگ بدلا اور نیا نام پیدا کیا۔ انتہیٰ کلامہ۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا

اور جب لیا ہم نے قرار تم سے اور اونچا کیا تم پر پہاڑ پکڑو جو

مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ

ہم نے دیا تم کو زور سے اور یاد کرتے رہو جو اس میں ہے تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ

ڈرو پھر تم پھر گئے اس کے بعد سو اگر نہ ہوتا فضل

اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

اللہ کا تم پر اور اس کی مہر تو تم خراب ہوتے

شناعت دوم

قال تعالیٰ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ ... الیٰ ... وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ

(ربط) گزشتہ آیت میں ایمان اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے اجر کا وعدہ فرمایا اب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ رغبت اور خوشی سے احکام خداوندی پر عمل کرنا محبین اور مخلصین کا کام ہے۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ ہے کہ جب تک ان پر تشدد اور سختی نہ کیا جائے اس وقت تک وہ عمل نہیں کرتے نیز گزشتہ آیات میں بنی اسرائیل کے جس استبدال کا ذکر تھا وہ نافرمانی کا تھا اب ان آیات میں ان کی اس نافرمانی کا ذکر ہے جو ان سے علانیہ طور پر ظاہر ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا کہ تم کو کوئی کتاب عطا کی جائے جس میں عبادت اور بندگی کے طریقے مذکور ہوں تو تم ضرور اس پر عمل کرو گے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تو موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ توریت کو قبول کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ بنی اسرائیل نے بعض احکام شاقہ کی وجہ سے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ ایک پہاڑ لا کر ان کے سروں پر معلق کر دو تو جبریل نے حکم الٰہی کے مطابق پہاڑ ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیا اور کہا اگر تم تورات کو قبول نہ کرو گے تو یہ پہاڑ تم پر چھوڑ دیا جائے گا۔ (معالم التنزیل)

بنی اسرائیل فوراً سجدہ میں گر گئے اور توریت پر عمل کرنے کا اقرار کیا۔ اس آیت میں حق جل شانہ نے اسی واقعہ کو یاد دلایا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا پختہ عہد لیا۔ اور اٹھایا تم پر کوہ طور کو تاکہ تم توریت کو قبول کرو۔ پس مضبوط پکڑ لو تم اس چیز کو جو ہم نے تم کو عطا کی یعنی توریت اس کو مضبوطی اور قوت کے ساتھ پکڑو اور فقط ظاہر توریت پر عمل کرنے پر اکتفا مت کرو بلکہ جو توریت میں ہے اس کو یاد کرو اور اس کے اسرار اور فوائد میں غور اور فکر کرو تاکہ تم دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچ جاؤ۔ اور مقام تقویٰ تم کو حاصل ہو جائے۔

ف: بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے بارہا اس کی درخواست کی کہ آپ اللہ سے استدعا کیجئے کہ ہم کو کوئی ایسی کتاب عطا فرمائے جو احکام الٰہیہ کی جامع ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اس کا پختہ عہد لیا کہ جب وہ کتاب عطا ہو تو ضرور اس پر عمل کرنا اگرچہ اس کے احکام تمہاری نفسانی

خواہشوں کے خلاف ہوں۔ بنی اسرائیل نے اقرار کیا کہ ہم ضرور اس پر عمل کریں گے جب اللہ تعالیٰ نے
توریت عطا فرمائی تو لگے قبول کرنے سے اور اس کے احکام پر عمل پیرا ہونے سے سرتابی کی اس
عہد شکنی سے باز رکھنے کے لئے کوہ طور کو ان کے سروں پر لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ پہاڑ کا ان کے سروں پر لا کر
کھڑا کر دینا ایمان لانے پر مجبور کرنے کے لئے نہ تھا اس لئے کہ ایمان تو وہ پہلے ہی سے لا چکے تھے۔ فقط
نقض عہد سے روکنے کے لئے تھا جیسے مسلمانوں پر حدود اور قصاص اور تعزیرات کا قائم کرنا ان میں
اکراہ نہیں بلکہ زنا اور سرقہ اور شراب خوری خونریزی اور رہزنی اور اسی قسم کے تمام فواحش سے روکنے
کے لئے ہے ہاں اگر پہاڑ کا معلق کرنا دین قبول کرنے کے لئے ہوتا تب آیۃ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ
کے خلاف ہوتا۔ پہاڑ کا سر پر لا کھڑا کرنا نقض عہد شکنی اور بد عہدی اور ایک ناشائستہ حرکت سے
روکنے کے لئے تھا نہ کہ دین قبول کرنے کے لئے ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۔ تم نے پھر اس کے بعد بھی
روگردانی کی۔ یعنی پھر تم ان تاکیدوں اور پختہ عہدوں کے بعد بھی احکام توریت سے منحرف ہو گئے پس
اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو یقیناً تم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوتے۔ تمہاری
بدعہدی اور عہد شکنی کا اقتضاء تو یہ تھا کہ تم کو فوراً عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا مگر اس کے فضل اور رحمت
نے تم کو عذاب سے بچا لیا اور تم کو توبہ اور استغفار کے لئے مزید مہلت دی اور اب تک توبہ کا دروازہ
کھول رکھا ہے لہٰذا نبی آخر الزمان کی متابعت کی سعادت حاصل کرو اور اگر تم اس نبی آخر الزمان پر ایمان
نہ لائے اور کفر پر مر گئے تو پھر اس خسران اور نقصان کی تلافی کا کوئی امکان نہیں رہے گا۔ توریت میں
جو تم سے نبی آخر الزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا جا چکا ہے اس کو پورا کرو ورنہ تم بھی عہد شکنی کرنے
والوں میں شامل ہو جاؤ گے اور عہد شکنی کی سزا کے مستحق ہو گے۔ آئندہ آیت میں بطور نظیر حکم شریعت
سے انحراف کے دنیوی زیان اور نقصان کو بیان فرماتے ہیں کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ پہلے لوگوں نے
ہفتہ کے بارہ میں توریت کے حکم سے عدول کیا اور پیغمبر کی متابعت سے انحراف کیا تو ان کے مسخ اور
لعنت کا کیا حال ہوا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ

اور جان چکے ہو جنہوں نے تم میں زیادتی کی ہفتے کے دن میں

فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا

تو ہم نے کہا ان کو ہو جاؤ بندر پھٹکارے ہوئے پھر ہم نے اس کو

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً

درعبرت رکھی اس شہر کے روبرو والوں کو اور پیچھے والوں کو اور نصیحت رکھی

لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٦٦﴾

ڈرنے والوں کو

شناعت سوم

قال تعالیٰ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِينَ اعْتَدَوْا مِنكُمْ ..... الی ..... وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ،

اور البتہ تحقیق تم خوب جان چکے ہو حال ان لوگوں کا کہ جنہوں نے ہفتہ کے دن حد سے تجاوز کیا پس ہم نے ان سے کہہ دیا کہ ہو جاؤ بندر ذلیل یعنی دھتکارے ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں ایک شہر دریا کے کنارہ آباد تھا جس میں بنی اسرائیل کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت تھی۔

بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے ہفتہ کے روز مچھلیاں دریا کے کنارہ پر بکثرت جمع ہو جاتیں اور ہفتہ گزرنے کے بعد یہ حالت ہوتی کہ ایک مچھلی بھی نظر نہ آتی۔ بنی اسرائیل نے جب یہ حالت دیکھی تو شکار کرنے کا ایک حیلہ نکالا کہ لب دریا چھوٹے چھوٹے حوض بنائے اور دریا سے پانی اور مچھلیاں آنے کے لیے نالیاں بنائیں ہفتہ کے روز جب وہ حوض مچھلیوں سے بھر جاتے تو وہ نالیاں بند کر دیتے اور یکشنبہ کو ان کا شکار کرتے۔ یہ طریقہ کچھ عرصہ تک جاری رہا۔ اسی بستی میں ان کے علاوہ بنی اسرائیل کے اور دو فریق تھے۔ ایک فریق تو ان کو اس حیلہ سے منع کرتا اور دوسرا فریق یہ سمجھ کر کہ ان کو نصیحت کرنا بے سود ہے اس لیے خاموش رہتا۔ نصیحت کرنے والوں نے جب یہ دیکھا کہ کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی تو بستی کو تقسیم کر لیا اور درمیان میں ایک لمبی دیوار کھینچ لی اس طرح سے شہر دو حصوں پر منقسم ہو گیا اور آمد و رفت کے لیے درمیان میں دروازہ رکھ لیا اور ہر فریق علیحدہ رہنے لگا۔ جب وہ کسی طرح باز نہ آئے تو داؤد علیہ السلام نے ان پر لعنت فرمائی۔ ایک رات وہ سب بندر بنا دیئے گئے۔ مرد بندر اور عورتیں بندریاں بنا دی گئیں۔ جب صبح ہوئی اور کوئی چلتا پھرتا نظر نہ آیا تو وہ لوگ جنکو اللہ نے اس عذاب سے محفوظ رکھا تھا آپس میں کہنے لگے کہ کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے جو بنی اسرائیل نظر نہیں آتے اور سخت متردد ہوئے جا کر دیکھا تو مکانات کے دروازے بند تھے کسی طرح دروازے کھول کر اندر داخل ہوئے تو دیکھا سب بندر بنے ہوئے ہیں جو شخص ان کو دیکھنے آتا تو بطور ترحم اور ملامت یہ کہتا کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو وہ کمال حسرت سے سر ہلاتا کہ بیشک آپ نے منع کیا تھا۔ اور یہ لوگ آنکھوں سے پہچانے جاتے تھے کہ یہ فلاں ہے اور وہ فلاں۔ تین دن تک اسی حالت میں رہے پھر سب مر گئے یہ تمام تفصیل امام ابن جریر

طبری اور حافظ ابن کثیر نے اپنی اپنی تفسیر میں ذکر کی ہے۔

امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے یعنی صورتیں اور شکلیں بندروں کی بن گئیں وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيزٍ۔ اور یہ اللہ پر کچھ دشوار نہیں اور آثار صحابہ اور تابعین بھی اسکی شہادت دے رہے ہیں نیز اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ وہ لوگ حقیقۃً بندر بنا دیئے گئے تھے۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ حقیقۃً بندر نہیں بنائے گئے تھے مگر اُن کے اخلاق اور عادات بندروں جیسے ہو گئے تھے تو یہ صریح غلط ہے۔ ظاہر قرآن اور ظاہر روایات اور اجماع سلف کے خلاف ہے۔ کافروں کے اخلاق تو ہر زمانہ میں بندروں سے بھی بڑھ چڑھ کر رہے ہیں اور اب تو ترقی کا دور ہے اور اس زمانہ کے کافر تو اخلاق میں بندر اور سور سے بھی بڑھ کر ہیں یہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ کی خصوصیت نہیں۔

ف مسخ کی تین قسمیں ہیں۔

اول: مسخ حقیقی یعنی حقیقت اور ماہیت کا بدل جانا جیسے گوشت کا پتھر ہو جانا جیسا کہ بعض حدیثوں میں آیا ہے۔

دوسرا: مسخ صوری یعنی حقیقت انسانیہ تو باقی رہے اور فقط صورت اور شکل بدل جائے جیسے اس قصہ میں ہوا کہ بنی اسرائیل کی فقط صورتیں اور شکلیں مسخ ہو گئیں کہ بجائے صورت انسانی کے بندر کی صورت بنا دیئے گئے مگر حقیقت انسانی جسکے ذریعہ سے انسان ادراک اور احساس کرتا ہے وہ بحالہ باقی تھی گویائی اور بولنے کی قوت سلب کر لی گئی تھی مگر عقل باقی تھی جس کے ذریعہ سے اپنی صورت بدلنے کا ادراک کرتے تھے اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ ہماری نافرمانی کی سزا ہے مسخ سے فقط اُن کی انسانی صورت زائل ہوئی نہ فہم اور شعور انسانی سب باقی رہا اسی لیے خٰسِئِیْنَ ذوی العقول کی جمع لائی گئی تاکہ ادراک انسانی کی بقاء پر دلالت کرے۔

قِرَدَةً کے لفظ سے بندر کی صورت ہونا معلوم ہوا اور كُوْنُوْا کے خطاب اور خٰسِئِیْنَ سے عقل اور انسانی شعور کا باقی رہنا معلوم ہوا اور جب ڈارون کی تحقیقات پر ایمان رکھنے والوں کے نزدیک بندر ترقی کر کے انسان بن سکتا ہے تو اگر انبیاء اللہ کے مقابلہ میں ترقی معکوس ہو کر انسان سے بندر بن جائے تو کیوں محال ہے حرکت کی مسافت ایک ہے حیوانیت سے انسانیت کی طرف ہو یا انسانیت سے حیوانیت کی طرف ہو۔ حیوان کو انسان بنتے تو کسی نے دیکھا نہیں اور ہزارہا انسانوں کو بندر بنتے ہوئے لاکھوں انسانوں نے حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآن اور حدیث نے اسکی خبر دی۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ — جسکا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے۔

عطاء خراسانی سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آواز دی گئی۔

یا اھل القریۃ کونوا قردۃ خاسئین — اے بستی والو ہوجاؤ بندر ذلیل۔

اس کے بعد لوگ ان کے پاس آتے اور یہ کہتے کہ کیا ہم نے تم کو منع نہیں کیا تھا تو سر سے اشارہ کرتے کہ بے شک۔

تیسرے: مسخ معنوی یعنی صفات نفسانیہ کا بدل جانا۔ مثلاً قناعت کا حرص اور طمع سے فہم و فراست کا سفاہت و بلادت سے بدل جانا کہ پہلے قانع تھا اب حریص بن گیا۔ پہلے متواضع تھا اب متکبر ہو گیا اس کو مسخ معنوی کہتے ہیں جسکو حق تعالیٰ نے ختم اور طبع کے ساتھ تعبیر کیا ہے اور آیات کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا اور فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ میں گدھے اور کتے کی مثال سے مسخ معنوی مراد ہے۔

بنی اسرائیل کا مسخ معنوی پہلے ہو چکا تھا اس وقت تو فقط مسخ صوری ہوا کہ بجائے شکل انسانی کے بندر کی شکل بنا دیئے گئے اس لیے کہ مسخ معنوی تو اسی وقت ہو چکا تھا کہ جب انبیاء اور علماء کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کَمَثَلِ الْحِمَارِ اور کَمَثَلِ الْكَلْبِ کا مصداق بن چکے تھے۔

آئندہ آیت میں اس مسخ صوری کی حکمت بیان فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے بندر بنائے گئے تاکہ نافرمانوں کو عبرت اور پرہیزگاروں کو نصیحت ہو۔ اور ظاہر ہے کہ نافرمانوں کو مسخ صوری ہی سے عبرت ہو سکتی ہے مسخ معنوی میں تو دوسرے نافرمان بھی انہی کے شریک اور ہم پلہ ہیں۔

ف: ابن عباس سے منقول ہے جنکو اللہ تعالیٰ نے بندر بنایا وہ تین دن سے زائد زندہ نہیں رہے اور نہ ان کی نسل چلی اور یہ بندر جو فی الحال موجود ہیں ان کی نسل سے نہیں بلکہ یہ اصلی بندر ہیں۔ (ابن کثیر)

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ پس بنایا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان بستیوں کے لیے جو اس قصہ کے سامنے تھا اور پیچھے آباد تھیں اور نصیحت بنایا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے یعنی تاکہ نافرمانوں کو اس واقعہ سے عبرت ہو اور فرمانبرداروں کو نصیحت ہو۔ مثل مشہور ہے۔

العبد یقرع بالعصا	غلام کو لکڑی سے تنبیہ کی جاتی ہے
والحر تکفیہ الملامۃ	اور شریف کو ملامت ہی کافی ہوتی ہے۔

(ربط) اب آئندہ آیات میں ان کی روگردانی کا ایک اور واقعہ ذکر فرماتے ہیں کہ وحی الٰہی پر اطمینان نہ کیا اور معاندانہ سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِۦٓ إِنَّ ٱللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اللہ فرماتا ہے تم کو کہ

تَذْبَحُوا۟ بَقَرَةً ۖ قَالُوٓا۟ أَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۖ قَالَ أَعُوذُ

ذبح کرو ایک گائے بولے کیا تو ہم کو پکڑتا ہے ٹھٹھے میں کہا پناہ

بِٱللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ ٱلْجَٰهِلِينَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا

اللہ کی اس سے کہ ہوں میں نادانوں میں بولے پکار ہمارے واسطے

رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ

اپنے رب کو کہ بیان کر دے ہم کو کہ وہ کیسی ہے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے

لَّا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذَٰلِكَ ۖ فَٱفْعَلُوا۟

نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی میانہ ہے ان کے بیچ اب کرو جو

مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا

تم کو حکم ہے بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب کو کہ بیان کر دے ہم

لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ

کو کیسا ہے رنگ اس کا کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے زرد

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ ٱلنَّٰظِرِينَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا۟ ٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ

ڈہڈہا رنگ اس کا خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو بولے پکار ہمارے واسطے اپنے رب

يُبَيِّن لَّنَا مَا هِىَ إِنَّ ٱلْبَقَرَ تَشَٰبَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّآ

کو بیان کر دے ہم کو کس قسم میں ہے وہ گایوں میں شبہ پڑا ہے ہم کو اور ہم

إِن شَآءَ ٱللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿۷۰﴾ قَالَ إِنَّهُۥ يَقُولُ إِنَّهَا

اللہ نے چاہا تو راہ پا لیں گے کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

گائے ہے محنت والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیتی کو

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ

بدن سے پوری ہے داغ کچھ نہیں اس میں بولے اب لایا تو ٹھیک بات

فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

پھر اس کو ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ کریں گے

شناعت چہارم معاندانہ سوالات

قال تعالیٰ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ... الی ... وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ

اور یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک متمول اور مالدار شخص جس کا نام عامیل کہا جاتا ہے سوائے بھتیجے کے اور کوئی اسکا وارث نہ تھا ایک مدت تک بھتیجا اس کے مرنے کا منتظر رہا جب دیکھا کہ وہ مرتا ہی نہیں تو ایک روز موقع پاکر قتل کر ڈالا اور شب میں اسکی نعش کو محلہ میں ڈال دیا جب صبح ہوئی تو اہل محلہ پر خون کا دعویٰ کیا۔ تاکہ ترکہ کے علاوہ اہل محلہ سے مقتول چچا کی دیت اور خون بہا بھی وصول کرے جیسا کہ ہماری شریعت میں قسامت کا حکم ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اہل محلہ سے دریافت کیا تو اہل محلہ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ واللہ نہ ہم نے قتل کیا اور نہ ہمکو قاتل کا کوئی علم ہے۔ اے نبی اللہ اور اے کلیم اللہ آپ ہی بارگاہ خداوندی میں عرض معروض کیجئے تاکہ اس واقعہ کی حقیقت منکشف ہو (تفسیر ابن کثیر)

اس وقت اللہ کی یہ وحی نازل ہوئی کہ تحقیق اللہ سبحانہ و تعالیٰ تمکو حکم دیتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس گائے کا ایک ٹکڑا اس مقتول پر لگاؤ تھوڑی دیر کے لیے وہ مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام زبان سے بتلا دے گا۔ یہ طریق اس لیے اختیار کیا گیا کہ انکار کی گنجائش نہ رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر بذریعہ وحی اسکا نام بتلا دیتے تو ممکن تھا کہ یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کرتے اور انکی بات کا یقین نہ کرتے اور کفر میں مبتلا ہوتے۔ اور جب ایک مردہ زندہ ہو کر خبر دے گا تو اس میں نہ تو کذب کا احتمال ہوگا اور نہ کسی کو چون و چرا کی گنجائش ہوگی اس لیے کہ جو شخص ابھی عالم غیب سے آیا ہو وہ کیسے جھوٹ بول سکتا ہے نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ لوگ

یہ سمجھ جائیں کہ گائے اور بچھڑا جس کو بنی اسرائیل نے معبود بنا لیا تھا وہ اس قابل نہیں کہ اسکی پرستش کی جائے وہ تو ذبح ہونے کے قابل ہے ۔

قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۔
بنی اسرائیل یہ حکم سنکر بولے کیا آپ ہم سے تمسخر کرتے ہیں۔ بھلا گائے کے ذبح کرنے اور قاتل کے معلوم ہونے میں کیا مناسبت ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ قاتل کا پتہ بتلاؤ اور آپ فرماتے ہیں کہ ایک گائے ذبح کریں

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پناہ مانگتا ہوں میں اللہ سے اس سے کہ میں نادانوں سے ہوں یعنی سوال کے مطابق جواب نہ دینا اور استہزاء اور تمسخر کرنا جاہلوں کا کام ہے معاذ اللہ انبیاء اللہ کا کام نہیں اور پھر وہ بھی احکام الٰہیہ میں۔

بنی اسرائیل اپنے زعم میں اس سوال کو فلسفہ سمجھے مگر حقیقت میں سراسر جہل اور سفہ تھا یہ نہ سمجھے کہ احکام الٰہیہ کے اسرار سوائے مقربین بارگاہ خداوندی کے کس کو معلوم ہو سکتے ہیں اور اسباب اور مسببات کے ارتباط اور مناسبت کو کون سمجھ سکتا ہے گائے کے پارچہ کے لگنے سے مردہ کا بول اٹھنا گائے کا ذاتی اور طبعی خاصہ نہیں بلکہ قدرت الٰہیہ کا کرشمہ اور بارگاہ کلیم اللہی کا معجزہ ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کہنے کے بعد یہ سمجھے کہ یہ حکم تو اللہ کی طرف سے آ ہی چکا ہے جس کی تعمیل ناگزیر ہے اس لیے یہ خیال ہوا کہ جس گائے کے ذبح کا حکم ہوا ہے شاید وہ کوئی عجیب و غریب گائے ہوگی اس لیے بار بار سوالات کیے کہ وہ کیسی گائے ہے اسکا رنگ کیسا ہے اسکی عمر کیا ہے وغیرہ وغیرہ ذلک۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل کسی گائے کو بھی ذبح کر دیتے تو کافی ہو جاتا لیکن انہوں نے تشدد کیا تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی اس لیے کہ حق تعالیٰ نے کسی خاص اور معین گائے کے ذبح کا حکم نہیں دیا تھا اس لیے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً میں لفظ بقرۃ نکرہ مستعمل ہوا ہے جس سے صاف ظاہر تھا کہ تعیین مقصود نہیں بلکہ تعمیل مقصود ہے اگر تخصیص اور تعیین مطلوب ہوتی تو اَنْ تَذْبَحُوا الْبَقَرَةَ الف لام کے ساتھ معرفہ لایا جاتا۔

آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کے لغو آمیز سوالات کا ذکر ہے قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۔ کہا انہوں نے آپ اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ بیان کرے کہ وہ گائے کیا چیز ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے کیونکہ یہ خاصیت نہ تو متعارف گائے کی ہے نہ قتیل کے زندہ کرنے کی معلوم ہوا کہ جس گائے کی یہ خاصیت ہے اسکی حقیقت ہی کچھ اور ہوگی اگرچہ نام اسکا گائے ہے مگر ماہیت نوعیہ اسکی بالکل جدا ہوگی۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے

کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وہ ایک گائے ہے یعنی اسی جنس کی ہے کسی دوسری جنس کی گائے
نہیں اور اس کی کوئی نئی حقیقت ہے اسی قسم کی ایک گائے ہے حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے
کوئی فرق نہیں البتہ سن اور عمر کے اعتبار سے کچھ فرق ہوگا وہ یہ کہ وہ نہ بڑھیا ہو نہ بچھیا بلکہ متوسط اور
بیچ بیچ ہو یعنی میانہ سال ہو جس کو ادھیڑ کہتے ہیں پس فوراً کر ڈالو جو تم کو حکم دیئے گئے ہو کوئی دشوار امر نہیں
حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خواب کے اشارہ پر بیٹے کو ذبح کرنے پر تیار ہو گئے اور تم ایک گائے کے
ذبح میں ہزاروں حجتیں کر رہے ہو۔ رہا خواص اور آثار کا پیدا ہونا سو وہ محض اللہ کے ارادہ اور مشیت پر
ہے حقیقت اور ماہیت کے اقتضا پر موقوف نہیں وہ جب چاہے اپنی قدرت سے یہ خواص
پیدا کر سکتا ہے مگر ان کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور مکرر سوال کیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن
لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ
کہا انہوں نے کہ آپ اپنے پروردگار سے استدعا کیجئے کہ ہمارے لیے بیان فرما دے کہ اس کا رنگ کیا
ہے۔ کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ تحقیق اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے زرد رنگ والی ہے رنگ اس
کا تیز اور کھلا ہوا ہے۔ دیکھنے والوں کو بھی معلوم ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو اس پر بھی تشفی نہیں ہوئی اور
پھر سوال کیا۔ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا
وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ۔ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ
تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ
بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ۔ کہا انہوں نے کہ آپ دعا کیجئے اپنے رب سے
کہ بیان فرمائے ہمارے لیے کہ اس گائے کی حقیقت تعیین کیا ہے جس کی یہ خاصیت ہے۔ اگرچہ اس
کا سن اور سال رنگ اور حال سب بتلا دیا گیا لیکن اب بھی ہم کو پورا انکشاف نہیں ہوا تحقیق گائیں
ہم پر مشتبہ ہو گئی ہیں۔ یہ اوصاف بہت سی گایوں میں پائے جا سکتے ہیں کوئی وجہ ترجیح بیان فرمایئے
کہ یہ خاصیت اس گائے میں کس بنا پر ہے لہٰذا وجہ ترجیح کے لیے کچھ اوصاف بیان فرما
دیئے جائیں۔

اور انشاء اللہ تعالیٰ یعنی اگر خدا نے چاہا تو ہم ضرور پتہ چلا لیں گے کہ اس گائے میں یہ
خاصیت عجیبہ کس بنا پر ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ لفظ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی پتہ نہ چلتا
یعنی اس کلمہ کی برکت سے ان کا تحیر اور تردد رفع ہوا جب تک اپنے عجز کا اقرار و اعتراف اور اللہ
اس کی قدرت اور مشیت سے استعانت نہ ہو کوئی عقدہ حل نہیں ہو سکتا۔

فائدہ | مماثلت ۔ یہ پہلے سوال کا اعادہ ہے مزید توضیح اور مزید انکشاف کے لیے
دوبارہ سوال کیا گیا کہا موسیٰ علیہ السلام نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ ایک گائے ہے محنت والی
نہیں کہ ہل میں جوتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہو کھیتی کو یعنی نہ بیل ہونے کی محنت اس سے لی گئی ہو اور نہ

اوپ پانی کی مشقت اس پر ڈالی گئی ہو۔ بے عیب ہو اور اس میں کوئی داغ نہ ہو۔ کہنے لگے کہ اب لائے آپ حق بات کو یعنی واضح اور مفصل بات آپ نے اب بتلائی جس سے پورا تردد رفع ہوا آخر کار حیوان تمام حیوانوں میں حیات کا مظہر اتم ہوگا۔ پس ممکن ہے کہ اس کی حیات کے اثر سے دوسرے میں بھی حیات کا اثر آجائے پس ایسی گائے کو خرید کر ذبح کیا اور لگتے نہ تھے کہ وہ کریں گے ان کے لغت آمیز استفسارات سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ غالباً ذبح نہ کریں گے۔ مگر خیر انشاء اللہ کہنے کی برکت سے کر گزرے۔

ف ۴۲ بنی اسرائیل چونکہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو چکے تھے اور یہ سمجھا تھا کہ معاذ اللہ یہ جانور خدا ہو سکتا ہے تو اس کے رد کرنے کے لیے بھی گائے کے ذبح کا حکم دیا گیا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ۭ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ

اور جب تم نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے اور اللہ کو نکالنا ہے

مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ۭ

جو تم چھپاتے تھے پھر ہم نے کہا مارو اس مردے کو اس گائے کا ایک ٹکڑا

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

اسی طرح جلا دے گا اللہ مردے اور دکھاتا ہے تم کو اپنے نمونے شاید تم

تَعْقِلُوْنَ ۝

سمجھو۔

شناعت تجسم (۵۱)

قال تعالیٰ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ... الیٰ ... وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ تم نے ایک محترم نفس کو قتل کر ڈالا پھر اس قتل کو ایک دوسرے

کے سر تھوپنے لگے وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا اور وہ کہتا ہے کہ اس نے مارا۔ اور جن چیزوں کو تم دلوں میں چھپاتے تھے اللہ تعالیٰ ان کو اندر سے باہر نکالنے والا ہے۔ جس سے تمہارے اندرونی اخلاق اور دلی خیالات اس طرح عیاں اور آشکارا ہو جائیں جیسے کسی محسوس شئی کو کسی بند صندوق سے نکال کر مجمع میں لا کر سب کے سامنے رکھ دیا جائے کہ سب اس کو اچھی طرح دیکھ لیں۔ پس کہا ہم نے کہ لگاؤ اس مردہ پر اس گائے کا کوئی ٹکڑا زبان یا دُم وغیرہ پر رکھ دو تو وہ جی اٹھے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مقتول فوراً زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔ قاتل کو پکڑا گیا اور قصاص لیا گیا اور میراث سے بھی محروم رکھا گیا۔ اور اسی وقت سے یہ حکم ہو گیا کہ قاتل ہمیشہ میراث سے محروم رہے گا اگرچہ قاتل مقتول کا باپ یا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

ف (۱) مقتول کا قول مر کر زندہ ہونے کے بعد اس وجہ سے معتبر مانا گیا کہ وہ عالم برزخ کو دیکھ چکا ہے لہٰذا اس کے قول میں اب کذب کا احتمال باقی نہیں رہا اور نہ وہم و خیال اور خطاء و نسیان کا۔ جیسے شجر اور حجر کا گویا ہونا نبی کا معجزہ ہے اسی طرح مردہ کا زندہ ہو کر قاتل کا نام بتانا موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا۔ آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جس طرح اس واقعہ میں اللہ نے محض اپنی قدرت سے عدل اور قصاص جاری کرنے کے لیے عارضی طور پر تھوڑی دیر کے لیے ایک خاص ضرورت اور مصلحت کے لیے ایک مردہ کو تمہارے روبرو زندہ فرمایا اور اس مردہ کا کلام تم نے اپنے کانوں سے سنا اسی طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے دن محض جزا دینے اور عدل قائم کرنے کے لیے اور انصاف کے لیے دوبارہ اپنی قدرت کاملہ سے مردوں کو محض اپنی قدرت سے زندہ فرمائیگا اور سب کا انصاف کریگا اور مظلوم کا ظالم سے قصاص اور بدلہ دے گا اور وقتاً فوقتاً اپنی قدرت کے نمونے اور کرشمے دکھلاتا رہتا ہے تاکہ تم سمجھو کہ اس قسم کے خوارق اور عجائب وقتاً فوقتاً قدرت کا انکار بے عقلوں کا کام ہے۔

امام المتکلمین عبدالکریم شہرستانی ملل و نحل میں فرماتے ہیں کہ جس طرح جاہل اور گنوار انسانوں کے عجیب و غریب افعال و حرکات پر متعجب ہوتے ہیں تو عقلاء دوران اور بڑے بڑے سائنسدان انبیاء و مرسلین کے آیات بینات اور خوارق و معجزات کو اسی سے کہیں زیادہ حیرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں اگر کسی فلسفی اور سائنسدان کا اپنی ناقص اور محدود عقل سے انبیاء و مرسلین کے معجزات کا انکار عجیب ہے تو جاہل اور گنواروں کا انسانی عجائب قدرت سے کیوں تعجب نہیں خوب سمجھ لو کہ شعور انسانی کو شعور پیغمبری سے وہی نسبت ہے جو شعور حیوانی کو شعور انسانی سے ہے۔ عجب نہیں کہ یہ نسبت بھی نہ ہو۔ انتہیٰ کلامہ مختصراً۔

ف (۲) اس آیت میں جو مضمون مذکور ہے وہ قصہ مذکورہ بالا کا ابتدائی حصہ ہے۔ اس تقدیم و تاخیر کی وجہ یہ ہے کہ اگر قصہ کو ترتیب سے بیان کیا جاتا تو یہ سمجھا جاتا کہ فقط ایک واقعہ کا بیان مقصود ہے۔ ترتیب کے بدلنے سے دو باتوں کی طرف اشارہ فرمایا اول اس طرف کہ حکم الٰہی کا فوراً امتثال کیوں

تَعْمَلُوْنَ ۝

کام سے

استعجاب بر قساوت بعد مشاہدۂ عجائب قدرت

قال تعالیٰ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ... الی ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ

پھر تمہارے دل خواکی ان عجیب نشانیوں کے دیکھنے کے بعد بھی سخت ہو گئے حالانکہ ہر ایک نشانی رقت قلب کے لیے ایک نمونہ جامعہ تھی حضرت مقتول کا زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتانا ایک عجیب و غریب کرشمہ تھا۔ یہ نشانی دلیل توحید بھی تھی اور دلیل نبوت و رسالت بھی تھی اور دلیل قیامت بھی تھی مگر پھر بھی دل نرم نہ ہوئے پس وہ مثل پتھروں کے سخت ہیں یا سختی میں پتھروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں تشبیہ اور تمثیل میں لوہے اور تانبے کا اس لیے ذکر نہیں فرمایا کہ لوہا اور تانبا آگ پر رکھنے سے پگھل جاتا ہے مگر ان کے دل اس قدر سخت ہیں کہ تخویف اور ترہیب کی آگ سے بھی نہیں پگھلتے پتھر کی طرح ہیں کہ جو کسی حال میں بھی نرم نہیں ہوتا یا پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں اس لیے کہ بعض پتھر ایسے ہیں کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ اگرچہ ان سے نہریں تو نہیں جاری ہو جاتیں لیکن پھٹ جاتے ہیں پھر ان سے پانی آہستہ آہستہ نکلتا رہتا ہے اور بعض ایسے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اسی طرح بعض قلوب ایسے ہیں کہ جن سے علوم و معارف کی نہریں جاری ہو جاتی ہیں کہ جن سے دنیا سیراب ہوتی ہے۔ یہ علماء ربانیین اور ائمہ ہادین کی شان ہے کہ جن کے کلمات طیبات نے مردہ دلوں کے حق میں آب حیات کا کام دیا۔ اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ ان سے نہریں تو نہیں مگر علم و حکمت کے چشمے رواں ہو گئے اور لاکھوں اور ہزاروں کو ان سے نفع ہوا۔ یہ علماء ربانیین کی شان ہے۔ اور بعض قلوب ایسے ہیں کہ اللہ کی عظمت اور جلال کے سامنے پست ہیں۔ تکبر اور غرور سے پاک ہیں کبھی اسکے حکم کے خلاف سر نہیں اٹھاتے یہ عباد اور زہاد کی شان ہے۔

مگر ان کافروں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ہیں کہ غرور اور تکبر عناد اور سرکشی سے کبھی حق کے سامنے جھکتے ہی نہیں اللہ کی ہدایت کو قبول کرنا تو درکنار اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔

بعض سلف سے منقول ہے کہ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ سے وہ لوگ مراد ہیں جو خوف خداوندی سے بکثرت روتے ہیں اور وَاِنَّ مِنْهَا

لَمَا يَتَشَقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ۔ سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو کم روتے ہیں اور وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دل سے تو روتے ہیں مگر آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے ۔ ہم سب کو اللہ سے یہ دعا مانگنی چاہیئے ۔ ؎

عیش و عشرت سے دو عالم کے نہیں مطلب مجھے ۔ چشم گریاں سینہ بریاں کر عطا یارب مجھے ۔ آمین

ف عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سوائے اللہ کے ذکر کے اور کثرت سے کلام نہ کیا کرو اس لیے کہ زیادہ کلام کرنا قلب میں قساوت (سختی) پیدا کرتا ہے اور سخت دل ہی خدا سے سب سے زیادہ دور ہے (ترمذی)

اس مقام پر بھی بنی اسرائیل کی جس قساوت کا ذکر ہے وہ بھی اسی سبب یعنی کثرت کلام کی وجہ سے ہے کہ جب گائے کے ذبح کا حکم ہوا تو سوالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا ۔ ان بیہودہ سوالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے ۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل اگرچہ تم اپنی قساوت قلبی کی وجہ سے خدا سے غافل ہو گئے ہو مگر خوب سمجھ لو ۔ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔ کہ اللہ تمہارے اعمال و افعال سے غافل اور بے خبر نہیں ۔

قساوت قلبی کا خاصہ یہ ہے کہ وہ خدا سے غافل بنا دیتی ہے اسی لیے حدیث میں آیا ہے

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْقَسْوَةِ وَالْغَفْلَةِ ۔	اے اللہ میں دل کی سختی اور غفلت سے پناہ مانگتا ہوں ۔

ایک شبہ پتھروں میں تو فہم اور ادراک ہی نہیں پھر خدا کے خوف سے پتھروں کے گرنے کا کیا مطلب ۔ ؟

جواب اہل سنت والجماعت کے نزدیک جمادات اور نباتات میں بھی روح اور حیات ہے اور ان میں ایک خاص قسم کا شعور اور ادراک ہے جس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے جیسا کہ امام قرطبی اور علامہ بغوی اور حافظ ابن کثیر نے اس کی تصریح فرمائی ہے اسی وجہ سے قرآن کریم میں جا بجا جمادات اور نباتات کی تسبیح و تحمید اور صلوٰۃ کا ذکر ہے ۔ قال تعالیٰ ۔

(۱) تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ	ساتوں آسمان اور زمین اور ان میں جو کچھ بھی ہے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی شئی ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح

تَسْبِيحَهُمْ	کو سمجھتے نہیں
(۲) كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهُ وَتَسْبِيحَهُ	ہر شئی کو اپنی نماز اور تسبیح کا علم ہے
(۳) وَالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ	گھاس اور درخت اللہ کے لیے سجدہ کرتے ہیں۔
(۴) قَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدْتُمْ عَلَيْنَا قَالُوا أَنْطَقَنَا اللَّهُ الَّذِي أَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ	کفار قیامت کے دن اپنی کھالوں سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی، وہ جواب میں کہیں گی کہ ہم کو اس خدا نے گویائی دی جس نے ہر چیز کو گویائی دی ہے۔
(۵) يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا	اس روز بیان کرے گی زمین اپنی خبریں اس وجہ سے کہ اس کو خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہوگا۔

اور اسی طرح شجر و حجر و حیوانات و جمادات کا انبیاء و مرسلین کی اطاعت اور فرمانبرداری اور ان سے کلام کرنا احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔

(۱) ستون حنانہ کا واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ صحیح بخاری میں مذکور ہے جس میں کسی مومن منصف کو تاویل کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔

عارف رومی فرماتے ہیں

استن حنانہ از ہجر رسول نالہ میزد ہمچو ارباب عقول
فلسفی کو منکر حنانہ است از حواس انبیاء بیگانہ است

(۲) صحیح بخاری میں ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے جبل احد کو دیکھ کر فرمایا ھٰذا جبل یحبنا ونحبہ یہ پہاڑ ہم کو محبوب رکھتا ہے اور ہم اس کو محبوب رکھتے ہیں اور محبت بدون معرفت اور ادراک کے ممکن نہیں۔

(۳) صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اب بھی اس پتھر کو پہچانتا ہوں کہ جو نبوت سے پیشتر مجھ کو سلام کیا کرتا تھا۔

(۴) صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور عثمانؓ جبل احد پر چڑھے تو پہاڑ کو جنبش ہوئی تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قدم مبارک پہاڑ پر مارا اور یہ فرمایا کہ اے پہاڑ ٹھہر۔ تجھ پر ایک نبی ہے

اور ایک صدیق اور دو شہید۔

(۵) حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ہم جب کبھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ساتھ مکہ سے باہر جاتے تو جس درخت یا پہاڑ پر گزر ہوتا تو یہ آواز آتی۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (اخرجہ البغوی باسنادہ فی العالم)

اس قسم کے اور صدہا واقعات ہیں جو کتب حدیث اور سیر میں مذکور ہیں، بطور نمونہ ہم نے چند واقعات ذکر کردیئے ہیں۔

عارف رومی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں۔ ؎

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند ۔۔۔ با من و تو مردہ با حق زندہ اند
آب و باد و خاک و نار پر شرر ۔۔۔ بے خبر با ما و با حق باخبر
باعکس آں زغیر حق بخبر ۔۔۔ بیخبر از حق و از چندیں نظیر
پیش تو آں سنگریزہ ساکت ست ۔۔۔ پیش احمد او فصیح و ناطق است
پیش تو استونِ مسجد مردہ است ۔۔۔ پیش احمد عاشق دل بردہ است
جملہ اجزائے جہاں پیش عوام ۔۔۔ مردہ و پیش خدا دانا و رام
مردہ زیں سو ز آنسو زندہ اند ۔۔۔ خامش اینجا وانطرف گویندہ اند

اور اسی پر تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع ہے کہ جمادات میں ایک روح مجرد ہے جو حق تعالیٰ شانہٗ کو پہچانتی ہے اور اسی کے احکام کی تعمیل کرتی ہے ایک مخلوق کا دوسری مخلوق سے بے تعلق اور بے خبر ہونا عقلاً ممکن بلکہ واقع ہے۔

لیکن مخلوق کا خالق سے بے تعلق ہونا عقلاً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ عارف رومی فرماتے ہیں۔

؎ بے تعلق نیست مخلوقے ازو

اور بے شمار آیات اور احادیث اسکی شاہد ہیں جو اہل علم پر مخفی نہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ

اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ایک لوگ تھے اُن میں کہ

مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ

سنتے تھے کلام اللہ کا پھر اسکو بدل ڈالتے بوجھ لے کر

مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵

اور ان کو معلوم ہے

شناعت ششم (۶)

متضمن بدفع کلفت ناصحین مشفقین از انتظار وطمع ایمان معاندین

قال تعالیٰ۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ ... الی ... وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝
گزشتہ آیات میں یہود کی قساوت کو بیان فرمایا، اب اُن مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہیں کہ جو ازراہ شفقت انکو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے اور ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ یہ کسی طرح ایمان لے آئیں مسلمانوں کو گمان یہ تھا کہ یہود توحید، اور انبیاء کرام کی نبوت کے قائل ہیں شاید یہ لوگ ایمان لے آئیں اللہ تعالیٰ نے انکی امید قطع کرنے کے لیے فرمایا کہ انکی قساوت انتہا کو پہنچ چکی ان سے ایمان کی طمع مت رکھو۔ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔ اے مسلمانو کیا تم بنی اسرائیل کی اس شدید قساوت کے بعد بھی توقع رکھتے ہو کہ وہ مخصوص تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں کا ایک فرقہ بلا واسطہ اللہ کے کلام کو سنتا تھا، اور پھر خوب سمجھ لینے کے بعد اس میں تحریف و تبدیل کرڈالتا تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اللہ کے کلام میں تحریف کررہے ہیں اور یہ بھی جانتے تھے کہ کلام خداوندی میں تحریف کرنا کس قدر جرم عظیم ہے۔ اس فریق سے وہ ستر لوگ مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے اور بلا واسطہ اللہ کے کلام اور اسکے اوامر ونواہی اور احکام کو سنا جب واپس آئے تو یہ کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ اگر ہوسکے تو کرنا اور نہ ہوسکے تو نہ کرنا۔ کلام الٰہی میں سے کچھ گھٹانا یا اپنی جانب سے کچھ اضافہ کردینا اسی کا نام تحریف ہے پس ان لوگوں نے کلام الٰہی میں اپنی طرف سے حروف اور الفاظ کا اضافہ کیا اور ایجاب اور لزوم کو تخییر سے بدل ڈالا۔

اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ کلام اللہ سے توریت مراد ہے اور يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ سے بواسطہ انبیاء کرام سننا مراد ہے۔ اور تحریف سے آیات توریت میں لفظی اور معنوی تحریف کرنا مراد ہے۔ مثلاً توریت میں جو آپکا حلیہ مبارک مذکور تھا اس میں ابیض کے بجائے آدم بنا دیا اور ربعۃ مائلا الی الطول کے بجائے طوالا۔ بنا دیا اور بہت سی جگہ تاویل فاسد کرکے معنی

میں تحریف کی اور یہی تفسیر یسمعون کلام اللہ سے ستر آدمیوں کا اللہ کے کلام کو بلا واسطہ سننا مراد تھا اور تحریف سے یہ مراد تھی کہ ان ستر آدمیوں نے جب قوم سے جا کر اللہ کا کلام نقل کیا تو اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ

ان استطعتم ان تفعلوا هذه الاشياء فافعلوا وان لم تفعلوا فلا بأس۔ یعنی یہ چیزیں اگر تم سے ہو سکیں تو کر لینا اور اگر نہ کرو تو کوئی مضائقہ نہیں۔

❊ ❊ ❊

ف جاننا چاہئے کہ توریت میں لفظی تحریف بھی ہوئی ہے اور معنوی تحریف بھی، اور یہی علماء محققین کا مسلک ہے۔ اور اصل تحریف تو تحریف لفظی ہے اس لیے کہ تحریف کے معنی حروف اور الفاظ کے بدل ڈالنے کے ہیں۔ اور تاویل فاسد کر کے معنی کو بدل ڈالنا مجازاً اس کو تحریف کہا جاتا ہے اور قرآن کریم میں جہاں کہیں توریت کی تحریف کا ذکر آیا ہے اس سے تحریف لفظی ہی مراد ہے کیونکہ تحریف معنوی تو قرآن میں بھی ہوئی ہے اور ہو رہی ہے اور حق جل شانہ کا یہ ارشاد۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ اور فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اس قسم کی آیتیں صراحۃً تحریف لفظی پر دلالت کر رہی ہیں جیسا کہ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر ابن جریر اور تفسیر درمنثور میں ان آیات کے شان نزول سے صاف ظاہر ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے اور جب اکیلے ہوتے

بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ

ہیں ایک دوسرے پاس کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو ان سے جو کھولا

اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاۗجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا

ہے اللہ نے تم پر کہ جھٹلاویں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے کیا تم کو

تَعْقِلُوْنَ (۷۶)

عقل نہیں

شناعت ہفتم (۷)

قال تعالیٰ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ... الی ... عِندَ رَبِّكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

اور جب منافقین یہود مسلمانوں سے ملتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ہم تصدیق کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق اور پیغمبر ہیں جن کی بشارتیں توریت میں مذکور ہیں۔ اور جب تنہا ایک دوسرے کے پاس ہوتے ہیں تمام مجمع میں ان کے سوا مسلمانوں میں سے کوئی نہیں ہوتا تو پھر علماء یہود جو اعلانیہ طور پر کافر ہیں وہ ان منافقین سے یہ کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں سے تو شاہ میں وہ چیزیں بیان کرتے ہو جو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولی ہیں۔ اور وہ خزائن علمیہ جو توریت اور زبور اور دیگر صحف انبیاء میں مخزون ہیں کہ جن میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور آپ کی امامت کے اوصاف اور آپ کے اتباع اور اطاعت کی تاکید مذکور ہے تم مسلمانوں کو ان خزائن علمیہ کا کھلا پتہ دیتے ہو۔ اس کا انجام یہ ہوگا کہ اس اقرار اور اعتراف کی وجہ سے مسلمان خدا کے نزدیک تم سے حجت کریں گے اور تم کو ملزم ٹھہرائیں گے کہ باوجود اس اعتراف اور اقرار کے پھر بھی ایمان نہ لائے کیا تم اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

الانسان ماخوذ باقراره یعنی انسان اپنے اقرار میں پکڑا جاتا ہے

یعنی تمہارا زبان سے اقرار کرنا اور پھر نہ ایمان لانا قیامت کے دن بڑی رسوائی کا باعث ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص زبان سے اقرار یا دستاویز لکھ دینے کے بعد حاکم کے سامنے انکار کرے تو زیادہ رسوائی ہے اور اگر حاکم کو معلوم ہوا اور گواہ بھی موجود ہوں مگر اس شخص نے اقرار نہ کیا ہو تو حاکم کے سامنے انکار کرنے سے رسوا تو ضرور ہوگا مگر اتنی رسوائی نہ ہوگی جتنی کہ اقرار کے بعد ہوتی۔

أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو چھپاتے ہیں

وَمَا يُعْلِنُونَ ۝

اور جو کھولتے ہیں

ب

تحمیق یہود بے بہود

قال تعالیٰ اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ ...... الیٰ ...... وَمَا یُعْلِنُوْنَ ۔

یعنی کیا ان کو یہ گمان ہے کہ اس چھپانے سے اللہ کے نزدیک ان پر کوئی حجت قائم نہ ہوگی اور یہ گمان کیا یہ ہاتھ کی لکھی ہوئی دستاویزیں یعنی توریت اور زبور کی وہ آیتیں جن میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صریح صریح بشارتیں مذکور ہیں بہ خداوند ذوالجلال کو قیامت کے دن ہم نہ پہنچ سکیں گی کیا ان کو معلوم نہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں کو خوب جانتا ہے جن کو وہ چھپاتے ہیں اور جن کو ظاہر کرتے ہیں یہ جلوت میں آپ کی نبوت و رسالت کا اقرار کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے اور جو خلوت میں اعتراف کرتے ہیں ان کو بھی جانتا ہے خلوت کا اقرار اگرچہ مسلمانوں کی نظر سے مخفی ہے مگر ہماری نظر سے تو مخفی اور پوشیدہ نہیں ہو سکتا۔ تم نے اگرچہ محبوب کے سامنے اقرار نہ کیا مگر اس خداوند ذوالجلال کے سامنے تو اقرار کر لیا جو کہ ہر جلوت اور خلوت غیب اور شہادت کا حاضر و ناظر ہے یہ احمق اتنا نہیں سمجھتے کہ اصل معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے جس کے یہاں ظاہر و باطن سر اور علانیہ جلی اور خفی سب یکساں ہے۔

تنبیہ توریت اور انجیل کی تحریف کے متعلق حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ اعجاز عیسوی ملاحظہ فرمائیں جو اس باب میں بے نظیر ہے۔

رسالہ موصوفہ میں اس امر کو نہایت بسط و شرح سے ثابت فرمایا ہے کہ توریت اور انجیل میں ہر قسم کی تحریف ہوئی ہے لفظی بھی اور معنوی بھی کمی اور بیشی زیادتی اور نقصان تغیر اور تبدیل غرض یہ کہ تحریف کی کوئی نوع ایسی نہیں کہ جس سے توریت و انجیل خالی ہو۔

یہ رسالہ اردو زبان میں ہے۔ مولانا موصوف کی دوسری کتاب اظہار الحق جو عربی زبان میں ہے اس میں بھی تحریف توریت و انجیل کی کافی و شافی تحقیق فرمائی۔ اور بہت سے علماء یہود و نصاریٰ بھی تحریف لفظی کے مقر اور معترف ہیں حضرات اہل علم اس کی مراجعت فرمائیں۔

(ربط) ان آیات میں یہود کے خواندہ لوگوں کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں ان کے ناخواندوں کا ذکر کرتے ہیں

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ

اور بعض ان میں ان پڑھ ہیں جو خبر نہیں رکھتے کتاب کی مگر بلا دلیل اپنی آرزوئیں اور

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

ان پاس نہیں سوا اٹکلیں

شناعت ہشتم (۸)

قال تعالی وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۝

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے پھر

يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا

کہتے ہیں یہ اللہ کے پاس سے ہے کہ لیویں اس پر مول

قَلِيلًا فَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُم

تھوڑا سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھ کے لکھے سے اور خرابی ہے

مِّمَّا يَكْسِبُونَ ۝

ان کو اپنی کمائی سے

شناعت نہم (۹)

قال تعالی فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ... الی ... وَوَيْلٌ لَّهُم مِّمَّا يَكْسِبُونَ

اور بعض ان میں سے ناخواندہ اور ان پڑھ ہیں، جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ویسے ہی ہیں۔ اسی وجہ سے ان پڑھ کو امی کہتے ہیں کہ اس کو صرف ماں ہی سے نسبت ہے۔ باپ سے لکھنا اور پڑھنا کچھ نہیں سیکھا۔ کتاب کو جانتے ہی نہیں نہ الفاظ سے واقف نہ معنی سے آگاہ سوائے آرزوؤں کے کچھ معلوم نہیں کہ جو تحریف کرنے والوں نے اپنی خواہش کے مطابق لکھ دیں ان میں مشغول رہتے ہیں مثلاً۔

لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى — کہ جنت میں سوائے یہود یا نصاریٰ کے اور کوئی نہ جائیگا۔

اور اگر بالفرض جہنم میں گئے بھی تو لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً یعنی صرف چند روز جہنم میں رہیں گے یہ آرزوئیں ان جاہلوں کے علماء سوء نے انکے دل خوش کرنے کے لیے دل نشین کر دی ہیں جس پر کوئی دلیل نہیں اور نہیں ہیں یہ لوگ مگر محض گمان اور خیال کی پیروی کرنے والے خود بھی انکو اسکا یقین نہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا اس لیے انکو بہ نسبت علماء کے کم عذاب ہوگا ان پر عذاب فقط اپنی گمراہی کا ہوگا اور علماء پر اپنے گمراہ ہونے اور دوسروں کے گمراہ کرنے کا بھی عذاب ہوگا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے پس خرابی اور بربادی ہے ان لوگوں کے لیے کہ جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر کہدیتے ہیں کہ یہ ہمارا لکھا ہوا اللہ ہی کی طرف سے ہے خوب جانتے ہیں کہ یہ تحریف ہے نادان اور بے خبر نہیں اس لیے کہ خود اپنے ہاتھ سے لکھ کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یہ محض اس لیے کرتے ہیں تاکہ اپنے رؤسا اور عوام سے اس ذریعہ سے کچھ قلیل معاوضہ حاصل کریں پس ایسے لوگوں کے لیے دو وجہ سے عذاب ہے ایک عذاب اس وجہ سے کہ انکے ہاتھوں نے تحریف کی کتابت کی ہے اور دوسرا عذاب اس وجہ سے کہ اس تحریف کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ کماتے ہیں، اول تو لوگوں کے خوش کرنیکے لیے کتاب الہی میں تحریف کی اور پھر چند پیسوں کی طمع میں آخرت کے اجر عظیم کو برباد کیا۔ ثَمَنًا قَلِيْلًا سے دراہم معدودہ مراد نہیں بلکہ مال کثیر مراد ہے اس لیے کہ اگر بالفرض حق اور ہدایت کی قیمت لگائی جائے تو روئے زمین کے خزانے اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ

اور کہتے ہیں ہم کو آگ نہ لگے گی مگر کئی دن گنتی کے تو کہہ

اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ

کیا لے چکے ہو اللہ کے ہاں سے اقرار تو البتہ خلاف نہ کریگا اللہ اپنا

عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اقرار یا جوڑتے ہو اللہ پر جو معلوم نہیں رکھتے۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ

کیوں نہیں جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے

فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

سو وہی ہیں لوگ دوزخ کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ

اور جو یقین لائے اور عمل کیے نیک وہ لوگ ہیں

الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

جنت کے وہ اسی میں رہ پڑے۔

شناعت دہم (۱۰)

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ... الیٰ ...... هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

اور یہود یوں کہتے ہیں کہ دوزخ ہم کو ہرگز نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم نے اللہ سے اس بارہ میں کوئی عہد لیا ہے، کہ تم کو فقط اس قدر مدت عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ عذاب کی مدت دلیل عقلی سے معلوم نہیں ہو سکتی اس کے لیے دلیل سمعی چاہیے ایسا عقیدہ بغیر عہد خداوندی کے نہیں ہو سکتا تو بتلاؤ کیا خدا نے تم سے کوئی ایسا عہد کیا ہے کہ اللہ اپنے اس عہد کے ہرگز خلاف نہ کریگا۔ یا اللہ پر افترا کرتے ہو ایسی باتیں جن کی سند تم کو معلوم نہیں اور خود اپنی طرف سے ایسی من گھڑت باتیں کرتے ہو بتلاؤ کس کتاب میں اللہ نے یہ حکم نازل کیا ہے۔ آئندہ آیت میں حق جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود کا یہ عقیدہ کہ ہم جہنم میں صرف چند روز رہیں گے بالکل غلط ہے۔ جنت میں داخل ہونا اللہ اور پیغمبر آخر الزمان پر ایمان لانے اور اعمال صالحہ کرنے پر موقوف ہے چنانچہ فرماتے ہیں بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۔ کیوں نہیں تم جیسے پیغمبر آخر الزمان سے سرکشی کرنے والے ضرور جہنم میں جائیں گے۔ اس لیے کہ جس شخص نے بھی گناہ کو کمایا اور گناہوں نے اس کا ہر طرف سے احاطہ کر لیا۔ اور کوئی جانب گناہ سے خالی نہیں رہی۔ جدھر دیکھئے گناہ ہی گناہ ہے نیکی کا نام و نشان نہیں۔ گناہوں نے ہر طرف

ایمان کے معتبر نہیں مگر عمل صالح کے لیے ایمان شرط ہے۔

فَإِذَا فَاتَ الشَّرْطُ فَاتَ الْمَشْرُوطُ — جب شرط فوت ہوئی تو مشروط بھی فوت ہوا۔

اسی وجہ سے کفار کے صدقات کو صرف صورۃً اعمال صالحہ کہا جا سکتا ہے ورنہ حقیقت میں اعمال صالحہ نہیں کما قال تعالیٰ

وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ — کافروں کے اعمال سراب کی مانند ہیں کہ دور
بِقِيعَةٍ يَحْسَبُهُ الظَّمْآنُ مَاءً — سے پیاسا اس کو پانی گمان کرتا ہے۔

جس طرح لکڑی کا گھوڑا اور تصویر کا بیل اصلی گھوڑے اور اصلی بیل کی صورت میں مشابہ ہے اسی طرح کافر کا عمل ظاہر صورت میں عمل صالح کے مشابہ ہوتا ہے مگر حقیقت میں نیک نہیں ہوتا ہے اس لیے کہ عمل صالح کی روح ایمان ہے اور وہ موجود نہیں۔

ف (۳) ہر شریعت میں یہ قاعدہ رہا ہے کہ کافر تو فی النار ہے ہمیشہ ہمیشہ اور ابد الآباد تک جہنم میں رہے گا۔ اور مومن عاصی چند روز دوزخ میں عذاب پا کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا کما قال تعالیٰ۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ — بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے
بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ — کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جاوے
لِمَنْ يَشَاءُ — اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے
منظور ہوگا وہ گناہ بخش دیں گے۔

یہود جو یہ روایت کرتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد کیا کہ تمہاری اولاد کو عذاب نہ دوں گا مگر تحلۃ القسم یعنی بقدر قسم پورا کرنے کے جیسا یہ فرمایا کہ فقط چند روز کے لیے جہنم میں رہیں گے۔ یہ روایت بالفرض اگر صحیح ہو تو اس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کے صلبی بیٹے مراد ہیں جنہوں نے یوسف علیہ السلام سے اپنا قصور معاف کرایا اور اپنے گناہ کو خداوندی میں بصد عجز و نیاز توبہ و استغفار کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ یہ تا ابد جہنم میں نہیں جائیں گے اور ان کی اولاد میں سے جو چند روز کے لیے جہنم میں جانے کا اس سے مومن عاصی مراد ہے جیسا کہ تمام شریعتوں کا قاعدہ ہے کہ جو شخص مومن ہو اور گناہگار ہو اس کو دائمی عذاب نہیں۔

بنی اسرائیل یہ سمجھے کہ یہ حکم اتفاقی طور پر ہمارے لیے مخصوص ہے اس لیے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَةً کا دعویٰ کر بیٹھے اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کا ازالہ فرمایا کہ یہ حکم بنی اسرائیل کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ دونوں جانب کا اعتبار ہے مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ میں جو لوگ بنی اسرائیل ملت حقہ اور دین حق کے متبع تھے۔ اگرچہ گناہوں اور غفلتوں میں ملوث تھے ان کے لیے یہ حکم تھا کہ بنی اسرائیل نہ تو کافروں کی طرح ہمیشہ جہنم میں رہیں گے بلکہ صرف چند روز کے لیے جہنم میں جائیں گے جیسا کہ مومن عاصی کا حکم ہے اور اب

وہ صورت باقی نہیں رہی اس وقت تم دین حق اور نبی برحق کے اتباع سے انحراف کیے ہوئے ہو۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہو اور نبی کی نبوت کا انکار کفر ہے۔ اس لیے تمہارا عذاب دائمی ہوگا جیسا کہ کافر کا تمام شریعتوں میں یہی حکم ہے کہ وہ ہمیشہ عذاب میں رہے گا۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ

اور جب ہم نے لیا اقرار بنی اسرائیل کا بندگی نہ کرنا

إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ

مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک اور قرابت والے سے

وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَ

اور یتیموں سے اور محتاجوں سے اور کہو لوگوں سے نیک بات اور

أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا

قائم رکھیو نماز اور دیتے رہیو زکوٰۃ پھر تم پھر گئے مگر

قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

تھوڑے تم میں اور تم کو دھیان نہیں۔

شناعت یازدہم (۱۱)

قال تعالیٰ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ ۔۔۔۔ الیٰ ۔۔۔۔ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں یہود کے اس زعم فاسد کا کہ ہم کو سوائے چند گنتی کے دنوں کے دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں اور فرمایا کہ یہ خیال خام ہے۔ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ خاندان نبوت سے تعلق پر نہیں۔ جو ایمان لائے اور عمل صالح کرے خواہ وہ کسی خاندان اور کسی قوم کا ہو اس کی نجات ہوگی اور جو کفر کرے گا وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا۔ جیسے نوح علیہ السلام کا بیٹا یہ آخرت کا معاملہ ہے۔

[illegible] کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

علاوہ ازیں تمہاری عہد شکنیوں کا مقتضیٰ بھی اس کے خلاف ہے کہ تم کو صرف چند روزہ عذاب دیا جائے جس قوم نے خدا تعالیٰ سے پختہ عہد اور پیمان کر کے توڑے ہوں اس قوم کو چند روز عذاب دیکر چھوڑ دینا خلاف حکمت ہے خصوصاً جبکہ عہد شکنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی ہو اور نیت بھی یہ ہو کہ ہمیشہ ان کاموں پر قائم رہیں گے۔ اس لیے آئندہ آیات میں بنی اسرائیل کی عہد شکنیوں کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ہم نے توریت میں بنی اسرائیل سے چند باتوں کا پختہ عہد لیا۔ اول یہ کہ سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کی عبادت نہیں کرو گے دوم یہ کہ والدین کے ساتھ خاص احسان کرو گے جو احسان کی تمام انواع واقسام کو شامل ہو اور اس کی تین قسمیں ہیں (۱) ترک ایذاء (۲) خدمت مالی (۳) خدمت بدنی، سوم اہل قرابت کے ساتھ قرابت احسان کرنا اور چہارم یتیموں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور پنجم عام غرباء اور محتاجوں کے ساتھ سلوک اور احسان کرنا اور ششم یہ کہ تمام لوگوں کے ساتھ خواہ مومن ہوں یا کافر اچھی طرح اور نرمی سے بات کرنا حسن خلق اور مدارات میں کسی کی تخصیص نہیں اور ہفتم یہ کہ نماز کو قائم رکھنا اور ہشتم یہ کہ زکوٰۃ ادا کرتے رہنا یہ وہ عہد تھے جو تم سے لیے گئے پھر تم نے ان مضبوط اور محکم عہدوں سے روگردانی کی مگر تم میں کے بہت ہی تھوڑے افراد ان عہدوں پر قائم رہے اور تم احکام خداوندی سے اعراض اور انحراف کے عادی اور خوگر ہی ہو گئے ہو اور یہ اعراض تمہاری عادت ثانیہ بن گئی ہے۔ اور پھر اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ہم اللہ کے محب اور محبوب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں چند روز رکھنے کا تو تم سے کوئی عہد نہیں کیا تھا البتہ تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم سوائے خدا کے کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین کے ساتھ احسان کرنا اور یتیموں اور مسکینوں کی خبر گیری کرنا اور لوگوں کے ساتھ عمدہ اخلاق سے پیش آنا مگر تم نے یہ عہد بھی توڑ ڈالا اور بہت ہی قلیل لوگ تم میں سے اس عہد پر قائم رہے مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

فائدۂ اولیٰ

والدین کی تربیت تربیت خداوندی کا ایک نمونہ ہے۔ والدین علم اسباب میں اسکے وجود کے ایک ظاہری سبب ہیں۔ ماں باپ اولاد کے ساتھ جو کچھ احسان کرتے ہیں وہ کسی غرض اور عوض کے لیے نہیں اولاد کی تربیت سے ماں باپ کسی وقت ملول نہیں ہوتے۔ اولاد کے لیے جو کمالات بھی ہو والدین دل وجان سے اس کی آرزو کرتے ہیں۔ اولاد کی ترقی اور عروج پر کبھی حسد نہیں کرتے ہمیشہ اپنے سے زیادہ اولاد کو ترقی اور عروج پر دیکھنے کے خواہشمند اور آرزو مند رہتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے بعد تعظیم والدین کا حکم دیا اور انہی وجوہ کی بنا پر والدین کی تعظیم تمام شریعتوں میں واجب رہی اور چونکہ یہ حق محض ماں باپ ہونے کی وجہ سے ہے اس لیے وَبِالْوَالِدَيْنِ میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی اشارہ اس طرف ہے کہ والدین کی تعظیم والدین ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں واجب اور لازم ہے۔ والدین خواہ کافر و فاجر ہوں یا منافق و فاسق ہوں۔ اسی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام نے آزر کی دعوت و تلقین میں ہمیشہ تلطف اور نرمی کو ملحوظ رکھا جیسا کہ سورۂ مریم میں مفصل قصہ مذکور ہے۔ اور قرآن اور حدیث میں جابجا

کافر ہو تو شریعت نے ماں باپ کے ساتھ بھی سلوک اور احسان کا حکم دیا ہے۔

فائدہ دوم مساکین تو یتیم اور مسکین دونوں ہی ہیں۔ مگر یتیم کم سن ہونے کی وجہ سے کمانے کی طاقت نہیں رکھتا اس لیے یتیم کو مسکین پر مقدم فرمایا۔

فائدہ سوم مالی سلوک اور احسان زیادہ تر قرابت کے ساتھ ہوتا ہے مالی احسان ہر ایک کے ساتھ ممکن نہیں اس لیے وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا فرمایا۔ مختصر یہ کہ اجانب کے ساتھ قولی احسان کا ذکر فرمایا اس لیے کہ تواضع اور حسن خلق کا معاملہ ہر ایک کے ساتھ ممکن ہے۔

فائدہ چہارم دعوت اور تبلیغ یعنی وعظ و نصیحت کے موقعہ پر نرمی اور ملاطفت محمود ہے کما قال تعالیٰ فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشَىٰ وقال تعالیٰ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وقال تعالیٰ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ وقال تعالیٰ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ غرض یہ کہ وعظ و نصیحت اور تبلیغ و مناظرہ میں تلطف اور لین مناسب ہے جیسا کہ ان آیات سے صاف ظاہر ہے۔ البتہ جہاد اور قتال میں غلظت اور شدت مناسب ہے کما قال تعالیٰ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ جہاد اور نصیحت کے فرق کو خوب سمجھ لو۔

فائدہ پنجم

در بیان فرق مدارات و مداہنت

بہت سے لوگ مدارات اور مداہنت میں فرق نہیں سمجھتے حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اپنی دنیوی اور جسمانی راحت اور منفعت کو دوسرے کی دنیوی راحت اور منفعت کے خیال سے چھوڑ دینے کا نام مدارات ہے اور کسی دنیوی لحاظ کے خاطر اپنے دین کو چھوڑ دینا اور دین میں سستی کرنا اس کا نام مداہنت ہے مدارات شریعت میں مستحسن اور پسندیدہ ہے اور مداہنت قبیح اور مذموم ہے کما قال تعالیٰ وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ۔

خلاصہ یہ کہ دین میں سستی اور نرمی کا نام مداہنت ہے اور دنیوی امور میں نرمی اور سستی کا نام مدارات ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ

اور جب لیا ہم نے اقرار تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں

وَلَا تُخْرِجُونَ أَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ

اور نہ نکال دو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر

أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ تَقْتُلُونَ

تم نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو پھر تم ویسے ہی خون کرتے ہو

أَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُونَ فَرِيقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ز

آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقے کو ان کے وطن سے

تَظٰهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَإِنْ يَأْتُوكُمْ

چڑھائی کرتے ہو ان پر گناہ سے اور ظلم سے اور اگر وہی آویں تم

أُسٰرٰى تُفٰدُوهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ إِخْرَاجُهُمْ ط

پاس کسی کی قید میں پڑے تو انکو چھڑائی دیتے ہو اور وہ بھی حرام ہے تم پر انکا نکال دینا

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا

پھر کیا مانتے ہو تھوڑی کتاب اور منکر ہوتے ہو تھوڑی سے پھر کچھ

جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ

سزا نہیں اس کی جو کوئی تم میں یہ کام کرتا ہے مگر رسوائی دنیا کی زندگی

الدُّنْيَا ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلٰى أَشَدِّ الْعَذَابِ ط

میں اور قیامت کے دن پہنچائے جاویں سخت سے سخت عذاب میں

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۸۵﴾ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے وہی ہیں جنہوں نے

اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

خرید کی دنیا کی زندگی آخرت دے کر سو نہ ہلکا ہوگا ان پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾

عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔

شناعت دوازدہم (۱۲)

قال تعالیٰ۔ وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ ... الیٰ ... وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ۔

(ربط) علاوہ ازیں تمہاری دوسری عہد شکنیوں کا بھی مقتضیٰ یہی ہے کہ تم کو چند روزہ عذاب نہیں بلکہ دائمی عذاب دیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ ہم نے تم سے اس امر کا پختہ عہد لیا کہ آپس میں خونریزی نہ کرنا اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالنا کیونکہ اپنے ہم مذہبوں کو قتل کرنا اور انکو جلاوطن کرنا درحقیقت اپنے ہی کو قتل کرنا اور جلاوطن کرنا ہے اسی وجہ سے بجائے اقربائکم و اہل دیارکم کے انفسکم کا لفظ استعمال فرمایا اور پھر تم نے اسکا اقرار بھی کر لیا کہ یہ عہد ہمیں بھی منظور اور قبول ہے اور فقط اقرار پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ تم اس پر شہادت اور گواہی بھی دیتے ہو کہ بیشک ہمارے بزرگوں نے یہ عہد کیا تھا اور پھر اس صریح اقرار اور صریح شہادت کے بعد تم ہی وہ لوگ ہو کہ باہم ایک دوسرے کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنی قوم کے ایک فریق کو جلاوطن بھی کرتے ہو اس طرح کہ تم ان کے مقابلہ میں اللہ کے گناہ اور معصیت اور بندوں پر ظلم اور تعدی کے ساتھ قتل کرنے اور جلاوطن کرنے میں ان کے مخالفین کی امداد کرتے ہو حالانکہ ان دونوں کو گھر سے نکالنا ہی حرام تھا اور علیحدہ حکم جو ملا تھا اس پر عمل کرنے کے لیے تیار رہتے ہو اور وہ یہ کہ اگر تمہارے ہم مذہب لوگ اسیر اور گرفتار ہو کر آتے ہیں تو انکا فدیہ دیکر انکو قید سے چھڑاتے ہو اور حالانکہ تم پر ان کا نکالنا اور جلاوطن کرنا ہی تم پر حرام تھا اور قتل کرنا تو اس سے بھی بڑھ کر جرم تھا۔ تعجب ہے کہ جو جرم شدید تھا اس کا تو ارتکاب کرتے رہے اور جو جرم ذرا خفیف تھا اس سے اجتناب کیا اور وہ اجتناب بھی اتباع شریعت کی بنا پر نہ تھا بلکہ اس بنا پر تھا کہ وہ حکم غرض اور طبیعت کے موافق تھا لہٰذا ایسے شخص کے لیے چند روزہ عذاب کافی نہیں دائمی عذاب چاہیئے۔

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے دو فریق تھے۔ ایک بنی قریظہ اور دوسرے بنی نضیر۔

اسی طرح مدینہ میں مشرکین کے بھی دو فریق تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج اور ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن تھا آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ بنی قریظہ تو قبیلہ اوس کے حلیف اور دوست تھے اور بنی نضیر قبیلہ خزرج کے حلیف اور دوست تھے۔ جب کبھی اوس اور خزرج میں لڑائی ہوتی تو حلف اور دوستی کی وجہ سے بنو قریظہ تو اوس کی حمایت اور مدد کرتا اور بنی نضیر قبیلہ خزرج کی حمایت اور امداد کرتا اور ہر قبیلہ اپنے

مخالف طبیعت ہو اسکو قبول نہ کرے وہ کافر ہے مسلمان نہیں دنیاوی حکومتوں میں بھی ایک قانون کا انکار بغاوت ہے جو شخص حکومت کے کسی حکم کے ماننے سے انکار کرے اس پر بغاوت کی دفعہ لگ جاتی ہے اور کفر اللہ کی بغاوت ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهِ

اور ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے

بِالرُّسُلِ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ

رسول اور دیے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور

وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ

قوت دی اس کو روح پاک سے پھر بھلا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول

بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ

جو نہ چاہا تمہارے جی نے تم تکبر کرنے لگے پھر ایک جماعت کو جھٹلایا

وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ﴿٨٧﴾

اور ایک جماعت کو مار ڈالتے

شناعت سیزدہم (۱۳)

قال تعالیٰ. وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ ..... الی ..... وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ۔

اور البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کی ہدایت اور اصلاح کا بڑا اہتمام کیا چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو ایک روشن کتاب یعنی توریت عطا کی اور پھر ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بنی اسرائیل کی اصلاح اور تربیت کے لیے مسلسل پیچھے بعد دیگرے پیغمبروں کو بھیجا کہ اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے رہیں اور شریعت موسویہ کی پیروی اور اس پر استقامت کی تلقین کرتے رہیں اور پھر خاندان بنی اسرائیل کے اخیر میں عیسیٰ بن مریم کو نبوت اور رسالت کے واضح اور روشن دلائل و معجزے اور خاص طور سے روح القدس یعنی جبرئیل امین سے

کو قوت دی جو ہر وقت اُن کے ساتھ رہتے تھے اور دشمنوں سے اُنکی حفاظت کرتے تھے، ولادت سے لیکر رفع الی السماء کے وقت تک جبرائیل ان کے محافظ رہتے اور انکے آثار و ثمرات انوار و تجلیات بھی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو کیا انکے بعد بھی تم نرم نہ پڑے اور جب کبھی کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے حکم لیکر آیا جس کو تمہارے نفس پسند نہ کرتے تھے تو تم نے تکبر اور سرکشی کی سو انکو قبول کا مقتضی یہ تھا کہ اللہ کے نبی اور رسول کی دل و جان سے اطاعت کرتے اور نفس سرکش کی مخالفت کرتے مگر تم جیسے نادان یہ تو کیا کرتے بس تم نے محض یہ طرز اختیار کی اور پیغمبروں کے ایک گروہ کو جھٹلایا اور انبیاء کی ایک جماعت کو مار ڈالتے ہو اور ظاہر ہے کہ جو مریض بجائے اسکے کہ طبیب کی ہدایت پر چلے الٹا طبیب ہی پر حملہ کرے اور اسکو جھٹلانے بلکہ اسکو قتل کر ڈالے وہ کیونکر شفایاب ہو سکتا ہے اور ایسے بدعمل مریض کیلئے ابدی محرومی کی سزا کوئی عجیب نہیں بلکہ دائمی اور ابدی سزا چاہیئے۔

ف یہود انبیاء کی تکذیب تو ایک مرتبہ کر چکے اور قتل کا سلسلہ جاری ہے حتیٰ کہ اب بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درپے قتل ہیں اس لیے کَذَّبْتُمْ بصیغہ ماضی لائے اور تَقْتُلُوْنَ کو بصیغہ مضارع لائے جو ان کے فعل قتل کے حال اور استقبال میں جاری اور مستمر ہونے پر دلالت کرتا ہے نیز قتل کا واقعہ اگرچہ گزشتہ زمانہ میں ہو چکا ہے مگر چونکہ ایسا قتل نہایت ہی عظیم اور سخت ہے اس لیے اس کی عظمت اور شناعت کے ظاہر کرنے کے لیے صیغۂ مضارع سے تعبیر کیا تاکہ وہ پیش نظر ہو جائے گویا کہ وہ اب ہو رہا ہے اور یہ ہولناک اور حیرتناک واقعہ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہے۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کے اُس معاملہ کا ذکر تھا جو انبیاء سابقین اور گزشتہ کتب منزلہ کے ساتھ تھا اب آئندہ آیات میں ان بدبختوں کے اُس معاملہ کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے نبی آخر الزمان اور قرآن کے ساتھ کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ

وہ کہتے ہیں ہمارے دل پر غلاف ہے — بلکہ نہیں لعنت کی ہے اللہ نے انکے انکار سے

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ (۸۸)

سو کم یقین لاتے ہیں

شناعت چہاردہم (۱۴)

قال تعالیٰ ۔ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۔۔۔۔۔ الی ۔۔۔۔۔ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۔

اور ان کے غرور اور تکبر کا یہ عالم ہے کہ انبیاء کے مخبروں سے بطور فخر یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلاف
میں محفوظ ہیں سوائے اپنے دین کے کسی نئی بات کا اثر ہمارے دلوں تک نہیں پہنچتا یعنی ہم اپنے دین پر
نہایت پختہ اور مضبوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں یہ وجہ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے انکار و تکذیب
کی وجہ سے ان پر لعنت فرمائی ہے اور اپنی رحمت اور عنایت سے دور ڈال دیا ہے اس لیے حق بات
ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کے دل حق اور نصیحت کو قبول نہیں کرتے اور حق سے متنفر اور بیزار ہیں یہ غلاف
نہیں بلکہ ان کی لعنت کی نشانی اور علامت ہے کفر اور لعنت کے زنگ نے ان کے دلوں کو اس قدر سیاہ
اور زنگ آلود کر دیا ہے کہ آئینۂ دل میں شاید ہی کوئی جز ایسا باقی رہا جو کہ ایمان اور ہدایت کی روشنی کو
قبول کر سکے اس لیے یہ لوگ بہت ہی قلیل ایمان لاتے ہیں یعنی شریعت کی کسی جزئی بات کو بھی مان لیتے ہیں مگر
ظاہر ہے کہ ایمان قلیل قابل قبول نہیں مثلاً اگر توحید و رسالت کا اقرار بھی کر لیا اور ایمان بالجنت و جہنم
پر بھی ایمان لے آیا اور شریعت کے دوسرے احکام کا انکار کر دیا تو ایسے ایمان سے کوئی فائدہ نہیں ایمان
قلیل تو کیا معتبر ہوتا نجات کے لیے تو ایمان کثیر بلکہ ایمان اکثر بھی کافی نہیں کہ دین کی کثیر اور اکثر باتوں کو مانے اور
بعض کا انکار کر دے ایمان ما انزل اللہ کے تمام احکام کے ماننے کا نام ہے بعض قلیل و کثیر کے ماننے سے آدمی
ہی مومن نہیں کہلاتا۔

فائدہ: حضرات مفسرین نے غُلْفٌ کے دو معنی بیان کیے ہیں اول یہ کہ غلف اَغْلَف کی جمع ہے
جیسے احمر اور اصفر کی جمع حُمْرٌ اور صُفْرٌ آتی ہے اور اَغْلَف اس شے کو کہتے ہیں جو
کسی غلاف اور پردہ میں محفوظ اور مستور ہو۔ اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمارے دلوں پر غلاف
اور پردہ پڑا ہوا ہے اس لیے آپ کی بات ہمارے دلوں تک پہنچتی نہیں جیسا کہ دوسری آیت میں ہے
وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ (اور کہا کافروں نے ہمارے دل پردوں میں ہیں) مجاہد اور قتادہ
سے یہی معنی منقول ہیں۔

دوم یہ کہ غُلْفٌ غلاف کی جمع ہے دراصل غُلُفٌ بضم اللام تھا جیسے کتاب کی جمع کُتُبٌ
آتی ہے مگر تخفیف کی وجہ سے لام کو ساکن کر دیا گیا اور ابن عباسؓ غُلُفٌ بضم لام پڑھتے تھے اس صورت
میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ ہمارے دل علم کے غلاف اور برتن ہیں جن میں ہر قسم کا علم بھرا ہوا ہے
تمہارے علم کی ضرورت نہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کا رد فرمایا کہ جھوٹ بولتے ہیں نہ ان کے دلوں پر پردہ ہے
اور نہ ان کے دل علم کے غلاف اور ظرف ہیں بلکہ ان کے کفر اور عناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے
دور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں سے قبول حق کی استعداد کو سلب کر لیا ہے اسی لیے ان کے دل
حق کو قبول نہیں کرتے فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ اللہ تعالیٰ نے انکو بہرا اور اندھا بنا دیا
ہے اور وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے ظاہر کا اندھا بنائے اور جس کو چاہے باطن کا اندھا بنائے
کسی کی مجال کیا ہے جو یہ پوچھ سکے کہ اس کی ظاہر یا باطن کی آنکھ کیوں پھوڑ دی؟

اخرج احمد بسند جید عن ابی سعید قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم القلوب اربعۃ قلبٌ اجرد فیہ مثل السراج یزھر و قلبٌ اغلف مربوط علی غلافہ و قلبٌ منکوس و قلبٌ مصفح۔ فاما القلب الاجرد فقلب المؤمن سراجہ فیہ نورہ و اما القلب الاغلف فقلب الکافر و اما القلب المنکوس فقلب المنافق عرف ثم انکر و اما القلب المصفح فقلب فیہ ایمان و نفاق فمثل الایمان فیہ کمثل البقلۃ یمدھا الماء الطیب و مثل النفاق فیہ کمثل القرحۃ یمدھا القیح۔ فای المادتین غلبت علی الاخری غلبت علیہ (در منثور ص ۸۶ ج ۱)

امام احمدؒ نے سند جید کے ساتھ ابو سعید خدریؓ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دل چار قسم کے ہیں ایک دل تو وہ ہے جو آئینہ کی طرح صاف وشفاف ہے اور اس میں کوئی چراغ روشن ہے اور ایک دل وہ ہے جو غلاف میں بند ہے اور غلاف کا منہ تاگے یا ڈوری سے بندھا ہوا ہے اور ایک دل الٹا اوندھا اور ایک دل وہ ہے جس کے دو رخ یعنی دو جانبیں ہیں ایک سفید ہے اور ایک طرف سیاہ۔ پس صاف وشفاف دل تو مومن کا دل ہے جس میں ایمان کا چراغ روشن ہے اور غلاف میں بند کافر کا دل ہے اور الٹا اوندھا دل منافق کا ہے کہ جس نے حق کو پہچانا اور پھر اس کا انکار کیا اور دو رویہ دل وہ ہے کہ جس میں ایمان اور نفاق دونوں جمع ہیں پس ایمان اس دل میں مثل سبزہ کے ہے کہ پاکیزہ پانی اس کو بڑھاتا ہے اور اس کے دل میں نفاق مثل ناسور کے ہے کہ جو دم بدم پیپ اور خون کو بڑھاتا ہے پس ان دو مادوں میں سے جو سا مادہ غالب آجائے اسی کا اعتبار ہے۔

✤ ✤ ✤

✤ ✤ ✤

اللّٰھم نوّر قلوبنا بانوار طاعتک و معرفتک آمین یا ارحم الراحمین۔

وَلَمَّا جَاۗءَھُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

اور جب پہنچی ان کو کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ان پاس والی کو

مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ

اور پہلے سے فتح مانگتے تھے

كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۡ فَلَعْنَةُ

کافروں پر پھر جب پہنچا ان کو جو پہچان رکھا تھا اس سے منکر ہوگئے سو

اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ

لعنت ہے اللہ کی منکروں پر برے مول خرید کیا اپنی جان کو کہ منکر

يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ

ہوئے اللہ کے اتارے کلام سے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے

فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

فضل سے جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے سو کما لائے غصہ

عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

پر غصہ اور منکروں کو عذاب ہے ذلت کا

شناعت پانزدہم (۱۵)

قال تعالیٰ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ..... الیٰ ..... وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ

(ربط) گزشتہ آیت میں قلب غلف کا ذکر تھا اب آئندہ آیات میں قلب منکر کا ذکر ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ یہود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوب پہچانتے تھے کہ یہی نبی آخر الزمان ہیں مگر عناد اور حسد کی وجہ سے ایمان نہیں لائے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسی کتاب آئی یعنی قرآن شریف جسکے اعجاز کو دیکھ کر خود ان کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ یہ کتاب اللہ ہی کی جانب سے ہے اور علاوہ ازیں وہ قرآن جو منجانب اللہ ان کے پاس آیا اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس پہلے سے موجود ہے یعنی توریت کی تصدیق اور موافقت کرتا ہے علاوہ ازیں آپ امی تھے۔ جب آپ عربی خط اور عبارت بھی نہیں پڑھ سکتے تھے تو کتاب عبرانی خط میں ہو اس کے معانی کی

واقفیت کیسے ہوسکتی ہے سوائے وحی کے اور کوئی ذریعہ علم نہیں اور تعجب ہے کہ یہ لوگ آپ کی نبوت میں تردد کرتے ہیں۔ حالانکہ نزول قرآن اور آپکی بعثت سے پہلے یہی لوگ کافروں اور بت پرستوں کے مقابلہ میں آپ کے نام اور برکت سے فتح و نصرت اللہ سے مانگا کرتے تھے چنانچہ یہود مدینہ اور یہود خیبر کی جب عرب کے بت پرستوں سے لڑائی ہوتی تو یہ دعا مانگتے۔

اللّٰهم ربنا انا نسألك بحق احمد النبي الامي الذي وعدتنا ان تخرجه لنا في آخر الزمان وبكتابك الذي تنزل عليه آخر ما تنزل ان تنصرنا على اعدائنا اخرجه ابو نعيم والحاكم والبيهقي وغيرهم عن ابن عباس وابن مسعود وغيرهم بالفاظ مختلفة (در منثور)

اے اللہ ہم تجھ سے اس احمد مصطفےٰ نبی امی کے حق سے سوال کرتے ہیں جس کا ظاہر کرنا تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور اس کتاب کے واسطہ اور برکت سے سوال کرتے ہیں جس کو تو سب سے اخیر میں نازل کریگا کہ ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح اور نصرت عطا فرما یہ روایت ابن عباس اور ابن مسعود اور دیگر صحابہ سے بالفاظ مختلفہ مروی ہے۔

✦ ✦ ✦

غرض یہ کہ آپ کے ظہور سے پہلے ہی یہود آپکو خوب پہچانتے تھے اور آپکے نام مبارک اور قرآن کریم کے واسطہ اور برکت سے اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعا مانگتے تھے اور فتح پاتے تھے اور آپ کے توسل کو سبب خیر و برکت سمجھتے تھے پس جب ان کے پاس وہ چیز خود بخود آپہنچی یعنی نبی امی اور قرآن جس کو آنے سے پہلے ہی خوب پہچان چکے تھے اور اسکے ظہور کے منتظر تھے آگئے تو محض حسد اور عناد کی وجہ سے ان کا انکار کر بیٹھے ایسے لوگوں کے عذاب میں کیسے تخفیف ہوسکتی ہے یا ایسے لوگوں کو عذاب ایام معدودہ کیسے ہوسکتا ہے پس لعنت ہو اللہ کی ایسے کافروں پر جنہوں نے دیدہ و دانستہ حق کو محض حسد اور عناد کی وجہ سے چھپایا۔ حق تو یہ تھا کہ جن کے نام کی برکت سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگتے تھے اور مستجاب ہوتے تھے آج دل و جان سے اس نبی امی اور اسکے دین کی نصرت اور اعانت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے ۔ اور سب سے پہلے اس نبی اور اس کتاب پر ایمان لاتے نیز جب یہ کتاب توریت کی مصدق تھی تو اس کی تصدیق عقلاً لازم تھی اس لیے کہ اسکی تکذیب توریت کی تکذیب کو مستلزم ہے۔ بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا یہ کہ انکار کرتے ہیں

لـه یعنی حسد اور عناد کی وجہ سے کفر کے بدلہ میں اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا گویا دوزخ کے فرشتوں کے ہاتھ ہلاکت کے لیے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا۔ اس تفسیر پر اشتروا بمعنی بیع کے ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے اور یہ تفسیر احسن ہے اور دوسری تفسیر پر اشتروا خریدنے کے معنی میں ہے جمہور کے نزدیک مختار پہلا ہی قول ہے ۱۲ منہ

أَنْبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

نبی اللہ کے پہلے سے اگر تم ایمان رکھتے تھے

شناعت شانزدہم (۱۶)

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا ...... إلى ...... إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ

اور دلیل اس امر کی کہ یہود کا یہ معاملہ آپ کے ساتھ محض حسد کی بناء پر ہے، یہ ہے کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ ہر اس چیز پر جو اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے خواہ کسی پیغمبر پر اس کا نزول ہوا ہو جو چیز بھی خدا نے نازل کی اس پر ایمان لانا واجب ہے خواہ وہ توریت و انجیل ہو یا قرآن کریم ہو۔ وجوب ایمان کی علت حکم خداوندی ہونا ہے جو تمام کتب الٰہیہ میں مشترک ہے تو اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہم تو فقط اس کتاب پر ایمان لائیں گے۔ جو خاص ہم پر ہمارے نبی کے واسطہ سے نازل کی گئی۔ اس قید سے ان کا حسد صاف ظاہر ہے کہ جو کتاب بنی اسرائیل پر اتری اس پر تو ایمان لائیں گے اور جو کتاب بنی اسمٰعیل پر اتری اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور محض حسد کی بناء پر اس کتاب کے سوا تمام کتابوں کا انکار کرتے ہیں حالانکہ توریت کے سوا اور جو کتابیں خدا تعالیٰ نے نازل کیں وہ فی نفسہٖ حق ہیں نفس الامر اور واقع کے مطابق ہیں اور ان کے تمام مضامین محقق اور مدلل ہیں اور فی نفسہٖ حق ہونے کے علاوہ اس کتاب کی تصدیق کرنے والی ہیں جو ان کے ساتھ ہے لہذا جو چیز فی حد ذاتہٖ حق اور واقع کے مطابق ہو اور پھر اس کے علاوہ اس چیز کے ساتھ مطابق ہو جس کو وہ سچا اور برحق سمجھتے ہیں تو ایسی چیز کو نہ ماننا سراسر خلاف عقل ہے اس لیے کہ مطابق کا مطابق بھی مطابق ہی ہوتا ہے لہذا ایک مطابق کو ماننا اور دوسرے مطابق کو نہ ماننا تناقض کو مستلزم ہے اور اگر اس پر بھی وہ توریت پر ایمان کے مدعی ہیں تو آپ ان سے یہ پوچھئے کہ اچھا تم یہ بتلاؤ کہ تم اللہ کے پیغمبروں کو کس لیے پہلے ہی سے قتل کرتے چلے آرہے ہو جو کہ انبیاء توریت ہی کے مطابق حکم دیتے تھے اور شریعت موسویہ کی تائید اور تجدید کے لیے مبعوث ہوتے تھے جیسے حضرت شعیا اور حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام اگر تم حقیقۃً توریت پر ایمان رکھنے والے تھے۔ معلوم ہوا کہ تم توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ توریت اور شریعت موسویہ پر تمہارا ایمان کا دعویٰ غلط ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ

اور آچکا تم پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر تم نے بنا لیا بچھڑا

مِنۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اس کے پیچھے اور تم ظالم ہو

شناعت ہفدہم (۱۷)

قال تعالیٰ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ .... تا ..... وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ۔

اور انبیاء کے قتل کا واقعہ تو موسیٰ علیہ السلام کے بہت بعد کا ہے خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں اس سے بڑھ کر کفر کر چکے ہو وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس توحید و رسالت کی نہایت واضح اور روشن دلیلیں لیکر آئے تھے جو اس بات پر صاف طور پر دلالت کرتی تھیں کہ عبادت اور بندگی اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہے اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں پھر بھی تم نے انکے جانے کے بعد ہی ایک گوسالہ بے عقل کو اپنا معبود بنا لیا اور جب خدا ہی ایک بے عقل حیوان ٹھہرا تو اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ بے عقل حیوان کے بندے کس درجہ بے عقل اور حیوان ہوں گے۔ ہندوستان کے ہندو جو گوسالہ پرستی کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکا سلسلہ سند سامری سے ضرور ملتا ہوگا اور تم بڑے ہی ظالم ہو کہ اپنے ہاتھ سے ایک بے عقل حیوان کی بنائی ہوئی صورت کو تم نے خدا بنا لیا کیا اس سے بڑھ کر بھی کوئی ظلم ہو سکتا ہے۔

ف گوسالہ کو معبود بنانا اس لیے تھا کہ یہ لوگ غایت حماقت کی وجہ سے یا تو یہ سمجھے تھے یا حلولیہ تھے یعنی خدا تعالیٰ کو کسی جسم میں حلول کرنا جائز سمجھتے تھے۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ

اور جب ہم نے لیا اقرار تمہارا اور اونچا کیا تم پر

الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا

پہاڑ پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو بولے

سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ

سنا ہم نے اور نہ مانا اور رچ رہا ان کے دلوں میں وہ بچھڑا

بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم

بدلے کفر کے تو کہہ بُرا کچھ سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر

مُّؤْمِنِينَ ﴿۹۳﴾

تم ایمان والے ہو

شناعت ہشتدہم (۱۸)

قال تعالیٰ۔ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ ... الیٰ ... اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔

اور ایک اور قصہ سنو جس سے توریت کے ساتھ یہود کے ایمان کا حال معلوم ہوگا۔ جب ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا کہ جب توریت تمہارے پاس پہنچے تو دل و جان سے اس کو قبول کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا مگر تم پہلے اس عہد سے پھر گئے، اور توریت پر عمل کرنے میں حیلے اور بہانے شروع کیے اس وقت ہم نے تمہارے سروں پر کوہ طور لا کھڑا کیا اور حکم دیا کہ جو احکام ہم نے تم کو دیئے ہیں ان کو نہایت مضبوطی اور پختگی کے ساتھ پکڑو اور گوش ہوش سے انکو سنو تاکہ ان کا علم تم کو یاد رہے اور پھر تمہاری یہ غفلت معصیت کا سبب نہ بن جائے اس کے جواب میں انہوں نے یہ کہا کہ احکام توریت کو سن لیا ہے مگر مانا نہیں اور اگر ان کے تمرد اور عصیان کا سب سے بڑا نمونہ دیکھنا چاہو تو یہ ہے کہ ان کے کفر اور سرکشی کی وجہ سے ان کے دلوں میں گوسالہ کی محبت پلا دی گئی تھی۔ اس لیے انکو گوسالہ پرستی پرلذیذ اور خدا پرستی تلخ اور ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ ظاہر نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے اسی حالت میں کہ سَمِعْنَا اور عَصَیْنَا دونوں کلمے زبان سے کہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ایسی خوفناک حالت میں زبان سے عصینا کہنا بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ بالفرض والتقدیر اگر کسی حالت میں زبان سے عَصَیْنَا نکالتے تو اسی وقت کوہ طور گرا کر انکو چور چور کر دیا جاتا اور سب کے سب ہلاک کر دیئے جاتے کیونکہ کوہ طور کو سروں پر لا کر کھڑا کرنا اس لیے تھا کہ وہ توریت کو قبول کریں ایسی حالت میں بھی اگر زبان سے عَصَیْنَا کہا تھا تو پھر کوہ طور کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہوا اس اشکال کی بنا پر بعض مفسرین نے توجیہ کی ہے کہ سَمِعْنَا کہنا بزبان قال تھا اور عَصَیْنَا کہنا بزبان حال تھا زبان سے تو فقط سَمِعْنَا ہی کہا تھا لیکن جب اقرار کے بعد فوراً ہی عصیان اور نافرمانی کرنے لگے تو ان کی حالت کے اعتبار سے عَصَیْنَا کہنا ان کی طرف منسوب کیا گیا گویا کہ وہ اسی حالت میں بزبان حال عَصَیْنَا کہہ رہے تھے حضرت شاہ عبدالعزیز

دہلوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ حقیقت امر یہ ہے کہ بنی اسرائیل باوجودیکہ کوہ طور کو اپنے سروں پر معلق دیکھ رہے تھے مگر یہ گمان کیا کہ یہ محض ڈرانے کے لیے ہے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی شفقت سے اور بلاؤں کی طرح یہ بلا بھی ٹل جائے گی اس لیے انہوں نے ابتداءً احکام تورات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور صاف سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہہ دیا کہ کیوں تورات کے احکام شاقہ کی ذمہ داری اپنے سر لیں۔ اس گمان پر انہوں نے یہ کلمہ اپنی زبان سے کہا لیکن جب دیکھا کہ پہاڑ ان کے سروں کے نزدیک ہوتا جا رہا ہے تو سمجھے کہ یہ چلا اور ہم اب پسے جاتے ہیں اس لیے مجبوراً سجدہ میں گر گئے اور زبان سے لفظ قبول کہے جیسا کہ سورۃ اعراف میں ہے۔ وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ جب یہ یقین ہو گیا کہ پہاڑ ٹلنے والا نہیں اس وقت مجبور ہو کر قبول کیا مگر کچھ مدت بعد پھر منحرف ہو گئے کما قال تعالیٰ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَكُنْتُمْ مِنَ الْخَاسِرِينَ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ قبول کے ایک مدت بعد انحراف کیا اور اس مقام پر ان کے ابتدائی حال کا بیان ہے کہ ابتداء میں انہوں نے قبول نہیں کیا اور سَمِعْنَا کے ساتھ عَصَيْنَا بھی کہا لیکن بعد میں مجبور ہو کر قبول کیا اور پھر ایک زمانہ کے بعد اس سے انحراف کیا، بحمد اللہ اس تقریر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔
انتہیٰ کلامہ ملخصاً و موضحاً۔

خلاصہ یہ کہ جس ایمان کے وہ مدعی تھے اس ایمان کی حقیقت اور کیفیت یہ ہے جو بیان ہوئی اسے ہمارے نبی آپ ان سے مختصراً بس اتنا کہہ دیجئے کہ بہت بری ہیں وہ چیزیں جس کے کرنے کا تم کو تمہارا ایمان حکم دیتا ہے اگر حقیقۃً تم مومن ہو اور دعوائے ایمانی ٹھیک ہے یعنی یہ فعل تمہارا ساختہ اور پرداختہ ایمان ہے جو ایسے افعال شنیعہ اور اقوال قبیحہ کا حکم دیتا ہے حقیقی ایمان کبھی اس قبیح اور شنیع باتوں کا حکم نہیں دے سکتا اگر تمہارا ایمان تم کو ایسی ہی باتوں کا حکم دیتا ہے تو بہت برا ایمان ہے مطلب یہ ہے کہ تمہارا ایمان اگر تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ خالق و مخلوق کو چھوڑ کر ایک بے زبان اور لا یعقل جانور کو خدا بنالو اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم الشان رسول کی تکذیب کرو بس ایسا ایمان جو تمہیں کفر کا حکم کرتا ہے یہ تو بہت ہی برا ایمان ہے۔ ایسے لوگ تو دائمی سزا کے مستحق ہیں ایسوں کے لیے ایام معدودہ کا عذاب ہرگز کافی نہیں۔

قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ
تو کہہ اگر تم کو ملنا ہے گھر آخرت کا اللہ کے یہاں

خَالِصَةً مِنْ دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ
الگ سوائے اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ

اگر سچ کہتے ہو اور یہ آرزو کبھی نہ کریں گے جس واسطے آگے بھیج

اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ

چکے ہیں ان کے ہاتھ اور اللہ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو اور تو دیکھے ان کو سب

اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ

لوگوں سے زیادہ حریص جینے کی اور شریک ٹھہرانے والوں سے بھی

يَوَدُّ اَحَدُھُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا ھُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ

ایک ایک چاہتا ہے کہ عمر پاوے ہزار برس اور کچھ اس کو سرکا نہ

مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

دے گا عذاب سے اتنا جینا اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتے ہیں۔

شناعت نوزدہم (۱۹)

قال تعالیٰ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۔

یہود باوجود ان شنائع اور قبائح کے یہ کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہیں جانے گا اور آخرت کی نعمتیں صرف ہمارے لیے مخصوص ہیں تو اے ہمارے نبی آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اگر دار آخرت فقط تمہارے ہی لیے اللہ کے یہاں خاص ہے اوروں کے لیے نہیں یعنی جنت اور نعمائے آخرت میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں تو ذرا مرنے کی تمنا اور آرزو کر کے دکھلاؤ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو اس لیے کہ دار آخرت کی وہ لازوال اور بے مثال نعمتیں کہ جن میں تمہارا کوئی شریک اور سہیم نہیں ان تک پہنچنے کا راستہ سوائے موت کے اور کوئی نہیں لہٰذا اگر تم کو یہ یقین ہے کہ اس دار جاودانی کی نعمتیں تمہارے لیے مخصوص ہیں تو پھر اس دار فانی اور کلبۂ احزان و پریشانی سے خلاصی اور نجات کی تمنا کرو۔ تم عقلاً شاہانہ اعزاز شاہی کے مقابلہ میں جیل خانہ کی ذلت اور مشقت کو ترجیح دینا کسی عاقل کا کام نہیں خصوصاً جبکہ جہاد و قتال کا بازار گرم ہے اور یہود کے مرد مارے جا رہے ہیں اور بچے اور عورتیں غلام بنائے جا رہے ہیں الخ

ہمیشہ ہوتا جا رہا ہے اور جزیہ اور خراج ان پر قائم کیا جا رہا ہے تو ایسی حیات سے بلاشبہ موت افضل اور بہتر ہے تم کو معلوم ہے کہ لذائذ دنیوی، نعیم اخروی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور تم اس وقت مسلمانوں سے جنگ و جدال کی وجہ سے سخت تکلیف میں ہو تو موت کی تمنا کرو تاکہ اس رنج و محن سے چھٹکارا ملے اور تم کو اپنے دعوے کے موافق خاصان خدا سے ہو اس لیے تمہاری دعا بھی ضرور قبول ہوگی خلاصہ یہ کہ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ اور ہم موت اور حیات کے مالک ہیں۔ جس وقت بھی تم موت کی تمنا کرو گے اسی وقت موت واقع کر دیں گے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ اگر یہود موت کی تمنا کرتے تو زبانی ہی سے تمنا کرتے ہی گلا گھٹ کر مر جاتے وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شئ ممکن الوقوع ہو۔ تحدی اور اظہار معجزہ کے وقت اس کا وقوع اور تحقق واجب اور لازم ہو جاتا ہے لیکن یہ وجوب اور لزوم ان کی تمنا اور آرزو پر موقوف تھا لہٰذا جب انہوں نے تمنا نہ کی تو موت بھی متحقق نہ ہوئی اور چونکہ ان کو یقین تھا کہ اللہ اور اس کے رسول کی تحدی کے بعد اگر ہم نے موت کی تمنا کی تو موت ضرور آ جائے گی اس لیے ڈر کے مارے موت کی تمنا نہیں کی۔ خوب جانتے تھے کہ موت کی تمنا کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ظاہر ہو جائے گا اس لیے موت کی تمنا کرنے سے عاجز رہے جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں اور ہم ابھی سے خبر دیتے ہیں کہ یہ لوگ ہرگز کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے ان اعمال شنیعہ کے خوف کی وجہ سے جو ان کے ہاتھ بھیج چکے ہیں یہ جملہ بطور پیشین گوئی اور غیب کی خبر کے ہے جو حضور کا معجزہ اور یہود کے عجز کی دلیل ہے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے اگرچہ وہ موت کی تمنا نہ کریں اور موت سے کتنا ہی بھاگیں۔ ایک نہ ایک دن ضرور موت آئے گی اور ان سب اعمال کفریہ کی ان کو سزا ملے گی۔

ف ۱: جاننا چاہیے کہ یہ ایک قسم کا مباہلہ تھا۔ حق اور باطل کا فیصلہ اکثر مناظرہ اور مجادلہ سے ہوتا ہے اور کبھی مباہلہ سے۔ اس لیے کہ فیصلہ کے دو طریق ہیں۔ ایک طریقہ معتاد اور ایک طریقہ غیر معتاد۔ معتاد طریقہ یہ ہے کہ مناظرہ اور مباحثہ سے فیصلہ کیا جائے۔ اور غیر معتاد طریقہ یہ ہے کہ فیصلہ ایسے طریقہ سے کیا جائے جو خارق للعادۃ اور اسباب ظاہری کے دائرہ سے بالا اور برتر ہو یعنی بطریق معجزہ اور کرامت اس کا فیصلہ کیا جائے چنانچہ اس مقام پر جب حجت اور دلیل اور نظر اور فکر کے تمام مراحل ختم ہو گئے تو خصم کے افحام اور الزام کے لیے ایک خارق عادت طریق اختیار کیا گیا وہ یہ کہ ایک مرتبہ زبان سے یہ کہہ دیں کہ اے اللہ ہم کو موت دے اسی وقت ان کا صدق و کذب ظاہر ہو جائے گا اور اگر یہود کو اس کا یقین نہ ہوتا تو جوش عداوت میں ضرور کہہ ڈالتے تاکہ حضور کا معجزہ ظاہر نہ ہو۔

ف ۲: یہ خطاب اور یہ تحدی ان یہودیوں کے ساتھ مخصوص تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھے اور خوب جانتے تھے کہ یہی وہ نبی برحق ہیں جن کی پیشین گوئی توریت میں ہے اور ہر زمانہ کے یہود سے یہ خطاب نہیں جیسا کہ روح المعانی ص ۲۲۷ ج ۱ عبداللہ بن عمر

اللہ عنہما سے منقول ہے دوبارہ تمنا الہی کے طور کے لحاظ سے فرمایا گیا

ف ۳ یہود نے زبان سے تمنا کی ورنہ ضرور منقول ہوتی اور نہ دل سے تمنا کی ورنہ اگر دل سے تمنا کرتے تو خفت اور الزام کے دور کرنے کے لیے زبان سے ضرور اسکا اظہار کرتے۔

ایک شبہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ سوال تو یہود کی طرف سے مسلمانوں پر بھی وارد ہو سکتا ہے کہ تم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ سوائے مسلمانوں کے اور کوئی جنت میں نہیں جائیگا لہذا تم کو بھی چاہیئے کہ موت کی تمنا کرو۔

ازالہ جواب یہ ہے کہ یہود کا عقیدہ فقط یہی نہیں تھا کہ ہم اہل حق ہیں اور ہمارے سوا کوئی جنت میں نہیں جائیگا بلکہ ساتھ یہ بھی اعتقاد تھا کہ ہم اللہ کے محبوب اور بیٹے ہیں کما قال تعالیٰ حکایۃ عنہم نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ہمارے اعمال وافعال اور اقوال واحوال کیسے ہی ناشائستہ اور ناگفتہ ہوں ہم ضرور جنت میں جائیں گے جنت ہماری ہے اور ہماری میراث ہے سیدھے ہم جنت میں داخل ہو جائیں گے اور مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ ہم اللہ کے محبوب اور بیٹے ہیں۔ اور جنت ہمارے لیے مخصوص ہے ہمارے اعمال اچھے ہوں یا برے ہر حال میں ہم جنت میں جائیں گے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا دارومدار ایمان اور عمل صالح پر ہے اس لیے مسلمان ہمیشہ اپنے نازیبا افعال و اقوال سے ڈرتے رہتے ہیں بخلاف یہود کے کہ وہ بیدھڑک گناہ کرتے رہتے ہیں اور ساتھ یہ کہتے جاتے ہیں سَيُغْفَرُ لَنَا یعنی ہم کوئی گناہ کر لیں سب بخشے جائیں گے کسی قسم کی معصیت ہمارے لیے مضر نہیں اور نہ ہم سے کوئی حساب وکتاب ہوگا۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا اس لیے ہر وقت وہ اپنی کوتاہیوں سے ڈرتے رہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ زندگی اور بڑھ جائے تاکہ گزشتہ تقصیرات کی توبہ اور استغفار سے کچھ تلافی کر سکیں اور کچھ اعمال صالحہ کر کے سفر آخرت کے لیے زاد اور راحلہ تیار کر سکیں۔

موت کی تمنا کا حکم شرعی

احادیث میں بلا ضرورت موت کی تمنا کرنے کی یا دنیاوی مصائب سے گھبرا کر موت کی آرزو کرنے کی ممانعت آئی ہے عمر کا زیادہ ہونا اور توبہ اور اعمال صالحہ کے لیے وقت کا میسر آنا ایک نعمت عظمیٰ اور غنیمت کبریٰ ہے البتہ اگر قلب پر لقاء خداوندی کا شوق غالب ہو تو پھر موت کی تمنا جائز ہے مگر شرط یہ ہے کہ غلبۂ شوق سے اس درجہ مغلوب الحال ہو جائے کہ دنیاوی منافع اسکی نظروں سے اوجھل ہو جائیں اور غلبۂ شوق میں اس کو اسکا بھی خیال نہ رہے کہ جس قدر عمر زیادہ ہوگی اسی قدر قرب خداوندی کے اسباب

زیادہ حاصل کر سکیں گے، اور حضرات صحابہ سے جو اس قسم کی آرزو منقول ہے سو وہ اس وقت میں تھی کہ جب اسباب موت کے سامنے آ گئے اور دنیا کی زندگی سے مایوسی ہو گئی، اس وقت موت کی فرحت اور مسرت میں کچھ کلمات زبان سے نکلے اور یہ وقت محل بحث سے خارج ہے، تفصیل کے لیے تفسیر عزیزی اور تفسیر مظہری کی طرف رجوع کی جائے، اور یہ لوگ موت کی تمنا اور آرزو ہرگز نہیں کر سکتے اس لیے کہ البتہ تحقیق آپ انکو سب لوگوں سے زیادہ اس فانی زندگی پر حریص پائیں گے حتیٰ کہ ان لوگوں سے بھی زیادہ حریص پائیں گے جو لوگ مشرک اور بت پرست ہیں اور اخروی حیات کے بالکل قائل نہیں دنیوی ہی حیات کو حیات سمجھتے ہیں اور یہود باوجودیکہ حیات اخروی اور آخرت کے ثواب اور عذاب کے قائل ہیں انکا سب سے زیادہ زندگی پر حریص ہونا اس امر کی بین دلیل ہے کہ انکو اپنے مجرم ہونے کا یقین کامل ہے ہر ایک ان میں سے یہ چاہتا ہے کہ اسکو ہزار برس کی عمر دیجائے حالانکہ ہزار برس کی عمر دیا جانا بھی اللہ کے عذاب کو دفع نہیں کر سکتا ہزار برس کے بعد پھر موت ہی ہے اور ان لوگوں کو اگر ہزار برس سے بھی زیادہ عمر ملے تب بھی کوئی فائدہ نہیں جس قدر انکی عمر زیادہ ہوگی اسی قدر انکا کفر زیادہ ہو گا اور حق تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے کہ وہ مدام کفر اور معصیت میں اضافہ کر رہا ہے انکے حق میں تخفیف عذاب کی کوئی صورت نہیں۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ

تو کہہ جو کوئی ہوگا دشمن جبریل کا سو اس نے اتارا ہے یہ کلام تیرے

بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ

دل پر اللہ کے حکم سے کہ سچ بتاتا اس کلام کو جو اس کے آگے ہے اور راہ دکھاتا اور خوشی

لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿۹۷﴾ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ

سناتا ایمان والوں کو جو کوئی ہوگا دشمن اللہ کا اور اسکے فرشتوں کا اور اسکے رسولوں

وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ﴿۹۸﴾

کا اور جبریل کا اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا۔

شناعت بستم (۲۰)

قال تعالیٰ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ ... الی ... فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ۔

ان آیات میں یہود کے نہ ایمان ماننے کے لئے ایک خاص بہانہ کو ذکر کر کے اس کا رد فرماتے ہیں۔
وہ یہ کہ ہم قرآن پر اس لیے ایمان نہیں لاتے کہ اس کو جبرئیل لیکر آتے ہیں اور وہ ہمارے دشمن ہیں وہی
ہم پر ہمیشہ اللہ کا عذاب لیکر آتے رہے ہیں اس لیے ہم ان کی بات نہیں مانیں گے، البتہ میکائیل ہمارے دوست
ہیں جو رحمت اور بارش کے فرشتہ ہیں وہ اگر وحی لیکر آتے تو ہم مان لیتے اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے
محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر یہودی یہ کہیں کہ ہم قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبرئیل کے واسطہ سے نازل
ہوا ہے، اور جبرئیل ہمارے دشمن ہیں، اور محمد رسول اللہ کو ہمارے پوشیدہ اسرار سے مطلع کرتے ہیں اور
اس سے پہلے بھی جس قدر باتیں اور نصیحتیں اور احکام مخالف نازل ہوئے وہ سب جبرئیل ہی لیکر آئے
اس لیے ہم قرآن کو نہیں مانتے۔ بخلاف توریت کے کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کو بلا واسطہ عنایت ہوئی تو آپ
ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو وہ درحقیقت اللہ کا دشمن ہے اس لیے کہ جبرئیل نے
اس قرآن کو آپ کے قلب پر اللہ کے حکم سے اتارا ہے جس میں جبرئیل کا کوئی دخل اور خطا نہیں وہ تو محض
سفیر ہیں۔ بلکہ یہی نہیں تو اس پر نظر کرو کہ نازل کرنے والا کون ہے حق جل شانہ اگر بجائے جبرئیل کے یہ کام میکائیل
کے سپرد فرماتے تو وہ بھی یہی کرتے۔

ف۔ او بجزنائی و ماجز فی نعیم

نیز اس قرآن کے اوصاف پر نظر ڈالو کہ وہ کیسا ہے سو اس میں تین صفتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ تمام پچھلی
کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے لہٰذا قرآن کریم کی تصدیق تمام کتب الٰہیہ کی تصدیق ہے اور اس
کی تکذیب تمام کتب الٰہیہ کی تکذیب ہے۔ دوّم یہ کہ وہ خدا تک پہنچنے کا سیدھا راستہ بتلاتا ہے
اور سیدھا راستہ تو اگر دشمن بھی بتلائے تو اسے فوراً قبول کرنا چاہئے۔ سوّم یہ کہ یہ کتاب اہل ایمان کے لیے
جو خداوند ذوالجلال کے دیدار کے مشتاق اور متمنی ہیں ایک عظیم بشارت ہے۔ پس اب تم ہی بتلاؤ کہ جو فرشتہ
تمہارے لیے خداوند ذوالجلال کی طرف سے ہدایت کے لازوال نعمت کا خوان لیکر آیا ہو اور محبین اور
مشتاقین کے لیے ساتھ ساتھ خوشخبری بھی لیکر آیا ہو وہ کمال محبت اور غایت الفت کا مستحق ہے یا دشمنی
اور عداوت کا۔ افسوس ان لوگوں نے اللہ کے بھیجے ہوئے ہدیہ کو قبول کیا اور نہ بشارت میں داخل ہوئے
یہ نہ سمجھا کہ اللہ کے فضل کو لیکر آنے والے سے دشمنی کرنا اللہ سے دشمنی کرنا ہے اور جو شخص اللہ
کا دشمن ہو اور اس کے فرشتوں اور پیغمبروں کا اور خاص کر جبرئیل اور میکائیل کا تو اس کو خوب سمجھ لینا چاہئے
کہ اللہ تعالیٰ تمام کافروں کا دشمن ہے لہٰذا جو شخص جبرئیل کا دشمن ہو گا وہ خدا اور اس کے فرشتوں اور اس
کے پیغمبروں کا دوست کیسے ہو سکتا ہے یہ سب اللہ کے مقرب بندے ہیں۔ جو شخص بھی ان میں سے کسی
سے عداوت رکھے وہ کافر ہے اور اللہ کا قرآن کا دشمن ہے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے دوستوں سے
دشمنی کرنا اللہ سے لڑائی مول لینا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ جب یہودیوں نے یہ کہا کہ جبرئیل ہمارے دشمن ہیں اور میکائیل ہمارے

دوست ہیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے یہ سوال کیا کہ یہ بتلاؤ کہ جبرئیل اور میکائیل کو بارگاہ خداوندی میں کیا مرتبہ اور کس درجہ کا قرب حاصل ہے یہودیوں نے کہا کہ جبرئیل اللہ کے داہنی جانب ہیں اور میکائیل بائیں جانب حضرت عمرؓ نے فرمایا رب خدا کی قسم یہ ناممکن ہے کہ جبرئیل، میکائیل کے دشمن ہوں، اور یہ بھی ناممکن ہے کہ میکائیل، جبرئیل کے دشمنوں سے دوستی اور صلح کریں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جب ان دونوں کو خدا سے یہ قرب ہے تو یہ ناممکن ہے کہ یہ دونوں آپس میں دشمن ہوں۔ (کذا فی الدر المنثور ص ۹۰ ج ۱)

نکتہ کسی کلام کے نازل ہونے کے دو طریقے ہیں، ایک یہ کہ وہ کلام اول کان پر پہنچے اور پھر کان سے دل تک پہنچے یہ طریقہ عام اور متعارف ہے۔

دوسرا طریق یہ ہے کہ اول دل پر اترے اور لفظ اور معنی سب سے پہلے دل میں آئیں اور پھر دل سے کان اور زبان پر پہنچیں۔ یہ طریقہ اہل اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ قرآن کریم کا نزول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طریق پر ہوتا تھا اسی وجہ سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے یاد کرنے اور بار بار پڑھنے کی حاجت نہ ہوتی تھی بلکہ ایک ہی مرتبہ میں آپ کو یاد ہو جاتا تھا۔ اسی لیے فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ فرمایا۔ بخلاف امت کے کہ ان کو قرآن معروف اور معتاد طریقے سے پہنچا ہے کہ اول کانوں سے سنا پھر دلوں تک پہنچا۔

نیز نزول وحی کی حالت میں حواس ظاہری بالکل معطل ہو جاتے ہیں اور غنودگی طاری ہو جانے کی وجہ سے حواس ظاہری اپنا کام نہیں کرتے اس لیے ایسی حالت میں الفاظ وحی کا تمام تر ورود اور نزول قلب ہی پر ہوتا ہے جس طرح انسان خواب میں الفاظ بھی سنتا ہے مگر ان الفاظ کا اصل مورد قلب ہی ہوتا ہے اس لیے کہ خواب کی حالت میں حواس ظاہری تو معطل ہو جاتے ہیں یا قلب پر نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن آپ کے قلب میں ایسا محفوظ ہو جاتا ہے کہ پھر آپ اس کو بھولتے نہیں اور نہ آپ کو اس کی مراد اور معنی میں کوئی اشتباہ لاحق ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں واضح اور منکر نہ ہوں گے ان سے مگر

الْفَاسِقُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا عَهْدًا نَبَذَهُ فَرِيقٌ

وہی جو بے حکم ہیں کیا جب کبھی باندھیں گے ایک اقرار پھینک دے گی اس کو ایک جماعت

مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَاۗءَهُمْ

ان میں سے بلکہ وہ اکثر یقین نہیں کرتے اور جب پہنچا ان کو

رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

رسول اللہ کی طرف سے سچا بتاتا ان پاس والی کو پھینک دی

فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ڎ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاۗءَ

ایک جماعت نے کتاب پانے والوں میں کتاب اللہ کی اپنی پیٹھ

ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا

کے پیچھے گویا کہ ان کو معلوم نہیں اور پیچھے لگے ہیں اس علم کے

الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ

جو پڑھتے تھے شیطان سلطنت میں سلیمان کی اور کفر نہیں کیا سلیمان نے

وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۤ

لیکن شیطانوں نے کفر کیا لوگوں کو سکھاتے تھے سحر

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ ھَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ

اور اس علم کو جو اترا دو فرشتوں پر بابل میں ہاروت اور ماروت پر

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ

اور وہ نہ سکھاتے کسی کو جب تک نہ کہتے کہ ہم تو ہیں آزمانے کو

فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ

سو تو مت کافر ہو پھر ان سے سیکھتے جس چیز سے جدائی ڈالتے

الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا ھُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ

مرد میں اور اس کی عورت میں اور وہ اس سے بگاڑ نہیں سکتے کسی کا

إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ

بغیر اذن اللہ کے اور سیکھتے ہیں جس سے انکو نقصان ہے اور نفع نہیں

وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ

اور جان چکے ہیں کہ جو کوئی اس کا خریدار ہو اس کو آخرت میں نہیں کچھ

خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا

حصہ اور بہت بری چیز ہے جس پر بیچا اپنی جانوں کو اگر ان کو

يَعْلَمُونَ ﴿١٠٢﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ

سمجھ ہوتی اور اگر وہ یقین لاتے اور پرہیز رکھتے تو بدلا تھا

عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

اللہ کے ہاں سے بہتر اگر ان کو سمجھ ہوتی

شناعت بست و یکم (۲۱)

قال تعالیٰ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ ... الیٰ ... لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۔

اور آپکی نبوت تنہا قرآن پر موقوف نہیں کہ جبرئیل کے متعلق یہ بہانہ کر دیا کہ قرآن تو جبرئیل لیکر آتے ہیں جو ہمارے دشمن ہیں بلکہ اللہ تحقیق ہم نے آپکی نبوت و رسالت کے ثابت کرنے کیلئے نہایت واضح اور روشن دلائل نازل کیے ہیں جن میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں اور نہ ان میں جبرئیل کا توسط ہے پس اگر قرآن کو دلیل نبوت نہیں سمجھتے کہ جبرئیل سے دشمنی ہے تو ان آیات بینات کا تمہارے پاس کیا جواب ہے جن میں جبرئیل امین کا واسطہ نہیں اور انکو خود بھی معلوم ہے مگر عناد کی وجہ سے انکار کرتے ہیں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ابن صوریا یہودی نے ایک مرتبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ تم اپنی نبوت و رسالت کی کوئی ایسی نشانی نہیں لائے جسے ہم بھی پہچانیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی رواہ ابن ابی حاتم۔ اور مطلب یہ ہے کہ آپکی نبوت کی ایک نشانی نہیں بلکہ صدہا نشانیاں موجود ہیں اور ان آیات بینات کا نہیں انکار کرتے مگر وہ لوگ جو حد ہی سے گزر گئے

ہیں اور مقتضا عقل و نقل دونوں ہی کو خیر باد کہہ بیٹھے ہیں کیا یہ لوگ اپنے فسق کے منکر ہیں حالانکہ ان کی
عادت مستمرہ یہ رہی ہے کہ جب کبھی ان لوگوں نے کوئی عہد و پیمان کیا ہے تو ایک فریق نے تو اس کو
بالکل ہی پس پشت ہی ڈال دیا ہے حالانکہ نقض عہد عقلاً و شرعاً ہر طرح قبیح اور مذموم ہے اور فقط بد عہدی ہی
نہیں بلکہ اکثر ان میں سے توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے اور توریت میں جو حضور پر ایمان لانے کا عہد
لیا گیا تھا اس کو واجب العمل نہیں سمجھتے ۔ حاصل مطلب یہ ہے کہ بد عہدی تو ادنیٰ درجہ کی چیز ہے بہت
سے تو توریت ہی پر ایمان نہیں رکھتے اور جب توریت ہی کو واجب الایمان اور واجب العمل نہیں سمجھتے تو
بد عہدی کرنے کو وہ کیا گناہ سمجھیں گے اب آئندہ آیت میں ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں اور
جب آئے ان کے پاس ایک عظیم الشان رسول آیا یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کو وہ پہچانتے تھے کہ
یہ رسول اللہ کی طرف سے ہے انبیاء سابقین کی بشارتیں اور اس رسول کے معجزات اس کے صدق پر شاہد
تھے اور معجزات کے علاوہ وہ پیغمبر اس کتاب کی تصدیق بھی کرنے والا ہے جو ان کے پاس ہے مثلاً توریت
اور انجیل جس میں نبی آخر الزمان کی خبر دی گئی ہے مگر باوجود اس کے اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ
یعنی توریت کو پس پشت ڈال دیا گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں کہ اللہ کی کتاب میں کیا لکھا ہوا ہے اور یا یہ معنی ہیں
کہ جانتے ہی نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس پر عمل کرنا واجب ہے غرض یہ کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو
تو پس پشت ڈال دیا جس کی انبیاء کرام تلاوت کرتے تھے اور ان منتروں کے پیچھے ہولیے جن کی شیاطین
الانس والجن حضرت سلیمان کے دور حکومت میں تلاوت کیا کرتے تھے حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت چونکہ
عام تھی جن اور انس پرند اور چرند سب ان کے زیر حکم تھے اس لیے شیاطین اور جنات اور آدمی سب
مل جل کر رہتے تھے شیاطین نے آدمیوں کو جادو سکھا رکھا تھا اور معاذ اللہ یہ سلیمان علیہ السلام کے
حکم سے ہرگز ہرگز نہ تھا اس لیے کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی کسی قسم کا کفر نہیں کیا
نہ عملی اور نہ اعتقادی اور نہ قبل النبوۃ اور نہ بعد النبوۃ اس لیے کہ وہ تو اللہ کے پیغمبر تھے کفر کے مٹانے
کے لیے مبعوث ہوئے تھے سحر کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرنا سراسر افترا ہے یہود چونکہ سحر
کو سلیمان علیہ السلام کی طرف نسبت کرتے تھے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی برأت ظاہر فرمائی
لیکن شیاطین نے از خود یہ کفر کا کام کیا کہ لوگوں کو سحر کی تعلیم دینے لگے ۔ یہود یہ کہتے تھے کہ حضرت سلیمان علیہ
السلام اللہ کے نبی نہ تھے بلکہ ساحر اور جادوگر تھے ۔ اسی کے زور سے جنات اور آدمیوں اور ہوا پر
حکومت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے اور سلیمان علیہ السلام نے کبھی یہ کام نہیں
کیا اس لیے کہ نبی معصوم ہوتا ہے اس سے کفر کا صادر ہونا ناممکن ہے ہاں تو کفر اور شرک کے مٹانے کے
لیے آتا ہے تو کیسے سکھلاتے اور علاوہ ازیں یہود اس سحر کا بھی اتباع اور پیروی کرتے تھے جو کہ شہر بابل میں دو
فرشتوں پر ایک خاص حکمت کی بنا پر نازل کیا گیا تھا جن کا نام ہاروت اور ماروت تھا وہ حکمت یہ تھی کہ
لوگ سحر اور معجزہ اور کرامت میں فرق معلوم کر لیں تاکہ پیغمبر اور جادوگر میں کوئی التباس اور اشتباہ نہ ہو کیونکہ

ظاہر معجزہ کی طرح سحر بھی خارق عادت ہے اس لیے حق تعالیٰ نے دو فرشتے بصورت انسان بابل میں اتارے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت سمجھائیں تاکہ لوگوں کو سحر اور معجزہ میں کوئی اشتباہ پیش نہ آئے اور چونکہ مقصود یہ تھا۔ اس لیے یہ دونوں فرشتے کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ خدا نے ہم کو مخلوق کے لیے فتنہ اور آزمائش بنایا ہے کہ کون سحر سیکھ کر کفر اور معصیت میں مبتلا ہوتا ہے اور کون اس کی حقیقت اور قباحت کو معلوم کر کے اس سے احتیاط اور پرہیز کرتا ہے سو دیکھو اس کو سیکھ کر کفر کا کام نہ کرنا یعنی سحر نہ کرنا اس سے ایمان جاتا رہے گا لیکن اس کے بعد بھی بعض لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے جن سے میاں اور بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالتے اور یہ سمجھتے کہ یہ چیزیں بدون اللہ کی مشیت کے مؤثر ہو جاتی ہیں اور یہ سراسر غلط ہے کہ یہ جادوگر اس سحر کے ذریعے سے کسی کو بھی بغیر اللہ کی مشیت اور ارادہ کے ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے جب خدا چاہتا ہے سحر میں تاثیر پیدا کر دیتا ہے اور جب چاہتا ہے تو اعمال کی تاثیر کو بند کر دیتا ہے اور سحر کو بے اثر بنا دیتا ہے اور اگر بالفرض والتقدیر سحر میں کوئی کفر اور شرک بھی نہ ہوتا تب بھی عقل کا مقتضیٰ یہی تھا کہ سحر سے احتراز کرتے کیونکہ یہ ایسے علم کو سیکھ رہے ہیں جو دنیا اور آخرت میں ان کے لیے ضرر رساں ہے اور اگر بالفرض مضر نہ ہو تو نافع بھی نہیں اور عاقل کا کام یہ ہے کہ جو چیز نقصان دے یا نفع نہ دے اس سے احتراز کرے اور ان کا سحر میں یہ اشتغال اور انہماک لاعلمی اور ناواقفی کی بنا پر نہیں کہ اس کے ضرر سے بے خبر ہوں بلکہ خود ان کو خوب معلوم ہے کہ جو کفر یا سحر کو خریدے گا اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں رہے گا البتہ بہت ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر ڈالا کاش یہ بات جانتے کہ ہم سعادت ابدیہ کو فروخت کر کے شقاوت ابدیہ کو خرید رہے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہود نے اپنے دین اور کتاب کے علم کو تو پس پشت ڈال دیا اور علم سحر کے پیچھے ہو لیے اور سحر کا علم لوگوں میں دو طرف سے پھیلا ایک تو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں چونکہ جنات اور انسان آپس میں ملے جلے رہتے تھے اس لیے آدمیوں نے جنات اور شیاطین سے سحر سیکھا اور حضرت سلیمان کی طرف نسبت کر دی کہ یہ سحر ہم کو انہی سے پہنچا اور اسی کے زور سے حضرت سلیمان جنات اور ہوا پر حکومت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ یہ کام کفر کا ہے سلیمان نے کبھی نہیں کیا۔ ان کے زمانہ میں شیطانوں نے آدمیوں کو سکھایا ہے۔ دوسرے ہاروت اور ماروت کی طرف سے پھیلا کہ وہ دو فرشتے تھے انسان کی شکل میں بابل میں رہتے تھے ان کو علم سحر معلوم تھا جو کوئی ان سے جادو سیکھنا چاہتا وہ پہلے ہی اس سے کہہ دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا لیکن جب وہ اصرار کرتا تو سکھا دیتے اور صاف کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی طرف سے آزمائش ہے ایسے علم سے آخرت میں کوئی فائدہ نہیں بلکہ دنیا اور آخرت دونوں ہی میں نقصان ہے بغیر اللہ کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتے اگر علم دین سیکھتے تو اللہ کے یہاں ثواب پاتے اور اب بھی اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا جیسا کہ آئندہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور بجائے سحر کے اللہ کی کتاب کا اتباع کرتے اور علم سحر اور کتب سحر اور [illegible]

پ

پاس نہیں آسکتی آپس میں دونوں نے مشورہ کیا کہ شرک اور قتل ناحق تو بہت بڑے گناہ ہیں اور شراب پینا اس درجہ کی معصیت نہیں اس لیے اس کو اختیار کر لینا چاہیئے غرض یہ کہ اس عورت نے پہلے ان کو شراب پلائی اور پھر بت کو سجدہ کرایا اور پھر شوہر کو قتل کرایا اور ان سے اسم اعظم سیکھا اور پھر ان کے ساتھ ہم بستر ہوئی پھر اول یہ عورت اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر چلی گئی اور اس کی روح زہرہ ستارہ کی روح کے ساتھ جا ملی اور اس کی صورت مسخ ہو کر زہرہ کی صورت ہو گئی اور وہ فرشتے اسم اعظم بھول گئے۔ اس لیے آسمان پر نہ جا سکے جب ہوش میں آئے نہایت نادم ہوئے اور ادریس علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا اور استغفار کی درخواست کی اور بارگاہ خداوندی میں شفاعت کے خواستگار ہوئے۔ بارگاہ الٰہی سے یہ حکم آیا کہ عذاب آخرت کو منظور کرو یا عذاب دنیا کو تم کو اختیار ہے کہ دنیوی یا اخروی عذاب میں جس کو چاہو اختیار کر لو فرشتوں نے دنیاوی عذاب کو سہل اور آسان سمجھا کہ یہاں کا عذاب تو عنقریب منقطع ہو جائے گا اس لیے اس کو اختیار کر لیا چنانچہ وہ اللہ کے حکم سے بابل کے کنویں میں الٹے لٹکا دیئے گئے اور وہیں ان کو آگ سے عذاب دیا جا رہا ہے۔ پھر جو کوئی ان کے پاس جادو سیکھنے جاتا ہے وہ اول تو اس کو سمجھا دیتے ہیں اور جب اصرار کرتا ہے تو اس کو سکھلا دیتے ہیں۔ (قصہ ختم ہوا)

تحقیق ہاروت و ماروت کا جو قصہ نقل کیا گیا اس میں علماء کے دو فریق ہیں ایک فریق یہ کہتا ہے کہ یہ قصہ سراپا موضوع ہے اور یہود کا من گھڑت قصہ ہے اور انہی کی کتابوں سے ماخوذ ہے حضرات محدثین اس قصہ کو باعتبار روایت کے غیر معتبر قرار دیتے ہیں اور حضرات متکلمین باعتبار درایت کے اس کو غیر معتبر کہتے ہیں۔ قاضی عیاض اور امام رازی نے اس قصہ کا شد و مد سے انکار کیا ہے اس لیے کہ یہ قصہ اصول دین کے خلاف ہے۔

(۱) اول یہ کہ فرشتے معصوم ہیں ان سے گناہ کا صدور عصمت کے منافی ہے۔

(۲) دوم یہ کہ جب وہ عذاب میں گرفتار ہیں تو ان کو فرصت کہاں سے ملی کہ لوگوں کو جادو سکھلائیں نیز تعلیم و تعلم کے لیے اختلاط ضروری ہے جو محبوس ہونے کی وجہ سے مفقود ہے۔ ان کو لوگوں سے اختلاط کیسے میسر ہوا۔

(۳) سوم یہ کہ ایک فاحشہ اور بدکار عورت کا دھوکہ سے اسم اعظم سیکھ کر آسمان پر چڑھ جانا سراسر غیر معقول ہے۔ اسماء الٰہی کے لیے تقویٰ اور طہارت شرط ہے۔

(۴) چہارم یہ کہ مسخ اور تبدیل صورت عقوبت کے لیے ہوتا ہے اور عقوبت کے لیے تحقیر اور اہانت لازم ہے اور آسمان پر پہنچ کر ستارہ بن جانے میں بڑی عزت ہے اور نہ کوئی تحقیر اور اہانت ہے

(۵) پنجم یہ کہ زہرہ تو ایک مشہور ستارہ ہے جو ابتدائے آفرینش عالم سے موجود ہے اور اس قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کو مسخ کر کے زہرہ ستارہ بنا دیا گیا جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ستارہ اس واقعہ کے بعد وجود میں آیا اور اس واقعہ سے پہلے یہ ستارہ موجود نہ تھا اور یہ سراسر غیر معقول ہے علاوہ ازیں

(۴) اور جس طرح بغرض ابتلاء و آزمائش فرشتے بشکل بشر بنا کر آسمانوں سے زمین پر اتارے گئے اسی طرح ایک ستارہ کی روح ایک حسین و جمیل عورت کی شکل میں بابل میں ہاروت اور ماروت کی عصمت کے امتحان کے لیے نمودار ہوئی اور امتحان ہو جانے کے بعد اصل صورت کی طرف لوٹ گئی یعنی صورت بشریہ سے صورت کوکبیہ کی طرف واپس ہو گئی جس طرح جنات مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر اپنی اصلی صورت کی طرف لوٹ جاتے ہیں اسی طرح یہاں سمجھو لہذا جن روایات میں اس عورت کا زہرہ ستارہ کی صورت میں مسخ ہونے کا ذکر آیا ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ اس عورت کی روح کا تعلق زہرہ کی روح کے ساتھ کر دیا گیا اور یہ مطلب نہیں کہ یہ ستارہ پہلے ہی سے موجود نہ تھا اور اب اس عورت کے مسخ ہونے کے بعد وجود میں آیا۔

(۵) اور صورت کوکبیہ اگرچہ کتنی ہی شرافت اور عظمت رکھتی ہو لیکن صورت انسانیہ کے اعتبار سے بہت حقیر اور ذلیل ہے۔ کما قال تعالیٰ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔

خلاصہ کلام | بعض علماء نے اس قصہ کو اصول دین اور قواعد شریعت کے خلاف سمجھا اس لیے اسکو غیر معتبر قرار دیا اور بعض علماء نے کثرت طرق اور کثرت اسانید کی بنا پر اس قصہ کو بالکلیہ انکار مناسب نہیں سمجھا بلکہ سندوں سے زیادہ اس قصہ کا مروی ہونا اس کی خبر دیتا ہے کہ اس قصہ کی اصل ضرور ہے بالکل بے اصل نہیں روایات مختلفہ کا جو قدر مشترک تھا حضرات اسکے تو قائل ہیں اور خصوصیات کے بارہ میں توقف اور سکوت کیا اور جو باتیں بظاہر اصول شریعت کے خلاف معلوم ہوتی تھیں انکی مناسب توجیہ اور تاویل فرمائی اور یہی طریق نہایت اسلم اور معتدل ہے۔ روایت کا وارد ہونا بطرق متعددہ یہ یہ ہے اگرچہ وہ طرق اور اسانید ضعیف اور واہی ہوں تب بھی ضعفاء کے مل جانے سے بھی ایک گونہ قوت آ جاتی ہے اس لیے جو ضعیف حدیث متعدد طرق سے مروی ہو اصطلاح محدثین میں اسکو حسن لغیرہ کہتے ہیں۔ لہذا کسی ضعیف روایت کے کثرت طرق اور کثرت اسانید سے یکسر قطع نظر کر لینا اور اپنی مزعوم درایت کی بنا پر اس روایت کا بالکلیہ انکار کر دینا خود خلاف درایت ہے کیا ضروری ہے کہ جو چیز آپ کے نزدیک خلاف درایت ہے وہ دوسرے عالم کے نزدیک بھی خلاف درایت ہو ممکن ہے کہ آپ کی درایت نے غلطی کی ہو۔ وفوق کل ذی علم علیم و فوق کل ذی فہم فہیم اور بعض اسرائیلیات جن کا صحیح ہونا بھی ثابت نہ ہو انکا انکار کا سبب نہیں ہو سکتا الا یہ کہ نصوص کتاب و سنت اور قواعد شریعت اور اجماع امت کے خلاف ہو۔ حدیث میں ہے حدثوا عن بنی اسرائیل ولا حرج اسرائیلی باتوں کے نقل میں کوئی حرج نہیں۔

میرا مطلب نہیں کہ یہ قصہ قطعاً صحیح ہے اور ناظرین بھی اس کو صحیح سمجھیں میرا مطلب فقط اس قدر ہے کہ بعض حضرات جو کہ ان روایات کا انکار کر رہے ہیں ان آیات کی تفسیر وہ اس قصہ کے صحیح ہونے پر موقوف نہیں جیسا کہ ناظرین نے تفسیر کو غور سے دیکھ لیا ہوگا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نے ایک وعظ میں فرمایا ہے کہ اگر یہ شبہ کیا جائے کہ سحر تو حرام اور کفر ہے پھر اس کا جاننا اور بضرورت شرعی اسکا سیکھنا خصوصاً جبکہ اس پر عمل کرنے کی مخالفت بھی ساتھ ساتھ ہو تو حرام نہیں جیسے سود اور رشوت کا کھانا حرام ہے مگر اس کی ماہیت معلوم کرنا اور اس کو بیان کرنا حرام نہیں، فقہاء رحمہم اللہ نے کلمات کفر کے لیے ایک مستقل باب رکھا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کن باتوں سے ایمان جاتا رہتا ہے فلسفہ کے بہت سے مسائل کفر ہیں لیکن ان کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ ان کی حقیقت معلوم کر کے ان کا جواب دیا جا سکے۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب

رہا یہ اشکال کہ پھر سحر کی تعلیم کے لیے فرشتے کیوں نازل کیے گئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی سے یہ کام کیوں نہ لے لیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہدایت محضہ کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اس کی تعلیم میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان سے سیکھنے کے بعد اسی میں مشغول اور مبتلا ہو جائے تو اس طرح حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام گمراہی کا سبب بعید بن جاتے جو ان کی شان ہدایت محضہ کے منافی ہے اس لیے حق تعالیٰ نے گمراہی کا سبب بعید بھی بنانا گوارا نہیں فرمایا بخلاف فرشتوں کے کہ ان سے تشریعی اور تکوینی دونوں قسم کے کام لیے جاتے ہیں اور تکوین میں جس طرح وہ مسلمانوں کی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں اسی طرح وہ کافروں کی بھی پرورش اور حفاظت کرتے ہیں حالانکہ ہمارے جیسے شرفاء کو کافر کی اعانت اور امداد ناجائز ہے انبیاء کرام کے سپرد تشریعی نظام سپرد ہوتا ہے اور ملائکہ کو تکوینی نظام سپرد ہوتا ہے اس لیے تعلیم سحر کی خدمت ملائکہ کے سپرد ہوئی کہ اگر وہ اس میں ضلالت کا سبب بن جائیں تو ان کی شان کے خلاف نہ ہوگا۔ اور حضرات انبیاء کے لیے گمراہی کا سبب بعید بننا بھی خلاف شان ہے۔ کذا فی تعمیم التعلیم صفحہ ۔۔۔ نمبر ۳ از تبلیغ۔

جس طرح حضرات انبیاء کرام نے یہ بتلا دیا کہ رشوت حرام ہے مگر رشوت کی حقیقت نہیں بتلائی اسی طرح حضرات انبیاء نے یہ تو جتلا دیا کہ سحر حرام ہے مگر سحر کی حقیقت نہیں بتلائی۔

فائدہ معلوم نہیں کہ بحالت عذاب وہ خود لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے ہیں یا جنات اور شیاطین کے واسطہ سے افادہ اور استفادہ ہوتا ہے واللہ اعلم (روح المعانی)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا

اے ایمان والو تم نہ کہو راعنا اور کہو

انظرنا واسمعوا وللکفرین عذاب الیم

انظرنا اور سنتے رہو اور منکروں کو دکھ کی مار ہے

شناعت بست ودوم (۲۲)

متضمن بتلقین احباب بآداب خطاب

قال تعالیٰ. یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ...... الیٰ ... وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں یہود کے اتباع سحر کا ذکر تھا آئندہ ارشاد فرماتے ہیں کہ سحر کا اجماع یہود کی طبیعتوں میں اس درجہ راسخ اور پختہ ہو گیا ہے کہ ان کی گفتگو اور مخاطبت بھی سحر کے اثر سے خالی نہیں۔ جس طرح سحر کے لیے معانی و حقیقت کی پوشیدگی شرط ہے اسی طرح ان کا کلام بھی ایسا ہوتا ہے کہ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ، ایسے ہی الفاظ کے ساتھ بات کرتے تھے چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم کلام ہوتے تو راعنا سے خطاب کرتے جسکے ظاہری معنی نہایت عمدہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت کیجئے اور ہمارے حال پر توجہ فرمائیے لیکن جن معنی کا وہ ارادہ کرتے وہ نہایت فاسد و گندہ ہیں۔ یہود یہ لفظ بول کر احمق یا چرواہے کے معنی مراد لیتے بہت سے مسلمانوں کو ان فاسد معنی کا علم نہ تھا انہوں نے یہ سمجھ کر کہ علماء اہل کتاب حضرات انبیاء کے آداب سے بخوبی واقف ہیں جب علماء یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ کلمہ تعظیم ہے اس لیے مسلمانوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اے ایمان والو ایمان کا مقتضی یہ ہے کہ تلبیس اور دھوکہ سے بچو اگرچہ تمہارا ارادہ دھوکہ کا نہ ہو تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کے وقت راعنا کا لفظ نہ کہو جس میں فاسد معنی کا ایہام ہے بلکہ اس کے بجائے لفظ انظرنا کہو یعنی ہم پر نظر عنایت فرمائیے اور ہم پر شفقت اور توجہ فرمائیے اور آپ جو ارشاد فرمائیں اس کو نہایت غور سے سنو کہ دوبارہ سوال اور ایسے مبہم الفاظ کے استعمال کی نوبت ہی نہ آئے اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے کہ جو اس قسم کے الفاظ سے رسول اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے ہیں اور رسول کی ایذاء اور تحقیر موجب کفر ہے۔

ف (۱) قرآن کریم میں پچاسی جگہ اس امت کے مسلمانوں کو یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے خطاب کیا گیا ہے۔ ان میں سے یہ پہلا موقع ہے کتب سابقہ میں صرف انبیاء کو خطاب ہوتا تھا اللہ تعالیٰ نے اس امت کو یہ شرف عطا فرمایا کہ قرآن کریم میں براہ راست اس امت کو مخاطب بنایا ایک شخص نے عبداللہ بن مسعودؓ سے درخواست کی کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرمائیے فرمایا کہ جب تو قرآن

پڑھے اور یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے مخاطب کر سنے تو فوراً اپنے کانوں کو اسکی طرف متوجہ کرنا اور خطاب کو خوب غور کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے جو اس میں تم سے خطاب فرمایا ہے اور کسی اچھی چیز کا حکم دیتا ہے یا کسی بری چیز سے منع کرتا ہے (رواہ عبداللہ بن المبارک وابو عبید والبیہقی فی شعب الایمان)

ف ۳ جس لفظ کے استعمال سے فاسد معنی کا ایہام ہو، بہ امکان اس کا استعمال نہ کرنا چاہیئے گو متکلم کی نیت صحیح ہو۔

ف ۴ نبی کی اشارۃً اور کنایۃً تحقیر بھی کفر ہے اس لیے کہ یہود صراحۃً آپ کی تحقیر نہیں کرتے تھے۔ صراحت چھوڑ کر اشارۃً اور کنایۃً آپ کی تحقیر کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو کافر فرمایا۔

مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا

دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو منکر ہیں کتاب والوں میں اور

الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِّنْ خَیْرٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ؕ

نہ مشرک والوں میں یہ کہ اترے تم پر کچھ نیک بات تمہارے رب سے

وَاللّٰہُ یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِہٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ

اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت سے جس کو چاہے اور اللہ

ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۱۰۵﴾

بڑا فضل رکھتا ہے۔

شناعت بست و سوم (۲۳)

قولہ تعالیٰ۔ مَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ... الیٰ ... وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ

شانِ نزول مسلمانوں نے یہود سے کہا کہ تم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ۔ یہودیوں نے کہا کہ خدا کی قسم ہماری تو دلی خواہش تھی کہ اگر تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ہوتا تو ضرور اس کو قبول کرتے لیکن تمہارا دین ہمارے دین سے بہتر ثابت نہیں ہوا۔ مزد علی

سے اپنی تکذیب میں یہ آیت نازل فرمائی کہ یہ سب غلط ہے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تم پر حسد کرتے ہیں۔ اور کافر خواہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین کو ذرہ برابر دل سے یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر کوئی خیر نازل کی جائے لیکن ان کے حسد سے کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کا محکوم نہیں اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہے اپنی رحمت سے مخصوص فرمائے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی نبوت اور وحی سے سرفراز فرمایا اور اپنے فضل سے آپ کو افضل الانبیاء بنایا علاوہ آپ کے دین کا تمام ادیان سے افضل اور اکمل ہونا روز روشن کی طرح واضح ہے۔

ف اس جگہ رحمت سے مراد نبوت ہے اور فضل اس احسان اور بخشش کو کہتے ہیں جو ابتداءً بلا وجہ ہو۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ

جو موقوف کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر

اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

یا اس کے برابر کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

قَدِيْرٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کو سلطنت ہے آسمانوں

وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ

اور زمین کی اور تم کو نہیں اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ

وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

مدد والا

شناعت بست و چہارم (۲۴)

قال تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ ... الیٰ ... مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۔

شان نزول یہود اور مشرکین بطور طعن یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب

کو ایک بات کا حکم دیتے ہیں اور پھر اس بات سے منع کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قرآن خدا کی طرف سے نہیں
بلکہ اپنی طرف سے کہتے ہیں۔ اسی پر یہ آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ اسی قسم کی باتوں سے کافروں کا مقصود یہ تھا
کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ شک اور شبہ ڈال دیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ خدا کی طرف سے جو کچھ ہم پر نازل ہوا
سب خیر ہی خیر ہے تو اس کے منسوخ ہونے کے کیا معنی۔ اگر پہلا حکم خیر تھا تو دوسرا شر ہوگا اور اگر دوسرا
حکم خیر ہے تو پہلا حکم شر ہوگا اور وحی الٰہی اور کلام خداوندی کا شر ہونا ناممکن اور محال ہے۔ اس شبہ کے
ازالہ کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ نسخ کے معنی تبدیل خیر بالشر کے نہیں یعنی
خیر کو شر کے ساتھ بدل دینے کے نہیں تاکہ وحی الٰہی اور خیریت میں منافات لازم آئے بلکہ ناسخ اور منسوخ
دونوں ہی خیر ہیں اس لیے کہ ہم جب کبھی کسی آیت کا حکم منسوخ کرتے ہیں کہ اس آیت کے حکم پر عمل نہ کیا
جائے اگرچہ اس آیت کی تلاوت باقی رہے یا ہم اس آیت ہی کو ذہنوں سے بھلا دیتے ہیں کہ اس
آیت کے الفاظ کو کسی حکمت اور مصلحت کی بنا پر قوت حافظہ سے فراموش کرا دیں اگرچہ حکم اس آیت
کا برقرار رکھیں کہ اس آیت کے ذہنوں سے نکل جانے کی وجہ سے تلاوت کی عبادت اور لذت
تو حاصل نہ کر سکیں اس منسوخ التلاوۃ آیت کے حکم پر عمل کر کے اجر کی تو ضرور ہی حاصل کر سکیں۔
پھر جب ہم کسی آیت کے حکم کو منسوخ کریں یا اس آیت کو ذہنوں سے بھلا دیں نسخ کے بعد اس آیت منسوخہ
یا منسیہ سے کوئی بہتر چیز لاتے ہیں یا اس آیت کے مثل لاتے ہیں یعنی حکم ناسخ حکم منسوخ سے سہولت عمل
یا موافقت مصلحت یا کثرت ثواب کے اعتبار سے بہتر ہوگا یا برابر۔ کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ
تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور تو صبح و شام ہر لحظہ و ہر لمحہ قدرت کے عجائب قدرت اور غرائب
حکمت کا مشاہدہ کرتا ہے جیسے مرض کا صحت سے بدلنا اور فقر کا تونگری سے بدلنا اور عزت کا
ذلت سے بدلنا اور بدبختی کا نیک بختی سے بدلنا پس جو ذات ان تغیرات اور تبدلات پر قادر ہے
کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ وہ ایک حکم سے دوسرے حکم کو بدل دے اور جس طرح احکام تکوینیہ میں
حسب اقتضاء مصلحت تغیر اور تبدیل معاذ اللہ جہالت نہیں بلکہ عین حکمت ہے اسی طرح احکام
شرعیہ میں بھی باقتضاء زمان و مکان اور باقتضاء طبع تغیر و تبدیل عین حکمت اور عین مصلحت ہے
دنیاوی تاریخ میں بھی احکام بدلتے رہتے ہیں اگر یہ بات نہ ہوتی تو توریت کے بعد انجیل کے نازل کرنے
کی کیا ضرورت تھی اور یہ تغیر و تبدل ہے اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ پہلے ہی
سے سب کچھ اس کے علم میں ہے البتہ اس تغیر اور تبدل سے ہمارے علم میں تغیر ہوتا ہے۔ سو اس
کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو قصور علم کی وجہ سے اس حکم کی مدت معلوم نہ تھی اور قصور فہم کی وجہ سے اس
حکم کو دائم اور مستمر سمجھ بیٹھے۔ جب حکم ناسخ نازل ہوا اس وقت اپنے قصور علم کا علم ہوا اور قصور
فہم کا فہم ہوا۔ دنیاوی حکومت میں بھی تغیر اور تبدل ہوتا ہے لیکن وہاں کسی ذو نفوذ قوت اور لاعلمی کی بنا پر
پہلا حکم منسوخ ہوتا ہے اور حق جل شانہ کے احکام میں تغیر و تبدل محض حکمت و مصلحت کی بنا پر ہوتا ہے

اللہ تعالیٰ کا علم غلطی سے پاک ہے۔

لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنْسَى میرا رب نہ غلطی کرتا ہے نہ بھولتا ہے۔

مریض کے حالات بدلنے کی وجہ سے طبیب دوا بدلتا رہتا ہے یہ طبیب کی جہالت نہیں بلکہ دلیل حذاقت ہے کہ ہر وقت کی مصلحت اس کے پیش نظر ہے اور اس قرآن کے علاوہ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہت آسمانوں کی اور زمین کی اور حکومت اور بادشاہت کے لوازم میں سے ہے کہ احکام میں تغیر اور تبدل ہوا کرتا جس وقت جو حکم دے اس کی تعمیل فرض اور لازم ہے اور اگر اسکے حکم اور فرمان کی تعمیل میں تامل کرو اور یہ کہو کہ ہم تو پہلے ہی حکم کو مانیں گے دوسرے حکم کو نہیں مانیں گے تو سمجھ لو کہ تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی کارساز اور مددگار نہیں کہ جو تمہیں اس کی گرفت اور بازپرس سے بچا سکے۔

فائدہ اول لغت میں نسخ کے دو معنی آتے ہیں ایک نقل اور تحویل جیسے نسخ الکتاب یعنی کتاب نقل کی، دوسرے معنی رفع اور ازالہ کے جیسے نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ (آفتاب نے سایہ کو زائل کر دیا)۔ آیت میں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی حکم اول کا اٹھا دینا۔

فائدہ دوم کتاب اللہ کا نسخ چند وجوہ پر آیا ہے (۱) ایک تو یہ کہ تلاوت منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا جیسے آیت رجم کہ تلاوت تو اس کی منسوخ ہو گئی اور حکم اس کا باقی ہے (۲) اور ایک یہ کہ حکم منسوخ ہو جائے اور تلاوت باقی رہے جیسے اقارب کے لیے وصیت کرنے کی آیت میراث سے اس کا حکم منسوخ ہو گیا اور تلاوت علی حالہا باقی ہے اور مثلاً وہ آیت جس میں ایک سال کی عدت وفات کا حکم مذکور ہے تلاوت اس کی باقی ہے مگر ایک سال کی عدت کا حکم چار مہینے اور دس دن کی آیت سے منسوخ ہو گیا (۳) اور ایک صورت یہ ہے کہ تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہوں جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ احزاب بقدر سورۂ بقرہ طویل تھی مگر اس کے اکثر حصہ کی تلاوت اور حکم دونوں منسوخ ہو گئے۔

فائدہ سوم نسخ کی دو قسمیں ہیں ایک یہ کہ حکم منسوخ کی جگہ دوسرا حکم نازل کیا جائے جیسے ایک سال کی عدت منسوخ کر کے چار مہینے اور دس دن کا حکم نازل کر دیا گیا۔ دوسری قسم یہ کہ پہلا حکم اٹھا لیا جائے اور کوئی جدید حکم اس کی جگہ نہ اتارا جائے جیسے ابتداء میں مہاجر عورتوں کے امتحان کا حکم تھا بعد میں اٹھا لیا گیا۔

فائدہ چہارم نسخ احکام یعنی اوامر اور نواہی میں جاری ہوتا ہے اخبار یعنی جو چیزیں خبر سے متعلق ہیں ان میں نسخ جاری نہیں ہوتا ہے اور اوامر و نواہی میں باقتضائے مصلحت تغیر و تبدل عقلاً و عالم کے نزدیک مسلم ہے بلکہ مصلحت کے بدلنے سے حکم کو نہ بدلنا عقلاً قبیح ہے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن

دل چاہتا ہے بہت کتاب والوں کا کسی طرح تم کو پھیر کر

بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم

مسلمان ہوئے پیچھے کافر کر دیں حسد کر کے اپنے اندر سے

مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا

بعد اس کے کہ کھل چکا ان پر حق سو تم درگزر کرو اور خیال

حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ

میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

قَدِيرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ۚ وَمَا

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور جو

تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ ۗ

آگے بھیجو گے اپنے واسطے بھلائی وہ پاؤ گے اللہ کے پاس

إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے

شناعت بست و ششم (۲۶)

قال تعالیٰ. وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ ... الیٰ ... إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

اے مسلمانو! یہ یہود قرآن اور دین میں طرح طرح کے جو نکتے نکالتے ہیں کبھی نسخ احکام پر اعتراض کرتے ہیں اصل وجہ یہ ہے کہ اکثر اہل کتاب کی دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ کسی طرح تم کو ایمان سے پھیر کر کافر بنا دیں کہ جس طرح ہم نے اپنی کتاب کی طرح تم بھی جدید حکم کا انکار کر دو اور اپنے نبی پر یہ اعتراض کر دو کر

کہ تم نے پہلے تو یہ حکم دیا تھا اور اب یہ دوسرا حکم اس کے خلاف کیسا؟ اور ان کی اس غرض فاسد کا کوئی محرک اور باعث تمہاری جانب سے وقوع میں نہیں آیا بلکہ محض حسد کی بنا پر کہ جو خود ان کے ناپاک اور گندے نفسوں سے پیدا ہوا ہے اور پھر تعجب یہ ہے کہ ان کی یہ کوشش اور یہ حسد کسی شک اور شبہ کی بنا پر نہیں بلکہ بعد اس کے ہے کہ حق ان کو خوب واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا دین اور ان کی کتاب اور ان کا رسول سب سچے ہیں نیز نسخ تو یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ہر شریعت میں علی اختلاف المصالح احکام بدلتے رہتے ہیں۔ بقرہ ہی کے قصہ میں دیکھ لو کتنی مرتبہ نسخ ہوا۔ تم ان کی باطل کا خیال مت کرو یہ حسد میں مبتلا ہیں خدا کا شکر کرو کہ تم حاسد نہیں محسود ہو۔ پس تم ان حاسدوں سے معاف کرو اور درگزر کرو۔ یعنی زبان سے بھی ان کو کچھ برا بھلا نہ کہو اور فی الحال ان سے کوئی جنگ و جدال اور قتل و قتال نہ کرو۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ جہاد و قتال اور جزیہ کا حکم نازل فرمائے اور جہاد و قتال کے حکم میں تاخیر عاجز ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ فی الحال بھی قادر ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اس تاخیر میں کچھ حکمتیں ہیں وہ قادر تو ایسا ہے جب چاہے گا ضعیف کو قوی پر غالب کر دیگا اور اگر تم کو ابھی سے ان حاسدوں سے جہاد کا شوق ہے تو جہاد بالسیف کا حکم آنے سے پہلے جہاد نفس میں مشغول رہو اور نماز کو قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ یہ عبادت مالی اور بدنی نفس پر بہت شاق اور گراں ہے پس اس جہاد و عملی جہاد میں لگے رہو۔ اور نماز اور زکوٰۃ کے علاوہ جو نیکی اور بھلائی بھی تم آگے بھیجو گے تمام جمع شدہ ذخیرہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پاؤ گے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمہارا کوئی عمل ضائع ہو جائے۔ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے عمل کو خوب دیکھنے والا ہے اس عمل کی کمیت اور کیفیت اور تمہارا اخلاص اور شوق اور نیت سب اس کی نظروں کے سامنے ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ

وہ کہتے ہیں ہرگز نہ جاویں گے جنت میں مگر جو ہوں گے یہود یا

نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ

نصاریٰ یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے تو کہہ دے لے آؤ سند اپنی اگر تم

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ

سچے ہو کیوں نہیں جس نے تابع کیا منہ اپنا اللہ

وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ

کے اور وہ نیکی پر ہے اس کو ہے مزدوری اس کی اپنے رب کے پاس اور نہ ڈر ہے

اور اعمال صالحہ شرط نجات اور مغفرت ہیں۔ اور یہ دونوں ان میں مفقود ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّ

اور یہود نے کہا نصاریٰ نہیں کچھ راہ پر اور

قَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ

نصاریٰ نے کہا یہود نہیں کچھ راہ پر اور وہ

يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ

سب پڑھتے ہیں کتاب اسی طرح کہی ان لوگوں نے جن پاس علم نہیں

مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

انہیں کی سی بات، اب اللہ حکم کرے گا ان میں دن قیامت کے

فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾

جس بات میں جھگڑتے تھے

شناعت بست و ہشتم (۲۸)

باشتراک نصاریٰ و مشرکین

قولہ تعالیٰ۔ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى ... الیٰ ... فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نجران کے نصاریٰ آئے، علماء یہود بھی ان کو سن کر آ گئے دونوں فریق کی آپس میں بحث شروع ہو گئی جوش میں آکر ایک دوسرے کی تکذیب کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اور جوش میں آکر یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ کسی صحیح اور قابل اعتبار چیز پر نہیں۔ بالکل بے بنیاد ہیں سرے ہی سے کسی بنیاد پر قائم نہیں اور اسی طرح نصاریٰ یہ کہنے لگے کہ یہود کسی چیز پر نہیں

یعنی انکا دین ہیچ اور بے بنیاد ہے اور حالانکہ دونوں فریق اللہ کی کتاب پڑھتے رہتے ہیں یعنی یہودی توریت کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے رہتے ہیں اور ہر کتاب میں دوسری کتاب اور اس کے رسول کی تصدیق موجود ہے توریت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل کی تصدیق کرتی ہے اور انجیل موسیٰ علیہ السلام اور توریت کی تصدیق کرتی ہے اصل بنیاد دونوں کی صحیح ہے اگرچہ بعد میں نسخ اور تحریف کی وجہ سے غیر معتبر ہو گئے اور اسی طرح ایسی ہی باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جن کے پاس علم نہیں یعنی مشرکین اور مجوس یہی کہتے ہیں کہ ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارے سوا سب بے دین اور گمراہ ہیں پس یہ ڈینگ ہے جس کا کوئی بھی بے دلیل ہانک ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کے درمیان ان تمام امور کا عملی طور پر فیصلہ فرما دیں گے جن میں یہ اختلاف کر رہے ہیں۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ یہودیت اور نصرانیت اپنے اپنے وقت میں صحیح تھیں۔ خاتم الانبیاء کے دین اور کتاب سے تمام ادیان منسوخ ہو گئے اور اب قیامت تک سوائے دین اسلام کے اور کوئی دین مقبول اور معتبر نہیں اور عملی فیصلہ سے مراد یہ ہے کہ اہل حق اور اہل باطل کے لیے جزاء اور سزا کا حکم سنا دیا جائیگا جس سے حق اور باطل کے امتیاز کا آنکھوں سے مشاہدہ ہو جائیگا اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ کون ہدایت پر ہے اور کون گمراہ۔ اور فیصلہ میں عمل کی قید اس لیے لگائی کہ علمی طور پر تو دنیا ہی میں دلائل اور براہین سے حق اور باطل کا فیصلہ ہو چکا ہے اگر طبائع میں تعصب اور عناد نہ ہو تو دنیا ہی میں نزاع اور اختلاف ختم ہو جاتا لیکن دنیا میں عملی طور پر حق اور باطل کی تفریق کا فیصلہ کر دینا خلاف حکمت ہے۔ دنیا دار تکلیف اور دار ابتلاء و امتحان ہے۔ عملی فیصلہ یوم جزا ہی میں مناسب ہے۔

ف كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ ــــــ میں قول کے ساتھ تشبیہ دینا مقصود ہے اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ میں مقولہ کے ساتھ تشبیہ دینا ہی مقصود ہے لہذا تشبیہ میں تکرار نہیں رہا نیز تاکید کے لیے تکرار عین بلاغت ہے فافہم ذلک واستقم۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا

اور اس سے ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جاوے وہاں

اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ

نام اس کا اور دوڑا ان کے اجاڑنے کو ایسوں کو نہیں پہنچتا

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا

کہ پیٹھیں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ان کو دنیا میں ذلت

خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۞ وَلِلّٰهِ

ہے اور ان کو آخرت میں بڑی مار ہے اور اللہ ہی کا

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ

کی ہے مشرق اور مغرب سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۞

بے شک اللہ گنجائش والا ہے خبر رکھتا۔

شناعت بست و نہم (۲۹)
باشتراک نصاریٰ و مشرکین

قال تعالیٰ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ... الیٰ ... اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب ہی اس امر کے مدعی ہیں کہ ہم حق پر ہیں لیکن اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہو جائے کہ حق سے کس قدر دور ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو اللہ کی مسجدوں کو اس بات سے روکتا ہے کہ ان میں اللہ کا نام لیا جائے خواہ دل سے اور خواہ زبان سے اور خواہ اعضاء اور جوارح سے اور فقط اسی پر کفایت نہ کرے بلکہ ان کے ویران اور برباد کرنے کی کوشش کرے مساجد کی بے حرمتی کرنا اور ان کو منہدم کرنا یہ مساجد کی ظاہری تخریب ہے اور عبادت اور ذکر اللہ کی بندش کر دینا یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ کے اس ارشاد

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ	اللہ کی مساجد کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نماز قائم کی۔

میں عمارت سے ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی عمارت مراد ہے اسی طرح وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا میں ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی تخریب مراد ہے۔ غرض یہ کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک نہایت قبیح اور فعل شنیع ہے۔ مدعیان مذہب کا ہر گروہ اسی بلا میں مبتلا ہے یہود اور نصاریٰ نے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کو ویران کیا اور مشرکین مکہ نے مسجد حرام کو ویران کیا اور اسی میں خدا

کا نام لینے سے مانع اور مزاحم تھے۔ ان ظالموں کو یہ چاہیئے تھا کہ مسجدوں میں اور خدا کے گھروں میں قدم
بھی رکھتے تو ڈرتے ہوئے کہ مبادا خدا کے گھر کے ادب اور تعظیم میں ہم سے کوئی قصور نہ ہو جائے
جس سے خدا کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ اس گھر کا ادب یہ ہے کہ اس کو اللہ کے ذکر اور تلاوت
سے آباد کیا جائے، خدا کے دربار میں داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے ہی دو رکعت نماز پڑھ
لینی چاہیئے۔ افسوس کہ یہ لوگ نہ خدا سے ڈرے اور نہ اس کے گھر کا ادب کیا بلکہ ظلم ڈھانے لگے اور لوگوں
کے بندوں کو اس کے دربار میں حاضری سے روکنے لگے۔ اور ظاہر ہے کہ دربار خداوندی کو ویران کرنے کی کوشش
کرنا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم نہیں ہو سکتا ایسے ہی لوگ دونوں جہان میں سزا یاب ہوں گے۔ ان کو دنیا میں بھی
ذلت و رسوائی نصیب ہوگی کہ قتل اور قید کئے جائیں گے اور آخرت میں بھی ان کے لئے بڑا عذاب ہوگا
اور اے مسلمانو! اگر کافر تم کو مسجد حرام اور مسجد اقصیٰ میں جانے سے روکیں تو ملول نہ ہونا۔ مشرق اور
مغرب سب اللہ ہی کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام روئے زمین کو تمہارے لئے مسجد بنا دیا ہے
ہر جگہ تمہارے لئے نماز اور عبادت درست ہے۔ اللہ تعالیٰ کوئی جسم اور جسمانی نہیں کہ جو کسی خاص
مکان میں موجود ہو اور دوسرے مکان میں نہ ہو وہ تو وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ البتہ تم زمان
اور مکان اور جہت کے ساتھ مقید ہو اس لئے اللہ تعالیٰ نے تمہاری عبادت کے لئے ایک جہت
مقرر فرما دی اور ایک قبلہ متعین کر دیا لیکن اگر تم کسی وقت میں کسی دشمن کے خوف کی وجہ سے قبلہ کی
طرف منہ کر کے نماز نہ پڑھ سکو۔ یا اندھیری رات میں قبلہ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تم نے تحری کر کے
نماز پڑھ لی اور بعد میں معلوم ہوا کہ نماز قبلہ رخ نہیں پڑھی گئی یا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنا چاہتے
تھے اور سواری کا منہ قبلہ کی طرف نہ تھا اور سواری سے اترنے میں دشواری تھی تو ان حالات میں نماز
پڑھتے وقت جدھر بھی اپنا منہ کر لو گے تو ادھر ہی اللہ کا رخ ہے یعنی وہی جہت اور سمت قبلہ کی
ہے اور تمہاری نماز ہر حال میں صحیح اور مقبول ہے اور ہر حال میں اللہ کا قرب اور حضور تم کو حاصل ہے
اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جسم اور جسمانی نہیں کہ اگر ایک مکان میں موجود ہو تو دوسرے مکان میں موجود
نہ ہو۔ وہ کسی مکان اور جہت کے ساتھ مقید نہیں اور اللہ تعالیٰ نے تم کو جو یہ وسعت اور
سہولت اس لئے عطا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ بڑے ہی وسیع رحمت والے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں
کہ واسع سے اللہ تعالیٰ کی ذاتی وسعت مراد ہے یعنی ذات کی طرح اس کی وسعت بھی بیچون و
بیچگون ہے جس کی کیفیت عقل و ادراک سے باہر ہے اور بندوں کی حاجتوں اور مصلحتوں کے خوب
جاننے والے ہیں۔ حسن بصری اور قتادہ سے مروی ہے کہ یہ قبلہ متعین ہونے سے پہلے تھا ابتداء میں
اختیار تھا کہ جس سمت میں چاہیں نماز پڑھیں بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا مگر یہ قول ضعیف ہے اور نہ
روایات سے اس پر کوئی سند اور دلیل نہیں اور بعض کہتے ہیں کہ تحویل قبلہ کی تمہید ہے اور یہود و
نصاریٰ کا رد ہے کہ جو ہر ایک اپنے قبلہ کو بہتر جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مشرق اور مغرب

سبب اسی کا ہے جس جہت اور جس سمت کی طرف متوجہ ہونے کا حکم ہے وہی جہت قبلہ ہے اور آیت کریمہ اپنے عموم کی وجہ سے ان تمام صورتوں کو شامل ہے جو اسکے شان نزول میں مروی ہیں ۔ ابوبکر رازیؒ نے احکام القرآن میں اسی عموم کو اختیار فرمایا ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ لَّهٗ مَا

اور کہتے ہیں اللہ رکھتا ہے اولاد وہ سب سے پاک ہے بلکہ اسی کا ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ بَدِيْعُ

کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں سب اسکے آگے ادب سے ہیں نیا نکالنے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا

والا آسمان اور زمین کا اور جب حکم کرتا ہے ایک کام کو تو یہی

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾

کہتا ہے اس کو کہ ہو جا وہ ہو جاتا ہے

شناعت ستم ایضاً
باشتراک نصاریٰ و مشرکین

قال تعالیٰ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ... الی ... كُنْ فَيَكُوْنُ ۔
الغرض مساجد اللہ کو ویران کرنا بلاشبہ ظلم ہے مگر یہ ظالم اس سے بڑھ کر شرک کے ظلم عظیم میں مبتلا ہیں اور وہ ظلم عظیم یہ ہے کہ یہ ظالم یہ کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے اپنے لیے اولاد بنائی ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت عزیرؑ خدا کے بیٹے تھے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ خدا کے بیٹے تھے اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتلاتے ہیں۔ سبحان اللہ کیا احمقانہ اور گستاخانہ کلمہ ہے سب کو معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اولاد سے پاک اور منزہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا ہونا عقلاً ناممکن ہے اس لیے کہ بیٹا باپ کے مماثل اور مشابہ اور ہم جنس ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ

بے مثل اور بے چون و بیگون ہے ورنہ اگر بیٹا باپ کے ہم جنس نہ ہو تو پھر وہ بیٹا اس باپ کا فرزند نہ ہوگا نیز بیٹے کا باپ کے ہم جنس نہ ہونا ایک عیب ہے اور اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے۔ نیز باپ اولاد کا محتاج ہوتا ہے اور اولاد سے پہلے بیوی کا محتاج ہوتا ہے کہ اولاد بغیر زوجہ کے ممکن نہیں اور اللہ تعالیٰ صمد یعنی بے نیاز ہے کسی کا محتاج نہیں۔ نیز ولادت کے لیے تغیر اور تبدل اور تجزی اور انقسام لازم ہے اور یہ خاصہ ممکن اور حادث کا ہے۔ قدیم میں کوئی تغیر اور تبدل نہیں ہوتا۔ نیز اگر بالفرض خدا تعالیٰ کے لیے فرزند ہو تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا وہ فرزند بھی قدیم اور واجب الوجود ہوگا یا نہیں اگر وہ فرزند خدا ہوا تو لامحالہ مستقل ہوگا اور باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا اس لیے کہ خدائی کے لیے بے نیازی لازم ہے حالانکہ بیٹے کا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہونا عقلاً محال ہے بیٹے کا وجود ہی باپ سے ہوا ہے اور جب بیٹا خدا ہونے کی وجہ سے باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو پھر اسکو باپ سے کوئی تعلق بھی نہ رہیگا اور بیٹے کا باپ سے بے تعلق ہونا ناممکن ہے اس لیے کہ فرع کا اصل سے بے تعلق ہونا عقلاً محال ہے۔ علاوہ ازیں جب بیٹا باپ سے مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو باپ خدا نہ رہیگا اس لیے کہ خدا سے کوئی مستغنی نہیں ہو سکتا وہ خدا ہی کیا ہوا جس سے کوئی مستغنی اور بے نیاز ہو سکے اور اگر یہ کہو کہ وہ بیٹا خدا اور واجب الوجود نہیں تو لامحالہ وہ خدا کا پیدا کیا ہوا ہوگا اور اسکا عبد اور مملوک ہوگا لہٰذا فرزند کا عبد اور مملوک ہونا لازم آئیگا اور بیٹا عبد اور مملوک نہیں ہوتا جیسا کہ آئندہ آیت میں ارشاد ہے۔ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ـــ یعنی اسکے لیے کوئی اولاد نہیں بلکہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں خاص اسی کی مملوک ہیں اور ملکیت اور ابنیت جمع نہیں ہو سکتی اس لیے کہ یہ امر ظاہر ہے کہ مملوک اور مخلوق مالک اور خالق کے ہم جنس نہیں اور فرزند باپ کے ہم جنس ہوتا ہے اسی وجہ سے شریعت میں یہ مسئلہ ہے کہ جو شخص اپنے بیٹے یا کسی قریبی رشتہ دار کا مالک بن جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے اس لیے کہ فرزندیت اور عبدیت میں تباین کلی اور منافات تامہ ہے پس جبکہ مخلوق میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتی تو بارگاہ الوہیت میں یہ دونوں چیزیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں اور علاوہ مملوک ہونے کے آسمان و زمین کے رہنے والے تمام کے تمام جن میں فرشتے اور حضرت عزیر اور حضرت مسیح بھی داخل ہیں سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ بعضے برضا و رغبت جیسے فرشتے اور انبیاء کرام اور مؤمنین صالحین اور بعضے جبراً و قہراً جیسے شیاطین اور کفار و فجار۔ کسی کی مجال نہیں کہ اسکے ارادہ اور مشیت کو ٹال سکے اور اسکے حکم سے سرتابی کر سکے۔ اور کفار و فجار جو بظاہر اس کی معصیت کرتے ہیں وہ تکوینی اور باطنی طور پر اللہ ہی کے ارادہ اور مشیت سے کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے انکو معصیت کرنے کی قدرت دیدی ہے ورنہ اگر وہ قدرت نہ دیتا تو کوئی معصیت نہ کر سکتا۔ غرض یہ کہ تمام موجودات اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں جس کو چاہے مارے اور جسکو چاہے جلائے کوئی اسکے تصرف سے باہر نہیں نکل سکتا اور جس کی یہ شان ہو اس کا کوئی ہم جنس اور مماثل نہیں ہو سکتا۔ اور بیٹے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ باپ کے ہم جنس ہو اور ترکیب

نہیں کر سکتی۔ لَهُ قَانِتُونَ سے الزام مقصود ہو کہ جن کو تم خدا کا بیٹا اور اولاد کہتے ہو وہ سب اللہ کی عبودیت کے معترف اور مقر ہیں اور ہر وقت اسی کی تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں، پھر تم اُن کو خدا کی اولاد کس طرح بتلاتے ہو، نیز ولادت کے لیے ماں اور عورت اور آلات اور اسباب کی ضرورت ہے اور خدا کی شان یہ ہے کہ وہ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے۔ یعنی بغیر مادہ کے آسمان اور زمین کا موجد ہے۔ محض اپنی قدرت سے تمام کائنات کو پردۂ عدم سے نکال کر مسندِ وجود پر لا بٹھایا ہے، پس اگر حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کر دے تو اس کے لیے مشکل نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی ایجاد میں کسی مادہ اور مدت اور کسی آلہ اور سبب کا محتاج نہیں اس لیے کہ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کو کُنْ کا حکم دیتا ہے یعنی موجود ہو جا، پس وہ شئی فوراً موجود ہو جاتی ہے اور فرشتے اور حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ سب اسی طریقہ سے پیدا ہوئے اور ظاہر ہے کہ اس طریقہ سے پیدا ہونے کا نام کسی کے نزدیک ولادت نہیں پھر کیوں ان کو خدا کی اولاد بتاتے ہو۔ نیز عیسیٰ علیہ السلام میں یہ قدرت نہ تھی کہ وہ کلمۂ کُن سے کسی کو پیدا کر سکیں اور بقول نصاریٰ وہ تو اپنی جان بھی یہود کے ہاتھ سے نہ بچا سکے اور نہ دشمنوں پر غلبہ پا سکے تو پھر وہ خدا کیسے ہو گئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ یہود اور نصاریٰ اور مشرکین خدا تعالیٰ کے لیے اولاد تجویز کرتے تھے اول حق تعالیٰ نے سُبْحٰنَهٗ فرما کر اولاد سے پاکی اور تنزیہ بیان فرمایا اور بعد ازاں چند وجوہ سے اس کا رد فرمایا اوّل یہ کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے وہ سب اسکی ملک ہے اور اولاد ملک نہیں ہوتی دوم یہ کہ تمام کائنات اسکی تابعدار اور اسکے ارادہ اور مشیت کے مسخر ہے کائنات کے ہر ذرہ سے حدوث اور احتیاج کے آثار اور علامات نمایاں ہیں جو سراسر وجوب ذاتی کے منافی ہیں اور حادث اور ممکن واجب ذاتی کا بیٹا نہیں ہو سکتا لہٰذا کائنات میں سے کوئی شئے بھی خدا کی اولاد نہیں ہو سکتی اس لیے کہ اولاد اگرچہ باپ کے برابر نہ ہو لیکن ہم جنس ضرور ہوتی ہے اور کائنات کا کوئی ذرہ وجوب ذاتی میں باری تعالیٰ کا شریک اور ہمسر نہیں۔

اور اگر چاہو تو یوں کہو کہ لَهُ قَانِتُونَ کو جملہ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کا تتمہ اور تکملہ بنا دو تو اب دونوں جملے مل کر ایک ہی دلیل بن جائیں گے۔ علیحدہ علیحدہ دلیل نہ بنیں گے تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ہے یعنی اللہ تعالیٰ بغیر مادہ کے آسمان و زمین پیدا کرنے والے ہیں اور ولادت کے لیے مادہ اور مدت درکار ہے چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ کی ایجاد کا طریقہ یہ ہے کہ جس چیز کو کُن فرما دیتے ہیں وہ اسی وقت موجود ہو جاتی ہے اور اس کا نام ولادت نہیں یا یوں کہو کہ یہ تمام صفات کمال خداوند ذوالجلال کے ساتھ مختص ہیں کسی فرشتہ اور نبی میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ خدا کے سوا نہ کوئی آسمان اور زمین کے ذرہ کا مالک ہے اور نہ ایک پتھر کے پیدا کرنے کی ایجاد اور تخلیق پر قادر ہے پھر کس طرح خدا کے فرزند ہو گئے۔ یا یوں کہو کہ بیٹا ہمیشہ باپ کا جزء ہوتا ہے اور جزء

کسی مرکب کا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ترکیب سے پاک ہے۔

فائدہ نصاریٰ جب ان دلائل قاطعہ اور براہین ساطعہ کے جواب سے لاجواب ہو جاتے ہیں تو یہ جواب دیتے ہیں کہ ہماری مراد بیٹے سے حقیقی معنی نہیں بلکہ معنی مجازی مراد ہیں جیسے پیار اور محبت میں کسی کو بیٹا بول دیتے ہیں تو اس سے معنی حقیقی مراد نہیں ہوتے بلکہ محبوب اور برگزیدہ کے معنے مراد ہوتے ہیں اس معنی کر ہم حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔

جواب اگر ابن اللہ سے خدا کے محبوب اور برگزیدہ کے معنی مراد ہیں تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے تمام ہی انبیاء خدا کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ ابن اللہ کا اطلاق محبوب اور برگزیدہ کے معنی میں اگرچہ کفر و شرک نہیں لیکن کفر اور شرک کا ایہام اس میں ضرور ہے جیسے غیر اللہ کو سجدہ بہ نیت تعظیم و تحیت کفر نہیں بلکہ حرام ہے۔ اسی طرح شریعت محمدیہ میں سجدہ تحیت و تعظیم کی طرح اس لفظ کے اطلاق ہی کو ممنوع قرار دیا۔ بارگاہ خداوندی کے آداب کے خلاف ہے کہ زبان سے کوئی لفظ ایسا نکالا جائے جس میں خدا تعالیٰ کی تنزیہ و تقدیس کے خلاف کا ایہام بھی ہو۔ پادری صاحبان جب بالکل ہی لاچار ہو جاتے ہیں تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ مسئلہ اسرار الٰہی اور رموز خداوندی سے ہے ہم لوگ سمجھانے سے قاصر ہیں۔ لیکن اب اس صریح خلاف عقل عقیدہ کے ماننے والے بہت ہی کم رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پادریوں کے جن کو روٹی سے تنخواہ ملتی ہے وہ حضرت مسیح کو خدا اور خدا کا بیٹا جانتے ہیں۔ باقی یورپ اور امریکہ کے اکثر عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بندہ اور رسول سمجھنے لگے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن کریم کی ساڑھے تیرہ سو برس کی مسلسل پکار کے بعد اب عیسائیوں کی سمجھ میں آیا کہ الوہیت مسیح اور تثلیث کا عقیدہ عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔

عذر لنگ اور بعض متعصب عیسائی جو حضرات صوفیہ کرام کی کتابوں کا کچھ مطالعہ کئے ہوئے ہیں وہ اپنے اس عقیدہ ابنیت کی اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام کی صفات، صفات خداوندی کا عکس اور پرتو تھیں اور چونکہ اس قسم کا انعکاس سوائے حضرت مسیح کے کسی مخلوق میں نہیں ظاہر ہوا اور اس بارہ میں حضرت مسیح کا مرتبہ تمام مخلوق سے بالا اور برتر تھا اس لیے انکو خدا تعالیٰ سے ایسی نسبت ہے جو اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں اس نسبت کو ہم ابوت اور بنوت سے تعبیر کرتے ہیں اور مسیح کو ابن اللہ کہتے ہیں۔

جواب یہ محض ایک مغالطہ آمیز تاویل ہے جس کے تسلیم کر لینے کے بعد عیسائیوں کے پاس مسیح کی خصوصی ابن اللہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں رہتی حق تعالیٰ نے اپنے بہت سے برگزیدہ بندوں کو اپنے صفات جلال و جمال کا مظہر بنایا اور ان پر اپنی صفات کمال کا خاص عکس اور پرتو ڈالا جو اور کسی مخلوق پر نہیں ڈالا تو کیا ان حضرات کو بھی ابن اللہ کہنا جائز ہوگا۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ذات بابرکات بھی صفات خداوندی کا خاص مظہر اور آئینہ تھی

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ

اور کہنے لگے جن کو علم نہیں کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا

تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

ہم کو آوے کوئی آیت اسی طرح کہہ چکے ہیں ان سے اگلے

مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ

انہی کی سی بات ایک سے ہیں دل ان کے ہم نے بیان کر دیں نشانیاں

لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

واسطے ان لوگوں کے جنکو یقین ہے

شناعت سی و یکم (۳۱) ایضاً

باشتراکِ نصاریٰ و مشرکین

قال تعالیٰ . وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ... الیٰ ... لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ .

گزشتہ آیات میں ان کی توحید کا حال بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں نبوت کے بارہ میں ان کے شبہ کو بیان فرماتے ہیں اور یہ نادان یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بلا واسطہ کلام کیوں نہیں فرماتا کہ یہ خود بالمشافہ ہم سے کہہ دے کہ یہ ہمارے نبی اور رسول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو جائیں اور ان کی اطاعت کرنے لگیں یا اگر ہم سے کلام نہیں کرتے تو کم از کم من جانب اللہ ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی آجائے کہ جسے دیکھ کر ہم کو بداہۃً آپ کی نبوت کا یقین آجائے حق تعالیٰ فرماتے ہیں یہ کوئی نیا جاہلانہ سوال نہیں جو جاہل ان سے پہلے گزرے ہیں وہ بھی ایسی باتیں کہتے رہے ہیں اور یہی ان کے جاہل اور نادان ہونے کی دلیل ہے کہ باوجود اپنے کمال ناواقفی کے اپنے کو خدا تعالیٰ کی ہم کلامی کا اہل سمجھتے ہیں تم تو دنیاوی بادشاہوں اور امیروں کی ہم کلامی کا بھی رتبہ نہیں رکھتے اگر ہر شخص خدا کی ہم کلامی کا رتبہ رکھتا تو پھر انبیاء اور مرسلین کے بھیجنے کی ضرورت کیا تھی۔ کیا دنیا میں کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ میں وزیر کے حکم کو نہیں مانوں گا جب تک کہ بادشاہ خود بالمشافہ مجھ سے آکر یہ نہ کہہ دے کہ یہ میرا وزیر ہے تم اس

کی اطاعت کرنا اور یہ کہ ان کی یہ بات بالکل مہمل تھی اس لیے حق تعالیٰ نے اسکا کوئی جواب نہیں ارشاد فرمایا۔

؎ پس جواب احمق آمد سکوت

بلکہ اس جاہلانہ سوال کے منشا کو بیان فرمایا وہ یہ کہ ان اگلے اور پچھلے کافروں کے دل ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اس لیے ان پچھلے نادانوں کے شبہات پہلے نادانوں کے شبہات کے مشابہ ہیں۔ یعنی اس زمانہ کے کافر اگرچہ پہلے زمانہ کے کافروں سے بہت بعد ہیں اب آپس میں کوئی سلسلۂ وصیت بھی نہیں مگر قلوب سب کے ہم رنگ ہیں اسی وجہ سے شبہات میں بھی تشابہ اور ہم رنگی ہے اور آیات اللہ معجزات کے انکار میں ایک دوسرے کے قدم بقدم ہیں اور جن مانے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں سو اس کا جواب یہ ہے کہ تم اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ کہہ کر ایک نشانی مانگتے ہو، ایک نشانی نہیں تحقیق ہم آپکی نبوت و رسالت کی تصدیق کے لیے صدہا بلکہ ہزار واضح اور روشن نشانیاں ظاہر کر چکے ہیں مثلاً شجر اور حجر کا آپکو سلام کرنا اور جانوروں کا آپ کی نبوت کی شہادت دینا وغیرہ وغیرہ سو افسوس ان نادانوں کو ان روشن اور واضح معجزات سے کوئی نفع نہ ہوا۔ یہ آیات بینات ان لوگوں کے لیے نافع ہیں جو یقین اور اطمینان حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ضدی اور معاند نہیں۔

فائدہ تشبیہ اور تشابہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ مختلف المراتب ہوتے ہیں اور تشابہ میں دونوں فقط برابر اور مساوی ہوتے ہیں اسی وجہ سے جہاں مساوات کا بیان مقصود ہوتا ہے وہاں بجائے تشبیہ کے تشابہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ کما قال قائل ؎

رق الزجاج و رقت الخمر فتشابها و تشاكل الامر

فكانما خمر ولا قدح وكانما قدح ولا خمر

اسی طرح یہاں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ میں تشابہ کا لفظ اختیار فرمایا اس لیے کہ مقصود یہ بتلانا ہے کہ اگلے اور پچھلے کافروں کے دل یکساں ہیں کوئی فرق نہیں۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا

ہم نے تجھ کو بھیجا ہے ٹھیک بات لیکر خوشی اور ڈر سنانے کو اور تجھ

تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ

سے پوچھ نہیں دوزخ والوں کی اور ہرگز راضی نہ ہوں گے تجھ سے

الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ

یہودی اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو ان کے دین کا تو کہہ جو

هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

راہ اللہ دکھادے وہی راہ ہے اور کبھی تو پیروی ان کی

اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

خواہشوں کی کرے بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا

مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِیْنَ

تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنیوالا اور مددگار جن کو ہم

اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ

نے دی ہے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا

اُولٰٓىِٕكَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ

وہ اس پر یقین لاتے ہیں اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے سو

هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

وہی ہیں نقصان والے۔

خاتمہ کلام واتمام حجت و الزام وتسلیہ سیدالانام علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا .. الی .. فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔

(ربط) یہاں تک بنی اسرائیل کی قباحتوں اور شناعتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تب نبی اکرم ﷺ کی تفصیل کی ابتداء کفران نعمت اور وثارت اور نعمت سے فرمائی۔ کما قال تعالیٰ۔

وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ — اور یاد کرو جب تم نے کہا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز ایک کھانے پر صبر نہ کریں گے۔

اور پھر درمیان میں ان کی قساوتِ قلب کو ذکر فرمایا۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ

پھر سخت ہوگئے تمہارے دل اس کے بعد پس وہ پتھر کی مانند ہیں یا اس سے بھی زیادہ سخت۔

اور اس قبائح اور شنائع کے سلسلہ کو ان کے کبر و نخوت پر ختم فرمایا کہ اس قدر مغرور اور متکبر ہیں کہ اپنے کو خداوند ذوالجلال کی ہمکلامی کا اہل سمجھتے ہیں اور احکم الحاکمین کے فرستادوں یعنی انبیاء و مرسلین کے اتباع اور اطاعت کو اپنے لیے کسر شان سمجھتے ہیں سو ظاہر ہے کہ تکبر اور نخوت سے بڑھ کر کوئی مرض نہیں تکبر ہی تمام امراض کی جڑ ہے یہی مرض سب سے پہلے دنیا میں آیا اور یہی مرض ابلیس کی لعنت کا سبب بنا۔ اب ان قبائح اور شنائع کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتا ہے کہ اے ہمارے نبی آپ مغموم اور رنجیدہ نہ ہوں، ورنہ ایسے رشد و ہدایت کی طمع دل سے نکال دیجئے جن کے دل پتھر سے زیادہ سخت ہوں اور کبر اور نخوت سے لبریز ہوں۔ ان سے اسلام اور ایمان کی توقع نہ رکھیے حق ان پر واضح ہو چکا ہے۔ آپ کی نبوت و رسالت کے اتنے واضح اور روشن دلائل ہم نے واضح کر دیئے ہیں کہ جس کے بعد طالب حق کے لیے کسی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں اور علاوہ ازیں ہم نے آپ کو دین حق دے کر بھیجا ہے جو آپ کی نبوت کی مستقل اور روشن دلیل ہے اور ایسا ثابت اور یقینی ہے کہ جو موجب طمانیت و یقین ہے اور شکوک اور شبہات سے اس میں تزلزل کا امکان نہیں بالفرض اگر آپ سے کوئی بھی معجزہ ظاہر نہ ہوتا تو فقط آپ کا دین حق اور آپ کی شریعت حقہ ہی آپ کی نبوت کے ثابت کرنے کے لیے کافی اور وافی تھی نیز ہم نے آپ کو مخلوق کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے کہ ماننے والوں کو جنت کی بشارت سنائیں اور منکرین کو عذاب سے ڈرائیں اور پھر لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں اگر ایسے معجزات ظاہر کر دیئے جاتے کہ جن سے مجبور اور لاچار ہو کر ایمان لانا پڑے تو وہ ایمان بے سود ہے مکلف بنانے کا جو مقصد ہے وہ جبری ایمان کی صورت میں باقی نہیں رہتا اور اگر یہ بد نصیب اب بھی ایمان نہ لائیں اور آپ کی دعوت حقہ کو قبول نہ کریں تو آپ رنجیدہ نہ ہوں آپ نے اپنا فرض منصبی یعنی دعوت و تبلیغ ادا کر دیا آپ سے ان جہنمیوں کے بارہ میں کوئی باز پرس نہ ہوگی از خود انہوں نے کفر اور جہنم کی راہ اختیار کی ہے۔ اگر آپ کا اختیار چلتا تو کبھی ان کو جہنم کی راہ نہ چلنے دیتے اور ان لوگوں کا آپ کی پیروی اور اتباع سے اعراض اس لیے نہیں کہ آپ کے دلائل نبوت میں کسی قسم کا قصور ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ ہرگز آپ سے راضی اور خوش نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ ان کی مخصوص ملت کا اتباع اور پیروی نہ کریں وہ اس غرہ میں ہیں کہ ہم کتب الٰہیہ کے علوم کے حامل اور علمبردار ہیں ہم کسی کا کیوں اتباع کریں ہم تو سب کے متبوع اور سردار ہیں لہٰذا جو شخص اپنے آپ کو متبوع سمجھتا ہو وہ تابع بننے پر کیسے راضی ہو سکتا ہے آپ ان کے اس خیال خام کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تحقیق اللہ کی ہدایت ہر زمانہ میں وہی ہدایت ہے جو اس

زمانہ کا نبی اور رسول بن کر آئے اور گزشتہ ہدایتیں اگرچہ اپنے اپنے وقت پر ہدایتیں تھیں مگر منسوخ ہو جانے کے بعد وہ ہدایت نہیں رہتی بلکہ ہوائے نفس بن جاتی ہے اور نفسانی خواہشوں کا اتباع کبھی ہدایت نہیں ہو سکتا۔ وہ تو صریح ضلالت ہے اور اگر بالفرض محال آپ ان ہوا پرستوں کی نفسانی خواہشوں کا اتباع کرنے لگیں بعد اس کے کہ آپ کے پاس اس بات کا علم قطعی آ چکا ہے کہ اب ہدایت اسی میں منحصر ہے کہ جو اللہ نے آپ پر نازل فرمایا اور گزشتہ کی تمام ہدایتیں منسوخ ہو کر ہوائے نفس بن گئی ہیں۔ پس اگر آپ آخری حکم اور آخری ہدایت کو چھوڑ کر کسی پچھلی ہدایت اور کسی پہلے حکم کا اتباع کرنے لگیں تو اللہ کے مقابلہ میں کوئی آپکا حمایتی اور مددگار نہیں جو اللہ کے عذاب سے آپکو بچا سکے۔ حتیٰ کہ اگر آپ توریت اور انجیل پر عمل کریں تو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام بھی آپکی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ان بیچاروں کا تو ذکر ہی کیا۔

ف یہ تہدیدی خطاب بظاہر حضور کو ہے لیکن سنانا معاندین کو ہے۔ عناد کی بنا پر ان کو مخاطب بھی نہیں بنایا اور ان کے خطاب سے اعراض فرمایا۔

یہاں تک ان اہل کتاب کا ذکر تھا کہ جو برائے نام اہل کتاب ہیں اور فی الحقیقت اپنی کتاب پر ایمان نہیں رکھتے اور عناد اور تعصب کی وجہ سے حضور کی نبوت کی تصدیق نہیں کرتے۔ آئندہ آیت میں ان اہل کتاب کی مدح ہے جنہوں نے دل وجان سے حق کا اتباع کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں کو ہم نے کتاب یعنی توریت اور انجیل عطا کی اور ان کی صفت یہ ہے کہ وہ اس کتاب کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کی تلاوت کا حق ہے یعنی نہ اس میں لفظی تحریف کرتے ہیں اور نہ معنوی تحریف اور نبی آخر الزمان کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں آئی ہیں ان کو چھپاتے نہیں ایسے ہی لوگ حقیقۃً اپنی کتاب پر ایمان لاتے ہیں اور اپنی کتاب کی ہدایت اور بشارت کے مطابق نبی آخر الزمان کی تصدیق کرتے ہیں اور جو لوگ نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لاتے وہ درحقیقت اپنی اپنی کتاب پر بھی ایمان نہیں رکھتے۔ اور جائز ہے کہ یَتْلُوْنَهٗ میں بہ کی ضمیر بجائے کتاب کے ہدیٰ یا قرآن کی طرف راجع کی جائے یعنی جو لوگ توریت اور انجیل کی کما حقہ تلاوت کرتے ہیں وہی اس ہدایت کو قبول کرتے ہیں جو نبی آخر الزمانؐ پر نازل ہوئی اور وہی اس آخری کتاب پر ایمان لاتے ہیں جس کی بشارت اپنی کتابوں میں پاتے ہیں اور فلاح دارین حاصل کرتے ہیں اور جو لوگ اپنی کتاب کا انکار کرتے ہیں یعنی توریت اور انجیل میں تحریف کرتے ہیں اور حضور کے ظہور کی جو بشارتیں ان کی کتاب میں مذکور ہیں ان کا انکار کرتے ہیں۔ پس یہی لوگ خسارہ والے ہیں کہ اپنی کتاب پر جو ایمان رکھتے تھے وہ بھی ہاتھ سے گیا اور جائز ہے کہ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ میں بہ کی ضمیر ہدیٰ اور قرآن کی طرف راجع ہو یا حضور کی طرف راجع ہو یعنی جو لوگ حضور کی نبوت یا آپکی ہدایت یا آپکے قرآن کے منکر ہیں وہ انتہائی خسارہ میں ہیں اس لیے کہ حضور آخری نبی ہیں اور قرآن آخری کتاب ہے۔ جب اس پر بھی ایمان نہ لائے تو آخرت کی نجات کا ذریعہ ختم ہو گیا ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ جب جعفر بن ابی طالبؓ حبشہ سے آئے تو چالیس آدمی ان کے ہمراہ تھے جن میں بتیس حبشہ کے تھے اور آٹھ شام کے تھے اور بحیرا راہب

تکریر تذکیر و اعادۂ تحذیر

قال تعالیٰ۔ یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ ۔۔ الیٰ ۔۔ وَلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ۔

(ربط) ابتداء سورت میں جب بنی اسرائیل کو خطاب فرمایا تو اسی عنوان اور اسی آیت سے شروع فرمایا اور طویل تفصیل کے بعد پھر اسی عنوان اور اسی آیت پر خطاب کو ختم فرمایا وجہ اس کی یہ ہے کہ اولاً حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کو اجمالاً یاد دلایا تاکہ شکر نعمت اختیار کریں اور کفران نعمت سے احتراز کریں۔ بعد ازاں حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور اپنی عنایات اور ان کی جنایات اور تقصیرات کی تفصیل فرمائی جو یہاں آکر ختم ہوئی تو پھر حق تعالیٰ نے پھر اسی مضمون کا اعادہ فرمایا جو ابتداء میں اجمالاً ان سے کیا گیا تھا تاکہ تفصیل کے بعد جب اجمال کا اعادہ کیا جائے تو تمام تفصیل بیک وقت المخاطبین کے سامنے آجائے اور یہ طریقہ بلغاء کے نزدیک نہایت بلیغ ہے اور تعلیم و تفہیم میں نہایت درجہ معین ہے اور یہ جو فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو اس سورت میں تین مرتبہ یٰبنی اسرائیل کے معزز خطاب سے مخاطب فرمایا اور اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے کی حیثیت سے انکو اپنے خطاب سے مشرف اور سرفراز فرمایا اور اس نسبت کو یاد دلا کر شکر اور اطاعت کی دعوت دی لیکن بنی اسرائیل نے جب اس ندا اور خطاب کے شرف کو ملحوظ نہ رکھا تو حق تعالیٰ نے ان سے اعراض فرمایا اور تین مرتبہ کے بعد وہ کسی لقب سے نہیں پکارا چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل پھر ایکبار تم کو خطاب کرتے ہیں اور یہ تیسری بار ہے اب اسکے بعد تم کو مخاطب نہ بنائیں گے وہ آخری خطاب ہے کہ میری نعمتوں کو اس حیثیت سے یاد کرو کہ وہ میرا عطیہ تھیں میری نسبت کے شرف اور عزت کو دیکھو اور یاد کرو پھر اس حیثیت کو دیکھو کہ اس نعمت کا یہ ہے کہ تم پر محض اپنی مہربانی سے انعام کیا تھا۔ نہ یہ کہ تمہارا استحقاق تھا اور یاد کرو اس مرتبہ کو بھی کہ تم کو محض اپنے فضل سے سارے جہانوں پر فضیلت اور بزرگی دی تھی۔ یہ بزرگی میرا عطیہ تھا تمہاری ذاتی شئی نہ تھی کہ تم سے جدا نہ ہو سکے۔ تم اس غرہ میں نہ رہو کہ یہ بزرگی تم سے چھینی نہیں جا سکتی۔ اگر اس فضیلت اور بزرگی کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو میرے رسول کی اطاعت کرو اور اس دن سے ڈرو کہ جس میں کوئی کسی کی طرف سے کام نہ آئے گا اور ایک نفس کی دوسرے نفس کی طرف نسبت بدون ایمان کے کارآمد نہ ہوگی اور نہ اسکی طرف سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا کہ جو رہائی کا سبب بن سکے اور نہ بدون ایمان کے کوئی شفاعت اور سفارش نفع دے گی البتہ انبیاء اور اولیاء کی شفاعت سے اہل ایمان کو نفع ہوگا اور نہ ان لوگوں کی کوئی مدد کی جائے گی اس لیے کہ نصرت کا وعدہ صرف اہل ایمان اور اہل یقین سے کیا ہے کما قال تعالیٰ۔ اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ۔ کافروں سے وعدہ نہیں۔

اور نبی آخر الزمان کے ظہور اور بعثت کی دعا سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔ لہذا حضرت ابراہیم کے طریقہ پر وہی شخص ہو سکتا ہے جو ملت اسلام کو قبول کرے اور نبی آخر الزمان پر ایمان لائے اور نماز کعبہ کو اپنا قبلہ سمجھے۔ تحریف یہ کہ یہ خیال کرنا کہ نبی آخر الزمان ہمارے خاندان سے نہیں اس لیے ہم ان پر ایمان نہیں لائیں گے یہ خیال غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے ایک اسحٰق علیہ السلام جن کے بیٹے اسرائیل یعنی یعقوب علیہ السلام ہیں اور ابراہیم علیہ السلام کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام ہیں ایک مدت تک نبوت اور فضیلت حضرت اسحٰق اور اسرائیل کی اولاد میں رہی اب وہ فضیلت حضرت اسمٰعیل کی اولاد کو بخشی اور وہ نعمت تفضیل جس سے بنی اسرائیل کو سرفراز فرمایا تھا اب وہ بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہوئی اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے دونوں ہی بیٹوں کے لیے برکت کی دعا کی تھی جس طرح اسحٰق علیہ السلام اور ان کی اولاد کے لیے برکت کی دعا مانگی تھی اسی طرح اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے بھی برکت کی دعا مانگی تھی جیسے کہ توریت کے سفر پیدائش باب میں ہے۔

"اور اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا۔ انتہی۔

پس تم کو چاہیے کہ اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ جو ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ کی اولاد میں سے ہے اور اسکا ظہور اور اسکی بعثت دعاء ابراہیمی کی برکت اور ثمرہ ہے اور اس نبی پر ایمان لا کر امت مسلمہ میں داخل ہو جاؤ اور دل و جان سے اسکی اطاعت کرو تاکہ تم کو بقدر اطاعت اس برکت میں سے کچھ حصہ ملے۔ اور ابراہیم خلیل اللہ کی طرح اسلام اور طاعت اور وفاداری اور محبت اور جاں نثاری کا رنگ اپنے جسم پر لگاؤ یعنی ختنہ کراؤ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے ختنہ کرائی تھی۔ توریت میں ہے کہ ختنہ اللہ کا داغ ہے جس طرح شاہی گھوڑوں پر داغ ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل اور اسکی اولاد کے لیے ختنہ کا داغ مقرر فرمایا اور قوت شہوانیہ اور بہیمیہ کے محل پر ختنہ کے داغ سے اس طرف اشارہ ہے کہ یہ عضو اللہ کے داغ سے داغا ہوا ہے بغیر سرکاری اجازت کے کسی مصرف میں اسکا استعمال جائز نہیں اور مونچھ کے لب کٹوانا اور ناخن کٹوانا اور مونچھ کے بال لینا اور مضمضہ اور استنشاق کرنا وغیرہ وغیرہ یہ بھی اسلام یعنی خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے نشانات ہیں۔ لہذا اے بنی اسرائیل اگر تم نعمت تفضیل میں سے حصہ لینا چاہتے ہو تو اب اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ کہ جو بنی اسمٰعیل میں سے دعائے ابراہیمی کے مطابق مبعوث ہوا ہے بنی اسرائیل کی تفضیل کا دور دورہ ختم ہو گیا اب تا قیامت بنی اسمٰعیل کی تفضیل کا دور دورہ رہے گا جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے چند باتوں سے آزمایا۔ ابراہیم کی پرورش بلا واسطہ رب کریم کی طرف سے تربیت تھی۔ ابراہیم کے پروردگار نے ابتداء ہی سے ابراہیم کی خاص طرح سے تربیت کی۔ طفولیت میں رشد عطا کیا اور پھر مرتبہ نبوت و خلت تک پہنچایا۔ یہاں تک کہ بطور آزمائش انکو چند باتوں کا حکم دیا تاکہ ملائکہ علوی اور سفلی کے سامنے انکا فضل و کمال اور حسن استعداد اور کمال ثابت

اور اہلیت ظاہر ہو جائے اور یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ جو مرتبہ ہم ان کو عطا کرنا چاہتے ہیں یہ اس مرتبہ کے لائق اور اہل ہیں حق تعالیٰ شانہ کی یہ سنت مستمرہ ہے کہ محض اپنے علم کی بنا پر کسی کو منصب اور مرتبہ نہیں عطا فرماتے جب تک کہ اس کی استعداد اور قابلیت اور اس کا استحقاق علی رؤس الاشہاد ظاہر نہ ہو جائے جیسا کہ آدم علیہ السلام کے قصہ میں پیش آیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے فضل اور کمال اور استعداد قابلیت کے ظاہر کرنے کے لیے چند باتوں سے ان کا امتحان فرمایا پس ابراہیم دل وجان سے کمال مسرت وانشراح کے ساتھ بلا کسی ردوپیش کے ان تمام باتوں کو تمام وکمال بجا لائے جس سے ان کی قوت علمیہ اور عملیہ کا کمال اور روح اور قلب کی صفائی اور نورانیت اور ظاہر وباطن کی نہایت درجہ طاقت خوب واضح ہو گئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم میں تجھ کو اپنے علم میں تمام لوگوں کا امام اور پیشوا بناؤں گا کہ تمام لوگ تیری پیروی کریں اور تیرا اتباع ہدایت کی دلیل ہو اور تیری مخالفت گمراہی کی دلیل ہو اور تیری ذات تمام عالم کے لیے مقتدا ومرجع ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ پورا ہوا یہود اور نصاریٰ اور مشرکین عرب اور مسلمان سب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں۔ عرض کیا کہ اے پروردگار اور میری اولاد میں سے ہر زمانہ میں کوئی امام رہے زمین کسی وقت بھی میری نسل کی امامت سے خالی نہ رہے غرض یہ تھی کہ تو نے مجھ کو تمام لوگوں کا امام بنایا اور قیامت تک میری بقاء ممکن نہیں اس لیے بقاء امامت کی صورت یہ ہے کہ یہ منصب عظیم قیامت تک میری نسل میں باقی رہے اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ میں نے تمہاری یہ دعا قبول کی اور تمہاری ہی اولاد میں نبوت اور کتاب رہے گی جیسا کہ سورۂ عنکبوت میں ہے وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ مگر یہ بتلائے دیتا ہوں کہ یہ بشارت تم کو ممکن نہ ہو گی بعض زمانوں میں تمہاری تمام نسل اور اولاد ظالم ہو گی اور ظالموں اور فاسقوں کو منصب امامت نہیں دیا جاتا اس لیے کہ اس منصب کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے۔ اور اس وقت کے یہود اور نصاریٰ انواع واقسام ظلم کے مرتکب ہیں شرک اور گوسالہ پرستی اور تحریف تورات وانجیل اور قتل انبیاء اللہ وغیرہ وغیرہ میں مبتلا ہیں منصب امامت کی ان میں بالکل اہلیت نہیں اور جو شخص باوجود ظالم ہونے کے اپنا امام بنائے وہ خود ظالم ہے۔ کما قال تعالیٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ۔

فائدہ

جاننا چاہیے کہ ظلم اور فسق کے مقابلہ میں عدالت اور تقویٰ ہے نہ کہ عصمت یعنی عدم الخطاء فی العمد واقتراف صور معصیت اور امامت کے لیے عدالت اور تقویٰ شرط ہے نہ کہ عصمت۔ لہٰذا اس آیت سے فرقہ امامیہ کا عصمت ائمہ پر استدلال کرنا صحیح نہیں اور نہج البلاغہ میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے نص صریح موجود ہے۔ لا بد للناس من امیر بر او فاجر یعمل فی امرتہ المؤمن ویستمتع الکافر ویامن فیہ السبل۔ الخ

اقوال مفسرین در تفسیر کلمات ابتلاء

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جن کلمات سے اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا وہ حسب ذیل ہیں: (۱) اپنی قوم سے مفارقت کرنا اور برائت یعنی نمرود کی وجہ سے ان سے برائت اور بیزاری اور قطع تعلق کرنا (۲) خدا کے لیے مناظرہ (۳) آگ میں ڈالے جانے پر صبر کرنا (۴) وطن سے ہجرت کرنا اور تمام عشائر و اقارب کو چھوڑ کر نکل جانا (۵) مہمان نوازی (۶) ذبح ولد پر تیار ہو جانا۔ اخرجہ ابن اسحٰق و ابن ابی حاتم عن ابن عباس، درمنثور صفحہ ۱۱۱ جلد ۱ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت یہ ہے کہ وہ کلمات جن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو آزمایا وہ دس خصال فطرت ہیں۔ پانچ تو ان میں سے سر میں ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) مونچھیں کتروانا (۲) مضمضہ یعنی کلی کرنا (۳) استنشاق یعنی ناک میں پانی ڈالنا (۴) مسواک کرنا (۵) سر میں مانگ نکالنا اور پانچ خصلتیں باقی بدن کے متعلق ہیں اور وہ یہ ہیں۔

(۱) ناخن ترشوانا (۲) بغل کے بال لینا (۳) موئے زیر ناف مونڈنا (۴) ختنہ کرنا (۵) بول و براز کی جگہ کو پانی سے دھونا یعنی پانی سے استنجا کرنا اور ایک روایت میں [illegible] اخرجہ عبد بن حمید [illegible] کا ذکر ہے اور صحیح مسلم میں عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دس چیزیں فطرت سے ہیں۔

(۱) مونچھوں کا کتروانا اور (۲) ڈاڑھی کا بڑھانا اور (۳) مسواک کرنا اور (۴) ناک میں پانی ڈالنا اور (۵) ناخنوں کا کتروانا اور (۶) براجم یعنی جوڑوں کا دھونا اور (۷) بغل کے بال چننا اور (۸) موئے زیر ناف کا حلق کرنا اور (۹) پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتے ہیں کہ دسویں خصلت میں بھول گیا شاید وہ مضمضہ ہو۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت یہ ہے کہ کلمات سے وہ تیس خصلتیں مراد ہیں کہ جو شرائع اسلام اور سہام اسلام کے نام سے موسوم ہیں دس ان میں سے سورۂ برائت؎ میں مذکور ہیں توبہ۔ عبادت۔ حمد و ثنا۔ سیاحت۔ رکوع۔ سجود۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ حفاظت حدود۔ ایمان اور دس ان میں سے سورۂ

؎ خصال برائت کی آیت یہ ہے۔ التائبون العابدون الحامدون السائحون الراکعون الساجدون الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر والحافظون لحدود اللہ وبشر المؤمنین ۔

؎ سورۂ احزاب کی آیت یہ ہے۔ إن المسلمين والمسلمات والمؤمنين والمؤمنات والقانتين والقانتات والصادقين والصادقات والصابرين والصابرات والخاشعين والخاشعات والمتصدقين والمتصدقات والصائمين والصائمات والحافظين فروجهم والحافظات والذاكرين الله كثيرا والذاكرات ۔

احزاب میں مذکور ہیں۔ اسلام۔ ایمان۔ قنوت۔ صدق۔ صبر۔ خشوع۔ صدقہ۔ روزہ۔ حفاظت شرمگاہ کی حفاظت کثرت ذکر اور دس خصلتیں ان میں سے سورۂ مومنون اور سورۂ سائل میں مذکور ہیں: ایمان، یوم الجزاء، خوف و خشیت از عذاب خداوندی، خشوع نماز، محافظت آداب و سنن نماز، لغویات سے اعراض و احتراز، ادائے زکوٰۃ، طلب حلال، غیر منکوحہ اور غیر مملوکہ سے شرمگاہ کی حفاظت، ایفاء عہد، ادائے امانت، ادائے شہادت، کلمات کی تفسیر میں اس کے علاوہ اور بھی کچھ اقوال ہیں، جو تفسیر درمنثور کی مراجعت سے معلوم ہو سکتے ہیں اور آیت قرآنیہ میں لفظ کلمات سب کو شامل ہے جائز ہے کہ سب مراد ہوں یا بعض مراد ہوں لیکن ایک ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے مختلف روایات کا آنا اس سے عموم ہی معلوم ہوتا ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ
اور جب ٹھہرایا ہم نے یہ گھر کعبہ اجتماع کی جگہ لوگوں کی اور پناہ اور

وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا
کر رکھو جہاں کھڑا ہوا ابراہیم نماز کی جگہ اور کہہ دیا ہم

إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ
نے ابراہیم اور اسمٰعیل کو کہ پاک کر رکھو گھر میرا واسطے طواف والوں کے

له اور سورۂ مومنون کی آیت یہ ہے: قد افلح المؤمنون الذین هم فی صلاتهم خاشعون والذین هم عن اللغو معرضون والذین هم للزکوٰة فاعلون والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک هم العادون والذین هم لاماناتهم وعهدهم راعون والذین هم علی صلواتهم یحافظون۔ تے اور سورۂ سائل کی آیتیں یہ ہیں: الذین هم علی صلاتهم دائمون والذین فی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم والذین یصدقون بیوم الدین والذین هم من عذاب ربهم مشفقون ان عذاب ربهم غیر مامون والذین هم لفروجهم حافظون الا علی ازواجهم او ما ملکت ایمانهم فانهم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذلک فاولئک هم العادون والذین هم لاماناتهم وعهدهم راعون والذین هم بشهاداتهم قائمون والذین هم علی صلاتهم یحافظون۔ منہ

وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

اور اعتکاف والوں کے لیے اور رکوع اور سجدے والوں کے

تعمیر بنائے خانۂ تجلی آشیانہ و فضائل قبلۂ اسلام و تلقین حج بیت حرام

قال تعالیٰ. وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ ... الیٰ ... وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۔ گزشتہ آیات میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت اور فضیلت کو بیان فرمایا اور ظاہر ہے کہ منصب امامت اور امامت کا لقب صاحب قبلہ ہونے کی طرف مشیر ہے اس لیے آئندہ آیات میں قبلۂ ابراہیمی کا ذکر فرماتے ہیں کہ یہ خانۂ تجلی آشیانہ وہی گھر ہے جس کو ابراہیم علیہ السلام نے اسمٰعیل علیہ السلام کی شرکت اور معیت میں بنایا تھا اور اسی مسجد کے اندر حضرت اسمٰعیل اور ان کی ذریت کو آباد کیا اور طرح طرح کی دعائیں کیں اور مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل متنبہ ہو جائیں کہ یہ نبی امی خاندان ابراہیم و اسمٰعیل سے ہے اور یہ خانہ کعبہ جو مسلمانوں کا قبلہ ہے یہ وہی مسجد معظم اور بیت محترم ہے جس کے بانی اول معمار امام الامم اور فخر عالم ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور اسمٰعیل ذبیح اللہ ان کے معین و مددگار اور شریک کار رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس علم کے بعد بنی اسرائیل کو بنی اسمٰعیل کی تفضیل اور قبلۂ اسلام کی فضیلت میں کوئی تحیر نہ رہے گا اور اب شاید تحویل قبلہ کے بارے میں زبان طعن نہ کھولیں گے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے بنی اسرائیل یہ تو تم کو معلوم ہو گیا کہ منصب امامت ظالم اور فاسق کو نہیں ملتا۔ دینی منصب اسی کو ملتا ہے جو ابراہیم کے طریقہ پر چلے اور اگر تم کو خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کے حج مقرر کرنے میں شبہ ہے کہ حج بالکل ایک لغو حرکت ہے جو عرب کے جاہلوں کا طریقہ ہے حضرت ابراہیم کا طریقہ نہیں تو اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو مرجع خلائق بنایا کہ لوگ اطراف عالم سے لوٹ لوٹ کر بار بار اس گھر کی زیارت اور طواف کے لیے رجوع کریں تاکہ اہل زمانہ کے عظیم اجتماع سے ایک خاص نورانیت پیدا ہو جس سے ہر ایک مستفید ہو جس طرح بہت سے چراغوں کے جمع ہو جانے سے بہیئت اجتماعیہ ہر ایک کا نور اضعافاً مضاعفہ ہو جاتا ہے جمعہ اور پنجگانہ نماز جماعت میں ایک شہر اور ایک محلہ کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے اور حج کے اجتماع میں اقطار عالم کے انوار و برکات کا اجتماع ہوتا ہے۔

ف اور جائز ہے کہ مثابۃ کو بجائے ثوب بمعنی رجوع کے ثواب سے مشتق مانیں یعنی لوگوں کے لیے ثواب حاصل کرنے کی جگہ بنائی کہ حج اور عمرہ کر کے ثواب حاصل کریں۔ ایک نماز پڑھیں تو لاکھ نمازوں کا ثواب پائیں اور جماعت سے پڑھیں تو ستائیس لاکھ کا ثواب پائیں اور ہم نے اسی گھر کو خاص طور پر مقام امن بنایا کہ جو وہاں داخل ہو وہ امن سے ہو جائے اور ہم نے یہ حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور اس جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرو تاکہ برکت حاصل ہو۔

ف مقام ابراہیم ایک خاص پتھر کا نام ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کو بنایا اس پتھر پر حضرت ابراہیم کے قدموں کے نشانات تھے لوگوں کے ہاتھ پھیرنے کی وجہ سے وہ نشانات اب معلوم نہیں ہوتے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی اذان دی تھی کما قال تعالیٰ وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ الآیہ۔ اور یہ پتھر عہد نبوی اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خانہ کعبہ سے متصل تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بسبب سیلاب آنے کے پتھر بہہ گیا حضرت عمرؓ نے اس کو وہاں سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دیا اور اسکے گرد پتھر کی دیوار بنا دی چنانچہ وہ پتھر اب تک اسی جگہ میں محفوظ ہے اور اس کے ارد گرد جالیاں بنی ہوئی ہیں اور بنانے کعبہ کے وقت بھی ابراہیم اور اسمٰعیل کو حکم دیا جو مقتضا عہد کے تھا کہ میرے اس مبارک گھر کو ہر قسم کی ناپاکی سے پاک رکھنا طواف کرنے والوں کے لیے اور اعتکاف کرنے والوں کے لیے اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔ یعنی نماز پڑھنے والوں کے لیے اس کو پاک و صاف رکھنا۔

نکتہ طواف اور اعتکاف چونکہ دو علیحدہ علیحدہ عمل ہیں ایک دوسرے پر موقوف نہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو جدا جدا واؤ عاطفہ ذکر فرمایا اور رکوع اور سجود دونوں مل کر ایک عبادت ہیں الگ الگ عبادت نہیں اس لیے رکوع اور سجود کو بدون عطف ذکر فرمایا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا

اور جب کہا ابراہیم نے اے رب کر اس کو شہر امن کا

وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

اور روزی دے اسکے لوگوں کو میوے جو کوئی ان میں یقین لاوے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ

اللہ پر اور پچھلے دن پر فرمایا اور جو کوئی منکر ہے

فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ

اس کو بھی فائدہ دوں گا تھوڑے دنوں پھر اسکو قید کر بلاؤں گا دوزخ کے عذاب میں

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ؀

اور بری جگہ پہنچے

دعاء ابراہیم برائے حرم و ساکنان حرم

قال تعالیٰ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا ... الی ... وَبِئْسَ الْمَصِيرُ

(ربط) جب خانہ کعبہ کی فضیلت اور اس کا مسکن تعظیم اللہ اور مسجد ابراہیم ہونا بتلا چکے تو آئندہ اس شہر اور اس کے ساکنین کے حق میں حضرت ابراہیم کی دعائیں ذکر فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو کہ جب حضرت ابراہیم نے اللہ کے حکم سے خانہ کعبہ بنانے کا پختہ ارادہ فرمایا تو یہ دعا کی کہ اے پروردگار اس لق و دق جگہ کو آباد شہر اور جائے امن بنا دے کیونکہ زمین حرم کی بقا بدون شہر کی آبادی کے ممکن نہیں اور شہر کی آبادی بدون امن کے باقی نہیں رہ سکتی۔ بدامنی سے شہر ویران ہو جاتا ہے اور اس شہر کے ساکنین کو قسم قسم کے پھلوں اور میووں سے عطا فرما اس لیے کہ ساکنان شہر کی آبادی رزق پر موقوف ہے بغیر رزق کے کوئی باقی اور زندہ نہیں رہ سکتا اور رزق کی درخواست میں ظالموں اور نافرمانوں کے لیے نہیں کرتا بلکہ صرف ان لوگوں کے لیے رزق طلب کرتا ہوں جو اس شہر کے رہنے والوں میں سے اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ رزق کو امامت پر قیاس مت کرو۔ امامت ایک دینی منصب ہے ظالم اس کا مستحق اور اہل نہیں اور رزق دنیوی ایسی شیٔ ہے جو عام ہے میں رب العالمین ہوں سب کا رازق ہوں۔ مومن کو بھی قرابت سے رزق دوں گا اور کافر کو بھی دنیا میں رزق دوں گا۔ اور جو کفر کرے گا اس کو بھی چند روز یعنی تھوڑی مدت تک اس کو دنیاوی منافع سے متمتع اور بہرہ مند کرتا رہوں گا اور پھر اس کو لاچار اور بے بس بنا کر کشاں کشاں عذاب نار تک پہنچاؤں گا اور بے شک دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے دنیا میں کوئی مکان اگر ایک طرف سے برا ہوتا ہے تو دوسری طرف سے اچھا بھی ہوتا ہے لیکن وہ دوزخ ایسا مکان ہے جو کسی اعتبار سے بھی اچھا نہیں ہر طرح سے برا ہی برا ہے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ
اور جب اٹھانے لگا ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور
إِسْمٰعِيلُ ۚ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ
اسمعیل اے رب ہمارے قبول کر ہم سے تو ہی ہے سنتا
الْعَلِيمُ ﴿١٢٧﴾
جانتا

دعاء ابراہیم و اسمٰعیل برائے قبولیت خدمت تعمیر بیت اللہ

قال تعالیٰ۔ وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ ... إلى ... أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

اور اس وقت کو بھی یاد کرو کہ جب ابراہیم خود اپنے ہاتھ سے اس گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے یعنی اس پر تعمیر کر رہے تھے۔ وہ دیوار بھی چنتے جاتے تھے اور اسی طرح اسمٰعیل بھی ان کے ساتھ بلند کرنے میں مشغول تھے۔ اور یہ دونوں بزرگ اس وقت نہایت عجز و انکساری کے ساتھ یہ کہتے جاتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار اپنے فضل سے ہماری اس محنت اور خدمت کو قبول فرما تحقیق تو ہی ہماری دعاؤں کو سننے والا ہے اور تو ہی ہماری نیت اور ہمارے ذوق و شوق کو جاننے والا ہے محض اپنے لطف و عنایت سے اپنے عاشقان بے نوا خاکساروں کی اس سعی کو مشکور فرما۔

ف (۱) قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ جو چیز لائق پذیرائی ہو۔ وہاں لفظ قبول استعمال کرتے ہیں اور جو چیز ناقص ہو اور قابل پذیرائی نہ ہو وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں اس لیے کہ لفظ تقبل باب تفعل سے ہونے کی وجہ سے تکلف پر دلالت کرتا ہے اور تکلف قبول اس بات کو مقتضی ہے کہ وہ چیز لائق قبول نہ ہو۔ پس اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال۔ غایت عجز اور کمال تواضع پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی ہمارا عمل اس قابل نہیں کہ مقبول ہو لیکن اگر تیرے لطف و عنایت اور فضل و رحمت سے قبول ہو جائے تو یہ تیرا محض جود و کرم ہے۔ ع

گرچہ یہ حرمت نہ میرا قابل منظور ہے ۔۔۔ پر جو ہو منظور کیا رحمت سے تیری دور ہے

اور اگر بالفرض کوئی عمل قابل قبول بھی ہو تب بھی حق تعالیٰ کے ذمہ اس کا قبول کرنا واجب نہیں اس لیے کہ قبولیت کے لیے مستقل درخواست چاہیے۔ اہل سنت والجماعت کا یہی مذہب ہے معتزلہ کے نزدیک ایسے عمل کو قبول کرنا خدا کے ذمہ واجب ہے۔ معتزلہ نے جب بندہ کے افعال اختیاریہ کو بندہ کا مخلوق اور مملوک قرار دیا تو خالق کے ذمہ ان کو قبول کرنا اور ان پر ثواب دینا واجب گردانا اور اپنی نادانی سے یہ نہ سمجھے کہ جس واجب الوجود پر کسی کو وجوب نہیں چلتا اور نہ اس پر کسی کا حق ہے اور خدا تعالیٰ کے سوا کون ہے جو اس پر کوئی حق لازم اور واجب کر سکے۔

ف (۲) جاننا چاہیے کہ بارگاہ خداوندی میں وہی عبادت اور خدمت مقبول ہے کہ جس کو کرنے والا دل و جان سے قابل قبول نہ سمجھے اور کرنے والے کی نظر اپنے عمل پر نہ ہو بلکہ اس کے لطف اور فضل پر ہو۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ

اے رب ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری

ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۖ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا

اولاد میں بھی ایک امت فرمانبردار اپنی اور بتلا ہم کو دستور حج کرنے کے

وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٢٨﴾

اور ہم کو معاف کر تو ہی ہے اصل معاف کرنے والا مہربان

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا

اے رب ہمارے اور اٹھا ان میں ایک رسول انہیں میں کا پڑھے ان

عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

پر تیری آیتیں اور سکھاوے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں

وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اور ان کو سنوارے تو ہی ہے اصل زبردست حکمت والا

دعاءِ ابراہیمی برائے وجود امتِ مسلمہ وقوم مسلمانان وظہور رسول محترم از ساکنان حرم کہ صاحب قرآن وخاتم پیغمبران باشد

قال تعالیٰ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ... الیٰ ۔ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔

(ربط) ان دونوں بزرگوں نے اپنی فراست خداداد اور انوار نبوت سے دیکھا کہ جب ہم کو ایسے ممتاز تجلی آشیانہ کی تعمیر کا حکم ہوا ہے تو ضرور اسکے تمر تک کسی ایسی عبادت کا بھی حکم ہونے والا ہے جو عشق و محبت کا رنگ لیے ہوئے ہو۔ اور ان عبادتوں کا بجا لانے والا صورۃً اگرچہ انسان ہوگا مگر معنیً ہمہ تن عاشق ہوگا گویا کہ دربار خداوندی کا معاینہ اور مشاہدہ کر رہا ہے اور جس امت کے لیے اس گھر کو قبلہ بنایا جائے

تو اس کو ایسے جدید وضع کے احکام دیئے جائیں گے جنکے اسرار و حکم ظاہر نظر میں جلوہ گر نہ ہونگے تو ظاہر پرست
آنکھ صورت پرستی پر محمول کریں گے اس لیے ان دونوں بزرگوں کو اندیشہ ہوا کہ مبادا ہماری ذریت اولاد در اولاد
ان جدید وضع کے احکام کے نزول پر ان کے قبول میں کسی قسم کا توقف اور تردد کرے اس لیے جناب الٰہی میں
یہی دعائیں فرمائیں وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ۔ اے اللہ ہم کو اپنا مسلم اور حکم بردار
بندہ بنا۔ دوسری دعا یہ فرمائی کہ اے اللہ ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ پیدا فرما یعنی ایسی امت اور
ایسی قوم پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور نام بھی اس قوم کا مسلم اور مسلمان ہو یعنی صفت بھی اس کی اسلام یعنی
اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ہو اور اس کا نام بھی اسلام سے پکاری جاتی ہو۔

تیسری دعا یہ فرمائی کہ اس امت مسلمہ میں ایک عظیم الشان رسول بھیج اور اس پر ایک عظیم الشان
کتاب نازل فرما یعنی قرآن کریم اور پھر وہ رسول اس امت کو کتاب و سنت کی تعلیم دے حضرت ابراہیم علیہ
السلام نے ان دعاؤں میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ یہ خانہ کعبہ آخری امت کا قبلہ ہوگا اس امت
کا نام امت مسلمہ ہوگا جیسا کہ سورۂ حج میں ہے ھُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ اور ملت اسلام اس کی ملت
مذہب ہوگا اور وہ عظیم الشان رسول جو ان میں مبعوث ہوگا وہ ساکنان حرم اور اسمٰعیل کی ذریت سے ہوگا
اللہ تعالیٰ نے ان کی دعائیں قبول فرمائیں اور بذریعہ وحی کے بتلا دیا کہ جس اولوالعزم رسول کے پیدا ہونے کی
تم دعا کر رہے ہو وہ آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور خاتم الانبیاء والمرسلین ہوگا اور ملت ابراہیمی کا متبع ہوگا اور اس
کی امت کا نام امت مسلمہ ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے بارگاہِ خداوندی میں بصد عجز و نیاز یہ عرض کیا کہ اے
ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا خاص اطاعت شعار اور فرمانبردار بنا کہ ہمارا ظاہر و باطن تیرے لیے مخصوص
ہو جائے کہ اس میں تیرے سوا کسی اور کی گنجائش نہ رہے اور ہماری ذریت میں ایک امت مسلمہ یعنی
ایک ایسی جماعت پیدا فرما کہ جو دل و جان سے تیری حکم بردار ہو اور قلب اس کا سلیم ہو اور مسلمان اس کی
زبان اور ہاتھ سے سالم اور محفوظ رہیں اور جب تو ان کو اپنے دربار کی حاضری کا حکم دے تو مجنونانہ اور
عاشقانہ وضع کے ساتھ برہنہ سر لبیک کہتے ہوئے تیرے در دولت پر حاضر ہو جائیں اور اے پروردگار ہم
کو ہماری عبادت اور دربار کی حاضری یعنی حج اور طواف کے مواقع بھی دکھلا دیجیے اور ان کے احکام اور آداب
بھی ہم کو بتلا دیجیے تاکہ آداب عبودیت اور آداب دربار میں ہم سے کوئی تقصیر نہ ہو جائے اور اے پروردگار
آخر ہم بشر ہیں سہو اور نسیان سے مرکب ہیں ہم سے اگر آداب دربار میں کوئی سہو اور تقصیر ہو جائے تو
ہم پر توجہ اور عنایت فرمانا اور ہماری تقصیر سے درگزر فرمانا بے شک آپ ہی بڑی توجہ اور عنایت فرمانے
والے اور مہربانی کرنے والے ہیں اور ہم تو ایک عظیم امت کا باوجود اختلاف آراء و ذہنوں کے ایک مسلک
اور ایک طریق پر مجتمع کسی مربی کے قائم رہنا عادۃً محال ہے اس لیے جناب الٰہی میں یہ عرض معروض کی
کہ اے ہمارے پروردگار ان ساکنان حرم میں ایک عظیم الشان رسول بھیج جو اس امت مسلمہ کو اسلام کا طریقہ
بتلائے اور وہ رسول ہم دونوں کی ذریت اور اولاد سے خارج نہ ہو بلکہ انہی میں سے ہو تاکہ دنیا اور آخرت

ہمیشہ ہمارے لیے عزت اور شرف کا موجب ہو اور اس طرح قیامت تک میری امامت باقی رہے اس لیے کہ میری اولاد کی امامت میری ہی امامت ہے۔ علاوہ ازیں جب وہ رسول انہی میں سے ہوگا تو لوگ اس کے مولد اور منشا سے اور اس کے حسب اور نسب اور اس کی امانت اور دیانت اور اخلاق اور اس کی صورت اور سیرت سے بخوبی واقف ہوں گے اور اس کے اتباع سے عار نہ کریں گے اور جب حق قرابت و مناسبت کے ساتھ قرابت کی محبت اور شفقت بھی مل جائے گی تو اس رسول کی اعانت اور نصرت و حمایت اور اس کی شریعت کی ترویج اور اشاعت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے اس نبی کو اپنا سمجھ کر معاملہ کریں گے۔ اجنبی اور غیر کا معاملہ نہ کریں گے۔ اور رسول ایسا ہو کہ اس پر ایسی جامع کتاب نازل ہو کہ اولین اور آخرین میں اس کی نظیر نہ ہو اور پھر وہ رسول تیری اس کتاب کی آیتیں پڑھ کر ان کو سنائے اس لیے کہ آیات کا پڑھ کر سنانا بغیر نزول کتاب کے ناممکن ہے۔ اور بعد ازاں وہ رسول ان کو اس کتاب کے معانی سکھلائے اور اس کے اسرار و حکم سے بھی آگاہ کرے تاکہ علم ظاہر اور علم باطن دونوں جمع ہو جائیں۔ تلاوت سے کتاب کے الفاظ اور کلمات کا علم ہوگا اور تعلیم و تفہیم سے اس کتاب کے معانی اور حقائق اور معارف معلوم ہوں گے۔ حفاظ قرآن اور قراء اور مجوّدین کے سینے اور زبانیں اس کتاب الٰہی کے الفاظ کی حفاظت کریں گی اور علماء ربانیین اور راسخین فی العلم کے دماغ اور قلم اس کتاب کے معانی کی حفاظت کریں گے کہ کوئی ملحد اور زندیق اس میں کسی قسم کی معنوی تحریف بھی نہ کر سکے۔ اور وہ رسول اپنی ظاہری تعلیم و تربیت اور باطنی فیض صحبت سے اُن کے دلوں کو گناہوں کے زنگ اور کدورت سے پاک و صاف کر کے مثل آئینہ کے چمکتے اور صیقل بنا دے کہ انوار و تجلیات کا عکس قبول کرنے لگیں اور حدیث میں جو العلماء ورثۃ الانبیاء آیا ہے اس کا صحیح مصداق وہی علماء ربانیین ہیں جو کتاب و سنت کی تعلیم کے ساتھ زنگ آلود نفوس کو صیقل کر کے مثل آئینہ کے بنا دیتے ہوں۔ بے شک تو ہی نہایت عزت والا اور نہایت حکمت والا ہے تو بالخصوص اس پر قادر ہے کہ تو ہماری اولاد میں ایسا عظیم الشان رسول بھیج کر لوگوں پر احسان فرمائے اور اس کو ایسی جامع کتاب اور جامع شریعت اور کامل دین عطا فرمائے کہ اس کے بعد تا قیامت کسی نبی اور رسول کی ضرورت باقی نہ رہے فقط گاہ بگاہ اس کی تجدید کافی ہو جایا کرے تفسیر ابن کثیر میں ابو العالیہ سے منقول ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب آیا۔

قد استجيب لك وهو كائن في آخر الزمان۔ (تفسیر ابن کثیر)

تمہاری دعا قبول ہوئی اس شان کا نبی آخر زمانہ میں ظاہر ہوگا اور یہی قتادہ اور سدی سے منقول ہے۔

اور اس آیت میں جو سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرأت ہے وہ بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ یہی خاتم الانبیاء ہوگا۔

وقرأ أبيّ وابعث في آخرهم رسولا۔ (روح المعانی ص ۳۴۲ ج ۱)

یعنی ابی بن کعبؓ کی قرأت میں ہے وابعث فی آخرہم رسولا۔

لطائف ومعارف

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام اگرچہ کبائر اور صغائر سب سے معصوم ہوتے ہیں مگر خداوند ذوالجلال کی عظمت اور جلال سے ہر وقت لرزاں اور ترساں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ حق ربوبیت اور حق عبودیت کسی سے ادا نہیں ہو سکتا اور جانتے ہیں کہ جو حق واجب تھا وہ ہم سے ادا نہ ہو سکا اس لئے بصد خشوع و خضوع خداتعالیٰ کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بار الٰہا تو ہمارے عجز اور قصور کو جانتا ہے ہمیں معاف کر اور تیرے حقوق میں ہم سے جو تقصیر ہوئی ہیں ان سے درگزر کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ کہنا اسی قبیل سے تھا دنیا کے بادشاہوں اور امراء کے خواص اور مقربین کے تعلقات پر نظر کرو عام رعایا کے لئے ایک عام قانون ہوتا ہے اور جس کی پابندی ان کے لئے کافی ہوتی ہے مگر خواص مقربین کے لئے ایک خاص قانون اور خاص بندشیں اور خاص ہدایتیں ہوتی ہیں۔

ع مرسیاست ذہب ونا دیگر اند

خواص اور مقربین ہر وقت اپنے آقا اور ولی نعمت کے خوش رکھنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

یہی حال بلکہ اس سے ہزار درجہ بڑھ کر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو خداوند ذوالجلال کے ساتھ ہے اگرچہ خود تو اسے کے بیچے عاشقانِ باوفا اور محبانِ باصفا اپنے محبوب حقیقی کے خوش رکھنے کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے لیکن اللہ جیسے محبوب برحق کے حقوق کوئی کیا ادا کر سکتا ہے اس لئے حضرات انبیاء بصد عجز و نیاز بارگاہ خداوندی میں یہ عرض کرتے ہیں وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ بار خدایا ہم سے تیرے حقوق اور واجبات کے ادا کرنے میں تقصیر ہوئی ہم اپنے عجز اور ناتوانی کی وجہ سے تیرا حق ادا نہیں کر سکے تو ہم پر رحم فرما اور ہماری تقصیروں سے درگزر فرما۔

یہ تو حضرات انبیاء کرام کی توبہ اور اس آیت کی عام وجہ تھی جو بیان ہوئی لیکن ابراہیم علیہ السلام کی وَتُبْ عَلَيْنَا کی ایک خاص وجہ اور بھی ہے وہ یہ کہ آپ نے یہ دعا صرف اپنے لئے اور اپنے فرزند اسمعیل علیہ السلام ہی کے لئے نہیں فرمائی تھی بلکہ اپنی تمام ذریت کو جو ہونے والی تھی اس کو بھی اس دعا میں شامل کر لیا تھا اس لئے یہ دعا بحیثیت مجموعی سب کے حق میں ہوئی جیسا کہ آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَن سَفِهَ

اور کون ہے جو نہ پسند کرے دین ابراہیم کا مگر جو بیوقوف ہو

نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ

اپنے ہی سے اور ہم نے اس کو خاص کیا دنیا میں اور وہ

فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ

آخرت میں نیک ہے جب اس کو کہا اس

رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

کے رب نے حکم بردار ہو بولا میں حکم میں آیا جہان کے صاحب کے

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِيَّ

اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب اے بیٹو

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا

اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین پھر تم نہ مرنا مگر

وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ

مسلمان ہو کیا تم حاضر تھے جس وقت

حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا

پہنچی یعقوب کو موت جب کہا اپنے بیٹوں کو تم

تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ

کیا پوجو گے بعد میرے بولے ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی

اِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا

اور تیرے باپ دادوں کے رب کی ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کی وہی ایک

وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ تِلْكَ اُمَّةٌ

رب ہے اور ہم اسی کے حکم پر ہیں وہ ایک جماعت

قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ

تھی گزر گئی ان کا ہے جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ

وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کام کی۔

ترغیب وتاکید اتباع ملت ابراہیمی کہ عین توحید و عین ملت اسلام است وفضائل ملت اسلام

قال تعالیٰ۔ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ ... الیٰ ... وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔

گزشتہ آیات میں اجمالاً حضرت ابراہیم کی ملت کی طرف اشارہ تھا کیونکہ حضرت ابراہیم کی اس دعا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ اور وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ کو حضرت ابراہیم نے اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے پسند کیا اور اس کی دعا کی وہ طریقہ۔ طریقہ اسلام ہے۔ اب آئندہ آیات میں اس کی تفصیل فرماتے ہیں کہ وہ ملت ابراہیم عین توحید اور عین اسلام ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ احکام خداوندی کی دل و جان سے بے چون وچرا اطاعت کرنا اپنے آپ کو خدا کے حوالے اور سپرد کر دینا آخیر پارہ تک اسی ملت اسلام کے فضائل اور اسی کے اتباع کی ترغیب میں کلام چلا گیا ہے جس سے یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب کا رد کرنا مقصود ہے کہ یہ سب حضرت ابراہیم کو اپنا امام اور پیشوا مانتے ہیں اور پھر ان کے خلاف طریقہ پر چل رہے ہیں حالانکہ اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی حضرت ابراہیم اور اسمٰعیل نے اپنے لیے دعا مانگی اور اسی کی وصیت کی اور اسی طرح حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ وہ کون شخص ہے کہ جو ابراہیم کی ملت سے عدول اور انحراف کرے حالانکہ وہ ملت تمام ملتوں سے افضل اور بہتر ہے اور صاحب ملت لوگوں کا امام اور پیشوا ہے اور سب سے پہلے اسی نے نہایت تضرع اور زاری سے امت مسلمہ کے وجود اور نبی آخر الزمان کے ظہور کی دعا مانگی کہ جو امت مسلمہ اور اسلام کا طریقہ تو ایسی بہتر ملت کے اتباع سے کون اعراض اور انحراف کر سکتا ہے مگر وہی شخص کہ جو اپنے ہی نفس سے جاہل اور نادان ہو کہ یہ نہ سمجھتا ہو کہ کون سی ملت فطرت سلیمہ کے مناسب ہے اور کون سی غیر مناسب اور کون سی ملت روح اور قلب کے لیے نافع ہے اور کون سی مضر۔ اور کس ملت کے قبول کرنے سے نفس

سکے لیے کمالات کا دروازہ کھلتا ہے اور کس صفت سے کمالات کا دروازہ بند ہوتا ہے اگر یہ سفیہ اپنے نفس سے بے خبر نہ ہوتا تو ملت ابراہیمی سے اعراض نہ کرتا اور البتہ تحقیق ہم نے ابراہیم کو دنیا میں برگزیدہ بنایا اور اپنے مقبول بندوں میں سے اس کو منتخب کیا اور تمام کمالات روحانیہ سے اس کو مکمل کیا یعنی نبوت و رسالت اور ولایت و امامت ان کو عطا کی اور خلعت کا خلعت ان کو پہنایا اور جو معبد انہوں نے تعمیر کیا اس کو قبلۂ عالم بنایا اور تحقیق آخرت میں وہ صالحین اور نیکو کاروں میں سے ہیں صلاح۔ فساد اور خلل کی ضد ہے۔ اور فساد اور خلل معصیت اور غفلت سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر صلاح کے یہ معنی ہونگے کہ ان کا ظاہر و باطن ہر قسم کے فساد اور خلل سے بالکل پاک ہے اور اس جگہ صلاح سے صلاح کامل مراد ہے اور یہ آیت ماقبل کی دلیل ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص خدا کا برگزیدہ اور منتخب بندہ ہو اور صلاح کامل کے ساتھ موصوف ہو اس کے طریقہ سے سوائے نادان کے کون اعراض کریگا۔ آئندہ آیت میں اس صفت کی تعیین فرماتے ہیں کہ وہ کیا ہے۔ یعنی اسلام ہے جبکہ یہی اسلام انکے برگزیدہ اور امام ہونے کا سبب ہے جبکہ ان سے پروردگار نے کہا کہ اے ابراہیم اسلام اختیار کرو اور مسلم بن جاؤ یعنی اپنے آپ کو اللہ کے حوالے اور سپرد کردے اور اپنی خواہش اور ارادہ کو اس کی رضا اور خوشنودی میں فنا کردے ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں نے اسلام اختیار کیا اور میں نے اپنے تمام کام رب العالمین کے سپرد کردیئے اور اپنے نفس کو درمیان سے بالکل نکال لیا۔ ع

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حساب کم و بیش را

اب اس میں تعیین ہوگئی کہ وہ صفت کیا ہے یعنی اسلام ہے جو تمام کمالات کا تخم اور تمام فضائل کی اصل ہے اخیر پارہ تک اسی اسلام کی فضیلت میں کلام چلا گیا۔

اور جب تک ابراہیم علیہ السلام زندہ رہے اسی ملت پر قائم رہے اور جب وصال کا وقت آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے سب بیٹوں کو جمع کرکے اسی ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی جن میں حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق بھی تھے۔ اور پھر اسی طرح اسحٰق علیہ السلام کے بیٹے یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا اے میرے بیٹو تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یہ دین اسلام پسند کیا ہے اسکے سوا کوئی دین مقبول نہیں پس تم ہرگز نہ مرنا مگر اسی حالت میں کہ تم اسلام پر پختہ اور قائم ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت اور نصرانیت کی وصیت نہیں کی بلکہ ملت اسلام پر قائم رہنے کی وصیت کی۔ پس اے اہل کتاب تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ یعقوب علیہ السلام نے وفات کے وقت یہودیت کی وصیت کی تھی اس کی نہ کوئی سند ہے اور نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی مشاہدہ۔ کیا تم اس وقت حاضر تھے جس وقت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا کہ بتلاؤ میرے بعد کس چیز کی عبادت کروگے۔ سب نے بالاتفاق یہ جواب دیا کہ ہم صرف اسی ایک خدا کی عبادت کرینگے جس کی آپ اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق عبادت کرتے آئے یعنی ایک خدا کی عبادت

کریں گے اور ہم سب اسی ایک خدا کی طاعت اور فرمانبرداری پر قائم رہیں گے۔ غرض یہ کہ یہود کا یہ دعویٰ کہ یعقوب علیہ السلام نے یہودیت کی وصیت کی تھی محض افتراء ہے جس کی کوئی سند ہے اور نہ تمہارا مشاہدہ۔

اے اہل کتاب اگرچہ تم ان بزرگوں کی اولاد ہو اور تم اس نسبت پر فخر اور ناز کرتے ہو لیکن یہ تو خدا کے برگزیدہ بندوں کی ایک جماعت تھی جو گزر گئی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تم کو وصیت کر گئی اس جماعت کے لیے وہ اعمال کام آئیں گے جو اس نے کیے اور تمہارے لیے تمہارے اعمال کام آئیں گے اور محض آباء و اجداد کے بزرگوں کا انتساب تم کو نفع نہیں دے گا اور اگر بالفرض وہ جیسے عمل کرتے تھے تو تم سے ان کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا ہر شخص سے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ غرض یہ کہ اجداد نے اگر کوئی گناہ کیا ہے تو تم سے اس کی باز پرس نہ ہوگی اور اگر انہوں نے نیک عمل کیے ہیں تو تم کو کوئی نفع نہیں۔ باپ کا کھانا اور پینا بیٹے کی بھوک اور پیاس کو دفع نہیں کر سکتا جب تک بیٹا خود نہ کھائے اور نہ پیئے۔

ع بندگی باید و پیمبر زادگی درکار نیست

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ
اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہود یا نصاریٰ تو راہ پر آؤ

قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ
تو کہہ نہیں بلکہ ہم نے پکڑی راہ ابراہیم کی جو ایک طرف کا تھا اور نہ تھا شریک

الْمُشْرِكِينَ ﴿١٣٥﴾
والوں میں

یہودیت اور نصرانیت کی طرف دعوت دینے والوں کو جواب

قال تعالیٰ۔ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا ... الیٰ ... وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ اور عجب ہے کہ یہ اہل کتاب حضرت ابراہیم کو اپنا امام اور پیشوا بھی کہتے ہیں مگر ان کے اتباع اور ان کے طریقہ پر چلنے کو سبب ہدایت نہیں سمجھتے بلکہ باعث ضلالت جانتے ہیں۔

اور یہ کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پا جاؤ گے اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ ہم یہودی یا نصرانی نہیں بنتے بلکہ ہم تو ملت ابراہیمی پر قائم رہیں گے اور ابراہیم ہی کے طریقہ پر اور مسلک پر چلیں گے جس میں ذرہ برابر بھی کجی نہ تھی وہ تو ماسوی اللہ کو چھوڑ کر اللہ کی طرف مائل تھے اور وہ کبھی مشرکین میں سے نہیں ہوئے نہ قبل نبوت ورنہ بعد نبوت اور تم باوجود دعوائے اتباع ابراہیمی کے مدعی ہونے کے کفر اور شرک میں مبتلا ہو۔

سلسلۂ کلام نہایت خوبی کے ساتھ چل رہا ہے یہود ونصاریٰ کو جو اپنے حسب ونسب پر ناز تھا اس کی تردید فرمائی ابراہیم علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا جس میں حضرت ابراہیم کی امامت اور تعمیر کعبہ اور دعا کا ذکر فرمایا اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور انہی دعا کے مطابق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا جنکا قبلہ اور جنکی ملت اور جنکا دین وہی ہے جو حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کا تھا اور ان سب نے اپنی اولاد کو اسی کی وصیت کی تھی کہ دین اسلام ہی پر مرنا۔ پھر تعجب ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تمہارے سامنے اسی ملت ابراہیمیہ اور دین اسلام کو پیش کرتے ہیں تو تم اسے قبول نہیں کرتے اسکے سوا اور کیا وجہ ہے کہ تمہاری عقلوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

فائدہ جلیلہ

حق جل شانہ نے اس سلسلہ میں سات جگہ اسلام کا ذکر فرمایا۔ پہلا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ دوسرا وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ. تیسرا قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ چوتھا قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ پانچواں فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ چھٹا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ساتواں وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انبیاء کرام کا مذہب اسلام ہے اور انبیاء کی جو لوگ اطاعت کرنے والے تھے ان کی صفت بھی یہی اسلام تھی مگر امت مسلمہ کا نام اور لقب حضور ہی کی امت کو عطا کیا گیا پچھلی امتوں میں بھی اسلام لانے والے گزرے ہیں مگر اسلام انکا لقب نہ تھا صرف صفت تھی۔ یہ لقب صرف امت محمدیہ کو عطا کیا گیا ایک زمانہ میں دین حق کا لقب یہودیت رہا۔ اور ایک زمانہ میں عیسائیت۔ اور نصرانیت رہا۔ صفت اسلام سب میں مشترک رہی سب اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے مگر امت مسلمہ کا لقب خاص آپ ہی کی امت کو عطا کیا گیا۔ اسکی مثال ایسی ہے کہ بادشاہ کے غلام تو سب ہی ہیں مگر سلیم کا نام ہی غلام رکھ دیا جائے تو صفت اور لقب دونوں جمع ہو جائیں گے صفت بھی غلام۔ اور لقب اور نام بھی غلام۔ اور مثلاً جیسے سب اللہ کے بندے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ اپنا نام ہی عبداللہ اور اللہ بندہ رکھے تاکہ ہر وقت اسکی عبدیت اور غلامیت سے لذت حاصل کرتا رہے تو اس کی شان ہی دوسری ہے۔

اور یہ مبارک لقب سب سے پہلے ہمارے لیے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تجویز فرمایا جیسا کہ سورۂ حج میں ہے مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ. پس اس عظیم الشان لقب کا حق یہ ہے کہ ہم دل وجان سے اللہ کے مطیع اور فرمانبردار بن جائیں محض لفظ مسلم

اور لفظ مومن پر قناعت نہ کریں۔

میم وواو و میم و نون تشریف نیست
لفظ مومن جز پئے تعریف نیست

فائدۂ دیگر جاننا چاہیئے کہ ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں (اول) اصول اور عقائد جیسے توحید و رسالت اور قیامت یہ چیزیں تو تمام انبیاء کرام میں متفق علیہ ہیں ان میں اختلاف ممکن نہیں اور نہ ان میں نسخ جاری ہوتا ہے (قسم دوم) قواعد کلیہ شریعت کہ جن کی طرف جزئیات اور فروع راجع ہوتے ہیں اور حکم میں ان کلیات کا لحاظ رہتا ہے اور انہی قواعد کلیہ کا نام ملت ہے جس میں اختلاف بہت کم ہوتا ہے ملت محمدی اور ملت ابراہیمی انہی اصول اور قواعد کلیہ کے لحاظ سے موافق اور متحد ہیں۔

(قسم سوم) احکام جزئیہ اور فروع جنکو شریعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں زمان اور مکان اور امم کے اختلاف سے شریعت کے احکام جزئیہ بدلتے رہے کما قال تعالیٰ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ پس ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت تو ایک مگر شریعت ہر ایک کی جدا ہے اسکی مثال یہی ہے کہ تمام حنفیہ امام ابوحنیفہ کو اپنا امام جانتے ہیں مگر باوجود اسکے امام ابو یوسف اور امام محمد اور امام زفر کبھی کبھی امام ابوحنیفہ کا خلاف بھی کرتے ہیں مگر تاہم حنفیت سے کسی حال میں خارج نہیں اور امام ابوحنیفہ کے مذہب کے قواعد مقررہ سے باہر نہیں جاتے مثلاً قیاس جلی یا قیاس استحسان اور عموم جلی کسی نہ کسی قاعدہ کے تحت میں اس جزئیہ کو درج کرتے ہیں۔

قُولُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ
تم کہو ہم نے یقین کیا اللہ کو اور جو اترا ہم پر اور جو اترا

اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ
ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور

الْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ
اسکی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ اور عیسیٰ کو اور جو ملا

النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ
سب نبیوں کو اپنے رب سے ہم فرق نہیں کرتے ایک میں

مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ﴿١٣٦﴾ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ

ان میں سے اور ہم اسی کے حکم پر ہیں۔ پھر اگر وہ بھی یقین لاویں

مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا

جس طرح پر تم یقین لائے تو راہ پائی انہوں نے اور اگر پھر جاویں تو اب

هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ

وہی ہیں ضد پر سو اب کفایت ہے تیری طرف سے انکو اللہ اور وہی ہے

السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾ صِبْغَةَ اللَّهِ ۖ وَمَنْ أَحْسَنُ

سننے والا جاننے والا ہم نے لیا رنگ اللہ کا اور کس کا رنگ

مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً ۖ وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ﴿١٣٨﴾

ہے اللہ سے بہتر اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں

تعلیم طریقۂ ایمان

قال تعالیٰ۔ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ ...... الیٰ ...... وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ۔

گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ یہ کہدو کہ ہم یہودی اور نصرانی نہیں بلکہ ملت ابراہیمی کے متبع ہیں۔ آئندہ آیت میں طریقۂ ایمان کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں کہ اس طرح اپنے ایمان کو ظاہر کرو کہ شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے کفر اور انکار کا ایہام نہ ہو لہٰذا جب تم اپنے ایمان کا اعلان کرو تو اس طرح کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر یعنی اس کے تمام اسماء و صفات پر اور اس کے تمام احکام پر اور اس کتاب اور شریعت پر ایمان لائے جو ہماری طرف بھیجی گئی اور ان تمام صحیفوں پر ایمان لائے کہ جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف بھیجے گئے جو ان میں نبی ہوئے جیسے عزیر اور شعیاہ اور ارمیاہ اور دانیال اور حزقیل علیہم السلام اور اس چیز پر بھی ایمان لائے کہ جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو دی گئی اور اجمالاً ہم ایمان لائے ان تمام صحیفوں پر اور شریعتوں اور احکام پر کہ جو تمام پیغمبروں کو پروردگار کی جانب سے دیئے گئے اگرچہ ان میں بعض بعض سے افضل

ہیں لیکن ہم ایمان لانے میں کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے کہ بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں اور ہم تو خاص اللہ کے مطیع اور فرمانبردار ہیں۔ سب انبیاء پر بلا تفریق ایمان رکھتے ہیں البتہ منسوخ شریعت کا اتباع نہیں کرتے صرف خاتم الانبیاء کا اتباع کرتے ہیں کہ جن کی شریعت تمام شریعتوں کی ناسخ ہے۔

تفریع بر مضمون سابق مع توبیخ و تقریع

جب یہ معلوم ہو گیا کہ اسلام کی حقیقت یہ ہے اور ایمان کا طریقہ یہ ہے پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں کہ جس طرح تم ایمان لائے ہو یعنی بلا تفریق تمام انبیاء و رسل کی تصدیق کریں پس تحقیق یہ بھی ہدایت پا جائیں گے اور اگر روگردانی کرتے ہیں تو یہ لوگ صرف مخالفت اور عداوت میں غرق ہیں آپ انکی عداوت اور مخالفت سے پریشان نہ ہوں عنقریب ہی اللہ تعالیٰ انکے شر سے آپکی کفایت کرے گا اور وہی اللہ تعالیٰ ان سے نمٹ لیگا تم فکر نہ کرو یہ مؤمنین سے حمایت و حفاظت بلکہ غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے پورا فرمایا جو قریظہ کو قتل کرایا بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا اور نصاریٰ پر جزیہ لگایا حق تعالیٰ کا یہ ارشاد فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ کا وعدہ ہے اور آئندہ کی خبر ہے جو پورے طور پر ثابت ہوئی کہ چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سر سے یہود اور نصاریٰ کے شر کو دفع کیا اور دین اسلام کے مقابلہ میں یہود و نصاریٰ مغلوب ہوئے اور اللہ کی پیشگوئی پوری ہوئی اور اللہ تعالیٰ تو سب کی باتوں کو سنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔ دشمنوں کا کوئی کید اور مکر اس سے پوشیدہ نہیں۔ یہ یہود اور نصاریٰ دن رات اس کوشش اور حرص میں ہیں کہ تم کو اپنے رنگ میں رنگ لیں۔ اے مسلمانو تم ان سے یہ کہدو کہ ہم کو تو اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اسکی اطاعت اور فرمانبرداری کا رنگ ہمارے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے رنگ سے کونسا رنگ بہتر ہے جو اسکی طرف نظر کی جائے اور یہ رنگ ہم سے زائل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ ہم خالص اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں عبادت کی وجہ سے وہ رنگ اور پختہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کی وجہ سے دوسرے رنگ کا اس پر کوئی دھبہ بھی نہیں لگنے پاتا عبادت اور اخلاص کی وجہ سے وہ زیادہ چمکتا جاتا ہے۔

جب آفتاب اسلام دنیا میں طلوع ہوا تو اس وقت یہود و نصاریٰ میں ایک رسم اصطباغ کی جاری تھی پہلے اس رسم کا رواج یہود میں تھا اور پھر عیسائیوں نے بھی اس رسم کو جاری رکھا اور اب تک عیسائیوں میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے یا کوئی عیسائی بنتا ہے تو اسکو زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے ہیں یا اس کے سر پر اس میں سے کچھ پانی ڈال دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب سچا عیسائی ہو گیا اسی رسم کا نام اصطباغ ہے جس کو آجکل بپتسمہ دینا کہتے ہیں چونکہ یہود اور نصاریٰ مسلمانوں سے

یہ کہتے تھے کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ اس لیے گویا وہ انہیں اصطباغ کی دعوت دیتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت صِبْغَةَ اللّٰهِ نازل فرمائی اور مسلمانوں کو یہود اور نصاریٰ کی دعوت اصطباغ کا یہ جواب بتایا کہ ان سے کہو کہ ہم تمہارا اصطباغ لے کر کیا کریں گے ہمیں تو اللہ کے دین کا رنگ کافی ہے جس سے بڑھ کر اور بہتر اور کون سا رنگ ہو سکتا ہے اور تم تو حضرت عزیر اور حضرت مسیح کو اللہ قرار دے کر اپنا خداوند سمجھنے کی وجہ سے شرک کے ناپاک رنگ سے ملوث ہو تم اہل توحید اور اہل اخلاص کو کس رنگ کی دعوت دیتے ہو۔

فائدہ صبغۃ اللہ کے اعراب میں مفسرین کا اختلاف ہے ایک قول یہ ہے کہ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہے اور تقدیر کلام اس طرح ہے صبغنا اللہ صبغۃ جیسے وَعْدَ اللّٰهِ اور صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ فعل مقدر کا مفعول مطلق ہونے کی بنا پر منصوب ہیں اور معنی یہ ہیں وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا اور صَنَعَ اللّٰهُ صُنْعًا علامہ زمخشری اور بیضاوی اور ابو حیان اور علامہ سیوطی نے اسی اعراب کو اختیار فرمایا اور ہمارا ترجمہ اور تفسیر اسی اعراب پر مبنی ہے دوسرا قول یہ ہے کہ منصوب علی الاغراء ہے اور تقدیر عبارت اس طرح ہے الزموا صبغة الله یعنی اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو۔ اس تقدیر پر بھی آیت کے معنی نہایت لطیف ہوں گے۔ اور مطلب یہ ہوگا کہ اے مسلمانو فقط تصدیق اور عبادت پر کفایت اور قناعت نہ کرو بلکہ اس سے ترقی کرو اور اپنے ظاہر و باطن کو اللہ کے رنگ سے رنگو اور وہ رنگ خداوند ذوالجلال کی اطاعت اور محبت اور رضا و تسلیم کا رنگ ہے جس سے بہتر کوئی رنگ نہیں جب کوئی شخص کسی کی مرضی کا اس درجہ تابع ہو جائے کہ اس کا کوئی حکم اس کو گراں نہ گذرے بلکہ کمال شوق اور غایت رغبت و محبت سے اس کی تعمیل کی طرف فدا اور دل و جان سے دوڑنے لگے تو محاورہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص تو فلاں کے رنگ میں رنگا ہوا ہے پس اے مسلمانو تم اللہ کے رنگ کو لازم پکڑو اور بطور تحدیث بالنعمۃ یا بطور لذت و مسرت یا بطور تعریض اور اتمام حجت یہ کہو کہ ہم تو خالص اللہ ہی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں تمہاری طرح شرک میں مبتلا نہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ صبغۃ اللہ ۔ ملۃ ابراہیم حنیفا ۔ سے بدل ہے اور بالفاظ دیگر ملۃ ابراہیم کی تفسیر ہے یعنی ملت ابراہیم اور ملت اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا عجیب و غریب رنگ ہے جس کے مشاہدہ کے لیے آنکھ چاہیے اور ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ صبغۃ اللہ سے مراد ختنہ ہے جو ملت ابراہیمی کا خاص شعار اور خاص رنگ ہے۔

قُلْ اَتُحَاۗجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَھُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ

کہہ دیجئے کیا تم جھگڑتے ہو ہم سے اللہ میں اور وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا اور ہم کو

أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُخْلِصُونَ

عمل ہمارے اور تم کو عمل تمہارے اور ہم اسی کے ہیں نرے

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم و اسماعیل اور اسحٰق

وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ

اور یعقوب اور اس کی اولاد یہود تھے یا نصاریٰ

قُلْ أَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ اللَّهُ ۗ وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ

کہہ تم کو خبر زیادہ ہے یا اللہ کو اور اس سے ظالم کون جس

كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهُ مِنَ اللَّهِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ

نے چھپائی گواہی جو تھی اس پاس اللہ کی اور اللہ بے خبر نہیں

عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا

تمہارے کام سے وہ ایک جماعت تھی گزر گئی ان کا ہوا

كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا

جو کما گئے اور تمہارا ہے جو تم کماؤ اور تم سے پوچھ نہیں

كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ان کے کام کی

تلقین جواب از مجادلۂ اہل کتاب

قال تعالیٰ قُلْ أَتُحَاجُّونَنَا فِي اللَّهِ ... الخ ... وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔

اور اگر اہل کتاب آپ سے اس بارہ میں مجادلہ کریں کہ ہم خدا کے رنگ کے ساتھ رنگین ہیں ہمارا دین اور ہماری کتاب تمہارے دین اور تمہاری کتاب سے مقدم ہے نبوت و رسالت ہمیشہ ہمارے ہی خاندانوں میں رہی اور ہم اللہ کے محبوب ہیں تو آپ انکے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ کیا تم ہم سے اللہ کے بارہ میں مجادلہ کیے چلے جاتے ہو، حالانکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے اسکی ربوبیت کسی کے ساتھ مخصوص نہیں سب کو عام ہے جو اسکے حکم کے مطابق طاعت اور عبادت کریگا وہ قبول ہوگی ورنہ رد۔ اور ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں کہ سراسر اسی کے حکم کے مطابق ہیں آخری نبی کی زبانی جو آخری حکم نازل ہوا اس پر عمل کرتے ہیں، اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں کہ ناسخ کے نازل ہونے کے بعد منسوخ حکم اور محرف شریعت پر عمل پیرا ہو اور تازہ اور محفوظ شریعت سے اعراض اور انحراف کر رہے ہو اور علاوہ ازیں ہمارے اور تمہارے درمیان میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ ہم خالص اللہ کے لیے عبادت کرنے والے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو وہ تعصب اور نفسانیت اور دنیوی اغراض اور اپنی آبائی رسم کے باقی رکھنے کے لیے کرتے ہو بلکہ صریح شرک میں مبتلا ہو، حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا بتلاتے ہو۔ توحید اور اخلاص کا تم پر کوئی ہلکا سا نشان بھی نہیں۔ لہذا تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، سراسر غلط ہے تم تو سرتاپا شرک کے رنگ میں رنگے ہوئے ہو تمہارا رنگ تمہارے اعمال سے ظاہر ہے اور ہمارا رنگ ہمارے اعمال سے ظاہر ہے اور کیا تم اس آخری پیغام کی ضد اور اپنی منسوخ اور محرف شریعت کی پچ میں یہ کہتے ہو کہ تحقیق ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور ان کی اولاد یہودی اور نصرانی تھے حالانکہ یہ لوگ نزول توریت وانجیل اور یہودیت اور نصرانیت کے ظہور سے پہلے گزر چکے ہیں اور گزشتہ آیات میں ان حضرات کا ملت اسلام پر ہونا بخوبی واضح ہو چکا ہے آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے کہ جس نے یہ خبر دی ہے مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۔ اب بتلاؤ تم زیادہ جاننے والے ہو یا اللہ اور ظاہر ہے کہ اللہ سے زیادہ جاننے والا اور کون ہو سکتا ہے بلکہ نصوص توریت وانجیل اس پر شاہد ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کی ملت حنیفیت تھی۔ ختنہ اور حج بیت اللہ ان کا شعار تھا یہودیت اور نصرانیت کے خواص مثلاً عقیدہ اور اتوار کی تعظیم ان کی شریعت میں نہ تھی اور یہ سب کچھ ان کو معلوم ہے مگر چھپاتے ہیں اور ایسے شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے کہ جو ایسی شہادت کو چھپائے اور دل میں رکھے جو اس کے پاس محفوظ ہو اور اس کو خوب یاد ہو اور وہ شہادت اس کو من جانب اللہ پہنچی ہو لہذا اس کے اعلان اور اظہار کا وہ مامور ہو اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں رسول آخر الزمان کے متعلق جو شہادتیں تمہاری کتابوں میں مذکور ہیں تمہارا ان واضح شہادتوں کو چھپانا اور نصوص توریت وانجیل میں تحریف اور تغیر و تبدل کرنا سب اللہ کی نظروں کے سامنے ہے اور تم اس پر فخر نہ کرو کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے

گئی اور مال و متاع کی طرح تمہارے لیے اپنے اعمال صالحہ کو ذخیرہ چھوڑ کر نہیں گئی کہ جو بوقت ضرورت تمہارے کام آسکے اس جماعت کے لیے اس کا کیا ہوا کام آئیگا اور تمہارے لیے تمہارا کیا ہوا کام آئے گا۔ دوسرے اُن کے اعمال کے متعلق کوئی سوال نہ ہوگا لہٰذا جب تم کو ان کے اعمال سے کوئی تعلق نہیں تو پھر ان کے اعمال سے نفع کی امید رکھنا سخت بھول اور نادانی ہے۔

فائدہ یہ آیت قریب ہی میں گذر چکی ہے تاکید اور مبالغہ کے لیے اس کو مکرر لائے کہ پھر کہہ دیتے ہیں کہ محض گروہ آباؤ اجداد کے بھروسہ پر نہ رہو۔ ~

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

الحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات والصلوٰة والسلام على سيد البريات وعلى آله واصحابه وازواجه الطاهرات۔ مسلسلات و متواترات ۲ شوال المكرم يوم دوشنبه سنہ ۱۳۶۹ھ مقام بهاولپور۔
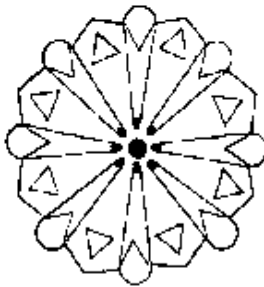
سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کس نے پھیر دیا مسلمانوں کو اپنے قبلہ سے

الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ

جس پر تھے تو کہہ اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب

يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۴۲﴾

چلاوے جس کو چاہے سیدھی راہ

اثبات فضیلت قبلۂ ابراہیمی واسرار تحویل قبلہ

قال تعالیٰ۔ سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ ... الیٰ ... صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں ملت ابراہیمی اور ملت اسلام کا افضل اور اکمل ہونا اور سرور عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا افضل الرسل ہونا بیان فرمایا۔ اب قبلۂ ابراہیمی اور کعبۂ اسلامی کا تمام قبلوں سے افضل ہونا بیان فرماتے ہیں کہ جس طرح اس امت کی ملت تمام ملتوں سے افضل اور اکمل ہے۔ اسی طرح اس امت کا قبلہ بھی تمام قبلوں سے افضل اور بہتر ہے اور جس طرح ملت ابراہیمی سے اعراض سفاہت اور جہالت ہے اسی طرح قبلۂ ابراہیمی سے بھی اعراض سفاہت اور جہالت ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ یہود اور نصاریٰ نے ملت ابراہیمی سے بھی اعراض کیا اور حق کو چھپایا اور اپنے آباء و اجداد کے انتساب پر اعتماد کرکے اعمال صالحہ سے اپنے آپ کو مستغنی سمجھا اور یہ انکی سفاہت اور بے وقوفی ظاہر ہوئی۔ اب عنقریب ایک سفاہت اور ظاہر ہوگی۔ وہ یہ کہ جب بیت المقدس کا استقبال منسوخ ہو کر خانہ کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہوگا تو یہ نادان اور بے وقوف جو محض صورت کے اعتبار سے انسانوں کی جنس سے ہیں عنقریب یہ کہیں گے کہ کس چیز نے ان کو اس قبلہ سے پھیر دیا کہ جس پر اب تک قائم تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آیت سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ کے بارہ میں علماء کے دو قول ہیں۔

قول اول ۱ قفال مروزی یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت تحویل قبلہ کے بعد نازل ہوئی اور یہ لفظ اگرچہ بظاہر استقبال کا صیغہ ہے لیکن اس جگہ ماضی کے معنی مراد ہیں۔

قول ثانی ۲ یہ آیت تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے پہلے نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے آئندہ پیش آنے والے طعن اور اعتراض کی پہلے ہی سے خبر دے دی۔ اس آیت

کے نزول کے وقت تک قبلہ تبدیل نہیں ہوا تھا بلکہ ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کی خبر دے
دی تاکہ مسلمان یہود کے اعتراض کو سن کر گھبرائیں نہیں اور اکثر مفسرین کا یہی قول ہے اور اس قول پر آیت کے
ربط کی تقریر اس طرح کی جا سکتی ہے کہ گزشتہ آیات اور رکوعات میں یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے ان
اعتراضات کے جواب دیئے گئے جو وہ کر رہے تھے اب اس آیت میں اس اعتراض کا جواب بتلاتے
ہیں جو آئندہ عمل کرنے والے تھے اور مطلب یہ ہے کہ اب تک تو یہود اور نصاریٰ اور مشرکین تم پر
وہی اعتراض کرتے تھے جو بیان ہو چکے اور جن کا جواب بھی ہم دے چکے۔ اب عنقریب وہ وقت
آنے والا ہے کہ جب تم کو تحویل قبلہ کا حکم دیا جائیگا تو یہ بیوقوف اور سفیہ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ کیا
دین ہے کہ جس کا قبلہ بدلتا رہتا ہے اور یہ کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنے سابق قبلہ کو کیوں چھوڑ دیا۔

شان نزول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ مکرمہ میں رہے تو خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بحکم خداوندی بیت المقدس
کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ سولہ یا سترہ مہینہ تک اسی طرف نماز پڑھتے رہے اس کے بعد خانہ کعبہ کی طرف
منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین طرح طرح کے طعن کرنے لگے یہود کہنے لگے کہ
پہلے تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو انبیاء کا قبلہ تھا اب اس کو کیوں چھوڑ دیا اور جب
آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو اس وقت بعض یہودی یہ کہتے کہ ہمارے دین کو تو مانتے
نہیں ہمارے قبلہ کی طرف کیوں نماز پڑھتے ہیں۔ بعض یہودی کہتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قبلہ سے واقف
نہیں اس لیے ہمیں دیکھ کر بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ مشرکین کہتے تھے کہ محمد اب سمجھ گئے
ہیں اور رفتہ رفتہ باقی دین کی طرف آ رہے ہیں۔ کوئی کہتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دین کے بارہ
میں متحیر ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں سے ملول ہوتے اور دل سے یہ چاہتے کہ خانہ کعبہ کی طرف
نماز پڑھنے کا حکم آ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں طعن کرنے والوں کے سوال سے خبر دی کہ جب تحویل
قبلہ کا حکم نازل ہوگا تو بے وقوف لوگ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا کہ جس
کی طرف وہ نماز پڑھا کرتے تھے یعنی یہ جو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اب کیا ہوا کہ وہ
اسے چھوڑ کر کعبہ کی طرف نماز پڑھنے لگے۔ آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ اللہ ہی کے لیے ہے مشرق
اور مغرب یعنی تمام جہات اور مکانات کا مالک ہے اس کو اختیار ہے کہ جس جہت اور جس سمت کو چاہے
قبلہ مقرر کرے اور جس کو چاہے منسوخ کرے۔ غلام کو یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں کہ پہلے یہ حکم دیا تھا اور
اب یہ حکم کیوں بدل دیا۔ غلام کا آقا سے اس قسم کا سوال بھی اس کی بے عقلی کی دلیل ہے۔ مریض کا طبیب سے
پوچھنا کہ نسخہ کیوں بدلا اس کی کمال سفاہت اور غایت حماقت کی دلیل ہے۔ غلام تو مولیٰ کے حکم کا تابع ہے
اسے تو حکم کا اتباع چاہیے مزاج اور حکمت سے اس کو کیا بحث۔ خیر اگر تم حکمت ہی معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو!
اصل مقصود عبادت ہے اور جہت عبادت کی ایک راہ ہے خدا کو اختیار ہے کہ جس راہ سے چاہے اپنے

بندوں کی منزل طے کرانے کسی کو کسی راہ سے اور کسی کو کسی راہ سے اور جسکو چاہتا ہے اپنی عبادت کا سیدھا اور قریب راستہ بتلا دیتا ہے کہ جلد منزل مقصود طے ہو جائے اس لیے تم کو بہترین قبلہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو عبادت اور معرفت کا سب سے قریب اور سیدھا راستہ ہے اور حضرت آدم علیہ السلام جو تمام بنی نوع انسان کے باپ ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کہ جو شجرۃ الانبیاء ہیں اور تمام مذاہب اور ملتیں انکی ملت کے تابع ہیں انکے لیے بھی یہی راستہ تجویز ہوا اور خانہ کعبہ ہی ان کے لیے قبلہ بنایا گیا کیونکہ خانہ کعبہ زمین کا مرکزی نقطہ ہے سب سے پہلے یہی مرکزی نقطہ پیدا کیا گیا اور یہیں سے زمین پھیلائی گئی اور یہی جگہ انسان کا مبداء تولد ہے اور یہی جگہ عرش عظیم اور بیت المعمور کے محاذات میں ہونے کی وجہ سے حق جل شانہ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اور انسان چونکہ مٹی سے پیدا ہوا ہے تو حسب قاعدہ کل شیء یرجع الی اصلہ اسکا اصلی میلان اسی مرکزی نقطہ یعنی خانہ کعبہ کی طرف ہوگا اگرچہ ظاہراً محسوس نہ ہو۔ اس لیے خانہ کعبہ قبلہ عالم قرار ہوا نیز روایات سے ثابت ہے کہ جب آسمان اور زمین کو یہ خطاب ہوا ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا تم خوشی سے آؤ یا ناچاری سے تو زمین کے اجزاء اور قطعات میں سے سب سے پہلے اسی جگہ نے اطاعت و فرمانبرداری کے قبول میں سبقت کی اس لیے از راہ قدر دانی حق جل شانہ نے اسی جگہ کو قبلہ مقرر فرمایا البتہ چند روز کے لیے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک بنی اسرائیل کے لیے مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنایا گیا کیونکہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا وطن اور مسکن اور مقام بعثت اور مقام دعوت ہونے کی وجہ سے مبارک اور مقدس جگہ ہے۔ اسی وجہ سے شب معراج میں حضور کو براق پر سوار کرکے بیت المقدس لایا گیا اور حضرات انبیاء کرام کی ارواح طیبہ سے ملاقات کرائی گئی اور وہیں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر گئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذاتی انوار اور تجلیات کے ساتھ انبیاء سابقین کے انوار و برکات بھی مل کر نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائیں اور ذی القبلتین کے لقب سے ملقب ہوں اور توریت اور انجیل کی بشارت پوری ہو کہ وہ نبی آخر الزمان صاحب قبلتین ہوگا لہٰذا مناسب ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج بیت المقدس سے پہلے چند روز کے لیے نماز میں بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہو اور یہ مقدس جگہ جو حضور کی معراج اور ترقی کا زینہ بنی اسکا حق یہ ہے کہ چند روز اس کی طرف منہ کرکے نماز ادا فرمائیں تاکہ سینہ مبارک اس مبارک اور مقدس جگہ کے انوار و تجلیات کو اپنے اندر جذب کرلے اور پھر یہ کمالات آپکے سینہ مبارک سے آپکی امت کے علماء کے سینوں کی طرف منتقل ہوں تاکہ آپکی امت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے وارث کہلا سکیں۔

غرض یہ کہ اسی وجہ سے چند روز کے لیے بیت المقدس کے استقبال کا حکم ہوا پھر ہمیشہ کے لیے اصلی قبلہ کے استقبال کا حکم نازل ہوا اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصلی قبلہ خانہ کعبہ ہے اور یہی جگہ تمام روئے زمین پر سب سے افضل اور اکمل ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل کہ تم ہو بتانے والے

النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ

لوگوں پر اور رسول ہو تم پر بتانے والا

تمام امتوں پر امت محمدیہ کی فضیلت

قال تعالیٰ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا ... الیٰ ... وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

اور جس طرح ہم نے تمہارے لیے بہتر قبلہ تجویز کیا کہ وسط زمین میں ہے۔ وہ تمہارا اصلی قبلہ ہے اور حق تعالیٰ شانہ کے انوار و تجلیات کا مرکز ہے اسی طرح ہم نے تم کو امت متوسطہ بنایا کہ جو اخلاق اور اعمال اور عقائد کے اعتبار سے متوسط اور معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان میں واقع ہے گویا کہ یہ امت اپنے کمال توسط اور کمال اعتدال کے اعتبار سے علاقہ امم کے درمیان میں مسند پر بیٹھی ہوئی ہے اور تمام امتیں اطراف و جوانب سے اسکی جانب متوجہ ہیں اور ہم نے تم کو اس توسط اور اعتدال کی فضیلت اس لیے عطا کی تاکہ تمہاری عدالت علی وجہ الکمال ثابت ہو جائے اور قیامت کے دن تم لوگوں پر گواہ بن سکو اس لیے کہ شہادت کے لیے عدالت شرط ہے اور جب تم کامل العدالت ہو گئے تو ٹھیک شہادت دے سکو گے۔ کمال اعتدال کی وجہ سے کسی ایک جانب تمہارا میلان نہ ہوگا اور تمہاری شہادت حق ہوگی اور طرفداری کے شائبہ سے پاک ہوگی۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اولین و آخرین کو جمع کرے گا اور گزشتہ امتوں کے کافروں سے خطاب فرمائے گا کہ کیا تمہارے پاس کوئی نذیر یعنی ڈرانے والا نہیں آیا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا جس سے ہم کو تیرے احکام کی اطلاع ہوتی۔ پھر انبیاء علیہم السلام سے دریافت فرمائیں گے۔ تمام انبیاء متفق اللفظ یہ عرض کریں گے کہ اے اللہ ہم تیرے احکام کو پہنچا چکے یہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگرچہ عالم الغیب ہیں ان کو سب معلوم ہے مگر اتمام حجت کے لیے انبیاء سے گواہ طلب کریں گے۔ حضرات انبیاء اپنی گواہی میں امت محمدیہ کو پیش کریں گے۔ امم سابقہ کے کافر کہیں گے کہ ان کو کیا معلوم یہ تو ہم سے قرنہا قرن بعد میں آئے۔ امت محمدیہ یہ جواب دے گی کہ اگرچہ ہم تمہارے بعد آئے مگر ہم کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا کہ تمام انبیاء نے اپنی اپنی امتوں کو اللہ کے احکام پہنچا دیے اور شہادت کے لیے علم قطعی اور یقینی کافی ہے۔ حاصل مشاہدہ ضروری نہیں اور نبی کی خبر مشاہدہ سے ہزار درجہ زیادہ قطعی اور یقینی ہے۔ مشاہدہ میں غلطی کا امکان ہے

نبی کی خبر میں غلطی کا احتمال نہیں اس لیے کہ نبی نبأ سے مشتق ہے اور نبأ لغت میں اس خبر کو کہتے ہیں جو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہو بلکہ عظیم الشان بھی ہو۔ اس وقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جائیگا اور آپ سے آپ کی امت کی اس شہادت کے متعلق دریافت کیا جائیگا۔ تو اے امت کے مسلمانو اس وقت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تم پر گواہ ہونگے اور تمہاری عدالت اور صداقت کی شہادت دیں گے اور پھر تمہاری شہادت کے مطابق حضرات انبیاء کے حق میں فیصلہ ہوگا اور کفار مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

فائدہ اس امت کو متوسط اس معنی کر فرمایا کہ یہ امت عقائد اور اعمال اور اخلاق کے اعتبار سے معتدل ہے افراط اور تفریط کے درمیان ہے۔ برخلاف یہود کے وہ تفریط میں مبتلا ہیں۔ حضرات انبیاء کی تنقیص کرتے ہیں انکو معصوم نہیں سمجھتے جو کہ نبوت کا خاصہ لازمہ ہے اور نصاریٰ افراط میں مبتلا ہیں کہ پیغمبر کو مرتبہ بندگی سے درجہ فرزندی پر پہنچایا اور توسط اور اعتدال ہی باجماع عقلاء اصل درجہ کا کمال ہے۔ اسی لیے علماء نے اس آیت سے امت محمدیہ کے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ اس امت کے اجماع کو نہ قبول کرنا اسکی عدالت سے عدول کرنا ہے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ کے وسط (درمیان) میں ہونے کے یہ معنی ہیں کہ یہ امت انبیاء اور اولیاء کے درمیان ہے انبیاء سے نیچے اور اولیاء سے اوپر۔ چونکہ اس خطاب کے بلاواسطہ مخاطب صحابہ کرام ہی ہیں اس لیے اہلسنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کرام کا مقام انبیاء کرام سے نیچے ہے اور تمام اولیاء سے بلند اور اونچا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَآ إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ

اور وہ جو ہم نے تمہارا قبلہ جس پر تو تھا نہیں مگر اسی واسطے کہ معلوم کریں

يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَإِنْ

کہ کون تابع رہیگا رسول کا اور کون پھر جاویگا الٹے پاؤں اور یہ بات

كَانَتْ لَكَبِيْرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا

بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دی اللہ نے اور اللہ

كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ إِيْمَانَكُمْ ؕ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ

ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا یقین لانا بیشک اللہ لوگوں پر

لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۱۴۳)

حقیقت ارتکاب سے جبریاں

تحویل قبلہ پر ایک شبہ مع الجواب

قال تعالیٰ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا ۔ الیٰ ۔ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ

آگے ایک شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں کہ جب یہ معلوم ہوگیا کہ اس امت متوسطہ اور کاملہ کے لیے مناسب یہی قبلہ کا طرہ ہے کہ جو وسط ارض میں ہے تو پھر اس میں کیا مصلحت تھی کہ چند روز کے لیے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا اور پھر اسکو منسوخ کیا۔ آئندہ آیت میں اسکا جواب دیتے ہیں کہ ہمارے علم میں تمہارا اصل قبلہ تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیم کے وقت سے چلا آرہا تھا اور جس قبلہ کی طرف بعد ازاں آپ نماز ادا کر رہے ہیں یعنی بیت المقدس اسکو ہم نے آپکا اصلی قبلہ نہیں بنایا تھا مگر محض اس مصلحت کے لیے چند روز کے لیے اس کے استقبال کا حکم دیا تھا کہ علانیہ اور ظاہری طور پر ہمکو یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں رسول کی تصدیق اور اطاعت سے تکذیب اور نافرمانی کی طرف پھر جاتا ہے یعنی بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانان قریش کا امتحان مقصود تھا کہ کون رسول اللہ کا سچا تابعدار ہے کہ جس قبلہ کی طرف بھی نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں اسی طرف نماز ادا کرتا ہے اور کون قومی عصبیت کی رعایت کرتا ہے اس لیے کہ قریش کعبۃ اللہ کی تعظیم پر فخر کرتے تھے اور قبلۂ ابراہیمی کی عبادت اور خدمت پر ناز کرتے تھے۔ اور بیت المقدس سے قبلۂ بنی اسرائیل ہونے کی وجہ سے نفرت کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قومی عصبیت کے امتحان کے لیے بجائے کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں مسلمانان قریش کا امتحان تھا اور پھر جب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوا تو اس میں مسلمانان یہود کا امتحان تھا اور چونکہ بیت المقدس محض چند روز کے لیے امتحاناً قبلہ بنایا گیا تھا اور ظاہر ہے کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر شاق اور گراں ہو اس لیے ارشاد فرماتے ہیں اور بے شک بیت المقدس کا قبلہ ہونا قریش اور عرب پر بہت شاق اور گراں تھا۔ اولاد اسماعیل ہونے کی وجہ سے قبلۂ ابراہیمی کو پسند کرتے تھے مگر ان لوگوں پر شاق نہیں کہ جنکو اللہ نے ہدایت اور توفیق دی ازلی ہدایت کی نظر ہمیشہ اطاعت پر رہتی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کی تعمیل کی جائے۔ جس جانب چہرہ کرنے کا حکم ہوگا اسی جانب متوجہ ہو جائیں گے۔ نیز بعض لوگ اپنے ذوق سلیم سے یہ خیال کرتے تھے کہ اگرچہ نماز کعبہ بیت المقدس سے افضل ہے۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع ہیں اور آپ کی رسالت تمام عالم اور امم کے لیے ہے

اس لیے یہ لوگ اپنی نور فراست سے سمجھتے تھے کہ ضروری ہے کہ کسی وقت استقبال بیت المقدس کی نوبت آئے گی۔ اور بعد چندے اصل قبلہ یعنی کعبہ کی طرف رجوع کا حکم ہوگا جو افضل الرسل کے مناسب ہے۔

ایک شبہ اور اسکا ازالہ الا لنعلم سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ حق تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا بعد میں معلوم ہوا حالانکہ اللہ تعالیٰ کا علم قدیم اور ازلی ہے حاشا وکلا اللہ کا علم حادث نہیں ہے۔

جواب بعض علماء نے یہ جواب دیا کہ علم سے تمیز کے معنی مراد ہیں یعنی ممتاز اور جدا جدا کر دینا بعض کہتے ہیں کہ علم سے مراد امتحان اور آزمائش ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ ہم مطیع کو نافرمان سے ممتاز اور جدا کر دیں یا یہ معنی ہیں کہ ہم امتحان کرتے ہیں کہ کون اطاعت کرتا ہے اور کون انحراف کرتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مضاف محذوف ہے۔ یعنی اللہ کے جاننے سے اللہ کے رسول کا اور جماعت مومنین کا جاننا مراد ہے یعنی تاکہ ہمارا رسول اور اہل ایمان جان لیں۔

اور بیت المقدس اگرچہ اصل قبلہ نہ تھا مگر تم نے اس مدت میں جو نمازیں بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں انکو ضائع نہ سمجھو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ جو تمہارے ایمان و نماز کو ضائع کر دے اس لیے کہ تم نے جو نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں وہ اللہ ہی کے حکم سے پڑھی ہیں اور تحقیق اللہ تعالیٰ تو تمام آدمیوں پر نیک ہوں یا بد مومن ہوں یا کافر سب ہی پر بہت ہی شفیق و مہربان ہیں وہ اپنے حکم کے اتباع کرنے والوں کی نماز اور بندگی کب ضائع کر سکتے ہیں۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ

ہم دیکھتے ہیں پھر پھر جانا تیرا منہ آسمان میں سو البتہ پھیریں گے

قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ

تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے اب پھیر منہ اپنا طرف مسجد حرام کے

وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ

اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی کی طرف اور جن کو

الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ

ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان

رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٤﴾

کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو کرتے ہیں

تحویل قبلہ کا حکیمانہ جواب

قال تعالیٰ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ... الیٰ ... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۔

گزشتہ آیات میں تحویل قبلہ پر شبہ کا حاکمانہ جواب تھا اب حکیمانہ جواب ارشاد فرماتے ہیں اور تحویل قبلہ کی حکمتوں کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

حکمت اول: رافت اور رحمت کی وجہ سے اگرچہ استقبال بیت المقدس میں بھی اجر کامل مل جاتا ہے مگر قبلہ کا مدار حقیقت کعبہ معظمہ ہے اور دل کا میلان طبعی کعبہ ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ تحویل قبلہ کے استقبال کا حکم لیکر نازل ہو۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے چہرہ کا بار بار وحی کے انتظار میں آسمان کی طرف اٹھنا کہ کب خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر نماز پڑھنے کا حکم نازل ہو اور چونکہ ہم کو آپ کی آرزو اور خواہش کا پورا کرنا منظور ہے پس اس لیے ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح میری ملت ابراہیمی ہے اسی طرح میرا قبلہ عبادت بھی قبلہ ابراہیمی بنا دیا جائے لہذا ہم حکم دیتے ہیں پس آپ اپنا منہ پھیر لیجئے بیت المقدس سے مسجد حرام کی طرف کیجئے کہ اب ہمیشہ کے لیے وہی آپ کا قبلہ ہے اور یہ حکم آپ کے ساتھ مخصوص نہیں اگرچہ درخواست آپ کی تھی مگر حکم تمام امت کے لیے ہے۔ امت سے کہہ دیجئے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو اسی جانب اپنے چہروں کو متوجہ کرو حتیٰ کہ اگر بیت المقدس میں بھی ہو تب بھی مسجد حرام ہی کی طرف متوجہ ہو کر نماز ادا کرو اور تحقیق اہل کتاب خوب یہ جانتے ہیں کہ یہ قبلہ حق ہے۔ خود ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان ملت ابراہیمی پر ہوں گے اور ان کا قبلہ قبلہ ابراہیمی ہوگا۔ اور اہل کتاب یہ بھی بالیقین جانتے ہیں کہ اس نبی اور اس امت نے یہ قبلہ اپنی رائے سے نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کے پروردگار کی جانب سے یہی حکم آیا ہے مگر اس کو چھپاتے ہیں ظاہر نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ان کی ان کارروائیوں سے غافل نہیں وہ خوب جانتا ہے کہ کون اس کے حکم پر چلتا ہے اور کون اپنی رائے اور خیال پر چلتا ہے۔ حاصل اس حکمت کا یہ ہے کہ ہم نے آپ کی خواہش اور خوشی کے موافق قبلہ تبدیل کر دیا تاکہ لوگوں پر آپ کا شرف اور آپ کی عظمت ظاہر ہو جائے۔

وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ

اور اگر تو لادے کتاب والوں کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ

مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ

چلیں گے تیرے قبلہ پر اور نہ تو مانے ان کا قبلہ

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ

اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ اور کبھی تو چلا ان کی

اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا

پسند پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو بے شک تو بھی

لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٤٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا

بے انصافوں میں جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں یہ بات جیسے

يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ

پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور ایک فرقہ ان میں چھپاتے ہیں حق کو

وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٤٦﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ

جان کر حق وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے

الْمُمْتَرِيْنَ ﴿١٤٧﴾ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا

والا اور ہر کسی کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم

الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

سبقت کرو بھلائیوں میں جہاں کہیں تم ہوگے کر لادے گا تم کو اللہ اکٹھا بے شک اللہ

عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ

ہر چیز کر سکتا ہے اور جس جگہ سے تو نکلے منہ کر

وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ

طرف مسجد حرام کے اور یہی تحقیق ہے تیرے رب

وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿١٤٩﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ

کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے اور جہاں سے تو نکلے

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ

منہ کر طرف مسجد حرام کے اور جس جگہ تم ہوا

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ

کرو منہ اسی کی طرف تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے

حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي

کی جگہ مگر جو ان میں بے انصاف ہیں سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے

وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

ڈرو اور اس واسطے کہ پورا کروں تم پر فضل اپنا اور تاکہ تم راہ پاؤ۔

عناد اہل کتاب دربارۂ قبلہ

قال تعالیٰ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ ... الی ... وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۔

(ربط) گزشتہ آیت میں یہ بیان فرمایا کہ اہل کتاب کو اس قبلہ کا حق ہونا بخوبی معلوم ہے اور خود ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان کچھ روز بیت المقدس کی طرف نماز پڑھیں گے اور آخر کعبہ کی طرف اور یہی ان کا اصل اور دائمی قبلہ ہے جو ملت ابراہیمی کے موافق ہے مگر حسد اور عناد کی وجہ سے چھپاتے ہیں آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ ان کا عناد کس درجہ پر پہنچا ہوا ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور اگر آپ اس قبلہ کی حقیقت اور فضیلت پر ہر قسم کے دلائل اور نشانات بھی لے آئیں تب بھی یہ لوگ آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں گے اور نہ آپ کبھی بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی کریں گے ان کا مقصود تو یہ

ہے کہ آپ انکے تابع بن جائیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ بھی ان کے قبلہ کا اتباع اور پیروی نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ انکا قبلہ منسوخ ہوچکا ہے اور جس قبلہ کا آپکو حکم ہوا ہے وہ آخر وقت تک کبھی منسوخ نہ ہوگا اور بیت المقدس کے استقبال کا اب کبھی حکم نہ آئیگا اور عقلاً بھی اہل کتاب کے قبلہ کا اتباع ممکن نہیں اس لیے کہ وہ خود بھی آپس میں قبلہ کے بارہ میں ایسے مختلف ہیں کہ آپس میں ہی ایک دوسرے کے قبلے کے متبع نہیں ہر ایک نے اپنی نفسانی خواہش سے ہی قبلہ کا اتباع کر رکھا ہے اور اے نبی کریم بالفرض اگر آپ نے ان نفسانی خواہشوں کا اتباع کیا بعد اسکے کہ آپ کے پاس قبلہ کے بارہ میں علم صحیح اور قطعی آچکا تو یقیناً آپ اس وقت ظالموں میں شمار ہونگے اس لیے کہ ناسخ کو چھوڑ کر منسوخ کا اتباع کرنا جائز نہیں ہے اور ہوائے نفسانی کا اتباع آپ سے بوجہ معصوم ہونے کے محال ہے لہذا آپ سے ان کے قبلہ کا اتباع بھی محال ہوگا۔

عناد اہل کتاب دربارۂ صاحب قبلتین و رسول ثقلین صلی اللہ علیہ وسلم

وحقیقت آں قبلہ

گزشتہ آیت میں قبلہ کے بارہ میں اہل کتاب کے عناد کا ذکر تھا اب صاحب قبلہ کے بارہ میں ان کے عناد کا ذکر ہے کہ اہل کتاب اس نبی موعود کو جانتے اور پہچانتے ہیں مگر مانتے نہیں چنانچہ فرماتے ہیں جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ آپکو خوب پہچانتے ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں کہ جن کی توریت اور انجیل میں بشارت دی گئی ہے۔ اہل کتاب آپکی صورت اور شکل کو دیکھ کر اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو صورت و شکل اور قد و قامت سے پہچانتے ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا اسی طرح نبی کریم کی صورت کو دیکھتے ہی پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی نبی برحق ہے اور یہ چہرہ جھوٹے کا چہرہ نہیں اس لیے کہ توریت اور انجیل میں آپکا حلیہ اور صورت و شکل اور قد و قامت لون وغیرہ سب مذکور تھا اور تحقیق ان میں کا ایک فریق حق کو چھپاتا ہے حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ توریت میں آپ کا نبی قبلتین ہونا بھی مذکور ہے یہی امر حق ہے جو تیرے رب کی جانب سے آیا ہے پس تو ان کی تلبیس کی وجہ سے ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہونا۔ خطاب آپکو ہے مگر سنانا دوسروں کو ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن سلامؓ سے دریافت کیا کہ کیا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیٹوں کی طرح پہچانتے ہو۔ تو جواب دیا کہ ہاں بیٹوں سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ بیٹے میں شک ہوسکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں کوئی شک نہیں ہو سکتا آپکی صفات اور علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی ہم نے پہچان لیا کہ آپ نبی برحق ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے سچ کہا اور اللہ نے تم کو خیر کی توفیق دی۔

حکمت دوم در تحویل قبلہ

اور دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ ہر امت کے لیے ایک جدا قبلہ ہے جس کی طرف وہ امت متوجہ ہوتی ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں نماز کا قبلہ بیت المقدس تھا اسی طرح تمہارے لیے بھی ایک مستقل قبلہ تجویز ہوا۔ جس طرح تمہارا دین مستقل اور جدا گانہ ہے اسی طرح تمہارے لیے قبلہ بھی مستقل ہونا چاہیے کوئی جہت اور کوئی سمت اپنی ذات سے قبلہ نہیں حق تعالیٰ نے جس جہت کو قبلہ بنا دیا وہ قبلہ ہو گئی اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے ایک جہت کو قبلہ مقرر کر دیا۔ پس اے مسلمانو تم اس قبلہ کے مسئلہ میں کچھ رد و کد نہ کرو۔ اصل نیکیوں کی طرف دوڑو جو مقصود بالذات ہیں یعنی نماز اور روزہ وغیرہ۔ نہ کہ قبلہ کہ وہ اصل عبادت نہیں بلکہ ذریعہ عبادت ہے اور اصل عبادت تو حکم خداوندی کا امتثال ہے۔ اسی کی طرف دوڑو۔ جس وقت وہ خداوند ذوالجلال بیت المقدس کے استقبال کا حکم دے بیت المقدس کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور جس وقت خانہ کعبہ اور مسجد حرام کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دے اسی طرف متوجہ ہو جاؤ کسی سے منازعت کی ضرورت نہیں۔ تمام خیرات اور نیکیوں کی روح امر خداوندی کے امتثال میں مبادرت اور سبقت کرنا ہے۔ اصل بھلائی حکم کی پیروی میں ہے جس وقت جو حکم ہو اسکی تعمیل کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ جہاں سب عبادتوں پر اجر ملے گا اور اصل عبادت تعیین حکم ہے وہ احکم الحاکمین ہے جو چاہے حکم دے تم مشرق اور مغرب میں جہاں کہیں بھی ہو گے تم سب کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حساب کے لیے حاضر کرے گا اور تمہارے اعمال کے مطابق تم کو جزا دیگا یعنی اختلاف جہات صرف دنیا میں ہے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سب کو جہات مختلفہ سے ایک مکان میں جمع کریگا اور سب کو بھلائی اور برائی کی جزا دیگا اور سب نمازوں کو بمنزلہ ایک نماز کے بنا دیگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اب آپ آئندہ نماز میں بیت المقدس کا استقبال نہ کریں بلکہ جس جگہ سے بھی نکلیں اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور یہی حق ہے کہ ہر نماز میں خانہ کعبہ کا استقبال کرو اور تیرے رب کی طرف سے یہ حکم آیا ہے جس سے مقصود تمہاری تربیت ہے اور تکمیل عبادت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے غافل نہیں کہ کون اس کے حکم کے موافق نماز ادا کرتا ہے اور کون اس کے خلاف کرتا ہے۔

حکمت سوم در تحویل قبلہ

اور تیسری حکمت اتمام حجت اور دفع الزام ہے۔ اولاً تحویل قبلہ کے حکم کا اعادہ فرمایا اور ثانیاً لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ سے اس حکم کی ایک جدید علت بیان فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور پھر ہم حکم کرتے ہیں اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ جس جگہ سے بھی باہر نکلیں تو اپنا منہ نماز میں مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور اے مسلمانو تم بھی جہاں کہیں ہو اپنا منہ اسی کی طرف کر لیا کرو تاکہ لوگوں کا تم پر کوئی الزام نہ رہے کیونکہ اگر تحویل قبلہ کا حکم نہ نازل ہوتا تو یہود تم کو یہ الزام دیتے کہ توریت میں یہ صاف لکھا ہوا ہے کہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ بالآخر قبلہ ابراہیمی ہوگا۔ اور خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہو جانے کا انکو حکم آئے گا

یہی یہود یہ الزام دیتے تھے کہ توریت میں جو نبی آخر الزمان کی علامت لکھی ہوئی ہے وہ آپ میں موجود نہیں اور مشرکین یہ الزام دیتے تھے کہ محمد دعویٰ تو کرتے ہیں ملت ابراہیمی کے اتباع کا مگر قبلۂ ابراہیمی سے روگردانی کرتے ہیں۔ اب تحویل قبلہ کے حکم نازل ہونے سے یہود اور مشرکین کسی کا کوئی الزام نہیں رہا اور ہر دو فریق کی زبان بند ہو گئی مگر جو ان میں ظالم ہیں وہ اعتراض اور طعن سے باز نہ آئیں گے۔ یہود یہ کہیں گے کہ محض حسد کی وجہ سے ہمارے قبلہ کو چھوڑا جو کہ انبیاء کا قبلہ تھا اور ظالم مشرکین یہ کہیں گے کہ محمد رفتہ رفتہ اپنے آبائی دین کی طرف آ رہے ہیں۔ پس تم ان ظالموں اور ان کے طعن سے نہ ڈرو۔ بلکہ فقط مجھ سے ڈرتے رہو اور ان کے طعن کی وجہ سے میرے حکم کو نہ چھوڑو۔ خالق کے حکم کو مخلوق کے طعن سے چھوڑنا موجب خسران و عذاب ہے اور خالق کی حکم برداری کے لیے مخلوق کے طعن پر صبر کرنا موجب فلاح و ثواب ہے مخلوق کا طعن مضر نہیں خالق کی خلاف حکمی مضر ہے۔

حکمت چہارم در تحویل قبلہ

اور چوتھی حکمت یہ ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں کہ نماز میں (جو کہ سب سے افضل اور اعلیٰ عبادت ہے) تمہاری توجہ سب سے افضل اور اکمل قبلہ اور بہترین جہت کی طرف ہو تاکہ اس جہت کے انوار و برکات بھی تمہاری نماز کو خوب روشن اور منور بنا دیں۔ قبلہ کے باب میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ عبادت میں افضل جہات کے استقبال کا حکم دیا جائے جیسا کہ دین کے بارہ میں اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں کہ دین کامل عطا کیا جائے کما قال تعالیٰ، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ۔

حکمت پنجم در تحویل قبلہ

اور پانچویں حکمت یہ ہے کہ تم کو سیدھا راستہ معلوم ہو اور افضل جہات کے استقبال سے تم کو ہدایت کاملہ حاصل ہو اور قریب ترین راستہ سے جلد منزل مقصود تک پہنچ جاؤ۔ (جیسا کہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کی تفسیر میں گزر چکا)

تحویل قبلہ کے حکم کو مکرر لانے کی حکمت

وجہ اول۔ تحویل قبلہ کے حکم فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کو تین بار اس لیے مکرر لایا گیا کہ حق تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی تین علت غائیہ ذکر فرمائیں۔ اول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا اور خواہش یہی تھی۔ اسی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تھے [illegible] مخالفین کا الزام دفع کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا کما اشار الیہ بقولہ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اس لیے ہر علت کے ساتھ معلول کو اور ہر دلیل کے ساتھ دعویٰ کی تجدید کر دی گئی کیونکہ کلام کی خوبی یہ ہے کہ علت اور معلول اور دعویٰ دونوں ساتھ ذکر کیے جائیں۔

وجہ دوم - بعض اہل علم نے تکرار کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ پہلی آیت خاص ساکنان حرم کے حق میں ہے اور دوسری آیت ساکنان جزیرۃ العرب کے حق میں ہے اور تیسری آیت تمام روئے زمین کے باشندوں کے حق میں ہے۔

وجہ سوم - پہلی آیت تعمیم احوال کے لیے ہے اور دوسری آیت تعمیم امکنہ کے لیے ہے اور تیسری آیت تعمیم ازمنہ کے لیے ہے یعنی تمام احوال اور تمام مکانات اور تمام اوقات میں یہی قبلہ ہے اسکا استقبال ضروری ہے۔

وجہ چہارم - چونکہ شریعت میں سب سے پہلے یہی حکم منسوخ ہوا اس لیے اس کے بیان میں زیادہ اہتمام کیا گیا اور تاکید کیلئے تین بار اس حکم کا اعادہ کیا گیا۔

وجہ پنجم - کسی حکم کا منسوخ ہونا محل فتنہ اور محل شبہ ہے اور احکام خداوندی میں نسخ جاری ہونا بے وقوفوں کی عقل سے باہر ہے اس لیے اس حکم کا تکرار مناسب ہوا۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا

جیسا بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا تمہارے پاس ہماری آیتیں

وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم

اور تم کو سنوارتا اور سکھاتا کتاب اور تحقیق بات اور سکھاتا تم

مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿۱۵۱﴾

کو جو تم نہ جانتے تھے

بیان وظائف رسول اعظم کہ از قبلہ ابراہیمی در حرم محترم مبعوث باشد

قال تعالیٰ - كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ ... الیٰ ... وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔

(ربط) ابتداء قصہ میں بناء کعبہ کا ذکر فرمایا اور بعد ازاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ذکر فرمائی رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ ۔۔۔ الآیۃ - کہ اے اللہ اس حرم کعبہ کی مجاورین میں سے ایک ایسا نبی مبعوث فرما کہ جو تیری آیات کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب و حکمت کی تعلیم

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿۱۵۲﴾

سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو

تلقین ذکر و شکر

قال تعالیٰ۔ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۔

پس جب کریم نے تمکو ایسی عظیم نعمتوں سے سرفراز کیا اور تم میں ایسا عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیج کر تمکو یاد کیا تو اسکا مقتضی یہ ہے کہ تم بھی مجھکو ہمیشہ یاد رکھو کسی وقت میری یاد سے غافل نہ ہو میں تمکو اپنے لطف وعنایت سے یاد کرونگا اور ملاء اعلیٰ میں تمہارے ذکر کا ذکر کرونگا کہ یہ میرے یاد کرنے والے بندے ہیں جس سے ملاء اعلیٰ اور ملائکہ مقربین کی عنایات تم پر مبذول ہوں گی۔

ف قلب سے حجابات ظلمت دور کرنے کے لیے ذکر الٰہی سے بہتر کوئی شے نہیں۔ جس طرح قلب سے حرص اور طمع کا فاسد مادہ دور کرنے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی نسخہ نہیں اور میرا احسان مانو اور شکر کرو کہ تمہاری ہدایت کے لیے ایسا عظیم الشان رسول بھیجا۔ شکر سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ لہذا اگر تم نے ہماری نعمت کا شکر کیا تو تمہاری ہدایت اور کتاب وسنت کے علم اور معرفت میں زیادتی ہوگی اور جتنا ذکر اور شکر کروگے اسی قدر تمہارے تزکیۂ باطن اور علوم ومعارف میں زیادتی ہوگی۔ اور میری ناشکری مت کرو کہ اس کمال کا انکار کر بیٹھو اور دل وجان سے اسکی اطاعت نہ کرو۔ اور اگر من جانب اللہ علوم ومعارف منکشف ہوں تو دعوے مت کرو دعوی بھی ناشکری میں داخل ہے۔

نکتہ دعاء ابراہیمی جو پہلے گذر چکی ہے اس میں تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مقدم تھا اور تزکیہ کا ذکر مؤخر تھا اور اس آیت یعنی كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ الخ میں تزکیہ کا ذکر مقدم ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ کا ذکر مؤخر ہے۔ وجہ اسکی یہ ہے کہ اصل مقصود تو تزکیۂ نفس ہے اور تعلیم الکتاب والحکمۃ اسکا وسیلہ اور ذریعہ ہے اگر تعلیم ہو اور تزکیہ حاصل نہ ہو تو تعلیم بے فائدہ ہے اور حصول تزکیۂ نفس تعلیم کتاب اور حکمت ہی کے بعد حاصل ہوتا ہے اور تعلیم تزکیہ کے مبادی اور مقدمات میں سے ہے اس لیے دعائے ابراہیمی میں ترتیب وقوعی کے لحاظ سے تزکیہ کے مبادی اور وسائل کو پہلے ذکر کیا اور مقصود کو اخیر میں ذکر کیا۔ اور حق جل شانہ نے جب دعاء ابراہیمی کی اجابت اور قبولیت کا ذکر فرمایا تو اصل مقصود کو پہلے ذکر فرمایا تاکہ سامعین کو ابتداء ہی سے یہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تزکیہ ہے اور وہ بارگاہ خداوندی سے منظور ہو چکا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ
اے مسلمانو قوت پکڑو ثابت رہنے سے اور نماز سے

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝
بیشک اللہ ساتھ ہے ثابت رہنے والوں کے

طریقۂ تحصیل ذکر و شکر و بیان فضیلت صبر

قال تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔

(ربط) گزشتہ آیت میں ذکر و شکر کا حکم تھا اور کفران نعمت کی ممانعت تھی اور ذکر و شکر میں تمام احکام خداوندی کو بجا لانا داخل تھا اور کفران نعمت کی ممانعت میں تمام منہیات اور ممنوعات سے بچنا داخل تھا اور تمام احکام کا بجا لانا اور تمام ممنوعات سے بچنا بظاہر بہت دشوار ہے۔ اس لیے آئندہ آیت میں مسلمانوں کو ذکر اور شکر کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں اے ایمان والو اگر ذکر اور شکر اور درجات قرب و معرفت کے حاصل کرنے میں دشواری معلوم ہو تو صبر اور نماز کی مدد اور سہارے سے اس کو حاصل کرو۔ صبر من جانب اللہ ایک خاص ہتھیار ہے کہ جو خاص انسان کو عطا کیا گیا ہے تاکہ مشکلات میں اس کا معین اور مددگار ہو۔ صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج و غم کو ہلکا کر دیتا ہے۔ حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں۔ ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں۔ انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔ اس لیے انسان کو شہوت اور غضب کا وار روکنے کے لیے صبر کا ہتھیار دیا گیا اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔ عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے مقابلہ پر جم جانا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنا اس کا نام صبر ہے۔ اخلاق جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ حق جل شانہ نے قرآن کریم میں صبر کو ستر سے زیادہ جگہ ذکر فرمایا ہے۔ آیات قرآنیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عمل صالح کا اجر مقرر ہے مگر صبر کا اجر بے حساب ہے۔ پس اگر نفس پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو ان کے آسان ہونے کا ایک علاج تو صبر ہے اور دوسرا علاج نماز ہے۔ اس لیے کہ نماز ایک تریاق مجرب ہے جو ذکر اور شکر اور خشوع اور خضوع اور اسی قسم کے مختلف اجزاء سے مرکب ہے جو ہر بیماری کی دوا اور ہر مشکل کا حل ہے۔ جیسے بارش کے لیے صلوٰۃ الاستسقاء ہے اور ہر دینی اور دنیوی مطلب کے لیے صلوٰۃ الحاجت ہے۔ حضرات انبیاء کرام کو جب مشکل پیش آتی تو نماز میں مشغول ہوتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی پریشانی آتی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز

(ربط) گزشتہ آیت میں صبر کی فضیلت کا بیان تھا کہ صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ جو مقام صبر کی انتہا کو پہنچ جائے کہ خدا کی راہ میں جان دے دے وہ بھی اسکو شیریں اور لذیذ معلوم ہو تو اس پر خداوند تعالیٰ دوام کی بےچون و بےچگون حیات کا ایک عکس اور پرتو ڈالتا ہے جس سے اس کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جن صابرین نے خدا کی راہ میں جان نثاری کی ہو ان کی حیات میں تردد نہ کرو اور جو صابر خدا کی راہ میں مارے گئے اور ان کی اس میں کسی قسم کی دنیوی اور نفسانی غرض نہ تھی ان کو یہ نہ سمجھو کہ عام مردوں کی طرح وہ مردہ ہیں بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں لیکن تم جانتے نہیں کہ وہ کس طرح کی زندگی ہے۔ وہاں کی زندگی تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس حیات کے ادراک کے لیے یہ حواس کافی نہیں۔

ف (۱) شہید اگرچہ بظاہر مرگیا لیکن اس کی موت عام لوگوں کی موت نہیں۔ مرنے کے بعد انسان کی ترقی رک جاتی ہے اس لیے کہ روح کی ترقی کا ذریعہ بدن ہے۔ جب روح کا بدن سے تعلق ختم ہوا تو ترقی مراتب بھی ختم ہوئی مگر شہید کی ترقی برابر جاری رہتی ہے جس عمل میں اس نے جان دی ہے اسکا اجر برابر جاری رہتا ہے گویا کہ اب بھی وہ عمل کر رہا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب آدمی مرجاتا ہے تو اسکا عمل ختم ہوجاتا ہے مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔ (بخاری ومسلم)

ف (۲) احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ شہداء کی ارواح سبز پرندوں کے پیٹ میں رکھدی جاتی ہیں اور جنت میں اڑتی پھرتی ہیں اور جنت کے میوے کھاتی ہیں اور عرش کی قندیلوں میں آرام کرتی ہیں۔

بظاہر وجہ یہ ہے کہ شہید نے اپنے بدن کو خدا کی راہ میں قربان کیا خدا تعالیٰ نے اس عنصری بدن کے بدلہ میں ایک دوسرا عنصری بدن اسکی روح کی سیر و تفریح کے لیے عطا فرمایا۔ یہ جسم طیوری اس روح کے لیے بمنزلہ ایک ہوائی جہاز کے ہے جسکے ذریعہ سے روح جنت میں اڑکر سیر و تفریح کرسکے۔ اور یہ روح اس نئے جسم میں مدبر اور متصرف نہیں۔ تاکہ تناسخ کا شبہ ہو۔ اس لیے کہ تناسخ کی حقیقت یہ ہے کہ روح ایک جسم سے جدا ہونے کے بعد دوسرے جسم سے اس طرح متعلق ہو کہ دوسرے جسم میں کوئی اور روح نہ ہو اور یہی روح اس جسم کی نشوونما کا سبب ہو اور یہی روح اس جسم میں مدبر اور متصرف ہو۔ اور ارواح شہداء میں یہ بات نہیں اس لیے کہ جسم طیوری کے ساتھ تو شہید کی روح کا تعلق ہوا ہے اس جسم طیوری کی روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ ہے اور جسم طیوری کے نشوونما اور تدبیر و تصرف کا کوئی تعلق شہید کی روح سے نہیں۔ اسکا تعلق پرندہ کی اصل روح سے ہے۔ پرندہ کا جسم اور روح علیحدہ ہے اور شہید کی روح علیحدہ اور وہ اس میں سوار ہے اور وہ سبز پرندہ مع اپنے جسم اور اپنی روح کے شہید کی روح کے لیے سواری ہے خوب سمجھ لو۔

ف ٣ | جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ شہداء کی حیات جسمانی ہے اس لیے کہ موت اور قتل کا تعلق جسم سے ہے اور یہی ظاہر آیت کا مفہوم ہے نیز اس لیے کہ سیاق آیت، شہداء کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے ہے، روحانی حیات شہداء کے ساتھ مخصوص نہیں وہ تو عامۂ مسلمین بلکہ کفار کو بھی حاصل ہے۔

✡

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ

اور البتہ ہم آزماویں گے تم کو کچھ ایک ڈر سے اور بھوک سے اور نقصان

مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ

سے مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے اور خوشخبری سنا

الصَّابِرِينَ ﴿١٥٥﴾ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا

ثابت رہنے والوں کو کہ جب ان کو پہنچے کچھ مصیبت تو کہیں

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ﴿١٥٦﴾ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ

ہم اللہ کا مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھر جانا ایسے لوگ انہی پر

صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی اور وہی ہیں

الْمُهْتَدُونَ ﴿١٥٧﴾

راہ پر

بیان امتحان صبر، بشارت صابرین و جزاء صبر

قال تعالیٰ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ ... الیٰ ... وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۔

ربط: گزشتہ آیت میں صبر کے سبب سے بڑے امتحان کا ذکر فرمایا یعنی جہاد فی سبیل اللہ کا۔

اب آئندہ آیت میں صبر کے گروہ کے امتحان کا ذکر فرماتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اس امتحان کے علاوہ اور بھی ہم تمہارے صبر کا امتحان لیں گے جو تم پر زیادہ شاق اور گراں نہ ہوگا اور خدا کی راہ میں جان دینے کی طرح مشکل نہ ہوگا۔ کبھی تمہارا امتحان کسی قدر دشمنوں کے خوف سے لیں گے کہ تم دشمنوں سے خوف زدہ ہو کر پریشانیوں میں مبتلا ہوگے اور کبھی فقر و فاقہ کے قدرے سے اور کبھی مالوں کے نقصان سے مثلاً مال ضائع ہو جائے۔ اور کبھی جانوں اور پھلوں کے نقصان سے۔ مثلاً عزیز و اقارب مر جائیں یا مثلاً کھیتی اور باغ کے پھل کسی آفت سے تلف ہو جائیں۔ تو اے مسلمانو ان مصائب و آفات میں صبر کرنا اور ذکر کرنا اور شکر سے غافل نہ ہونا اور جو لوگ اس امتحان اور آزمائش میں پورے اتریں تو اے نبی کریم آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو صبر کرتے ہیں اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے بلکہ اپنی اور سب کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ ہم سب اللہ کے مملوک اور غلام ہیں یہ ہماری جانیں اور یہ مال سب اسی کی ملک ہے جو چاہے لے اور جو چاہے چھوڑے۔ غلام کو آقا کے سامنے مجال دم زدن نہیں وہ ارحم الراحمین ہم پر ہم سے زیادہ مہربان ہے وہ اگر کسی وقت بھوکا رکھے تو اس کی حکمت اور مصلحت ہے طبیب مشفق اگر بد پرہیزی اور فساد معدہ کی وجہ سے ایک وقت کھانے کی ممانعت کردے تو یہ اس طبیب کے مشفق ہونے کی دلیل ہے اور ہم سب اللہ ہی کی طرف لوٹنے والے ہیں وہاں پہنچ کر ہم کو پتہ چل جائے گا کہ جو ہم سے لیا گیا ہے اور ہم دگنا سے زائد ہم کو اس کا اجر ملے گا

ف حدیث میں ہے کہ یہ کلمہ خاص اسی امت کو ملا ہے۔ دوسری امتوں کو عنایت نہیں ہوا چنانچہ یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے غم میں یا اسفیٰ کہا اور انا للہ نہیں کہا ایسے صابرین پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات اور خاص توجہات ہیں جو حضرات انبیاء کی عنایات کے ہم رنگ ہیں جو ان کے پروردگار کے پاس سے آتی ہیں اور ان پر خدا کی مہربانی ہے کتاب و سنت میں صلوٰۃ کا لفظ انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص ہے۔ صابرین کی بشارت میں صلوات کا اس لیے استعمال فرمایا کہ حق تعالیٰ صبر کرنے والوں کو ان عنایات خاصہ سے سرفراز فرماتے ہیں جو حضرات انبیاء کی صلوات و عنایات کی ہم رنگ ہوتی ہیں اس لیے کہ مصائب اور حوادث میں صبر و تحمل سے کام لینا اور کوئی کلمہ شکایت زبان سے نہ نکالنا اور خداوند ذوالجلال کی طرف رجوع کرنا انبیاء کرام کا طریقہ ہے۔ کما قال تعالیٰ۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ	سو تو ٹھہرا رہ جیسے ٹھہرے رہے ہیں ہمت
مِنَ الرُّسُلِ	والے رسول۔

اس لیے صابرین کو صلوات و عنایات خاصہ سے سرفراز فرمایا اور جان و مال کا جو نقصان ہوا اس کے عوض میں عنایات عامہ یعنی طرح طرح کی رحمتوں اور مہربانیوں سے نوازا۔

ہمارے اس بیان سے صلوٰۃ اور رحمت میں فرق واضح ہو گیا۔ صلوات سے عنایات خاصہ مراد ہیں جو دینی اور دنیوی اور ظاہری اور باطنی برکات کا موجب ہیں اور رحمت سے عنایات عامہ مراد ہیں۔

جو دنیا میں فوت شدہ جان و مال کا عوض اور نعم البدل ہیں خوب سمجھ لو۔ اور ایسے ہی لوگ علاوہ اس کے کہ وہ عنایات خاصہ اور عنایات عامہ کے مورد ہیں۔ ہدایت یافتہ بھی ہیں کہ انہوں نے مصیبت کے وقت میں جب کہ یہ موقع تھا کہ کوئی کلمہ شکایت کا زبان سے نکل جاوے اور خداوند ذوالجلال کی ناراضگی اور دوری اور مہجوری کا سبب بن جاتے تو ایسے وقت میں قرب خداوندی اور اس کی خوشنودی کا راستہ نکال لیا اور اُدھر ہی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کمال ہدایت یہی ہے کہ ہر طرف سے اپنے مطلب کا کھوج لگا لے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۭ	کوئی مصیبت بغیر اللہ کے حکم کے نہیں پہنچتی اور جو شخص اپنے ایمان مصیبت میں ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے قلب پر ہدایت اور معرفت کی راہ کھول دیتے ہیں۔

فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں یہ منقول ہے نعم العدلان و نعم العلاوۃ یعنی اس آیت میں حق تعالیٰ نے صابرین کے لیے تین چیزوں کا وعدہ فرمایا۔ ایک صلوات اور دوسرے رحمت اور تیسرے ہدایت۔ فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ صلوات اور رحمت جو ایک دوسرے کے قرین اور عدیل ہیں۔ یہ دونوں کیا اچھے عدیل ہیں اور ہدایت ان عدلین کے علاوہ ہے یعنی ایک زیادتی ہے جو صلوۃ اور رحمت پر زیادہ ہے۔

فائدہ (۱) اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصیبت کے وقت تسلی کے دو طریقے ارشاد فرمائے۔ ایک عقلی اور ایک طبعی عقلی تو یہ ہے اِنَّا لِلّٰهِ ہم سب اللہ کی ملک ہیں جس کو چاہے دنیا میں رہنے دے اور جس کو چاہے آخرت میں بلالے۔ عقل سلیم تسلیم کرتی ہے کہ مالک کو اختیار ہے کہ اپنی ملک میں جو چاہے تصرف کرے لہٰذا کسی عزیز کے مرنے پر شکایت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کی ملک میں دو گھوڑے ہوں ایک کو یہاں باندھ دے اور دوسرے کو دوسری جگہ باندھ دے تو کسی کو اعتراض کا حق نہیں۔ یا مالک کسی چیز کو اوپر کی منزل میں رکھ دے اور کسی کو نیچے کی منزل میں رکھ دے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے جس کو چاہیں دنیا میں رکھیں اور جس کو چاہیں آخرت میں رکھیں۔

اور طبعی یہ ہے وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ یعنی ہم سب کو وہیں جانا ہے اور وہی ہمارا وطن اصلی ہے اور یہ دنیا تو ایک جیل خانہ ہے۔ اب اگر کسی کو جیل خانہ اور چاہ زندان سے نکال کر گلستان اور بوستان میں لے جا کر بٹھا دیا تو حقیقت میں خوشی کا مقام ہے کہ بجائے غم کدہ کے عشرت کدہ مل گیا۔ غرض یہ کہ ایک جملہ یعنی اِنَّا لِلّٰهِ میں عقلی تسلی ہے اور دوسرے جملہ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ میں طبعی تسلی ہے یہ تو تسلی ہوئی۔ مگر باایں ہمہ شریعت نے حزن و ملال اور رونے اور آنسو بہانے کی ممانعت نہیں کی کہ وہ غیر اختیاری امر ہے بلکہ اس میں ایک قسم کی فضیلت بھی رکھ دی اور یہ فرمایا کہ ھی رحمۃ یعنی آنسو بہانا بھی خداتعالیٰ کی رحمت ہے۔ سبحان اللہ شریعت کی خوبی کو دیکھیے کہ عقل کی اور طبیعت کی اور جذبات کی سب ہی

کی روایت ہے۔

(ملخص از وعظ الصبر و الصلوٰۃ، وعظ دوم از سلسلہ التبلیغ از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ)

فائدہ ۲: خبر کر دی۔ یہ وہاں مصیبت کی پہلے ہی سے خبر دے دی جائے تو صبر آسان ہو جاتا ہے دفعۃً مصیبت آنے سے آدمی گھبرا جاتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان مصائب کی پہلے ہی خبر دیدی تاکہ صبر آسان ہو جائے۔

فائدہ ۳: امام شافعیؒ سے منقول ہے کہ آیت میں خوف سے خوف خدا مراد ہے اور جوع سے رمضان کے روزے اور اموال کی کمی سے زکوٰۃ اور صدقات مراد ہیں اور انفس میں جانوں کے نقصان سے امراض اور بیماریاں مراد ہیں اور ثمرات کے نقصان سے اولاد کا مرنا مراد ہے کیونکہ اولاد انسان کی زندگی کا پھل ہے۔

جامع ترمذی میں ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ جب فرشتے کسی مرد مومن کے بچہ کی روح قبض کر کے لے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتے ہیں۔

اقبضتم ولد عبدی — کیا تم نے میرے بندہ کے بچہ کی روح قبض کر
فیقولون نعم فیقول اقبضتم — لی؟ کیا تم نے میرے بندہ کے ثمرۂ قلب کو لے
ثمرۃ قلبہ فیقولون نعم — لیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں جی ہاں۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تو میرے بندہ نے اس مصیبت پر کیا کہا؟ عرض کرتے ہیں کہ آپکے بندہ نے اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھی، اور آپ کی حمد و ثنا کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندہ کے لیے جنت میں ایک محل تیار کرو اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔
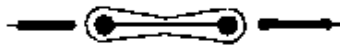
اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ

صفا اور مروہ جو ہیں نشان ہیں اللہ کے پھر جو کوئی حج

الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ

کرے اس گھر کا یا زیارت تو گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے ان دونوں میں

وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝

اور جو کوئی شوق سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدردان ہے سب جانتا ہے

استشہاد بر فضیلت صبر

قال تعالیٰ۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ۔۔۔ الیٰ۔۔۔ فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ

[ربط] گزشتہ آیات میں صابرین کے لیے اپنی معیت اور صلوات اور رحمت اور ہدایت کا ذکر فرمایا اب آئندہ آیات میں اس کی ایک دلیل اور ایک شاہد ذکر فرماتے ہیں۔ یعنی حضرت ہاجرہؑ اور حضرت اسماعیلؑ کے صبر جمیل کی ایک یادگار ذکر فرماتے ہیں کہ صفا اور مروہ کی سعی اسی صبر کی یادگار ہے جنکو صبر کی برکت سے معیت خاصہ سے سرفراز فرمایا اور اپنی صلوات اور رحمتیں ان پر نازل کیں۔ اور اس یادگار صبر کے بیان سے بحث قبلہ اور مناسک حج و عمرہ کی بھی تکمیل ہو جائے گی اور نیز وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ سے بھی سلسلۂ کلام مربوط ہو جائے گا۔ ابتلاء اور امتحان ہی سے سلسلۂ کلام کا آغاز ہوا اور ابتلاء اور امتحان ہی پر اسکا اختتام ہوا۔ نیز ابتدائے قصہ میں امامت کا ذکر تھا۔

إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا — میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا۔

اور منصب امامت کے لیے صبر کامل اور ایقان تام ضروری ہے۔ کما قال تعالیٰ

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا	اور کیے ہم نے ان میں سردار جو راہ چلاتے
لَمَّا صَبَرُوا ۖ وَكَانُوا بِآيَاتِنَا	ہمارے حکم سے جب وہ ٹھہرے رہے
يُوقِنُونَ ۔	اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے۔

اس لیے سلسلۂ کلام کو صبر کے فضائل اور برکات اور اسکے شواہد اور ثمرات پر ختم فرمایا۔

شان نزول صفا اور مروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے لوگ ان دو پہاڑیوں کے درمیان میں طواف کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں کافروں نے ان پر دو بت رکھ دیے تھے اور انکی تعظیم کرتے اور انکا استلام کرتے اور یہ سمجھتے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لیے ہے جب زمانۂ اسلام کا آیا اور مسلمانوں کو سعی بین الصفا والمروۃ کا حکم ہوا تو مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف ان بتوں کی تعظیم کے لیے ہے اور بتوں کی تعظیم اسلام میں ممنوع ہے اس لیے صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تحقیق کوہ صفا اور کوہ مروہ اور پہاڑیوں کی طرح معمولی پہاڑ نہیں مگر حضرت ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کے رضاء بالقضاء کی برکت سے خدا کی یادگاروں میں سے ہو گئے۔ اور ان کا طواف مناسک حج سے بنا دیا گیا سو جو شخص حج بیت اللہ یا عمرہ کا ارادہ کرے اس پر صفا اور مروہ کی سعی اور طواف میں ذرہ برابر گناہ نہیں محض کافروں کی مخالطت سے شبہ میں مت پڑو۔ صفا اور مروہ در اصل شعائر الٰہیہ میں سے ہیں اور ان کا طواف سراسر خیر اور عبادت ہے۔ اور جو شخص کوئی خیر اور نیکی شوق اور رغبت سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی قدر دانی

فرماتے ہیں اور اسکی نیت اور اخلاص کو خوب جانتے ہیں۔ اور بقدر اخلاص کے اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔

ف (۱) شعائر شعیرۃ یا شعارۃ کی جمع ہے جسکے معنی علامت اور نشانی کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں شعائر ان افعال کو کہتے ہیں کہ جنکے ذریعہ سے آدمی کا مسلمان ہونا ظاہر ہوتا ہے اور انکو شعائر اسلام بھی کہتے ہیں۔

ف (۲) آیت شریفہ کا مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی کے حکم سے بتوں کی مشابہت کا خیال ہوا تو یہ آیت نازل ہوئی جسکا حاصل یہ ہے کہ صفا اور مروہ اصل میں خدا کی یادگاریں ہیں۔ اور کافروں کی مشابہت امر عارضی ہے وہ اس میں موثر نہ ہوگی جب کہ نیت خالص اللہ کی ہو جیسے خانہ کعبہ چند روز غلبۂ کفار کی وجہ سے بیت الاصنام یعنی بت خانہ بن گیا لیکن اسکا قبلہ اور مطاف ہونا ساقط نہ ہوا۔ اس لیے کہ جو شے بالذات بھلی ہے وہ عوارض کی وجہ سے زائل اور ساقط نہیں ہوتی اس لیے مسلمانوں کو صفا اور مروہ کی سعی میں کوئی تردد اور تامل نہ ہونا چاہیے۔ مشابہت کفار اس وقت موجب حرمت ہوتی ہے کہ جب کسی شئے کا شعائر اللہ میں سے ہونا کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جیسے تعظیم نوروز اور ہولی اور دوالی اور دسہرہ اور نصاریٰ کی کرسمس اور جو افعال اللہ کے نزدیک مشروع و محبوب و پسندیدہ ہیں ان میں کفار کی مشابہت موثر نہیں جیسے حج اور عمرہ اور ختنہ اور عقیقہ اور قربانی اور کسوف کے وقت صدقہ اور غلاموں کا آزاد کرنا۔ مشرکین عرب میں رائج تھا۔

ف (۳) سعی بین الصفا والمروۃ امام شافعیؒ کے نزدیک فرض ہے اور امام اعظم ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے اور امام احمدؒ کے نزدیک مستحب ہے جیسا کہ لا جناح کے لفظ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمل ضروری اور واجب نہیں۔ بخاری اور مسلم میں ہے کہ عروۃ بن الزبیرؓ نے عائشہ صدیقہؓ سے عرض کیا کہ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا کہ کوئی گناہ نہیں کہ صفا اور مروہ کا طواف کرے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے آیت کا یہ مطلب نہیں جو تو نے سمجھا۔ اگر آیت کا وہ مطلب ہوتا جو تو نے بیان کیا تو عبارت قرآنی اس طرح ہوتی فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ بِهِمَا یعنی اس شخص پر کوئی گناہ نہیں جو صفا اور مروہ کا طواف ترک کرے اور یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی جن کا قصہ یہ ہے کہ انصار قبل اسلام مناۃ کی عبادت کرتے تھے اور جب مسلمان ہوئے اور سعی بین الصفا والمروہ کا حکم ہوا تو کفار کی مشابہت کی وجہ سے دل تنگ ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔ (بخاری و مسلم)

چونکہ انصار پر کفار کی مشابہت کی وجہ سے سعی بین الصفا والمروہ کا کرنا گراں گزر رہا تھا اس لیے اس گرانی کے دفع کرنے کے لیے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ فرمایا اور یہ بتلا دیا کہ اس میں کوئی گناہ نہیں جس سے ترک کی اجازت دینا مقصود نہیں ورنہ اگر ترک سعی کی اجازت دینا مقصود ہوتی تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ لَّا يَطَّوَّفَ فرماتے یعنی کوئی حرج نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ نہ کرے۔ غرض یہ کہ آیت میں لا جناح کا لفظ طواف بین الصفا والمروہ کرنے کے متعلق آیا ہے سعی کرنے کی اجازت ہے ترک طواف کی

ترک سعی کے مطابق لا جناح نہیں فرمایا کہ جس سے ترک سعی کی اجازت مفہوم ہوتی۔ علاوہ ازیں اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ لا جناح کا لفظ محض اباحت پر دلالت کرتا ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ لفظ محض خوف حرج رفع کا فائدہ دینے کی باعث اور جواز پر دلالت نہیں کرتا بلکہ سعی پر دلالت کرتا ہے کہ صفا اور مروہ کا طواف بتوں کے ہوتے ہوئے بھی صفا و مروہ کا طواف جائز ہے۔ مثلاً کوئی شخص یہ مسئلہ دریافت کرے کہ جس کپڑے پر تھوڑی سی نجاست لگی ہوئی ہو اس کپڑے میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو یہ جواب دیا جائے گا لا جناح علیک ان تصلی فیہ یعنی ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج اور گناہ نہیں۔ تو اس عبارت سے لفظ نماز کی اباحت اور جواز نہیں سمجھی جاتی بلکہ قلیل نجاست کی حالت میں نماز پڑھنے کا جواز مفہوم ہوتا ہے اسی طرح یہاں سعی واجب ہے اور بتوں کی نجاست کا موجود ہونا جس کی وجہ سے انصار کو گرانی تھی وہ جائز اور مباح ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ
جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارا صاف حکم

وَالْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ
اور راہ کے نشان بعد اس کے کہ ہم ان کو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں

أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا
ان کو لعنت دیتا ہے اللہ اور لعنت دیتے ہیں سب لعنت کرنے والے مگر

الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ
جنہوں نے توبہ کی اور سنوارا اور بیان کر دیا تو ان کو معاف کرتا

عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
ہوں اور میں ہوں معاف کرنے والا مہربان جو لوگ منکر ہوئے

وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَ
اور مر گئے منکر ہی انہیں پر ہے لعنت اللہ کی اور

الْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا
فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی رہا کریں گے اس میں

وجہ سے خراب اور برباد ہو رہے تھے انکی اصلاح کر دی اور گذشتہ غلطیوں کا تدارک کر دیا اور جس حق کو چھپایا تھا اسکو لوگوں کے سامنے بیان کر دیا تو ایسے لوگوں کو میں معاف کر دیتا ہوں اور بجائے لعنت کے ان پر رحمت نازل کرتا ہوں اور میں تو بڑا ہی توبہ کا قبول کرنے والا اور بڑا ہی مہربان ہوں کہ توبہ کرنے سے لعنت کو رحمت سے اور سزا کو انعام سے بدل دیتا ہوں۔ تحقیق جو لوگ حق پوشی کی وجہ سے کفر کی حد تک پہنچ گئے اور بدون توبہ کے کفر کی حالت میں مر گئے ایسے لوگوں پر اللہ کی اور تمام فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی مستقل لعنت ہے۔ حتی کہ خود ان کی بھی ان پر لعنت ہے اس لیے کہ یہ کافر خود یہ کہتے ہیں کہ جو دیدہ و دانستہ حق کو چھپائے اس پر اللہ کی لعنت اور یہ نہیں سمجھتے کہ ہم بھی خود اس عموم میں داخل ہیں۔ اور یہ لوگ ہمیشہ اسی لعنت میں رہیں گے۔ یہ لعنت کبھی ان سے منقطع نہ ہوگی کیونکہ بغیر توبہ کے مرے ہیں۔ علاوہ ازیں انکے عذاب میں تخفیف نہ ہوگی بلکہ دم بدم زیادتی ہوتی رہے گی۔ دنیا میں جن جن ان کا کفر اور تمرد بڑھتا تھا آخرت میں عذاب بڑھتا رہے گا اور نہ انکو مہلت دی جائے گی کہ کچھ دیر آرام کر لیں اور دم لے سکیں کہ عذاب سہنے کی کچھ قوت آجائے اس لیے کہ عذاب میں تخفیف اور مہلت یہ بھی ایک قسم کا لعنت سے نکلنا ہے جو ان کے حق میں ناممکن اور محال ہے۔

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ

اور تمہارا رب ایک رب ہے کسی کو پوجنا نہیں اسکے سوا بڑا مہربان ہے

الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾

رحم والا

اعلانِ توحید

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ۔

ربط: گذشتہ آیات میں اللہ کے احکام چھپانے والوں پر لعنت اور عذاب کا ذکر فرمایا آئندہ آیت میں حق تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کا ذکر فرماتے ہیں کہ وہی ایک معبود ہے اسکے سوا کہیں پناہ نہیں جو اسکی لعنت سے تم کو چھڑا سکے اور اس کے سوا کوئی رحمان اور رحیم نہیں جو خدا کی لعنت اور لعنت کو رحمت اور عنایت سے بدل دے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارا معبود ایک ہی ہے وہی رحمان اور رحیم ہے۔ رحمت عامہ اور خاصہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے اس لیے بدون اسکی رحمت کے لعنت سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں اگر خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ تم کو اسکی لعنت سے نکال لیتا اور

تم پر رحمت کرتا، لیکن اسکے سوا کوئی خدا نہیں جو رحمت عامہ اور خاصہ کا مالک ہو اور عجیب نہیں کہ اس عذاب میں اہل کتاب کو تہدید اور عتاب ہو کہ باوجودیکہ توریت اور انجیل میں اللہ کی توحید کی صریح آیتیں مذکور ہیں، پھر بھی تم حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیتے ہو اور اس طرح شرک میں مبتلا ہو اور اس توحید کو جو تم کو معلوم ہے چھپاتے ہو۔ مطلب یہ کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپانے کی وجہ سے بھی مستحق لعنت ہوئے اور توحید خداوندی کے اخفاء اور کتمان کی وجہ سے بھی مورد لعنت بنے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ

آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور

الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ

دن کا بدلتے آنا اور کشتی جو لیکر چلتی ہے دریا میں

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ

جو چیزیں کام آویں لوگوں کو اور وہ جو اللہ نے اتارا آسمان سے

مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا

پانی پھر جلایا اس سے زمین کو مر گئے پیچھے اور بکھیرے اس میں

مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۪ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ

سب قسم کے جانور اور پھیرنا ہواؤں کا اور ابر جو حکم کا

الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

تابع ہے درمیان آسمان اور زمین کے ان میں نشانے ہیں

يَّعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾

عقلمند لوگوں کو

دلائل توحید

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ... الی ... لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔

(ربط) جب آیۃ وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ نازل ہوئی تو مشرکین نے تعجب سے کہا کہ کیا سارے
جہان کا ایک ہی خدا ہے اگر ایسا ہے تو اس پر کیا دلیل ہے اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں
جن میں توحید کے دلائل بیان فرمائے کہ علویات اور سفلیات اور متوسطات اور ان کے احوال وصفات سب
دلائل وحدانیت اور ربانیت کی دلیل ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق (۱) آسمانوں اور (۲) زمین کی پیدائش
میں (۳) اور دن ورات کی آمد ورفت اور ان کے مختلف ہونے میں (۴) اور ان جہازوں اور کشتیوں میں
کہ جو دریا میں لوگوں کی منافع کی چیزوں کو لیکر چلتی ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کو آدمی اور سامان
پہنچاتی ہیں جہاں آدمیوں اور جانوروں کا پہنچنا ممکن نہیں (۵) اور اس پانی میں کہ جو اللہ تعالیٰ نے آسمان
سے نازل کیا اور پھر اس پانی سے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا یعنی خشکی اور قحط سالی کے بعد قسم قسم کے
پھول اور پھل اس میں اگ آئے (۶) اور ہر قسم کے جانور اس میں پھیلائے (۷) اور ہواؤں کے پھیرنے میں
کبھی مشرق کا چلنا اور کبھی مغرب کا اور کبھی شمال کا اور کبھی جنوب کا (۸) اور اس ابر میں کہ جو آسمان
اور زمین کے درمیان معلق ہے حالانکہ ہزاروں من پانی سے بھرا ہوا ہے باوجود اس عظیم ثقل کے زمین پر گر نہیں
جاتا۔ ان تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی وحدت اور رحمت کے عجیب وغریب دلائل اور براہین ہیں ان لوگوں
کے لیے جو اپنی عقل کو نظر اور فکر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمام چیزیں حق تعالیٰ کی کمال قدرت اور کمال حکمت
اور اس کی وحدانیت اور رحمت پر مختلف طرح سے دلالت کرتی ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) آسمانوں میں غور کیجئے کہ تمام آسمان حقیقت اور طبیعت جرمیہ کے اعتبار سے ایک ہی ہیں مگر کوئی چھوٹا
ہے اور کوئی بڑا اور پھر کواکب اور نجوم ثوابت اور سیارات، شمس اور قمر اور زہرہ اور مریخ اور مشتری میں
غور کیجئے ہر ایک کی شان جدا ہر ایک کا رنگ جدا، ہر ایک کی حرکت جدا اور حرکت کی سمت اور جہت جدا
ہر ایک کا رخ جدا۔ ہر ایک کا طلوع اور غروب جدا۔ اس عجیب نظام کو دیکھ کر ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ کارخانہ
خود بخود نہیں چل رہا بلکہ کسی علیم وقدیر اور حکیم وخبیر کے ارادہ اور مشیت سے اس کا انتظام چل رہا ہے اور کوئی
اس کا شریک اور سہیم نہیں۔ اور افلاک اور شمس وقمر کی حرکات سے منافع عالم وابستہ ہیں یہ اس کی کمال رحمت کی دلیل ہے
(۲) اور علی ہذا زمین کی پیدائش بھی اس کی وحدانیت اور رحمت کی دلیل ہے۔ زمین کے قطعات کا مختلف الخواص
اور مختلف الطبیعت ہونا کہ کسی زمین سے گیہوں پیدا اور کسی سے اناج۔ اور کسی سے بادام پیدا ہو اور
کسی سے آم۔ کسی زمین کے بسنے والے عاقل اور کسی جگہ کے بسنے والے ایسے کودن اور ناداں کہ بعض چیزوں
میں حیوان بھی ان سے بہتر نکلے یہ اختلافات کہاں سے آگئے اور کس طرح آگئے۔ زمین کا مادہ اور طبیعت تو
ایک ہی ہے وہ کون ذات ہے کہ جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کو شور اور بنجر بنایا اور دوسرے کو سرسبز
اور مرغزار بنایا یہ سب اسی علیم وقدیر کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ جس کی قدرت اور حکمت کے سمجھنے سے تمام
عالم قاصر اور عاجز ہے یہ دلیل تو وحدانیت کی ہوئی اور زمین رحمت خداوندی کی دلیل اس طرح سے ہے کہ
تمام عالم کے بسنے والے اسی زمین پر چل کر اپنی حاجتیں پوری کرتے ہیں اسی سے پیدا شدہ غذاؤں اور پھلوں

اور چشموں اور نہروں سے نفع اٹھاتے ہیں اور تمام سونا اور چاندی وغیرہ وغیرہ سب اسی زمین میں اللہ کی
قدرت سے پیدا ہوتا ہے۔ کانوں کا مختلف ہونا اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اور ان کا نافع اور مفید ہونا اس
کی رحمت کی دلیل ہے۔ آسمان اور زمین علیحدہ علیحدہ بھی نعمت ہیں اور دونوں مل کر بھی رحمت ہیں اس لیے
آسمان اور زمین کے خصائص اور تفاعل سے جو منافع اور فوائد پیدا ہوتے ہیں وہ ان کے ادراک سے عقل
قاصر ہے۔

(۳) اور اسی طرح لیل و نہار کا مختلف ہونا کبھی دن ہے کبھی رات۔ کبھی دن بڑا اور رات چھوٹی۔ اور کبھی اس
کا برعکس، کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے؟ یہ کسی قادر مطلق کے ہاتھ میں اس کی ڈور ہے، اگر دن نہ ہوتا اور فقط
رات ہوتی تو تمام عالم مستمر اور دائم ظلمت اور تاریکی کی مصیبت میں گرفتار رہتا اور چلنا پھرنا مشکل ہو جاتا
اور اگر رات نہ ہوتی فقط دن ہی دن ہوتا تو تمام عالم گرمی سے جھلا اٹھتا اور کھیتیاں جل کر خاک ہو جاتیں اور
اس راحت اور آرام سے کہ جو رات کی بدولت سے حاصل ہوتا ہے تمام جہان یک لخت محروم ہو جاتا
معلوم ہوا کہ لیل و نہار کا اختلاف جس طرح اس کی وحدانیت کی دلیل ہے اسی طرح اس کی رحمانیت کی بھی
دلیل ہے۔

(۴) اور علی ہذا جہاز اور کشتی بھی اس کی قدرت اور رحمت کی دلیل ہے۔ ایک تولہ لوہا یا تانبہ ایک منٹ
کے لیے پانی پر نہیں ٹھہرتا مگر جہاز اور کشتی کہ جس میں ہزارہا من لوہا اور تانبا لدا ہوا ہوتا ہے ایک ملک سے
دوسرے ملک تک ہزارہا میل طے کر کے صحیح و سالم پہنچتے ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور
رحمانیت کی دلیل ہے۔

(۵، ۶) اور علی ہذا آسمان سے باران رحمت کا نازل ہونا اور زمین کا اس سے سرسبز اور شاداب ہو جانا اور
قسم قسم کے اشجار اور نباتات اور فواکہ و ثمرات کا اس سے پیدا ہونا اور علی ہذا اس سے حیوانات کا ایسا
مختلف الالوان پیدا ہونا کہ ایک کی شکل اور صورت دوسرے کی شکل اور صورت سے نہ ملے یہ بھی اس کی
وحدانیت اور رحمانیت کی دلیل ہے اس لیے کہ یہ اختلاف بے شمار فوائد اور منافع پر مشتمل ہے۔ حق
تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت سے حیوانات دو قسم کے بنائے ایک تو وہ جو بطریق توالد و تناسل پیدا
ہوتے ہیں جیسے انسان اور اونٹ اور بیل اور بکری، اور دوسری قسم وہ ہے جو بطریق تولید پیدا ہوتے ہیں
جیسے ہزارہا حشرات الارض مٹی سے پیدا ہوتے ہیں اور ہزارہا مچھر اور جھینگر برسات کے پانی سے پیدا
ہوتے ہیں۔ ہر ایک کی صورت اور شکل الگ اور ہر ایک کا رنگ الگ جس سے باہمی فرق اور امتیاز کا
نفع اور فائدہ ہوتا ہے اور یہ حق تعالیٰ کی عظیم رحمت اور مہربانی ہے ورنہ اگر سب ایک رنگ اور ایک
شکل کے ہوتے تو پہچاننا ممکن نہ تھا۔ اگر آدمی اور حیوانات باہم ممتاز نہ ہوتے تو کارخانۂ معاش معطل اور
درہم برہم ہو جاتا۔ ایک انسان کے چہرہ میں غور کرو کہ آنکھ بھی ہے اور کان بھی اور ناک بھی ہے اور منہ بھی
سر بھی ہے اور دماغ بھی۔ ایک عجیب و غریب تصویر ہے قوائے عقلیہ اور حسیہ کا مجموعہ ہے اور فیاض ذوالجلال

الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

سخت ہے

استعجاب واستبعاد بر اتخاذ انداد بعد واضح شدن وحدانیت رب عباد

قال تعالیٰ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ ... الیٰ ... وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۔

(ربط) گزشتہ آیت میں اہل عقل اور اہل نظر کا بیان تھا اب اس آیت میں بدعقلوں کا بیان ہے کہ جب اللہ کی وحدانیت اور اس کی رحمانیت کے دلائل اظہر من الشمس ہیں تو عقل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی کو عبادت اور محبت کے ساتھ مخصوص کرتے اور لیکن بعضے آدمی ظاہراً انسانی عقل و شعور رکھتے ہیں اللہ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں مگر حد آدمیت اور دائرۂ انسانیت سے باہر ہیں کہ اللہ کے سوا جو منعم حقیقی ہے ایسے بے سود شریک بناتے ہیں جو قدرت اور نفع و نقصان سے اس درجہ دور تر اور کمتر ہیں کہ خدا سے کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ دلائل اور براہین سے قطعی ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ کا ایک بھی شریک اور ہمسر نہیں ہو سکتا اور یہ لوگ اس درجہ بے عقل ہیں کہ ایک شریک اور ایک ہمسر پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ خدا کے لیے بہت سے شریک اور ہمسر بناتے ہیں اور خدا کے مثل اور برابر ان کو محبوب رکھتے ہیں اور خدا کی طرح ان کی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی طرح ان کے حکموں کو بے چون و چرا واجب الاطاعت سمجھتے ہیں اور ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کی محبت اور اطاعت میں فرق ہونا چاہیے۔ اس لیے اہل ایمان اگرچہ بعض چیزوں کو طبعاً محبوب رکھتے ہیں مگر اس درجہ محبوب نہیں رکھتے کہ ان کو خدا کے برابر کر دیں بلکہ وہ اللہ کی محبت میں بہت سخت اور محکم ہیں اس لیے کہ دنیا میں جو بھی فضل و کمال یا جود و نوال ہے اس کا منبع اور سرچشمہ خداوند ذوالجلال ہے اور مخلوق اس کا عکس اور پرتو ہے اس لیے اہل ایمان خالق کو بالذات محبوب اور مخلوق کو بالعرض محبوب رکھتے ہیں اس لیے کہ محبت محبوب کی عزت اور کمال کے مطابق ہوتی ہے اور عزت اور کمال اور جود و نوال میں خدا سے بڑھ کر کوئی نہیں وہی منعم حقیقی ہے اس لیے راحت اور مسرت، بیماری اور تندرستی، شادی اور غمی کسی حال میں بھی اہل ایمان کی محبت اللہ سے کم نہیں ہوتی۔ بخلاف مشرکین کے کہ جب اپنے معبودوں سے ناامید ہو جاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۔

اور اگر یہ ظالم کہ جنہوں نے خدا کا شریک اور ہمسر بنا کر اپنی جانوں پر ظلم و ستم

کیا اچھا ہو اگر آنے والے وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت انکو عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہوگا تو انکو خوب معلوم ہو جائے کہ سارا زور اللہ ہی کے لیے ہے اور تمام کائنات ضعیف اور عاجز ہے اور سب اللہ کے قہر اور غلبہ کے نیچے دبے ہوئے ہیں سوائے اسکے کوئی بھی نفع اور ضرر کا مالک نہیں اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔ کوئی بت اور کوئی معبود کسی کو اللہ کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتا۔[۱][۲]

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا

جب الگ ہو جاویں جن کے ساتھ ہو گئے تھے اپنے ساتھ والوں سے

وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾

اور دیکھیں عذاب اور ٹوٹ جاویں انکے سب طرف کے علاقے

وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ

اور کہیں گے ساتھ پکڑنے والے کاش کہ ہم کو دوسری بار زندگی ہو تو ہم الگ

كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ

ہو جاویں ان سے جیسے یہ الگ ہو گئے ہم سے اسی طرح دکھلاتا ہے اللہ انکو کام انکے افسوس

عَلَيْهِمْ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾

دلانے کو اور ان کو نکلنا نہیں آگ سے

[۱] خلاصہ اس طرف ہے کہ آیت اذ یرون العذاب میں عذاب سے عذاب اخروی مراد ہے اور اذ کے معنی میں ابتدا کے ہے اس لیے کہ اذ تبرا الذین الخ اذ یرون العذاب سے بھی عذاب اخروی ہی مراد ہوگا۔ اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ عذاب سے دنیوی عذاب اور دنیوی مصائب اور تکالیف مراد ہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت یہ لوگ دنیاوی مصائب اور فقر و فاقہ اور دکھ اور بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس وقت غور و فکر سے کام لیں تو ان پر یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ سارا زور اور قدرت اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ سب عاجز اور درماندہ ہیں اس لیے کہ یہ بت مصیبت اور بلا کو ٹال نہیں سکتے اور جب یہ امر واضح ہو جائے تو پھر کسی کو خدا کے برابر محبوب نہ رکھیں ۱۲ منہ

[۲] اشارۃ الی تقدیر المعمول وھو یعلموا ای القوۃ للہ الخ ۱۲

[illegible]

انجام شرک

قال تعالیٰ اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا ... الیٰ ... وَمَا هُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ

بڑی شدید عذاب کا وقت ۔ وہ وقت ہوگا جب پیشوا اپنے پیروؤں سے الگ اور بیزار ہو جائیں گے اور تابع اور متبوع اثر کرنے والے اور گمراہ ہونے والے دونوں فریق عذاب خداوندی کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے ۔ اور دنیا میں جو باہمی تعلقات تھے وہ اس روز سب منقطع ہو جائیں گے نہ کوئی تابع رہے گا اور نہ کوئی متبوع ہر ایک جرم میں شریک ہوگا سب پر اپنے جرم کی پکڑ پڑی ہوگی ہر ایک کو اپنی فکر ہوگی لیکن اس وقت یہ تبری اور بیزاری ذرہ برابر مفید نہ ہوگی بجز کف افسوس ملیں گے ۔ اور جن لوگوں نے دوسروں کی پیروی کی تھی اور خود دوسروں کے بہکانے سے کفر اور شرک کیا تھا وہ اس وقت تمنا کریں گے کہ کاش ہم کو پھر ایک دفعہ دنیا میں لوٹنے کا موقع ہے تو ہم بھی ان سے اپنا بدلہ لیں اور ہم بھی ان سے اسی طرح بیزار ہوں جس طرح یہ لوگ ہم سے بیزار ہوئے ۔ مگر اس بیزاری سے کچھ سوائے حسرت کے کوئی فائدہ نہ ہوگا اور قیامت کے دن فقط یہی ایک حسرت نہ ہوگی بلکہ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو ان پر حسرتیں بنا کر دکھلائے گا ۔ قیامت کے دن ان کے تمام صدقات اور قربات ایک ایک کر کے ضائع اور رائیگاں ہوں گے اور حسرتوں کی کوئی انتہا نہ ہوگی ۔ اور یہ لوگ کبھی دوزخ سے نکلیں گے ہی نہیں کیونکہ شرک کی سزا دائمی عذاب ہے البتہ گنہگار مسلمان انبیاء اور صلحاء کی شفاعت سے بعد چندے جہنم سے نکال لیے جائیں گے ۔

فائدہ چونکہ مسند الیہ کی تقدیم مفید حصر ہوتی ہے اس لیے آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ عدم خروج من النار کفار کے ساتھ مخصوص ہے جس سے معلوم ہوا کہ کفار کے علاوہ کوئی فریق ایسا بھی ہے جو کہ بعد چندے دوزخ سے نکالا جائے گا وہ گنہگار مسلمانوں کا فریق ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۡ وَّلَا

اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے جو حلال ہے اور ستھری اور نہ

تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ اِنَّمَا

چلو قدموں پر شیطان کے وہ تمہارا دشمن ہے صریح وہ تو یہی

۱؎ اشارۃ الی ان اذ تبرأ الذین اتبعوا متعلق بقولہ شدید العذاب ۱۲

يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ

حکم کرے گا تم کو برے کام اور بے حیائی اور یہ کہ جھوٹ لگاؤ اللہ پر

مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنْزَلَ

جو تم کو معلوم نہیں اور جب ان کو کہیے چلو اس پر جو نازل کیا

اللّٰهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَآءَنَا ۗ أَوَ

اللہ نے کہیں نہیں ہم چلیں گے اس پر جس پر دیکھا اپنے باپ دادوں کو بھلا

لَوْ كَانَ آبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾

اگرچہ انکے باپ دادا نہ عقل رکھتے ہوں کچھ نہ راہ کی خبر

وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا

اور مثال ان منکروں کی جیسے مثال ایک شخص کی کہ چلاتا ہے ایک

لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَآءً وَنِدَآءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ

چیز کو جو کچھ نہیں سنتی سوا پکارنا اور چلانا بہرے گونگے اندھے ہیں

فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

سو ان کو عقل نہیں

خطاب عام و تذکیر انعام و ابطال رسوم شرکیہ و تفصیل حلال و حرام

قال تعالیٰ یَا أَیُّہَا النَّاسُ کُلُوا مِمَّا فِی الْأَرْضِ حَلَالًا طَیِّبًا ... الیٰ ... فَہُمْ لَا یَعْقِلُونَ ۔

ربط: گزشتہ آیات میں عقیدۂ شرک کی قباحت اور مشرکین کی تشنیع و تجہیل فرمائی، اب آئندہ آیات میں رسوم شرکیہ اور افعال کفریہ کا ابطال اور حلال و حرام کی تفصیل فرماتے ہیں۔

ربط دیگر: گزشتہ آیات میں حق تعالیٰ کا معبود برحق اور رحمن و رحیم ہونا بیان فرمایا، ان آیات میں حق تعالیٰ کا رازق ہونا بیان فرماتے ہیں کہ وہی رازق ہے اور وہی تمام ارزاق کا خالق ہے جس چیز کو

وہ حلال کر دے وہ حلال ہے اور جس چیز کے استعمال کو منع فرمائے وہ حرام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے لوگو
جب تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں کا یہ ظلم ہے صحبت سے کچھ نہیں تو ایسے چیزوں اول
کو ان کے پیرو مت چلو اور ان کے کہنے سے کسی چیز کو اپنے اوپر حلال اور حرام نہ کرو کیونکہ یہ بھی خدا تعالیٰ
کے ساتھ ایک قسم کا شرک ہے حلال و حرام ہونا محض اللہ کے حکم کے تابع ہے اس لیے کہ سب چیزیں
اللہ ہی کی ملک ہیں کسی کو اللہ کی ملک میں تصرف کا حق حاصل نہیں کہ حلت و حرمت کا حکم لگائے۔ لہذا
تم اس فعل قبیح سے توبہ کرو اور کھاؤ اس چیز سے جو اللہ نے زمین میں پیدا کی بشرطیکہ وہ حلال بھی ہو اور
پاکیزہ بھی ہو۔ اور حلال وہ ہے کہ جس کی شریعت نے ممانعت نہ کی ہو اور طیب وہ ہے جو بالکل پاک
اور صاف ہو کسی غیر کا حق اس سے متعلق نہ ہو۔ مثلاً غصب اور خیانت اور رشوت اور چوری یا کسی اور ناجائز
طریقہ سے اس کو حاصل نہ کیا گیا ہو اس لیے کہ جو چیز فی حد ذاتہ حلال ہو مگر دوسرے کا حق اس کے ساتھ متعلق
ہو تو اس کا کھانا بھی جائز نہیں جیسے کوئی شے اصل میں تو پاک ہو اور بعد میں نجاست آلودہ ہو جائے تو اس
کو کھانا جائز نہیں رہتا۔ اور حلت اور حرمت میں اللہ کے حکم کا اتباع کرو اور شیطان کے قدموں کی پیروی
نہ کرو اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے شیطانی وسوسوں کی بنا پر اس کے کھانے سے پرہیز نہ کرو
تحقیق وہ شیطان تمہارا قدیمی اور کھلا دشمن ہے اس کے کہنے میں نہ آنا دشمنی میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتلاتا ہے
جز این نیست کہ وہ تم کو برائی کا حکم دیتا ہے تاکہ عذاب آخرت کے مستحق ہو جاؤ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے
تاکہ مخلوق کی نظر میں بھی حقیر ہو جاؤ۔

ف (۱) سوء کا تعلق افعال سے ہے اور فحشاء کا تعلق اخلاق سے ہے۔ اور نیز شیطان تم کو اس بات کا بھی حکم دیتا ہے کہ تم اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کا تم کو علم نہیں۔ ایسے ہی مزعومہ اعمال کی ان کو تلقین کرتا ہے جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔

ف (۲) بدعت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ جس کام کو اللہ نے موجب ثواب قرار نہیں دیا آپ اس کو بلا دلیل شرعی موجب ثواب قرار دے۔

ف (۳) شیطان کبھی نیک کام کا بھی حکم کرتا ہے جیسا کہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ شیطان کو تہجد یا صبح کی نماز کے لیے جگانے آیا سو وہ اس آیت کے معارض نہیں اس لیے کہ شیطان اگرچہ ظاہر میں نیکی کا حکم کرتا ہے لیکن مقصود اس کا بدی ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر گناہ نہیں کرتا تو کم از کم اس کو چھوٹی طاعت میں لگا دیا جاوے تاکہ بڑی عبادت کر کے اجر عظیم نہ حاصل کر سکے۔

ع ہر چہ گیرد علتی علت شود

اور یہ لوگ دام شیطانی میں اس درجہ گرفتار ہیں کہ آبائی رسوم کو حکم خداوندی سے بڑھ کر سمجھتے ہیں
حتی کہ جب ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ حکم کا اتباع کرو اور اپنے باپ دادا کے طریقہ کو
چھوڑ دو تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے حکم کو نہیں جانتے بلکہ ہم اس رسم کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے

آباؤ اجداد کو پایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ کیا یہ لوگ اپنے آباؤ اجداد کا اتباع کریں گے اگرچہ وہ نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوں۔ دنیاوی امور میں اگرچہ بڑے عاقل اور ہوشیار ہیں لیکن دین اور آخرت کی عقل سے کورے ہیں، جیسا اس دور کے عقلاء بنے بیٹھے ہیں۔ دانایانِ فرنگ کو دیکھو جن کی عقل کا ڈنکا ہر جگہ عالم میں بج رہا ہے وہ دین میں ایک اور ایک تین کے قائل ہیں۔

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی کے روحانی یا جسمانی آباؤ اجداد عقل بھی رکھتے ہوں اور ہدایت یافتہ بھی ہوں اور ما انزل اللہ کے احکام اور ہدایات کو خوب سمجھتے ہوں تو ایسے آباؤ اجداد کا اتباع اور تقلید عین عقل اور عین ہدایت بلکہ عین ما انزل اللہ کا اتباع ہے۔ حکم خداوندی کے خلاف کسی کا اتباع بلاشبہ گمراہی ہے لیکن حکم خداوندی کے سمجھنے کے لیے اگر کم عقل والا اپنے سے زیادہ عقل والے کا اتباع کرے تو عین ہدایت اور مقتضائے عقل ہے۔ آئندہ آیت میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فقط بے عقل ہی نہیں بلکہ فی الحقیقت حدود انسانیت سے خارج ہیں جانوروں کی طرح ہیں اخیار کے حسن و قبح اور نفع اور ضرر کو نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ کون سا گھاس اچھا ہے اور کون سا گھاس کڑوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دل ان کا حق کے اعتبار سے مردہ ہے، ان کافروں کی مثال اس شخص کی سی ہے کہ جو بھیڑ بکریوں اور جانوروں کو چلا چلا کر پکار رہا ہو اور وہ جانور سوائے بلانے اور پکارنے کے کچھ نہ سنتا ہو، یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ واعظ اور ناصح کی آواز تو سنتے ہیں مگر اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے یہ لوگ اگرچہ بظاہر سب سنتے ہیں مگر حقیقت میں بہرے ہیں کلمۂ حق نہیں سن سکتے باطل کے حق میں بولنے والے مقرر ہیں لیکن حق کے حق میں گونگے ہیں۔ حق بات زبان سے نہیں نکل سکتی۔ سب کچھ دیکھتے ہیں مگر دل کے اندھے ہیں حق اور باطل کا فرق نظر نہیں آتا۔ پس ثابت ہوا کہ ان کے تمام حواس جو عقل کے مبادی اور مقدمات ہیں وہ سب معطل ہو گئے ہیں، اس لیے یہ لوگ حق اور ہدایت کو کچھ نہیں سمجھتے پس یہ لوگ جانوروں کی طرح عقل معاش رکھتے ہیں آخرت کی عقل سے عاری اور کورے ہیں۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ

اے ایمان والو! کھاؤ ستھری چیزیں جو ہم نے روزی دی تم کو

وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا

اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے بندے ہو اس نے تو

حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ

حرام کیا ہے تم پر مردہ اور لہو اور گوشت سور کا اور

مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ

جس پر نام پکارا اللہ کے سوا کا پھر جو کوئی پھنسا ہو نہ

بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ

بے حکمی کرتا ہے اور نہ زیادتی تو اس پر نہیں گناہ بیشک اللہ بخشنے والا

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

مہربان ہے

خطاب خاص با اہل اختصاص

قال تعالیٰ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ ... الیٰ ... اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

(ربط) گزشتہ آیات میں خطاب عام تھا۔ اور اس آیت میں خاص اہل ایمان کو خطاب ہے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ایمان اور محبت خداوندی کا اقتضاء یہ ہے کہ خدا کے رزق کو کھاؤ اور شکر کرو۔ کُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّکُمْ وَاشْکُرُوْا لَہٗ۔ الآیۃ نعمت کے استعمال سے منعم کی محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر کرنے سے نعمت میں زیادتی ہوتی ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے کہ اکل حلال سے دعا اور عبادت قبول ہوتی ہے۔ اور اکل حرام سے دعا اور عبادت قبول نہیں ہوتی۔ اکل حلال سے مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! ایمان اور محبت کا یہ مقتضیٰ نہیں کہ تم اپنے خیال سے لذیذ اور پاکیزہ چیزوں کو ترک کر دو اور اس کو عبادت سمجھنے لگو بلکہ مقتضائے ایمان اور محبت یہ ہے کہ جو حلال اور پاک چیزیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں انکو رغبت کے ساتھ کھاؤ۔ عاشق تو معشوق کے ہاتھ کی روکھی سوکھی چیز کو بھی خیر ہی سمجھ کر کھاتا ہے تم ہمارے رزق کو اس خیال سے کھاؤ کہ ہم نے تم کو یہ رزق دیا ہے۔ اسباب اور وسائط کو محض پردہ سمجھو اصل مالک اور معطی ہم ہیں۔ عطیہ کے ساتھ تو ہے رغبتی معطی کے ساتھ بے رغبتی کو موہم ہے لہٰذا منعم حقیقی کی طرف سے جو نعمت آئے اس کو بصد شوق و رغبت استعمال کرو۔ تاکہ منعم تم سے راضی ہو۔ اور یہ مت سمجھو کہ پاکیزہ چیزوں کے استعمال سے حظ نفس میں گرفتار ہو جائیں گے جو عبادت سے غفلت کا سبب بنے گا۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ تم اللہ کا شکر کرو۔ تاکہ تمہاری یہ لذت بھی عبادت بن جائے کیونکہ پاکیزہ رزق کھانے سے اللہ کی محبت پیدا ہوگی اور محبت سے شکر نکلے گا اور شکر ایک عظیم عبادت ہے جس سے اللہ کی نعمت اور

حماقت میں زیادتی ہوتی ہے اس طرح تم رزق کو عبادت بنا سکتے ہو اگر تم خالص اللہ کی عبادت کرتے ہو تو اپنے خیال کو اس میں دخل نہ دو اس لیے کہ عبادت سے مقصود رضائے حق ہے وہ جس طرح بھی حاصل ہو۔ ؎

چوں طمع خواہد زمن سلطان دیں خاک بر فرق قناعت بعد ازیں

الغرض پاکیزہ چیزوں کا کھانا ایمان اور عبادت کے منافی نہیں۔ البتہ حرام چیزوں کا استعمال اللہ کی نافرمانی سے دوری کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں جز ایں نیست کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف ایسی چیزوں کو حرام فرمایا جو جسمانی اور روحانی حیثیت سے تمہارے لیے مضر ہیں۔ ایک مردار کو جو خود بخود مر گیا ہو یا خلاف طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو اور بہتے ہوئے خون کو اور خنزیر کے گوشت کو کیونکہ یہ جانور حریص اور بے حیائی اور بے غیرتی اور نجاست خوری میں مشہور ہے جو قومیں خنزیر کھاتی ہیں ان سے حیا اور غیرت و ناموس کی صفت ہو جاتی ہے۔ نیز یہ جانور انسان کے اخلاق کو بہت زیادہ متاثر کرتا ہے اور فضلات انسانی خنزیر کی خاص خوراک ہے اور جس کا گوشت پوست زیادہ تر فضلات انسانی سے پیدا ہوتا ہے لہذا خنزیر کا گوشت کھانا گویا کہ اپنا ہی فضلہ کھانا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا فَإِنَّهُ رِجْسٌ۔ یعنی وہ نجس العین ہے۔

اور حرام کیا اللہ نے اس جانور کو کہ جو بقصد تقرب غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو جس جانور کی جان کو اللہ کے سوا کسی بت یا کسی نبی یا ولی کی روح کے لیے نذر کر دیا جائے اور ان کی رضا اور خوشنودی کے لیے اس کو ذبح کیا جائے تو اس جانور کا کھانا حرام ہے اگرچہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اس لیے کہ جانور کی جان صرف اللہ کی ملک ہے آدمی کی ملک نہیں کہ دوسرے کو بخش دے اس لیے جانور کی جان کو غیر اللہ کے نام زد کر دینا صریح شرک ہے اور ظاہر ہے کہ شرک کی نجاست اور گندگی تمام نجاستوں سے زیادہ سخت ہے لہذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے تو اس شرک کی نجاست اور خباثت اس جانور میں اس درجہ سرایت کر جاتی ہے کہ اگر ذبح کے وقت اللہ کا نام بھی لیا جائے تب بھی وہ جانور حلال نہیں ہوتا جیسے کتا اور سور خدا کا نام لیکر ذبح کرنے سے بھی حلال نہیں ہوتا۔ اور مردار اسی وجہ سے تو حرام ہے کہ اس پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا۔ لہذا جو جانور غیر اللہ کے نام زد کر دیا جائے وہ بدرجہ اولیٰ حرام ہوگا۔ البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد ذبح سے پہلے مالک اس فاسد نیت سے توبہ کر لے اور اس ارادۂ فاسدہ سے رجوع کر لے تو پھر وہ جانور اللہ کے نام پر ذبح کرنے سے حلال ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے

لعن اللّٰہ من ذبح لغیر اللّٰہ	اللہ کی لعنت ہے اس شخص پر جو غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب کی نیت سے جانور ذبح کرے۔

لغیر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ نیت غیر اللہ کی ہو۔ خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لے یا نہ لے اسی طرح مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے معنی یہ ہیں کہ جو جانور غیر اللہ کے نامزد کیا گیا ہو جس سے مقصود غیر اللہ

تعظیم ہو وہ حرام ہے خواہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو یا نہ لیا گیا ہو۔ یہ لفظ قرآن کریم میں چار جگہ آیا
ہے اور سب جگہ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ فرمایا اور کسی جگہ یہ نہیں فرمایا مَا ذُبِحَ بِاسْمِ غَيْرِ اللّٰهِ
کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو۔ غیر اللہ کا نام لیکر ذبح کرنا اور ہے اور غیر اللہ کے تقرب اور رضا
حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنا اور ہے۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ لغیر اللہ اور باسم غیر اللہ کا
فرق معمولی استعداد والوں پر بھی مخفی نہیں۔ اہلال کے لغوی معنی عربی زبان میں شہرت اور آواز دینے کے
ہیں۔ لغۃً اہلال لغت عرب میں ذبح کے معنی میں نہیں آتا۔ چنانچہ سورۂ مائدہ میں مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ
کے بعد وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کو علیحدہ ذکر فرمایا۔ معلوم ہوا کہ اہلال لغیر اللہ اور شئے ہے اور ذبح
لغیر اللہ اور شئے ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس اللہ سرہ نے آیت مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ
کی تفسیر میں ایک مستقل مکتوب تحریر فرمایا ہے جو فارسی میں ہے اور عجیب و غریب حقائق و معارف
پر مشتمل ہے اس مقام پر اس کا خلاصہ اور اہم اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ وہو ہذا۔

حلت اور حرمت کا دار و مدار نیت پر ہے اور ذکر لسانی اسی نیت قلبی کا ترجمان ہے اس لیے بغیر
ذکر لسانی نیت قلبی کا علم ناممکن ہے۔ حدیث میں ہے۔ انما الاعمال بالنیات عمل کی حقیقت بھی
نیت قلبی ہے اور حرکات ظاہری صورت عمل ہیں اگر عمل ہے اور نیت نہیں تو جسم بے جان ہے اور کَسَرَابٍ
بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً کا مصداق ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت اور حرمت کی علت ذبح کے
وقت فقط زبان سے اللہ یا غیر اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ حلت کی اصل علت خالص اللہ کی نیت ہے اور
حرمت کی اصل علت غیر اللہ کی نیت ہے اور آیۂ فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ
اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ میں فقط ذکر لسانی مراد نہیں بلکہ اصل ذکر اور ذکر حقیقی وہ
ذکر قلبی ہے اور ذکر لسانی کو اس لیے ذکر کہا جاتا ہے کہ وہ ذکر قلبی کا ترجمان ہے اس لیے کہ اگر کوئی شخص
دل سے کسی کی یاد میں محو ہو اور زبان سے ساکت ہو تو وہ ذاکر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر زبان سے کسی کا نام لے
اور دل میں کوئی اور بسا ہوا ہو تو حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک یاد کرنے والوں میں اسکا شمار نہیں ہو سکتا
نیت قلبی ایمان کی طرح باطنی شئے ہے اور ذکر لسانی کلمۂ شہادت کی طرح اسکا ترجمان ہے۔ کلمۂ شہادت کو
ایمان کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا ورنہ لازم آئیگا کہ جو کلمۂ اسلام کے تلفظ کے وقت مومن ہوا وہ اس تلفظ
سے پہلے مومن نہ ہو اسی طرح جس شخص نے کسی جانور کے متعلق نیت تقرب غیر اللہ کی کی، جیسا کہ جانور کو غیر خدا کے
لیے نذر کر دیا مگر ذبح کے وقت زبان سے نام اللہ کا لیا تو اسکا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ تقرب غیر اللہ
کی نیت کے بعد ذبح کے وقت محض زبان سے اللہ کا نام لینا محض بے روح ہے۔

مشرکین عرب نیت بھی غیر اللہ ہی کی کرتے تھے اور ذبح کے وقت بھی نام غیر اللہ ہی کا لیتے تھے اور
مومنین مخلصین نیت بھی خالص اللہ ہی کی کرتے تھے اور نام بھی خالص اللہ ہی کا لیتے تھے۔ بعد میں نیت تو

کرتے ہیں غیر اللہ کی۔ اور ذبح کے وقت نام لیتے ہیں اللہ کا۔ یہ یہی ہیں صورت شرک بھی ہے اور الفاظ میں بھی کہ صورت توحید کی ہے اور معنی شرک کے ہیں۔ اس تیسری قسم کا مصداق اس امت کے مشرک ہیں۔ کہ
مَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ ۔ سه

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر ٭ ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

اول کی دو صورتوں میں ظاہر اور باطن میں کوئی تخالف نہیں، اس لیے اس کا حکم ظاہر ہے اور اس تیسری صورت میں ظاہر اور باطن میں تخالف ہے اس لیے کہ باطن میں نیت تو ہے غیر اللہ کی اور ظاہر میں ذبح کے وقت نام ہے اللہ کا۔ اس لیے اعتبار ظاہر کا نہ ہوگا ایسا جانور اگرچہ ظاہر میں فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۔ کی قسم سے معلوم ہوتا ہے لیکن باطن اور حقیقت میں وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۔ کی قبیل سے ہے جس کا مقتضی صریح ممانعت اور حرمت ہے ذکر لسانی کو اگر حلت اور حرمت میں دخل ہے تو باعتبار صورت کے ہے اور مرتبہ ثانیہ میں ہے۔ اور ذکر نہانی اور نیت اندرونی کو باعتبار حقیقت کے مرتبہ اولیٰ میں دخل ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حلت و حرمت میں ذکر لسانی کو تو دخل ہو اور ذکر نہانی کو اس میں دخل نہ ہو۔ پس جس جانور میں نیت تو غیر اللہ کی ہو اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی حقیقت تو دوسری قسم کی ہوگی اور صورت دوسری قسم کی ہوگی۔ اور جب صورت اور حقیقت میں تعارض اور تخالف ہوا تو ترجیح حقیقت کو ہوگی۔

نیز جان کی نذر صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے غیر اللہ کے لیے جان کی نذر جائز نہیں۔ اور اگر بالفرض جان کی نذر غیر اللہ کے لیے جائز ہوتی تو قربانی مثل جملہ عبادات کے نہ ہوتی اور قربانی اور غیر قربانی کے احکام نیت کے فرق پر مبنی ہیں۔

بطور احتمال عقلی یہاں ایک چوتھی قسم اور بھی نکل سکتی ہے جو اس قسم ثالث کا بالکل عکس ہے وہ یہ کہ نیت تو ہے خاص اللہ کے لیے نذر کی مگر ذبح کے وقت نام لیا جائے غیر اللہ کا یہ قسم آج تک کبھی وجود میں نہیں آئی محض احتمال عقلی کا درجہ ہے وجود نفس الامری سے اس کو کوئی حصہ نہیں۔ نیز جاننا چاہیے کہ آیت شریفہ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ میں اہلال باعتبار زمانہ کے عام ہے وقت ذبح کا جو تخصیص اور تقیید اس میں حضرات مفسرین نے عند الذبح زیادہ فرمایا ہے اس کی مراد تقیید اور تخصیص نہیں بلکہ یہ لفظ اس لیے زیادہ کیا ہے کہ نیت سابقہ کا علم اور ظہور ذبح کے وقت ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے تقرب کی نیت ہے تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا۔ اور اگر غیر اللہ کی نیت کی ہے تو ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لے گا۔ نزول آیت کے زمانہ میں اللہ کی نذر اور غیر اللہ کی نذر میں امتیاز اور فرق اسی طرح ہوتا تھا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کی نذر ہے اور غیر اللہ کا نام لیا تو معلوم ہوا کہ غیر اللہ کی نذر ہے اور مشرکین امت کی یہ تیسری قسم کہ نیت تو ہو غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام ہو اللہ کا یہ قسم اس زمانہ میں موجود ہی نہ تھی یہ شرک اور توحید کا معجون مرکب بعد میں نمودار ہوا۔ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ظاہر اور صورت کے اعتبار سے جائز ہوگی تو باطن اور

حقیقت کے اعتبار سے ناجائز ہوگی۔ حاصل یہ کہ عند الذبح کی قید اس زمانہ کے دستور کی طرف اشارہ کے لیے ہے احترازی قید نہیں عند الذبح کی قید اس لیے ذکر فرمائی ہے کہ اشارہ اس طرف ہے کہ اگر کسی نے حیوان کو غیر اللہ کے نام زد کیا اور غیر اللہ کے تقرب کی نیت کی تو اس جانور کی حرمت اسی شرط پر موقوف ہے کہ اس کی یہ نیت ذبح کے وقت تک باقی رہے اور اگر ذبح سے پہلے اس نیت فاسدہ سے توبہ کرلے اور اللہ کے نام پر ذبح کرے تو پھر یہ جانور حرام نہ رہے گا بلکہ حلال ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ عند الذبح کی قید نیت اور فعل ذبح میں مقارنت اور اتصال کے بیان کرنے کے لیے ہے اور تبدیل نیت اور تغیر ارادہ سے احتراز کے لیے ہے کہ اگر غیر اللہ کی نیت فعل ذبح کے ساتھ متصل اور مقرون ہے تب تو وہ جانور حرام ہے اور اگر ذبح سے پہلے نیت بدل جائے تو حرمت بھی مبدل بہ حلت ہو جائے گی۔

نیز عند الذبح میں لفظ عند ظرف زمان ہے جو فعل اور قرآن پر دلالت کرتا ہے مطلقیت پر دلالت نہیں کرتا اور حکم حلت وحرمت کا دارومدار نیت پر ہے نہ کہ زمانہ اور مکان پر اس کا مدار نہیں اور بدلیت حرمت کی علت اہلال لغیر اللہ ہے اور عند الذبح کی قید اہلال اور ذبح میں اقتران بیان کرنے کے لیے ہے یعنی درمیان میں کوئی دوسری نیت فاصل اور متخلل نہیں۔ پس اگر علت یعنی نیت غیر اللہ ابتداء سے اخیر تک یعنی وقت ذبح تک مستمر ہے تو حرمت بھی مستمر ہے اور اگر علت یعنی نیت بدل جائے تو معلول یعنی حرمت بھی بدل جائے گی۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ما اہل بہ لغیر اللہ سے صرف وہی جانور مراد ہے کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور تشہیر سابق اور نیت متقدمہ کو حرمت میں کوئی دخل نہیں تب بھی اثبات حلت کے لیے کافی نہیں اس لیے کہ حرمت فقط ما اہل بہ لغیر اللہ میں منحصر نہیں، مردار اور مغصوب کا گوشت اور مردار خور جانور کا گوشت بھی حلال نہیں حالانکہ وہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں اسی طرح یہ جانور اگرچہ ما اہل بہ لغیر اللہ میں داخل نہ ہو تب بھی حلال نہ ہوگا اس لیے کہ قصد غیر اللہ کے تقرب کی نیت حرمت کے لیے کافی ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم (ماخوذ از مکتوب سوم از مکاتیب قاسم العلوم)

الغرض حق جل شانہ نے ان چیزوں کو حرام فرمایا کہ یہ چیزیں گندی اور ناپاک ہیں ان چیزوں کے استعمال سے انسان کا قلب اور اس کی روح گندہ اور ناپاک ہو جاتی ہے۔ حلال چیزوں کے کھانے سے قلب میں اللہ کی محبت پیدا ہوتی ہے اور حرام چیزوں کے استعمال سے دل سے اللہ کی محبت رخصت ہو جاتی ہے اور قلب میں بجائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معصیت کی رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ گندگی اور نجاست کا کیڑا گندگی ہی سے زندہ رہتا ہے۔ عطر سونگھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن حق تعالیٰ نے شدید مجبوری کی حالت میں ان چیزوں کی حرمت میں کچھ سہولت اور رخصت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس جو شخص بھوک سے نہایت ہی مجبور اور لاچار ہو۔ اور دل سے ان چیزوں کے کھانے سے متنفر اور بیزار ہو پس اگر ایسا شخص ان میں سے کسی چیز کو کھالے

بشرطیکہ وہ طالب لذت نہ ہو اور مقدار حاجت سے تجاوز کرنے والا ہو یعنی سد رمق سے زیادہ نہ کھائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں اس لیے کہ خبیث اور گندی چیز کا بقدر ضرورت استعمال بحالت مجبوری اگر بکراہت قلب اور دلی نفرت کے ساتھ ہو اور لذت کا تصور نہیں کرتا، لیکن آخر گندی چیز تو گندی ہی ہے اس کا کچھ نہ کچھ اثر اور رنگ ضرور آئیگا مگر چونکہ یہ فعل بحالت مجبوری صادر ہوا ہے اس لیے حق تعالیٰ نے اس سے مواخذہ نہ فرمایا اس لیے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں کہ اس ناچاری کی حالت میں جو گندی چیز استعمال کی ہے اس پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے، اور بڑے مہربان ہیں کہ اس پر بڑا رحم فرمایا کہ اس بے چارگی کی حالت میں کھانے کی اجازت عطا فرمائی۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَ

جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب اور

يَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي

لیتے ہیں اس پر مول تھوڑا وہ نہیں کھاتے اپنے

بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ

پیٹ میں مگر آگ اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ قیامت

الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾

کے دن اور نہ سنوارے گا ان کو اور ان کو دکھ کی مار ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ

وہی ہیں جنہوں نے خرید کی گمراہی بدلے راہ کے اور مار

وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾

بدلے بخشش کے سو کیا صبر ہے ان کو آگ پر

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ

یہ اس واسطے کہ اللہ نے اتاری کتاب سچی اور جنہوں نے

اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

سی راہیں نکالیں کتاب میں وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں

ذکر محرمات معنویہ مثل دین فروشی وحق پوشی

قال تعالیٰ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ

ربط: گذشتہ آیات میں محرمات حسیہ کا بیان تھا۔ ان آیات میں محرمات معنویہ کو بیان کرتے ہیں جو حرمت میں محرمات حسیہ سے بڑھ کر ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق جو اہل کتاب مردار اور خنزیر کی حرمت پر اعتراض کرتے ہیں تعجب ہے کہ یہ لوگ اس علم کو چھپاتے ہیں جسکو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی ہدایت کے لیے اتارا ہو اس علم کو چھپا کر مخلوق کو گمراہ کر رہے ہیں اور پھر اس پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس امانت کی خیانت کے معاوضہ میں دنیا کا معمولی اور حقیر معاوضہ حاصل کر رہے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ جو مال دین کو فروخت کر کے اور حق کو چھپا کر حاصل کیا جائے وہ مردار اور خنزیر سے زیادہ ناپاک ہے ایسے لوگ اپنے شکموں میں سوائے آگ کے کچھ نہیں بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بات و کلام بھی نہیں کریگا۔ حالانکہ قیامت کے دن دربار عام ہوگا کہ مومن اور کافر، فاسق و فاجر سب جمع ہونگے اس دن کی ہمکلامی کوئی رتبہ اور شرف نہیں رکھتی۔ وہ وقت تو عدالت اور فیصلہ کا ہوگا مجرم اور قصوروار بھی اسکا کلام سنیں گے لیکن یہ لوگ اس دن بھی کلام الٰہی سے محروم رہیں گے۔ عتاب اور سرزنش بھی بواسطہ فرشتوں کے ہوگی اور نہ اس دن انکو اللہ تعالیٰ پاک و صاف کریگا جیسے گنہگار مسلمانوں کو اس لیے عذاب دیا جائیگا کہ وہ پاک و صاف ہو کر دخول جنت کے قابل ہو جائیں لیکن ان لوگوں کو اس لیے عذاب دیا جائے گا کہ ہمیشہ تکلیف اور درد اٹھاتے رہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ اور ان کے لیے ہمیشہ کا دردناک عذاب ہوگا۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں کہ جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں اور عذاب کو مغفرت کے بدلہ میں بغرض دنیا عذاب و لعنت خرید لیا ہے یہ کسی قابل نہیں کہ انکو پاک کیا جائے اور اللہ کے کلام سے انکو عزت بخشی جائے بلکہ انکو دردناک عذاب سے نجات ہی نہ دیجائے۔ ان لوگوں نے خود ہی اپنے لیے آگ کو پسند کیا ہے پس شاباش ہے انکی ہمت و جرأت پر۔ یہ لوگ آگ پر کیسے ہی صبر کرنے والے ہیں اور تمام سزا بھی اس لیے ہے کہ اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تاکہ لوگوں پر حق واضح ہو اور تحقیق جن لوگوں نے ایسی کتاب کے بارے میں بے راہی اختیار کی کہ اسکے مقصود ہی کو بدل دیا۔ اظہار حق کی بجائے کتمان حق کرنے لگے۔ تحقیق حق کے بجائے تلبیس حق کرنے لگے تو جان لو ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی سخت مخالفت میں ہیں کہ جس کتاب کو ہدایت کے لیے نازل فرمایا تھا اسکو گمراہی کا ذریعہ بنا لیا۔ اور ظاہر ہے کہ جو مختار مطلق کی کھلم کھلا مخالفت کرے وہ

ایسی ہی سزاؤں کا مستحق ہوگا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ

نیکی یہی نہیں کہ منہ کرو اپنے مشرق یا مغرب

وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ

کی طرف لیکن نیکی وہ ہے جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور

الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ

پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور نبیوں پر اور دیوے مال

عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ

اس کی محبت پر ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو

وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَ

اور راہ کے مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور

اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

کھڑی رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو

اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَ

جب قول کریں اور ٹھہرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور

حِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ

وقت لڑائی کے وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی

هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

بچاؤ میں آئے

ابوابُ البِرّ والصّلۃ

قال تعالیٰ لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ ... الیٰ ... وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔

یہاں پہنچ کر سورۂ بقرہ نصف ہو جاتی ہے۔ ابتداء سورت سے یہاں تک کے نصف میں اہمیت دعوت کو خطاب تھا۔ یعنی ان لوگوں کو خطاب اور عتاب تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منکر تھے اور اس میں بھی زیادہ تر خطاب بنی اسرائیل کو رہا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے مگر چھپاتے تھے اور اقرار نہیں کرتے تھے۔ اور اس اخیر نصف میں امتِ اجابت کو خطاب ہے اور مختلف قسم کے احکام کی تعلیم اور تلقین ہے جو عبادات اور معاملات اور معاشرت وغیرہ وغیرہ سب کو شامل ہے۔ اس طرح سے یہ تفصیل اخیر سورت تک چلی گئی ہے۔

نیز سورۃ کے نصف اول میں زیادہ تر اصول دین اور ایمانیات کا بیان تھا اور اس اخیر نصف میں زیادہ تر احکام عملیہ کا بیان ہے۔ پھر جب ان احکام عملیہ کا آغاز فرمایا تو پہلے ان تمام احکام کو لفظ بر سے تعبیر فرمایا جو بَرّ بمعنی وسعت سے ماخوذ ہے یعنی احکام عملیہ کا ایک وسیع اور طویل و عریض سلسلہ جو نصف سورت سے شروع ہو کر اخیر سورت تک چلا گیا، پھر ان احکام عملیہ کے بیان میں عجیب ترتیب کو ملحوظ رکھا کہ پہلے اصول بر کو بیان فرمایا یعنی ایمانیات اور مکارم اخلاق کو بیان کیا جن کا شروع سورت میں یعنی اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ الخ میں اجمالاً ذکر تھا اور پھر فروع بر کو بیان فرمایا۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام عملیہ کے مجموعہ کو ابواب البر والصلۃ سے موسوم اور ملقب کیا جائے جیسا کہ صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک مستقل کتاب اور باب ہے۔ واللہ الہادی الیٰ سواء الطریق وبیدہ ازمۃ التوفیق والتحقیق۔

اصُولِ بِرّ

(ربط) گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی حق پوشی اور رشوت ستانی اور ہدایت کے بدلے میں ضلالت کو خریدنے کا بیان تھا اب آئندہ آیات میں اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب باوجود دین تباہ کئے اور مشرکین کے اپنے کو اہل بر اور ابرار سمجھتے اور اس خیال خام میں مبتلا ہیں کہ نجات کے لیے استقبال قبلہ کافی ہے اور یہ سب غلط ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ نیکی اور خوبی فقط اسی کا نام نہیں کہ تم اپنے چہرہ کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو لیکن اصل نیکی یہ ہے کہ اپنے دل کا رخ اللہ کی طرف پھیر دو اور اس کی رضا اور اطاعت کو اپنا قبلہ توجہ بناؤ۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک نیک وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے یعنی ذات و صفات میں اس کو یکتا اور یگانہ سمجھے اور آخری دن پر بھی یعنی قیامت کے آنے پر اور فرشتوں پر بھی ایمان

ہے۔ فرشتوں پر۔ ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ سمجھے کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں بغیر اُس کی مرضی کے کچھ نہیں
کرتے، مرد سے پیدا ہوئے نہ کسی کے جنے ہوئے وہ نوری ہیں اور کسی کے بیٹے نہیں اور کسی کے باپ اور کسی کے زوجہ نہیں، معصوم ہیں
کھانے اور پینے سے پاک ہیں۔ اور تمام آسمانی کتابوں اور پیغمبروں پر بغیر تفریق کے ایمان لائے کہ جن کتابوں کے ذریعہ
سے اللہ کے صحیفے اور سچے احکام ہم تک پہنچے جن میں بعض احکام۔ گو قرآن بعض احکام کے ناسخ ہیں۔ ان تمام
چیزوں کے اعتقاد میں تو یہ ہے۔ اور انفاق فی المال میں تو یہ ہے کہ مال کو باوجود محبوب اور ضرورت مند ہونے کے
بالخصوص قرابت داروں کو بغض حق قرابت کی وجہ سے دے تاکہ صدقہ و صلہ رحمی دونوں کو جمع کرسکے اور
یتیموں کو دے کہ جو بوجہ خورد سالی کے کسب معاش نہیں کرسکتے اور بوجہ بے پدری کے کوئی ان کا خبر گیر نہیں
اور ان غریب محتاجوں کو دے کہ جن کی آمدنی اُن کے ضروری خرچ سے کم ہے وہ بسبب مسکنت[1] کی وجہ سے نہ وہ
کسی سے سوال کرتے ہیں اور نہ اظہار حاجت کرتے ہیں۔ اور مسافروں کو دے جن کے پاس سفر میں خرچ نہ رہا
ہو اگرچہ وطن میں مال ہو۔ مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن السبیل سے مسافر مراد ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے
ہیں کہ ابن السبیل سے مہمان مراد ہے۔ اور سوال کرنے والوں کو دے خواہ مسلمان ہوں یا کافر۔ اگرچہ ان
کی حاجت اور ضرورت کا علم نہ ہو۔ اس لیے کہ ظاہر یہی ہے کہ بغیر ضرورت کوئی عاقل سوال اور گداگری کی ذلت گوارا
نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سوال کرنے والے کا حق ہے
اگرچہ وہ گھوڑے پر چڑھا ہوا سوال کرے اور گردنوں کے چھڑانے میں یعنی غلاموں کے آزاد کرانے یا مسلمان قیدیوں
کے چھڑانے میں جو کافروں کے ہاتھ میں گرفتار ہوں، یا قرض داروں کو قرض کی قید سے چھڑانے میں یا قیدیوں
کے اوپر دینے میں اپنا مال خرچ کرے۔

یہ تو حقوق العباد میں بر یعنی نیکی کا بیان ہوا۔ اور حقوق اللہ میں بر اور نیکی یہ ہے کہ نماز کو قائم کرے
اور تمام اعضاء سے اللہ کا حق ادا کرے اور زکوٰۃ دے جو کہ مال میں اللہ کا حق ہے۔ یہ وہ خصال بر ہیں
جو اللہ تعالیٰ نے بندوں پر لازم کی ہیں۔ اب آگے آیات میں ان خصال بر کا ذکر فرماتے ہیں کہ جن کو آدمی
خود اپنے اوپر لازم کرلے چنانچہ فرماتے ہیں اور وہ لوگ بھی نیک ہیں کہ اپنے عہد کو وفا کریں جو اللہ سے یا مخلوق
سے کیا ہے۔ اللہ سے جو نذر مانی ہے یا کسی سے کوئی عہد کیا ہے اس کا ایفاء لازم ہے لیکن یہ واجب
ہے کہ جس وقت عہد کیا ہے اسی وقت نیت وفا کی رکھیں۔ جو شخص عہد کرتے وقت نیت وفا کی رکھے وہ
عنداللہ وفا کرنے والوں میں شمار ہوگا۔ اگرچہ بعد میں کسی مجبوری سے وفاء عہد نہ کرسکے اور جس شخص نے عہد
کرتے وقت وفاء کی نیت نہیں کی لیکن بعد میں لوگوں کی ملامت کی وجہ سے اپنے عہد کو پورا کیا تو یہ وفا

---

[1] مسکنت کے لفظ میں مسکین کے مادہ کی طرف اشارہ ہے اور بعد کے لفظ میں لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا
کی طرف اشارہ ہے۔ جو حدیث میں ہے لیس المسکین الذی ترده التمرة والتمرتان واللقمة واللقمتان ولکن
المسکین الذی لا یجد غنی یغنیه ولا یفطن له فیتصدق علیه۔

معتبر نہیں انما الاعمال بالنیات اور اہل بر یہی ان لوگوں کا خاص طور پر شمار ہے جو صبر اور تحمل کرنے والے ہیں تنگ دستی اور شدت فقر میں اور حالت مرض میں اور لڑائی کے وقت میں یہ انسان ان پر تین قسم کی مصیبتیں آتی ہیں مالی اور بدنی اور روحانی۔ فقر مالی مصیبت ہے اور مرض بدنی مصیبت ہے اور لڑائی میں چونکہ جان کا خطرہ ہے تو وہ روحانی مصیبت ہے۔ اور صابر کامل وہ ہے جو تینوں مصیبتوں میں صبر کرے اور جو بعض مصیبتوں پر صبر کرے اور بعض پہ نہ کرے تو وہ صابر کامل نہیں ہاں یہ بھی صابر ہیں متفاوت درجات ہیں پس ایسے ہی لوگ سچے اور پرہیزگار ہیں جن کے اخلاق و اعمال درست ہیں ایمان اور اہل بر وہی لوگ ہیں جن میں یہ تمام اوصاف جمع ہوں۔ یہود اور نصاریٰ کو نیکوکاری کا دعویٰ زیبا نہیں اس لیے کہ ان لوگوں کا نہ ایمان درست ہے اور نہ اخلاق و اعمال درست ہیں۔ ایمان باللہ میں تو یہ قصور کیا کہ حضرت عزیر اور حضرت مسیح علیہم السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔ نیز یہود نے یَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ اور اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ کہا اور گوسالہ کو معبود بنایا اور اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ کہا۔ اور نصاریٰ اتحاد اور حلول کے قائل ہو گئے۔ اور ایمان بالآخرت میں یہ قصور کیا کہ جنت کو اپنے لیے مخصوص کیا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى۔ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً کہا اور ایمان بالملائکہ میں یہ قصور کیا کہ جبرئیل امین کو اپنا دشمن جانا اور فرشتوں کی عصمت کے منکر ہوئے۔ اور ایمان کتب میں یہ قصور کیا کہ دنیاوی منافع کے لیے اللہ کی کتابوں میں تحریف کی اور حق کو چھپایا۔ اور ایمان انبیاء میں یہ قصور کیا کہ انبیاء میں تفریق کی اور بہت سے نبیوں کو قتل کیا اور ان پر ایمان نہ لائے۔ بات بات میں حضرات انبیاء سے جھگڑے اور بحثیں کیں، اور دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہوئے کہ احکام الٰہی کو رشوت لے کر بدل ڈالا اور دین کو دنیا کے بدلہ میں فروخت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے بدلہ میں خرید لیا۔ اور بے صبری تو ان کی معروف اور مشہور ہے اور بے صبری یہاں تک پہنچی کہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ کہہ دیا اور بزدلی اس حد تک پہنچی کہ باوجود وعدہ فتح کے اِذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ۔ کہہ کر بیٹھ گئے۔ پھر کس بنا پر نیکوکاری کا دعویٰ کرتے ہیں۔ صحابہ کو دیکھو ہر چیز میں کامل اور صادق ہیں۔ ایمان میں اور اخلاق میں اور اعمال میں۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

ف اس آیت میں بر کی چھ قسمیں بیان ہوئیں اول۔ ایمان کے اصول خمسہ۔ دوم۔ ایثار مال بحبہ۔ سوم۔ اقامت صلوٰۃ۔ چہارم۔ ایتاء زکوٰۃ۔ پنجم۔ وفاء عہد۔ ششم۔ صبر علی البأساء والضراء و حین البأس۔ پس جس نے ان چھ چیزوں کو مکمل کر لیا اس نے بر کو مکمل کر لیا اور ابرار کے زمرہ میں داخل ہو گیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ

اے ایمان والو! حکم ہوا تم پر بدلا برابر

فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ

مارے گیوں میں صاحب کے بدلے صاحب اور غلام کے بدلے غلام

وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ

اور عورت کے بدلے عورت پھر جس کو معاف ہوا اس کے بھائی کی طرف سے

فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ

کچھ ایک تو چاہیئے مرضی پر چلنا موافق دستور کے اور پہنچانا اسکو نیکی سے یہ آسانی

تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ

ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی پھر جو کوئی زیادتی کرے بعد اسکے

ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ

تو اسکو دکھ کی مار ہے اور تم کو قصاص میں

حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾

زندگی ہے اے عقلمندو شاید تم بچتے رہو

شروع بر یعنی احکام عملیہ فرعیہ کا بیان

قال تعالیٰ یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُونَ ۔

گزشتہ آیات میں اصول بر کا بیان تھا اب اسکے بعد فروع بر یعنی احکام عملیہ و فرعیہ کی تفصیل شروع ہوتی ہے۔ جس میں زیادہ تر احکام جزئیہ کا بیان ہے۔

حکم اول در بارۂ قصاص

اے ایمان والو ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ کے جو احکام تمہارے لیے مقرر کر دیئے گئے ہیں ان سے سر مو تجاوز نہ کرو خصوصاً خون کے معاملہ میں خاص طور سے صبر سے کام لو اور جوش انتقام میں حدود شریعت سے تجاوز نہ کرو۔ مقتولین بقتل عمد کے بارے میں تم پر مساوات اور برابری فرض کر دی گئی ہے۔ ایک مقتول کے بدلہ دو مقتولوں کے

برابر سمجھو حسب اور نسب اور علم و فضل وغیرہ کی وجہ سے قصاص میں تامل نہ کرو۔ جاہلیت کے دستور پر نہ چلو۔ جاہلیت کا دستور یہ تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلہ میں رذیل لوگوں کے آزاد قتل کرتے تھے اور ایک عورت کے بدلہ میں مرد کو قتل کرتے اور ایک مرد کے بدلہ میں کئی کئی آدمیوں کو قتل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امتیاز کو ختم فرما دیا اور حکم دے دیا کہ جانیں سب کی برابر ہیں۔ قصاص کے بارے میں امیر اور غریب شریف اور رذیل کا کوئی فرق نہیں ورنہ اگر قصاص میں اس قسم کے امتیازات کا لحاظ کیا جائے تو قصاص کا دروازہ ہی بند ہو جائے۔ آزاد برابر ہے آزاد کے۔ اگرچہ ایک امیر و شریف ہو اور دوسرا فقیر اور رذیل ہو اور غلام برابر ہے غلام کے اگرچہ ایک غلام کسی معمولی آدمی کا ہو اور دوسرا غلام بادشاہ کا ہو۔ اور عورت برابر ہے عورت کے اگرچہ ایک بیگم ہو اور دوسری مزدورنی ہو۔ غرض یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ضروری ہے اور جاہلیت کا یہ طریقہ کہ اشراف اپنے غلام کے عوض میں آزاد کو قتل کریں اور اپنی عورتوں کے عوض میں مردوں کو قتل کریں اور ایک مرد کے عوض میں کئی کئی مردوں کو قتل کریں یہ ہرگز درست نہیں۔ جانیں سب برابر ہیں۔

یہ اس آیت کا ظاہری مدلول اور منطوق ہے۔ اور مفہوم مخالف اس آیت کا یہ ہے کہ غلام آزاد کے برابر نہیں اور عورت مرد کے برابر نہیں مگر یہ آیت اس کے حکم سے ساکت ہے۔ ائمہ دین کا اس میں اختلاف ہے امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ جس طرح غلام بدلہ میں آزاد کے اور عورت بدلہ میں مرد کے قتل کی جائے گی اسی طرح آزاد بدلہ میں غلام کے اور مرد بدلہ میں عورت کے قتل کیا جائے گا۔ شوافع یہ کہتے ہیں کہ آزاد کو بمقابلہ غلام اور مرد کو بمقابلہ عورت قتل نہ کیا جائے گا بلکہ دیت لے لی جائے گی۔ حنفیہ کہتے ہیں اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ سے زمانۂ جاہلیت کی رسم کو باطل کرنا مقصود ہے اور یہ مقصود نہیں کہ غلام آزاد کے برابر نہیں ورنہ لازم آئیگا کہ باندی اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو اور آزاد مرد اور آزاد عورت میں بھی فرق ہو۔ حالانکہ باندی اور آزاد عورت میں بالاجماع کوئی فرق نہیں اور اسی طرح آزاد مرد اور آزاد عورت میں بالاتفاق کوئی فرق نہیں لہٰذا جس طرح باندی کا آزاد عورت سے قصاص لیا جاتا ہے اور آزاد عورت کا آزاد مرد سے قصاص لیا جاتا ہے اسی طرح غلام کا آزاد مرد سے بھی قصاص لیا جائے گا۔

نیز شوافع کا یہ استدلال آیت کے مفہوم مخالف سے ہے اور مفہوم مخالف کی دلالت اول تو ظنی ہے اور دوم یہ کہ مفہوم مخالف کا اعتبار اسی صورت میں درست ہے کہ جب تک وہ مفہوم کسی دوسری نص صریح کے منطوق اور عموم کے منافی نہ ہو اور یہاں اس آیت کا مفہوم آیت اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ اور حدیث المسلمون تتکافأ دماؤھم کے منافی ہے اس لیے اس جگہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہ ہوگا اور نفس

ف تمام مسلمانوں کے خون برابر ہیں ۱۲

بالْأُنْثىٰ الخ سے جو بظاہر تخصیص مفہوم ہوتا ہے وہ قصہ اتفاقی پر محمول ہوگا، رسم جاہلیت کے مقابلہ میں قصر مراد ہے تخصیص حقیقی مراد نہیں۔

فائدہ جاننا چاہئے کہ مقتولین میں لفظ قصاص یعنی فقط جان لینے کے اعتبار سے برابری اور مساوات ہے قتل کی کیفیت میں مساوات اور برابری نہیں۔ مثلاً یہ جائز نہیں کہ آگ سے جلانے والے کو آگ میں جلایا جائے اور پانی میں غرق کرنے والے کو پانی میں غرق کرکے مارا جائے یا اگر کسی نے کسی کو جادو سے مارا ہے تو اسکو جادو سے مارا جائے۔ اسی لیے فِي الْقَتْلٰى فرمایا فی القتل نہیں فرمایا یعنی مقتولین میں برابری ہے کیفیت قتل میں برابری نہیں خوب سمجھ لو۔

اب قصاص کے بعد مسئلہ عفو کا بیان فرماتے ہیں پس جو شخص کہ اس کے لیے اس کے بھائی کی جانب سے اگر پوری معافی نہ ہو بلکہ کچھ تھوڑی سی بھی معافی ہو جائے بایں طور کہ بعض وارث معاف کر دیں اور بعض نہ کریں تو قاتل سے قصاص ساقط ہو جائیگا اور دیت یعنی تاوان واجب ہو جائے گی اس لیے کہ خون کوئی شئی متجزی نہیں کہ اس کا بعض حصہ تو لیا جائے اور بعض حصہ چھوڑا جائے اس لیے قصاص تو ساقط ہو جائے گا اور جن وارثوں نے خون معاف نہیں کیا ہے انکو بقدر انکے حصہ کے دیت دلائی جائے گی۔ ایسی صورت میں قاتل قصاص سے تو بری الذمہ ہو جائیگا البتہ اس کے ذمہ یہ واجب ہوگا کہ معاف کرنے والے کی مرضی کا اتباع کرے جو اس کی مرضی ہو اسکو قبول کرے بشرطیکہ وہ معمول شریعت کے مطابق ہو ایسی فرمائش نہ ہو جو شریعت کے خلاف ہو مثلاً ولی مقتول، قاتل سے یہ کہے کہ اس شرط سے معاف کرتا ہوں کہ اپنے لڑکے کو میرا غلام بنا دے یا اپنی دختر سے زنا کی اجازت دے پس اس قسم کی غیر معقول شرطیں غیر مقبول ہیں اس میں اتباع ہرگز جائز نہیں اور نیز قاتل کے ذمہ یہ واجب ہے کہ جس چیز کا دینا قبول کیا ہے اس کو اچھی اور سلوک کے ساتھ معاف کرنے والے کی طرف ادا کرے یعنی بلا تاخیر کے وقت مقررہ پر دیت کی پوری رقم ادا کردے نہ ٹلائے اور نہ اس کو پریشان کرے اور نہ کوئی دغل و فصل کرے یہ دیت اور عفو کی اجازت تمہارے پروردگار کی طرف سے تخفیف ہے اور رحمت اور مہربانی ہے ورنہ جرم کے لحاظ سے تو سوائے سزائے قتل کے اور کوئی گنجائش نہ تھی تخفیف یہ کہ یہود کی طرح قصاص کو واجب اور نصاریٰ کی طرح عفو کو لازم نہیں قرار دیا اور مہربانی یہ ہے کہ قاتل، اولیاء مقتول کی خوشامد کرکے معاف کرالینے اور ان کو راضی کرلینے سے زندہ رہ سکتا ہے اور وارثان مقتول کو اگر حاجت ہو تو مال لے لیں اور اگر ثواب آخرت کے طالب ہوں تو مفت میں معاف کر دیں پس جو شخص اس تخفیف اور رحمت کے بعد حد سے تجاوز کرے مثلاً معاف کرنے اور دیت لینے کے بعد جب قاتل مطمئن ہو جائے تو اسکو قتل کر دے یا قاتل دیت کا وعدہ کرکے فرار ہو جائے تو ایسے شخص کے لیے دردناک عذاب ہے اور قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن اس میں تمہاری بہت سی جانوں کی زندگی ہے۔ ایک جان لینے سے بہت سی جانیں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یعنی قصاص میں اگرچہ بظاہر ایک جان جاتی ہے لیکن بہت سی جانیں اس سے محفوظ رہتی ہیں۔ قاتل گناہ سے پاک ہوا

اور عذاب دوزخ سے رہائی پائی اور حیات ابدی کو حاصل ہوئی اور مقتول اگرچہ مارا گیا لیکن جب اس کا عوض اور بدلہ لے لیا گیا تو اس کا مرنا رائیگاں نہیں گیا۔ وارثانِ مقتول کے لیے باعثِ عزّ و جاہ ہوا اور قصاص لینے سے وارثوں کا دل ٹھنڈا ہوا جس کی آگ بجھ گئی اور آئندہ کے لیے کشت و خون کا سلسلہ بند ہوا اور فریقین ایک دوسرے سے مطمئن ہو گئے پس اس حکم کا مشروع ہونا خلائق کے لیے موجبِ رحمت و سرمایۂ زندگی ہوا اے عقل اور فہم والو اگر تم مغزِ عقل کو دریافت کرنا چاہو اور پوست پر قناعت نہ کرو تو سمجھ لو کہ قصاص سراسر زندگی ہے البتہ جن لوگوں کی عقل ناقص ہے یا وہ بات کی تہ تک نہیں پہنچتے فقط ظاہر پر اکتفا کرتے ہیں اور قصاص کو اتلافِ جان سمجھتے ہیں اور یہ حکم اس لیے مشروع ہوا کہ شاید تم ارادۂ قتل سے پرہیز کرو تاکہ قتل خونریزی سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ

حکم ہوا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت اگر چھوڑے کچھ مال

خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ

کر جاوا مرتے ماں باپ کو اور ناتے والوں کو دستور سے

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ

ضرور ہے پرہیزگاروں کو پھر جو کوئی اس کو بدل ڈالے بعد اس کے کہ سن چکا تو اس

فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ

کا گناہ انہیں پر ہے جنہوں نے بدلا بیشک اللہ

سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا

ہے سنتا جانتا پھر جو کوئی ڈرا دلانے والے کی طرفداری سے یا

أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ

گناہ سے پھر ان میں صلح کروا دے تو اس پر گناہ نہیں بیشک اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿۱۸۲﴾

بخشنے والا ہے مہربان۔

حکم دوم وصیت

قال تعالیٰ۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ ... الیٰ ... إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

گزشتہ آیات میں قصاص کو بیان فرمایا اب آئندہ آیات میں وصیت کا ذکر فرماتے ہیں کہ جو جانوں کی حیات اور زندگی کا سامان ہے۔ شروع اسلام میں جب تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا تو والدین اور اقارب کے لیے وصیت فرض تھی مقداروں کی کوئی تعیین نہ تھی وصیت کرنے والے کی صواب دید پر تھا کہ جس مقدار مناسب سمجھے ان مقداروں کی وصیت کردے اسکے بعد جو باقی بچے وہ سب اولاد کا ہے اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے اور چونکہ وصیت اور اقارب کی رعایت امر فطری اور عقلی ہے اور ہر ملت و مذہب میں رائج ہے اس لیے اس آیت کو پہلی آیت کی طرح يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا سے شروع نہیں فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم پر فرض کیا گیا کہ جب تم میں سے موت کسی کے سامنے آجائے بشرطیکہ وہ اتنا مال چھوڑ کر مرے کہ تجہیز و تکفین کے بعد بچا رہے تو اس پر لازم ہے کہ وصیت کرنا والدین اور دیگر اقارب کے لیے۔ مگر یہ ضروری ہے کہ وہ وصیت شریعت کے مطابق ہو۔ مثلاً یہ نہ کرے کہ والدین کو نظر انداز کردے اور دوسرے رشتہ داروں کو مقدم کردے یا غیر رشتہ دار کو محروم کردے اور دولت مند کے لیے وصیت کردے غرض یہ کہ جو وصیت شریعت کے مطابق ہو جائے ہے اسکا پورا کرنا خدا سے ڈرنے والوں کے لیے ضروری ہے کسی کو اس میں تغیر اور تبدیل کا اختیار نہیں پس جو شخص حق لازم کی وصیت کو سن لینے کے بعد وصیت کے مضمون میں کچھ تغیر اور تبدیل کرے تو اس تغیر و تبدیل سے جو حق تلفی ہوگی اس کا گناہ تبدیل کرنے والوں پر ہوگا۔ حاکم اور مفتی نے اگر ظاہر اور قواعد شریعت کی بنا پر فیصلہ کیا ہے اور فتویٰ دیا ہے تو حاکم اور مفتی گنہگار نہ ہوگا کیونکہ تحقیق اللہ تعالیٰ سننے والے اور جاننے والے ہیں تبدیل کرنے والوں کے اقوال کو سنتے ہیں اور ان کی نیتوں اور ارادوں کو جانتے ہیں اور حاکم اور مفتی کی معذوری کو بھی جانتے ہیں۔ البتہ ایک صورت میں وصیت میں تغیر و تبدیل جائز ہے وہ یہ کہ وصیت کرنے والے سے کسی قسم کی بے جا طرفداری یا واضح صریح گناہ کا اندیشہ ہو کہ غیر مستحق کو دے اور مستحق کو محروم کرے یا کسی کو کم اور کسی کو زیادہ دے پس یہ شخص اگر اس وصیت کو درست کردے یعنی اس وصیت کو شریعت کے مطابق کردے تو ایسے تغیر و تبدیل میں اس پر کوئی گناہ نہیں بیشک اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی رحمت فرمانے والے ہیں یہ نیت اصلاح سے گناہ کرنے والوں کو بھی بخش دیتے ہیں اور جو شخص نیک نیتی سے کوئی تغیر اور تبدیل کرے اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی؟

يَا أَيُّهَا	الَّذِينَ	آمَنُوا	كُتِبَ	عَلَيْكُمُ	الصِّيَامُ
اے	ایمان والو	حکم ہوا	تم پر	روزے	کا

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

جیسے حکم ہوا تھا تم سے اگلوں پر تاکہ تم

تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ

پرہیزگار ہو جاؤ گنتی کے دن ہیں پھر جو کوئی تم میں

مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى

بیمار ہو یا سفر میں تو گنتی چاہیئے اور دنوں سے اور جن

الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ

کو طاقت ہے تو بدلہ ہے ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی

خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِنْ

خوشی سے کرے نیکی تو اسکو بہتر ہے اور روزہ رکھو تو تمہارے بھلا ہے اگر

كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

تم سمجھ رکھتے ہو

حکم سوم صوم

قال تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ ۔ الیٰ ۔۔۔ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔

اے ایمان والو: ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ تم بحیثیت اہل ایمان کے اپنے نفس موذی کو مارو کہ جو ہر وقت تمہاری تاک میں ہے اور تمہارے اور خدا کے درمیان سدِّ راہ ہے تمہارا دشمن ہے اور تمہارے جانی اور ایمانی دشمن یعنی شیطان کا دوست بلکہ حقیقی اور جڑواں بھائی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ شیطان اور نفس دونوں حقیقی بھائی ہیں۔ ساتھ پیدا ہوئے اس لیے ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اس دشمن کو مارو اور روح کو زندہ کرو جو تمہارے پاس فرشتوں کی جنس کی ایک چیز ہے۔ نفس کے مارنے اور روح کے زندہ کرنے کا بہترین طریقہ صبر ہے۔ اور صبر حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ چند روز روزے رکھو تو قوت بہیمیہ اور قوت

منشیہ جو تمام معاصی کا منبع ہے اسکے کچلنے کے لیے روزہ تریاق اور اکسیر کا حکم رکھتا ہے لیکن یہ روزہ یہود اور
صابئین کی طرح نہ رکھو کہ دن میں تو خود روزہ دار اختیار اور بعض اوقات صبح سے کھاتے رہو اور بوقت شب کھانے
سے رکو۔ یہ طریقہ شریعت الٰہی کے خلاف ہے بلکہ تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا جیسے پہلے لوگوں پر فرض
کیا گیا تھا کہ مطلقاً کھانے اور پینے اور عورتوں کی صحبت سے دن میں کامل پرہیز رکھیں۔ حضرت آدم علیہ السلام
کے زمانہ سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ تک یہی طریقہ رہا البتہ تعیین ایام میں خلاف رہا حضرت آدم
پر ہر مہینہ میں تین دن کے روزے یعنی ایام بیض کے فرض تھے۔ یہود پر یوم عاشوراء اور ہفتہ اور انکے سوا
اور چند روز کے روزے فرض تھے نصاریٰ پر ماہ رمضان کے روزے فرض تھے۔

معاذ بن جبلؓ اور ابن مسعودؓ و ابن عباسؓ اور عطاءؒ اور ضحاکؒ اور قتادہؒ سے منقول ہے کہ عاشورہ
اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے لیکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ
تک مقرر ہے رمضان کے روزوں کے حکم سے یہ حکم منسوخ ہوا۔ حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ واللہ ہر گزشتہ
امت پر پورے ایک ماہ کے روزے فرض رہے ہیں جس طرح ہم پر فرض ہیں اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے
مرفوع روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رمضان کا روزہ اگلی امتوں پر فرض کیا تھا (رواہ ابن ابی حاتم) الغرض روزہ
کی فرضیت قدیم ہے کوئی شریعت اسکی فرضیت سے خالی نہیں ہوئی اس لیے یہ مبارک عبادت تم پر فرض
کی گئی تاکہ تم متقی اور پرہیزگار بن جاؤ کیونکہ روزہ کی خاصیت ہی یہ ہے کہ روزہ کی عادت اور کثرت آدمی کو
پرہیزگار بنا دیتی ہے اور یہ روزے تم پر شمار کیے ہوئے دنوں کے لیے فرض کیے گئے ہیں جو ایک مہینہ
کی مدت ہے نہ بہت کم اور نہ بہت زیادہ اگر بہت کم ہوتی تو تھوڑی مدت کی عبادت سے نفس عبادت
کے رنگ سے رنگین نہ ہوتا اور اگر روزہ کی مدت بہت زیادہ ہوتی تو مشقت میں پڑ جاتے اس لیے
تھوڑے ہی دنوں کا روزہ تم پر فرض کیا گیا مگر اس میں تمہاری سہولت کی رعایت کی گئی بس ایک سہولت
تو یہ ہے کہ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو جس کی وجہ سے روزہ رکھنا دشوار ہو تو اسکو اجازت ہے
کہ روزہ افطار کرلے مگر اتنے دنوں کو شمار کرکے بعد رمضان کے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ لے
خواہ مسلسل یا بافاصلہ اور دوسری سہولت یہ ہے (جو بعد میں منسوخ ہوگئی) کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی
طاقت رکھتے ہوں مگر باوجود اسکے روزہ رکھنے کو دل نہ چاہے تو انکے ذمے اسکا فدیہ یعنی روزہ کا بدلہ
دینا ہے اور وہ فدیہ ایک مسکین کی خوراک ہے اس لیے کہ یہ شخص خدا کے لیے خود ترک طعام و شراب
نہیں کر سکتا تو کم از کم کسی بھوکے کو کھلا دے کہ جب وہ کھا کر عبادت کریگا تو ثواب میں اسکا بھی حصہ ہوجائیگا
اور یہ بدلہ بہت ہی کم ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ۔ لیکن جو شخص خوشی سے

لہ جیسے کہ ہر ایک کا طریقہ تھا کہ بہت زیادہ رکھتے تھے۔ بالکل نہ رکھتا تھا مگر ... اور ہر ایک کا فرق یہی تھا کہ ... سے
تو بہت گر جاتا تھا مگر فرق اتنا تھا ... سے بہت زیادہ نہ ہوتا تھا ... چند دنوں کی مدت کو ترک کیا جاتا ہے ... روزہ بن جاتا ہے

خیر اور نیکی میں زیادتی کرے یعنی بجائے ایک مسکین کے کئی مسکینوں کو کھانا دے دے تو وہ بھی بہتر ہے جتنی نیکی زیادہ کرو گے اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا لیکن تمہارا خود روزہ رکھنا فدیہ سے کہیں بہتر ہے اگرچہ فدیہ مقدار واجب سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اگر تم روزہ کے فضائل اور فوائد کو جانتے ہو کہ روزہ کس درجہ کی پاک چیز ہے روح کے زندہ کرنے اور نفس اور شہوات کے کچلنے میں کوئی اس کا بدل نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر عمل کا اجر محدود ہے مگر صبر اور روزہ کا اجر غیر محدود ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اور حج وغیرہ کی ایک محسوس صورت ہے جو ریا وغیرہ کے ذریعہ سے توڑی جا سکتی ہے مگر روزہ کی کوئی صورت محسوس نہیں کہ جس کو توڑا جا سکے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ

مہینہ رمضان کا جس میں نازل ہوا قرآن

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ

ہدایت واسطے لوگوں کے اور کھلی نشانیاں راہ کی اور

الْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ

فیصلہ پھر جو کوئی پاوے تم میں یہ مہینہ تو اسکو روزہ رکھے

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ

اور جو کوئی ہو بیمار یا سفر میں تو گنتی چاہیے اور دنوں

اُخَرَ ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

سے اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر مشکل

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ

اور اس واسطے کہ پوری کرو گنتی اور بڑائی کرو اللہ کی اس پر کہ تم کو راہ بتائی

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور شاید تم احسان مانو

تعیین ایام معدودہ

قال تعالیٰ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ... الیٰ ... وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

گذشتہ آیت میں بلا تعیین چند دنوں کے روزہ رکھنے کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں حق تعالیٰ شانہ ان ایام معدودات کی تعیین فرماتے ہیں یعنی وہ شمار کیے ہوئے دن جن میں روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے وہ ماہ رمضان المبارک ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا جو تمام لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور جس میں ہدایت اور تمیز حق و باطل کی صاف صاف اور نہایت واضح اور روشن دلیلیں اور نشانیاں ہیں جو سوائے قرآن کے اور کسی کتاب میں نہیں۔ توریت اور انجیل میں نور اور ہدایت تھی اور حق و باطل میں فرق کرتی تھی مگر قرآن کی طرح واضح اور روشن نہ تھی۔ قرآن کریم کا ہر حرف ہدایت اور امتیاز حق و باطل کی واضح اور روشن دلیل ہے اسی وجہ سے بینات کو جمع لایا گیا اور ہدیٰ کو مفرد لایا گیا۔ ہدایت کبھی خفی ہوتی ہے اور کبھی جلی اور کبھی آفتاب کی طرح اجلیٰ اور روشن ہوتی ہے۔ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ کا مطلب یہی ہے کہ قرآن کریم ہدایت اور امتیاز حق و باطل میں آفتاب کی طرح روشن ہے توریت و انجیل اس درجہ روشن نہ تھیں پس تم میں سے جو شخص یہ مہینہ پائے تو اس کو چاہیے کہ اتنے روزے رکھے جتنا مہینہ پائے اتنے کے روزے رکھے اگر پورا مہینہ پائے تو پورے مہینے کے روزے رکھے اور اگر کچھ دن پائے تو اتنے دن روزے رکھے غرض یہ کہ جو شخص اس مہینہ کو پائے سو اس پر لازم اور فرض ہے کہ اس مہینہ کے روزے رکھے اور ابتداء میں جو فدیہ کی اجازت دی گئی وہ منسوخ ہوئی اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہے اب انکو افطار کی اجازت نہیں رہی اس آیت سے فدیہ کا حکم منسوخ ہو گیا اور البتہ مریض اور مسافر کیلیے جو سفر اور مرض کی وجہ سے افطار کی رخصت اور اجازت دی گئی تھی وہ بدستور اسی طرح باقی ہے کہ جو شخص ایسا بیمار ہو کہ جسکو روزہ رکھنا دشوار ہو یا شرعی سفر پر ہو یعنی سفر میں جتنی مسافت شریعت میں معتبر ہے اتنی مسافت کے سفر کا ارادہ ہو تو ایسے شخص کو رمضان میں افطار کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے شمار کے مطابق روزے رکھنا اس پر لازم ہے۔ مریض اور مسافر کے حکم کو اس لیے مکرر بیان کیا گیا کہ یہ وہم ہو سکتا تھا کہ شاید فدیہ کی طرح یہ رخصت بھی منسوخ ہو گئی ہو افطار اور قضا کا حکم منسوخ نہیں ہوا اور قضا کے حکم میں فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ فرمایا یعنی اور دنوں میں گنتی و شمار کے مطابق روزے رکھنے چاہئیں اور دنوں کی قید اس لیے لگائی کہ رمضان کے فوت شدہ روزوں کی قضا آئندہ رمضان میں جائز نہیں۔ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں قضا کے روزے رکھنے چاہئیں اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ سہولت اور آسانی کرنا چاہتے ہیں اور تم پر سختی اور دشواری نہیں چاہتے اسی لیے تمکو مرض اور سفر کی حالت میں افطار کی اجازت دی اور دوسرے دنوں میں فوت شدہ روزوں کے

شمار کے مطابق قضا رکھنے کا حکم اس لیے دیا کہ تم اپنے روزوں کے شمار کو پورا کرو تاکہ تمہارے ثواب میں کمی نہ رہ جائے اور تم اس شمار کو پورا کرکے متقی اور پرہیزگار بن جاؤ اور اس میں بھی یہ سہولت ہے کہ فوت شدہ روزوں کی قضا خواہ ایک ہی مرتبہ کرلو یا متفرق کرکے رکھو دونوں اختیار ہیں اور تاکہ تم اللہ کی کبریائی اور بزرگی بیان کرو کہ اس نے تم کو ایسے طریقہ کی ہدایت کی کہ جس سے تم رمضان المبارک کی فوت شدہ خیرات و برکات کی قضا سے کچھ تلافی کرسکو۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ سے رمضان کے تیس دن پورے کرنا مراد ہیں اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ سے ختم رمضان کے بعد عید کا چاند دیکھ کر عید میں جاتے وقت اور عید کی نماز میں تکبیر کہنا مراد ہے جس طرح نماز ع اور حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی مسنون ہے اسی طرح رمضان کے روزوں سے فارغ ہونے کے بعد تکبیر و تحمید مسنون ہے اور تاکہ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ اس نے تم پر ایک مہینہ کے روزے فرض کیے کہ جو درجات عالیہ کے ملنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے نیز اس پر بھی شکر کرو کہ اس نے حالت مرض اور سفر میں تمہیں افطار کی اجازت دی کہ جس میں تمہارے لیے تخفیف اور سہولت ہے۔ غرض یہ کہ عزیمت بھی نعمت ہے اور رخصت بھی نعمت ہے سب نعمتوں کا شکر کرو تاکہ کامل متقی اور پرہیزگار بن جاؤ۔

نزول قرآن اور صیام رمضان میں مناسبت

★ نزول قرآن اور صیام رمضان میں مناسبت

یہ ہے کہ حق جل شانہ نے اس مہینہ کو قرآن کریم کے نازل کرنے کے لیے پسند کیا اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کلام معجز نظام کے انوار و تجلیات اور خیرات و برکات کی کوئی حد اور نہایت نہیں۔ محبین اور عاشقین دنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہیں لیکن اس کے کلام سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کلام کے پردہ سے کچھ اس کا جلوہ نظر آجاتا ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

چیست قرآں اے کلام حق شناس — رونمائے رب ناس آمد بناس
حرف حرفش را ست در ہر معنئے — معنئے در معنئے در معنئے

چنانچہ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت اور انجیل اور زبور اسی مہینہ میں اتاری۔ بلکہ رمضان المبارک

ع کما قال تعالیٰ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. وقال تعالیٰ فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا۔ پہلی آیت سے نماز جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد ذکر خداوندی کا حکم ہے اور دوسری آیت میں حج سے فارغ ہونے کے بعد ذکر الٰہی کا حکم ہے۔ ۱۲

کی طرح یہ مہینہ بھی اپنی نوع میں حقیقتِ جامعہ ہے اسی مناسبت سے اس مہینہ میں قرآن مجید نازل ہوا اور چونکہ درختوں میں کھجور کا درخت شجرۂ طیبہ ہے اور کھجور اسکا ثمرۂ طیبہ اور حقیقتِ جامعہ ہے اور حضرت آدم کے خمیر کا بقیہ ہے اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا افطر احدکم فلیفطر علی تمر فانہ برکۃ — جو کوئی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے کیونکہ کھجور سراسر خیر و برکت ہے

اور ظاہر ہے کہ جب یہ مبارک پھل پہنچیگا تو یہی جامع اور مبارک غذا جزو بدن بنے گی جس سے روزہ کی برکتوں میں اضافہ ہو جائیگا۔ اس طرح سے روزہ اور مقتضائے جامع کی برکتوں کے مل جانے سے قلب نورٌ علیٰ نور کا مصداق بن جائیگا۔ اور اسی وجہ سے کہ کھجور ایک نہایت مبارک اور جامع غذا ہے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری میں بھی کھجور کے کھانے کی ترغیب دی اور ارشاد فرمایا۔

نعم سحور المؤمن التمر — کھجور مومن کی کیا اچھی سحری ہے۔

قرآن کریم میں ایمان کو شجرۂ طیبہ یعنی کھجور کے درخت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور رمضان کا روزہ ایمان کا ایک شعبہ ہے اس لیے رمضان کا افطار اور سحری مرد مومن کیلئے کھجور سے مسنون ہوئی۔ اور شب قدر اس مہینہ کا خلاصہ اور زبدہ ہے گویا کہ شب قدر مغز ہے اور یہ مہینہ پوست کی طرح ہے۔ پس جس کا یہ مہینہ جمعیت خاطر کے ساتھ گذر جائے اور اس مبارک مہینہ کی خیرات و برکات سے بہرہ اندوز ہو جائے تو اسکا تمام سال جمعیت اور خیر و برکت کے ساتھ گذرتا ہے۔ وفقنا اللہ تعالیٰ للخیرات والبرکات فی ہذا الشہر المبارک ورزقنا اللہ سبحانہ النصیب الاعظم منہ آمین۔
(مکتوب ۱۴۲ دفتر اول)

فائدہ جلیلہ رمضان کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کے دن اور ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھے جاتے تھے اس میں اختلاف ہے کہ وہ روزے فرض تھے یا نفل۔ عبداللہ بن مسعود اور معاذ بن جبل اور عطاء رضی اللہ عنہم کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روزے فرض تھے اور ابن ابی لیلیٰ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض نہ تھے بلکہ محض بطور تطوع اور نفل رکھے جاتے تھے۔ اکثر احادیث سے وجوب ہی معلوم ہوتا ہے بہرحال جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو صوم عاشورہ اور ہر مہینے میں تین روزوں کی فرضیت تو باقی نہ رہی البتہ استحباب باقی رہ گیا اور اس میں بھی ویسا اہتمام نہ رہا جیسا کہ پہلے تھا۔

اسی وجہ سے علماء کو اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کی تفسیر میں اختلاف ہے بعض صحابہ اور تابعین اور علماء کہتے ہیں کہ ان گنتی کے دنوں سے عاشورہ اور ہر مہینے کے تین دن کے روزے مراد ہیں۔ جب رمضان کے روزوں کا حکم آیا تو یہ روزے منسوخ ہو گئے اور جمہور صحابہ و تابعین کا مسلک یہ ہے کہ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے رمضان کے روزے مراد ہیں اور یہ آیت منسوخ نہیں۔ اور صوم عاشورہ اور ایام بیض کا حکم منجانب اللہ

جو تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے ان دنوں کے روزوں کو پسند فرمایا۔ جیسا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کو دیکھا کہ وہ عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تم اس دن کیوں روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا، یہ دن بہت مبارک ہے اس دن میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دشمن سے نجات دی اور فرعون کو غرق کیا، موسیٰ علیہ السلام نے بطور شکریہ اس دن کا روزہ رکھا، اس لئے ہم بھی اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے زیادہ موسیٰ علیہ السلام کا حق دار میں ہوں اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی روزہ رکھا اور صحابہ کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا (بخاری و مسلم)

علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ امام احمدؒ اور ابو داؤدؒ اور حاکمؒ نے معاذ بن جبلؓ سے عاشورہ کا روزہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کا واجب ہونا روایت کیا لیکن یہ وجوب اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے تھا اور اس آیت سے منسوخ ہو گیا۔

پس معلوم ہوا کہ راجح اور صحیح قول یہی ہے کہ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ سے رمضان کے روزے مراد ہیں، عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین روزے مراد نہیں اس لئے کہ افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت احادیث اور روایات میں رمضان المبارک کے روزوں کے متعلق آئی ہے۔ عاشوراء اور ہر مہینہ کے تین دن کے روزوں کے متعلق فدیہ کا حکم کہیں ثابت نہیں۔ سنن ابو داؤد کی ایک روایت سے یہ ایہام ہوتا ہے کہ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ کا حکم عاشورہ اور ہر مہینہ کے تین روزوں کے متعلق ہے مگر یہ صحیح نہیں۔ یہ روایت مختصر ہے، دوسری مفصل روایت میں رمضان کے روزوں کا مفصل ذکر ہے اور وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کا حکم رمضان ہی کے روزوں سے متعلق ہے اس روایت میں رمضان کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے ابہام ہوا۔ واللہ اعلم۔

اقوالِ علماءِ کرام در بارۂ تفسیرِ آیتِ فدیۂ صیام

قال تعالیٰ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ

اس آیت کی تاویل اور حکم میں علماء کا اختلاف ہے آیت مذکورہ کے متعلق علماءِ تفسیر کے دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے، دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اس آیت کا حکم اب بھی باقی ہے اس فریق سے آیت کی مختلف توجیہات منقول ہیں جن کو ہم علی الترتیب ذکر کریں گے۔

گروہِ اوّل

اکثر علماءِ محققین کی رائے یہ ہے کہ آیت میں نسخ ضرور واقع ہے عبداللہ بن عمرؓ اور سلمہ بن الاکوعؓ اور دیگر صحابہ سے یہی منقول ہے۔ امام بخاریؒ اور مسلمؒ اور

ابوداؤد، بیہقی وغیرہم کی احادیث اور روایات سے یہی ظاہر ہے کہ ابتداء اسلام میں لوگوں کو اختیار تھا کہ اگر روزہ کی ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ روزہ افطار کرلیں اور ہر روزہ کے بدلے میں فدیہ دیدیں۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے اگر ابتداء ہی سے روزہ کا قطعی حکم ہو جاتا تو شاق ہوتا بعد چندے یہ اختیار منسوخ ہوگیا اور فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ سے روزہ رکھنے کا حکم قطعی ہوگیا۔ چنانچہ حافظ بدرالدین عینی شرح بخاری میں آیات صیام کی ترتیب نزولی اور ناسخ و منسوخ کی تعیین کے بارے میں لکھتے ہیں۔

كان في بدء الاسلام فرض عليهم الصوم فاشتد عليهم فرخص لهم في الافطار والفدية وقال معاذ كان في ابتداء الامر من شاء صام ومن شاء افطر واطعم عن كل يوم مسكينا حتى نزلت الاية التي بعدها فنسختها (عینی شرح بخاری ص ۲۶۸ ج ۱)

شروع اسلام میں روزے فرض ہوئے تھے عادت نہ ہونے کی وجہ سے لوگوں پر گراں گزرے تو افطار کر کے فدیہ دے دینے کی اجازت دے دی گئی۔ چنانچہ معاذ بن جبلؓ کہتے ہیں کہ شروع اسلام میں جو چاہتا روزہ رکھتا اور جو چاہتا افطار کرتا اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیتا۔ یہاں تک کہ اس کے بعد کی آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

امام ابن جریر طبریؒ بروایت ابن ابی لیلیٰ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما قدم عليهم امرهم بصيام ثلاثة ايام من كل شهر تطوعا غير فريضة قال ثم نزل صيام رمضان قال وكانوا قوما لم يتعودوا الصيام قال وكان يشتد عليهم الصوم قال فكان من لم يصم اطعم مسكينا ثم نزلت هذه الاية فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اپنے صحابہ کو ہر مہینہ میں تین دن کے روزوں کا حکم دیا مگر بطور فرض نہیں بلکہ بطور نفل حکم دیا اس کے بعد رمضان کے روزوں کا حکم نازل ہوا۔ مگر چونکہ لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہ تھے اس وجہ سے اگر روزہ رکھنا گراں ہوا تو یہ سہولت کر دی گئی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دے چنانچہ کچھ عرصہ تک لوگ ایسا ہی کرتے رہے کہ جو شخص روزہ نہ رکھتا وہ ایک فقیر کو کھانا کھلا دیتا چند روز کے بعد یہ آیت نازل ہوئی فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ الآیۃ۔ اس وقت

کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب جیسا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ تو حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو نابینا ہونے کی وجہ سے جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا۔ ان کے شکوہ کے جواب میں غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ کے الفاظ اور نازل ہو گئے اور جس طرح كُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے ظاہری معنی سمجھ کر تکیہ کے نیچے دو دھاگے رکھنے شروع کر دیئے تو اس اشتباہ کے زائل کرنے کے لیے مِنَ الْفَجْرِ کو نازل کیا۔

پس جس طرح غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ اور مِنَ الْفَجْرِ کا باوجود ماقبل کے ساتھ شدید تعلق ہونے کے جداگانہ نزول ہو سکتا ہے اسی طرح وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ کا بھی باوجود ماقبل سے مربوط ہونے کے علیحدہ نزول ہو سکتا ہے مثلاً کہ مِنَ الْفَجْرِ اور غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ۔ یہ تو مفرد ہے اور نہ مستقل جملہ بلکہ متعلقات میں سے ہے اور وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ تو پورا جملہ ہے پس جب کہ الفاظ مفردہ کا علیحدہ نزول جائز اور واقع ہے تو پورے جملہ کے علیحدہ نزول میں کیوں اشکال ہے۔ حق تعالیٰ بہت سی آیات کے نازل فرمانے والے ہیں آیات کو متفرقاً نازل فرماتے ہیں اور پھر مطلع فرما دیتے ہیں کہ اس آیت کو فلاں جگہ رکھا جائے اور اس آیت کو فلاں جگہ اور اس مفرد اور اس جملہ کا فلاں مفرد اور فلاں جملہ سے تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نزول کی ترتیب اور ہے اور موجودہ مصحف کی ترتیب اور ہے اور اس وقت جس ترتیب سے قرآن کریم کی تلاوت کی جاتی ہے یہ بعینہ وہی ترتیب ہے کہ جس ترتیب سے جبریل امین حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر رمضان میں دور فرماتے تھے۔

حق تعالیٰ شانہ نے اپنی حکمت بالغہ اور رحمت کاملہ سے بہت سے احکام میں بندوں کو تدریج سہولت کے ساتھ احکام کا مکلف بنایا۔ جس طرح ابتداء اسلام میں نماز میں سہولتیں تھیں۔ سلام و کلام بھی نماز میں جائز تھا بعد میں شریک ہونے والا اپنے قریبی نمازی سے یہ بھی پوچھ لیا کرتا تھا کہ کتنی رکعتیں ہو چکی ہیں۔ مگر بعد میں یہ تمام سہولتیں اور رخصتیں یک لخت منسوخ ہو گئیں۔

اسی طرح روزے کے احکام میں تدریج اور سہولت کو مرعی رکھا گیا بالآخر جب صحابہ کرام کے نفوس قدسیہ حق جل وعلا کے انوار و تجلیات سے روشن ہو گئے اور روزہ کی جسمی مشقت اور گرانی بھی دل سے بالکل نکل گئی تو اب بجز صبر کے یہ حکم قطعی آگیا کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ اور اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرام کی یہ کیفیت ہوئی کہ روزہ کی خدمت اور مشقت سہل بلکہ فرحت و لذت ہو گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم تو مسلسل روزہ رکھنے کی ممانعت فرماتے ہیں۔ اور صحابہ کرام صوم وصال اور صائم الدہر ہونے پر اصرار کرتے ہیں۔

دفع تعارض اس مقام پر صحیح بخاری کی روایات میں بظاہر کچھ تعارض کا شبہ ہوتا ہے کہ بعض

روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ہے اور بعض روایات سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ آیت فدیہ کا ناسخ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ کی آیت ہے۔

جواب

یہ ہے کہ حضرات محدثین بسا اوقات اپنے مدعا کے ثابت کرنے کے لیے آیت کا ابتدائی حصہ نقل کر کے چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ آیت کے ابتدائی حصہ کو مدعا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن درحقیقت اس سے پوری آیت کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھ جاؤ محل استشہاد خود تمہارے سامنے آجائے گا۔ اور تم خود ہی اس کو متعین کرو گے جیسا کہ امام ترمذی نے باب ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ میں یہی حدیث لانے کے بعد استشہاد میں آیت لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ الخ۔ لکھ کر چھوڑ دی۔ حالانکہ آیت کے اس ابتدائی حصہ کو باب سے کوئی تعلق نہیں، مطلب یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھو اور جب تم وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ پر پہنچو گے تو موقع استدلال خود تمہارے سامنے آجائے گا اسی طرح وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ سے فقط یہی الفاظ مراد نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم اس آیت کو اخیر تک پڑھتے چلے جاؤ اور جب تم فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ پر پہنچو تو محل استدلال کو سمجھ لو اور متعین کر لو کہ فدیہ کا اصل نسخ اس آیت سے ہوا ہے۔ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ اس کی تمہید تھی۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ دونوں ہی آیتیں حکم فدیہ کی ناسخ ہیں، یعنی ہر آیت سے فدیہ کا نسخ معلوم اور مفہوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ میں لفظ خیر واقع ہوا ہے جو استحباب اور فضیلت پر دلالت کرتا ہے۔ وجوب اور لزوم پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا وہ گزشتہ تخییر کے لیے کیسے ناسخ ہو گا؟ جواب یہ ہے کہ خیر کا لفظ کبھی وجوب اور لزوم کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے جیسے وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ انْتَهُوا خَيْرًا لَكُمْ۔ تثلیث سے باز آجانے کو خیر فرمایا حالانکہ یہ کسی کا مذہب نہیں کہ جائز تثلیث بھی ہے مگر ترک تثلیث توحید سے افضل اور بہتر ہے اسی طرح اس آیت میں خیر کا لفظ شر کے مقابلہ میں ہے فرض اور واجب کے مقابلہ میں نہیں۔ خوب سمجھ لو۔

دوسرا گروہ

اور علماء کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ اس گروہ نے آیت کی مختلف توجیہات کی ہیں۔

توجیہ اول

بعض توجیہ یہ ہے کہ يُطِيقُونَهُ۔ کا مادہ طاقت ہے جس کے معنی کسی کام پر نہایت مشقت اور محنت کے ساتھ قادر ہونے کے ہیں۔ اور بسہولت قادر ہونے کو "وسع" کہتے ہیں تو اب آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ روزہ رکھنے پر بمشقت تمام قادر ہوں جیسا کہ شیخ کبیر اور عجوز یعنی بہت بوڑھا مرد اور بہت بوڑھی عورت۔ ان کے لیے اجازت ہے کہ روزہ افطار کریں اور اس کے بدلہ میں فدیہ ادا کر دیں اور اس معنی کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جو عبداللہ بن عباس کی ہے

سے منقول ہے وہ یہ کہ بجائے یُطِیْقُوْنَهٗ کے یُطَوَّقُوْنَهٗ اور یُطَیَّقُوْنَهٗ پڑھتے تھے جس کے معنی "بہ تکلف" اور بمشقت روزہ رکھنے کے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ یطیقونہ کی قراءت کے بھی یہی معنی لیے جائیں تاکہ دونوں قراءتیں مطابق اور ہم معنی ہو جائیں۔ رہا یہ سوال کہ یطیقونہ کا لفظ باعتبار لغت کے بھی اس معنی کا متحمل ہو سکتا ہے یا نہیں اس کے لیے علامہ زمخشری کا کلام پیش کر دینا کافی ہے کہ جو لغت عربیت میں عرب اور عجم کا مسلّم امام ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

ویجوز ان یکون هذا معنی یطیقونه ای یصومونه جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم (کشاف ص۲۲۳ ج ۱)	اور ہو سکتا ہے کہ یطیقونہ کے معنی لیے جائیں کہ جو لوگ نہایت مشقت اور انتہائی محنت کے ساتھ روزہ رکھ سکیں۔

اس کے بعد ثابت ہو گیا کہ اگر یہ معنی مجازی بھی ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں حقیقی معنی مراد لینا اگر متعذر ہوں تو بالاجماع مجازی معنی مراد لینا ضروری ہو جاتے ہیں۔ جس کے شواہد قرآن کریم اور حدیث نبوی اور کلام عرب میں بے شمار ہیں اور قرینۂ مجاز اس مقام پر یہ ہے کہ تمام امت محمدیہ کے علماء اور فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ ایک صحیح سالم تندرست آدمی کے لیے ہرگز اجازت نہیں کہ وہ فی یوم ایک مسکین کو کھانا دے کر روزہ سے رستگاری حاصل کرلے ورنہ روزہ کا حکم فقط ابرار و فقراء کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور امراء اور اغنیاء تمام کے تمام فدیہ دیکر روزہ کی فرضیت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

دوسری توجیہ شیخ جلال الدین محلیؒ فرماتے ہیں کہ یطیقون سے پہلے ایک لا مقدر ہے اور معنی یہ ہیں کہ جو لوگ روزہ کی طاقت نہیں رکھتے جیسا کہ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمْ اَنْ تَضِلُّوْا میں بالاتفاق لا تضلوا کے معنی مراد ہیں اور لا مقدر ماننے کی تائید ایک قراءت سے بھی ہوتی ہے جس میں حضرت حفصہؓ نے لَا یُطِیْقُوْنَهٗ پڑھا ہے۔ حضرات اہل علم کشف الاسرار[1] بزدوی ص۳۱ ج ۱ کی مراجعت کریں۔

[1] کشف الاسرار کی عبارت یہ ہے۔ قال تعالیٰ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ۔ كان ذلك فی بدء الاسلام فرض عليهم الصوم ولم يتعودوه فاشتد عليهم فرخص لهم فی الافطار والفدية وقرأ ابن عباسؓ يطوقونه ای يكلفونه على جهد منهم وعسر وهم الشيوخ والعجائز وحكم هؤلاء الافطار والفدية وهو على هذا الوجه غير منسوخ ويجوز ان يكون هذا معنى يطيقونه ای يصومونه جهدهم وطاقتهم ومبلغ وسعهم كذا فی الكشاف وذكر فی التيسير وفی قراءة ابن عباسؓ وعلى الذين يطوقونه ای يتكلفونه فلا يطيقونه وفی قراءة حفصة وَعَلَى الَّذِيْنَ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ وقيل هی فی الشيخ الفانی فعلى هذا لا يكون منسوخا فانه حكم ثابت مجمع عليه۔ كذا فی كشف الاسرار ص۳۱ ج ۱۔

تیسری توجیہ

حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے اس آیت کی ایک لطیف توجیہ فرمائی ہے جو یہ کہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یطیقونہ کی ضمیر مفعول صوم کی طرف راجع نہیں، بلکہ یہ ضمیر طعام کی طرف راجع ہے، جو اگرچہ لفظوں میں مؤخر ہے مگر رتبۃً مقدم ہے کیونکہ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ خبر مقدم ہے اور فدیہ مبتداء مؤخر ہے اور طعام مسکین مبتداء سے بدل ہے، پس جس طرح مبتداء رتبۃً مقدم ہے اگرچہ لفظوں میں مؤخر ہے، اسی طرح مبتداء کا بدل بھی رتبۃً مقدم ہوگا۔ اور فدیہ سے مراد صدقۃ الفطر ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے روزوں کی فرضیت بیان فرمائی اور اس آیت میں روزوں کے بعد صدقۃ الفطر کا ذکر فرمایا۔ اور اس سے اگلی آیت میں روزوں کے بعد تکبیرات عید کی طرف اشارہ فرمایا وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جو روزہ دار کھانا دینے کی طاقت رکھتے ہیں رمضان گزرنے کے بعد وہ صدقۃ الفطر بھی ادا کریں۔"

خلاصۂ کلام

یہ کہ اگر یہ آیت صحیح اور تندرست کے بارے میں ہے تو منسوخ ہے اور اگر شیخ فانی اور عاجز کے حق میں ہے تو آیت محکم ہے اور شیخ فانی اور عاجز کے لیے اب بھی یہی حکم ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ
اور جب تجھ سے پوچھیں بندے میرے مجھ کو تو میں تو نزدیک ہوں قبول کرتا ہوں
دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ
دعا مانگنے والے کی دعا کو جس وقت مجھ سے مانگتا ہے تو چاہئے کہ وہ حکم مانیں میرا
وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾
اور یقین لاویں مجھ پر تاکہ نیک راہ پر آویں

ترغیب دعا بعد تلقین تکبیر و شکر

قال تعالیٰ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔

گذشتہ آیات میں اللہ کی تکبیر اور شکر کا بیان تھا اب اس آیت میں دعا کا بیان ہے کہ دعا سے

حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ دعا سے پہلے تکبیر اور ثناء کا بیان اس طرف مشیر ہے کہ دعا کا ادب اور طریقہ یہ ہے کہ پہلے حق تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جائے اور پھر اپنی حاجت کی درخواست کی جائے انبیاء کرام علیہم کا طریقہ دعا یہی تھا اور مجیب نہیں کہا اس طرف بھی اشارہ ہو کہ وہ معنی قبولیت دعا کا صیغہ ہے اسکو نسبت بھی دعا کو روزہ کے ساتھ خاص مناسبت اور تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روزہ دار کی دعا بہ نسبت غیر روزہ دار کے زیادہ مقبول ہوتی ہے جیسا کہ احادیث میں بکثرت آیا ہے۔ اس لئے احکام صیام کے درمیان میں دعا کا ذکر نہایت مناسب ہوا چنانچہ فرماتے ہیں اور جب استفسار کریں آپ سے میرے بندے میرے متعلق کہ ہمارا پروردگار ہم سے قریب ہے یا بعید اگر قریب ہے تو آہستہ مناجات کریں اور اگر دور ہے تو ہم اس کو پکاریں تو آپ ان کے جواب میں میری طرف سے کہہ دیجئے کہ تحقیق میں تو قریب ہی ہوں نزدیک ہوں تمہاری جان اور جسم سے بھی زیادہ قریب ہوں مجھ کو دیکھتا بھی ہوں اور تمہاری آواز بالکل بیش علیم و سمیع ہوں تم مجھ کو نہیں دیکھتے اس لئے تم مجھ کو دور سمجھتے ہو ورنہ حقیقت میں میں تم سے بہت قریب ہوں۔ دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جس وقت بھی وہ مجھ سے درخواست کرے بشرطیکہ وہ مناسب بھی ہو اور کسی حکمت اور مصلحت کے خلاف بھی نہ ہو جیسا کہ دوسری جگہ آیا ہے بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ ۔ اگر منظور الٰہی ہوتا ہے تو دعا کو منظور کر لیتا ہے ورنہ نہیں پس گویا یہ آیت کہ جو اجابت دعا کے حق میں مطلق ہے اس دوسری آیت سے مقید ہے محمول کرنا چاہئے۔ پس بندوں کو بھی چاہئے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین لائیں تاکہ رشد اور ہدایت پائیں الحاصل میں بے نیاز اور غنی مطلق ہوں اور پھر بندوں کی درخواست سنتا ہوں اور اے بندو! تم میرے سائل اور محتاج ہو تم کو چاہئے کہ میرا قرب اور رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی ہر حاجت میرے سامنے پیش کرو اور میری باتوں پر یقین رکھو۔ میرے احکام کو قبول کرو۔ اللہ سے مانگنا یہی ہدایت اور رشد کا راستہ ہے

فائدہ (۱) جس طرح حق تعالیٰ کی ذات اور صفت بے چون و بے چگون ہے اور حیطۂ عقل سے بالاتر ہے اسی طرح اسکا قرب بھی بے چون و چگون ہے۔

جاں بتو نزدیک تو دوری ازو ۔ قرب حق را چون بدانی اے عمو

فائدہ (۲) دعا کا مقتضیٰ تو یہی ہے کہ قبول ہو کیونکہ حق تعالیٰ جواد اور کریم ہیں اور سب سے بے نیاز ہیں ابوداؤد اور ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارا پروردگار بڑا حیا والا اور کرم والا ہے جب بندہ اس کے سامنے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کو شرم آتی ہے کہ اسکو خالی ہاتھ واپس کر دے۔ انتہی۔ لیکن اگر بندہ ہی آداب دعا اور شرائط قبولیت کا لحاظ نہ رکھے تو مستحق قبولیت نہیں ہوتا۔ مثلاً دعا مانگنے میں حدود سے تجاوز کر جائے یا ایسی چیز مانگے جو قطع رحمی یا کسی کی ہلاکت اور بربادی کی دعا مانگے۔ یا اللہ کے علم میں مقدر ہو چکا ہے کہ یہ شخص آئندہ چل کر اسکا دوست بن جائیگا اور اس پر رحم کرنے والا ہے کہ طرح طرح کے فائدے پہنچائے گا تو اس دعا کا قبول نہ کرنا اسی کے حق

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ

وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو ان کی اللہ نے معلوم

أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ

کیا کہ تم اپنی چوری کرتے تھے سو معاف کیا تم کو اور

عَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ

درگزر کی تم سے پھر اب ملو ان سے اور چاہو جو لکھ دیا

اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ

اللہ نے تمکو اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آوے

الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ

تمکو دھاری سفید جدا دھاری سیاہ سے فجر کی

ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ

پھر پورا کرو روزہ رات تک

حکم چہارم متعلق بہ سحور وافطار

قال تعالیٰ۔ أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ ... الی ... ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ

ابتداء اسلام میں سونے سے پہلے کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی تو اجازت تھی لیکن اگر سو جانے کے بعد آنکھ کھلے تو پھر اجازت نہ تھی۔ بعض صحابہ بغیر کھائے پیئے سو گئے اور اسی طرح روزہ رکھ لیا۔ بھوک اور پیاس کی شدت کی وجہ سے غشی طاری ہوگئی اور بعض سونے کے بعد عورتوں سے صحبت کر بیٹھے اور بعد میں سخت نادم اور پشیمان ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر تائب ہوئے۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی اور یہ حکم منسوخ ہوا چنانچہ فرماتے ہیں جائز اور حلال کر دیا گیا تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں سے مشغول ہونا جیسے روزہ دار کے لیے شب میں کھانا اور پینا جائز کر دیا گیا اسی

طرح اپنی عورتوں سے مخالطت بھی جائز کر دی گئی۔ جس میں ملاپ کی وجہ سے صبر دشوار ہے کیونکہ عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو اس لیے احتراز مشکل ہے اس لیے روزوں کی رات میں مخالطت کو حلال کر دیا گیا اور گزشتہ ممانعت تم سے ختم کر دی گئی۔ اللہ نے جان لیا کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے یعنی حکم خداوندی میں تقصیر اور کوتاہی کرتے تھے۔ مگر جب تم اپنی اس حرکت پر نادم اور پشیمان ہوئے اور معذرت کی تو اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تمہارا قصور معاف کیا اور تمہاری خیانت سے درگزر کیا۔ پس اب تم کو اجازت ہے بلا تردد شب کو ہم بستر ہو تم ان سے اور جو اولاد اللہ نے تمہارے لیے مقدر کی ہے اس کو طلب کرو کہ یہ مبارک چیز ہے۔ اس نیت سے اگر صحبت کرو گے تو اس چیز کی برکت سے اولاد بھی مبارک ہو گی اور جس طرح تم کو رمضان کی راتوں میں ہم بستری کی اجازت دی گئی اسی طرح تم کو یہ بھی اجازت ہے کہ کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ سپید خط یعنی صبح صادق کا نورانی خط رات کے سیاہ خط سے ممتاز اور جدا ہو جائے یعنی تم کو صبح صادق تک کھانے اور پینے اور عورتوں سے جماع کرنے کی اجازت ہے سابق ممانعت منسوخ کر دی گئی پھر صبح صادق سے لے کر رات کے آنے تک روزہ کو پورا کرو یعنی غروب آفتاب تک پورا کرو۔

ف (۱) مِنَ الْفَجْرِ میں مِنْ یا تو تبعیض کے لیے ہے یا تبیین کے لیے ہے۔ اگر تبعیض کے لیے ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ خیط ابیض جو فجر کا ایک حصہ ہے اور اگر مِنْ بیانیہ ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ وہ خیط ابیض کہ جو سپیدہ خود فجر ہے اور لفظ خیط کے لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ فجر کا اگر ادنیٰ حصہ بھی ظاہر ہو جائے تو کھانا اور پینا حرام ہو جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ مِنْ سببیہ ہے یعنی فجر کے طلوع ہونے کی وجہ سے خیط ابیض ظاہر ہو جاتا ہے۔

ف (۲) خیط ابیض اور خیط اسود کا استعمال صبح کی روشنی اور رات کی تاریکی میں شائع اور ذائع تھا کسی تفسیر اور بیان کا محتاج نہ تھا۔ لیکن جب بعض لوگوں کو محض ظاہری لفظی بناء پر آیت کے مطلب میں اشتباہ ہوا تو مزید توضیح کے لیے مِنَ الْفَجْرِ کا لفظ نازل ہوا۔

عدی بن حاتم سے روایت ہے کہ جب آیت حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ نازل ہوئی تو میں نے ایک سیاہ دھاگا اور ایک سفید دھاگا لیا اور دونوں کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور دونوں کو دیکھتا رہا۔ رات کی تاریکی میں دونوں میں کچھ فرق نہ معلوم ہوا۔ صبح کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ واقعہ سن کر ہنس پڑے اور یہ فرمایا۔

انک لعریض القفا۔ یعنی تو کم عقل ہے۔

یہ تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے اور مِنَ الْفَجْرِ کا لفظ نازل ہوا۔ تاکہ ظاہر بین علماء بھی سمجھ جائیں کہ خیط ابیض اور خیط اسود سے ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ معنی مجازی اور کنائی مراد ہیں اور یہی

پر تمام امت کا اجماع ہے کہ خیط ابیض سے صبح صادق مراد ہے۔

ف ۱۳ فجر تک جماع کی اجازت ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر جنب صبح صادق کے بعد غسل جنابت کرے تو اس کا روزہ صحیح ہے۔ جنابت روزہ کے منافی نہیں۔

وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ

اور نہ لگو ان سے جب اعتکاف بیٹھے ہو مسجدوں میں

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ

یہ حدیں باندھی ہیں اللہ کی سو ان کے نزدیک نہ جاؤ اسی طرح بیان کرتا

اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کو تاکہ وہ بچتے رہیں

حکم پنجم دربارۂ اعتکاف

قال تعالیٰ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ ... الیٰ ..... لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۔

روزہ کے بعد اعتکاف کے مسائل بیان فرماتے ہیں۔ اسی ربط کی بنا پر فقہاء کرام کتاب الصوم کے بعد کتاب الاعتکاف لاتے ہیں اقتداءً بالقرآن الحکیم۔ اور مت اختلاط کرو اپنی بیبیوں کو اس حالت میں کہ جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں بیٹھے ہو۔ اگرچہ تم کسی ضرورت سے مسجد سے باہر نکلے ہو اور خواہ دن ہو یا رات ہو بہرحال اعتکاف کی حالت میں بیوی کے پاس جانا حرام ہے۔ روزہ اگرچہ غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے مگر اعتکاف دن کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اعتکاف رات اور دن دونوں ہی کا ہوتا ہے۔ اور معتکف اگرچہ کسی ضرورت استنجاء وغیرہ کی بنا پر مسجد سے باہر آجائے لیکن حکماً وہ مسجد ہی میں معتکف اور مقیم ہے اس لیے معتکف کو مسجد سے باہر جا کر بھی صحبت کی اجازت نہیں۔ یہ تمام احکام اللہ کے حدود ہیں جو حلال و حرام میں حد فاصل ہیں پس ذرہ برابر ان سے تجاوز نہ کرو بلکہ ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ قریب جانے سے اندیشہ ہے کہ کہیں حدود ممنوعہ میں داخل نہ ہو جاؤ دین کی براءت اور عزت اگر چاہتے ہو تو شبہات سے بچو۔ اسی وجہ سے ارشاد ہے وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ۔ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ۔ چہ جائیکہ اس کو ہضم کر جاؤ۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام کو لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ اللہ کی حدود مقررہ میں داخل ہونے سے بچتے رہیں۔ اپنے قدم کو معصیت کی حدود سے بچائے رکھنے ہی کا نام تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

فائدہ ۱: حالت اعتکاف میں بیوی سے مباشرت حرام ہے۔ مباشرت سے اعتکاف ٹوٹ جاتا ہے۔

فائدہ ۲: وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف سوائے مسجد کے کسی اور جگہ صحیح نہیں۔

فائدہ ۳: اعتکاف ہر مسجد جماعت میں درست ہے کسی مسجد کی خصوصیت نہیں۔ اس لیے کہ آیت میں لفظ مساجد عام ہے۔ امام مالک یہ فرماتے ہیں کہ سوائے مسجد جمعہ کے کسی اور مسجد میں اعتکاف درست نہیں۔

فائدہ ۴: اعتکاف رمضان مبارک کے اخیر عشرہ میں سنت مؤکدہ ہے مگر سنت کفایہ ہے کہ اگر بستی یا شہر میں بعض کے اعتکاف کرنے سے سنت ادا ہو جاتی ہے سب پر لازم نہیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں

الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ

تک کہ کھا جاؤ کاٹ کر لوگوں کے مال میں سے مار کر ناحق

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

کہ اور تم کو معلوم ہے

حکم ششم منع از مال حرام

قال تعالیٰ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ ... الیٰ ..... وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

گزشتہ آیات میں روزہ اور دعا کا ذکر تھا اس آیت میں حرام مال کے کھانے کی ممانعت ہے اشارہ اس طرف ہے کہ روزہ اور دعا کی قبولیت کے لیے اکل حلال شرط ہے۔ نیز پہلے افطار اور سحری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ فرمایا کہ افطار اور سحری حلال روزی سے ہونا چاہیے نیز اصل مقصود روزہ سے طہارت

نفس ہے تو جب عبادت نفس کیلئے معنوی غذا یعنی حلال مال کے متعلق کی اجازت نہیں تو حرام مال کی عبادت کیسے ہو سکتی ہے؟ حلال مال سے روزہ تو صرف دن کا ہے اور حرام مال سے روزہ مدت العمر کے لیے ہے یعنی ساری عمر کا معمول و معمول ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور مت کھاؤ ایک دوسرے کے مال ناحق طریقہ سے ہر ایک کو چاہیئے کہ دوسرے کے مال کو اپنا مال سمجھ کر حفاظت کرے اور مت لے جاؤ مال کے مقدمے حکام کی طرف اس غرض سے کہ کھا جاؤ لوگوں کے مال کا ایک حصہ ظلم اور تعدی اور فریب کے ذریعہ سے اور حالانکہ تم جانتے ہو کہ تم اس معاملہ میں حق پر نہیں رشوت دیکر اپنے موافق فیصلہ کرالینے سے وہ مال تمہارا نہیں ہو جاتا وہ مال لوگوں ہی کا مال رہتا ہے۔ جیسا کہ لفظ اموال الناس سے مفہوم ہوتا ہے یعنی باطل فیصلہ سے وہ مال لوگوں کی ملک سے نہیں نکلا جو اس کے اصل مالک ہیں۔ البتہ حکام چونکہ حقیقت حال سے واقف نہیں ظاہر حال کے موافق فیصلہ کر دیتے ہیں وہ معذور ہیں ان پر کوئی گناہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر حاکم ظاہراً شریعت کے موافق فیصلہ کر دے اور دل سے کسی جانب اس کا میلان نہ ہو تو اس کو عند اللہ اجر ملے گا اگرچہ وہ فیصلہ فی نفسہ ناحق اور گناہ ہو۔

مسئلہ اس آیت سے یہ معلوم ہو کہ قضاء قاضی سے کوئی حرام شے حلال نہیں ہو جاتی جیسا کہ بخاری و مسلم میں ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے لوگو! میں تمہاری طرح بشر ہوں اور تم میرے پاس اپنے جھگڑے اور مقدمے فیصلہ کرانے کے لیے لاتے ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اظہار مدعا میں دوسرے سے زیادہ ہوشیار اور فصیح اللسان ہوں اور میں اس کے ظاہری بیان اور برہان پر اس کے موافق فیصلہ کردوں تو تم کو چاہیئے کہ اگر میں شہادت کے اعتبار سے اسکو دوسرے مسلمان بھائی کا حق دلا دوں تو اسکو ہرگز نہ لے کیونکہ حقیقت میں میں نے اس کو آگ کا انگارہ دے دیا ہے۔

اور یہی تمام علماء کا مذہب ہے کہ یہ مال اس پر حرام ہے اور قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نافذ نہیں۔ جو امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب بھی یہی ہے کہ املاک مرسلہ میں قضاء قاضی فقط ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نہیں یعنی جس صورت میں مالک کی ملک پہلے سے ثابت ہو۔ وہاں اگر کوئی جھوٹا دعوی اور جھوٹی شہادت کے ذریعہ سے اپنے موافق فیصلہ کرالے تو وہ شے اسکے لیے حلال نہ ہوگی لیکن اگر عقود اور فسوخ میں قاضی نے کوئی فیصلہ کر دیا تو قاضی کا حکم ظاہراً (یعنی دنیوی احکام) اور باطناً یعنی عند اللہ یکساں طور پر نافذ اور جاری ہوگا۔ عقود سے معاملات مثل بیع و شراء و اجارہ و نکاح مراد ہیں۔ اور فسوخ سے معاملات کا فسخ کرنا اور توڑنا مراد ہے۔ جمہور علماء اس صورت میں امام ابوحنیفہؒ کے خلاف ہیں امام ابوحنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ دو گواہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے گواہی دی کہ فلاں شخص نے فلاں عورت سے نکاح کر لیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ عورت اس مرد کو دلا دی جائے۔ اس عورت نے کہا اے امیر المؤمنین! میرا اس شخص سے نکاح نہیں ہوا اگر آپکو یہی منظور ہے تو میرا

نکاح اسکے ساتھ پڑھ دیجئے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ان گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا۔ واللہ اعلم۔ یہ عورت پہلے
سے کسی کی منکوحہ نہ تھی اس لیے یہ شہادت زور نکاح کے لیے کافی بھی تھی۔ اور اگر کسی کی منکوحہ ہوتی تو یہ نکاح
اس کے لیے حلال نہ ہوتی۔ امام اعظمؒ کے نزدیک عقود وفسوخ سے اسی قسم کی صورت مراد ہے۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ

تجھ سے پوچھتے ہیں نئے چاند کا نکلنا تو کہہ یہ وقت ٹھہرے ہیں واسطے لوگوں کے

وَالْحَجِّ

اور واسطے حج کے

حکم ہفتم اعتبار حساب قمری

قال تعالیٰ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ ...... وَالْحَجِّ ۗ
گزشتہ آیات میں روزہ اور افطار اور سحر کا ذکر تھا جسکا تمام تر تعلق رویت ہلال سے ہے اس
لیے ان آیات میں رویت ہلال کے مسائل کو ذکر فرماتے ہیں لوگ آپ سے چاندوں کے متعلق دریافت
کرتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ چاند اول دبلا باریک ظاہر ہوتا ہے پھر بڑھتا جاتا ہے پھر کامل ہو جاتا ہے۔ آپ اس
سوال کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ یہ تغیر و تبدل لوگوں کے دینی معاملات میں اوقات مخصوصہ اور مدت معینہ
معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں اور خصوصاً حج اور روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کے لیے یعنی اس سے حج اور روزہ اور عدت
کے ختم ہونے اور قرض وغیرہ کے معاملات کی مدت اور وقت کا علم ہوتا ہے قمری حساب کا جاننا نہایت آسان
ہے ہر شخص چاند کے حساب سے تاریخ معلوم کر سکتا ہے شمسی حساب کے لیے جنتری درکار ہے ہر کس و ناکس
شمسی حساب کو نہیں سمجھتا۔ علم ریاضی میں بغیر کمال حاصل کیے شمسی حساب کا سمجھنا ممکن نہیں اور چاند کا حساب
فطری اور آسان ہے جو سہولت قمری حساب میں ہے وہ شمسی حساب میں نہیں اسی لیے شریعت نے حج
اور روزہ اور زکوٰۃ اور عدت وغیرہ کا مدار قمری حساب پر رکھا ہے۔ حج اور زکوٰۃ میں قمری حساب کا اعتبار
ہے شمسی حساب کا اعتبار نہیں۔ شریعت میں مہینہ اور سال قمری ہی معتبر ہے اور اسکا استعمال مسلمانوں کے لیے
فرض کفایہ ہے۔ اگرچہ دنیوی معاملات میں شمسی حساب کا استعمال جائز ہے لیکن اگر سب کے سب قمری حساب
کو ترک کر دیں تو گنہگار ہوں گے جیسا کہ فرض علی الکفایہ کا حکم ہے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا

اور نیکی یہ نہیں کہ گھروں میں آؤ پچھیت پر سے

وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ

لیکن نیکی وہی ہے جو کوئی بچتا رہے اور آؤ گھروں میں دروازوں سے

وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۱۸۹﴾

اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم اپنی مراد کو پہنچو

حکم ششم اصلاح بعض رسوم جاہلیت

قال تعالیٰ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا ... الیٰ ... لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔

گزشتہ آیت میں حج کا ذکر تھا۔ آئندہ آیت میں حج کے متعلق جاہلیت کی ایک غلط رسم کی اصلاح فرماتے ہیں۔ بخاری میں براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب احرام باندھ لیتے تو گھروں میں دروازوں سے نہ داخل ہوتے بلکہ مکان کی پشت کی طرف سے داخل ہوتے اور نقب لگا کر یا سیڑھی لگا کر اندر آتے اور اس کو فضیلت اور قربت سمجھتے۔ اس پر حق جل شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اور اس میں کوئی فضیلت اور بزرگی نہیں کہ تم حالتِ احرام میں گھروں میں پشت کی جانب سے آیا کرو۔ لیکن نیکی اور بزرگی یہ ہے کہ حالتِ احرام میں خاص طور پر اللہ کی محرمات سے بچے۔ اور جب تم کو گھروں میں آنے کی ضرورت ہو تو دروازوں کی طرف سے آؤ اور احکامِ خداوندی میں تغیر اور تبدل سے بچتے رہو۔ کسی شئے کو اپنی رائے سے عبادت اور معصیت سمجھ لینا تقویٰ کے خلاف ہے۔ امید ہے کہ تم اپنی مراد کو پہنچو گے۔

ف مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا جائز اور مباح ہے لیکن اس کو عبادت اور نیکی سمجھنا بدعت ہے۔ شریعت کی نظر میں وہ بر اور تقویٰ کے منافی ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی مباح کو نیکی اور بزرگی سمجھ لینا یہ بدعت ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہر کام کو اپنے طریقہ سے کیا کرو۔

اطلبوا الارزاق من اسبابها

وادخلوا الابيات من ابوابها

اور اس معنی پر آیت کا ماقبل سے ایک لطیف ربط ہو جاتا ہے کہ بے محل اور لایعنی سوال ایسا کہ تم نے ہلال کے گھٹنے اور بڑھنے کے متعلق کیا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکان میں پشت کی جانب سے داخل ہونا۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو لڑتے ہیں تم سے

وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾

اور زیادتی مت کرو اللہ نہیں چاہتا زیادتی والوں کو

وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ

اور مارو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو

مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا اور دین سے بچلانا مارنے سے زیادہ ہے

وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتَّىٰ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک

يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ

وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ پھر اگر وہ لڑیں تو ان کو مارو

كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ

یہی سزا ہے منکروں کی پھر اگر وہ باز آویں تو اللہ

غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ

بخشنے والا مہربان ہے اور لڑو ان سے جب تک نہ باقی رہے فساد

وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا
اور حکم رہے اللہ کا پھر اگر وہ باز آویں تو زیادتی نہیں مگر

عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾ الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ
بے انصافوں پر حرمت کا مہینہ مقابل حرمت کے مہینے کے اور

الْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا
ادب رکھنے میں بدلہ ہے پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم

عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَ
اس پر زیادتی کرو جیسے اس نے زیادتی کی اور ڈرتے رہو اللہ سے

اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٩٤﴾
اور جان رکھو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے

حکم نہم متعلق بہ قتال کفار

قال تعالیٰ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ... الیٰ ... وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ

گزشتہ آیات میں حج اور روزہ کے لیے خاص خاص مہینے کا ہونا بیان فرمایا۔ حج سوائے ان ایام مقررہ کے دوسرے ایام میں حج نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ملت ابراہیمی میں یہ حکم تھا کہ چار مہینوں میں قتل و قتال حرام ہے ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب یہ چار مہینے اشہر حرام کہلاتے تھے۔ اور یہ چار مہینے امن کے کہلاتے تھے۔ ان دنوں میں تمام ملک عرب میں لڑائی موقوف ہو جاتی تھی اور کوئی کسی سے تعرض نہ کرتا تھا اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذی قعدۃ الحرام ۶ھ میں صحابہ کی ایک کثیر جماعت کے ہمراہ عمرہ کا قصد فرمایا جب مکہ کے قریب پہنچے تو مشرکین مکہ آپ کو روکنے کے لیے تیار ہو گئے اور مسلمانوں کو عمرہ کرنے اور مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ بالآخر اس پر صلح ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بدون عمرہ کیے ہوئے واپس ہو جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئندہ ماہ ذی قعدۃ الحرام ۷ھ میں مع اصحاب عمرۃ القضاء کے لیے مکہ تشریف لائے تو اندیشہ ہوا کہ اگر مشرکین مکہ اس ماہ حرام میں خلاف عہد

کفر میں رحمت نہیں فرمائے کیونکہ کفر و شرک محل رحمت نہیں بلکہ مورد غضب و لعنت ہے۔ اور اسے مسلمانو جب
تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ کفر محل رحمت نہیں تو ان کو قتل سے کیوں روکو اور ان سے اس وقت تک جنگ کا
سلسلہ جاری رکھو جب تک کہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد ختم نہ ہو جائے اور خالص حکم اللہ ہی کا چلنے لگے
یعنی کفر مغلوب ہو جائے اور اسلام غالب آ جائے کہ کفر کو اسلام کے مقابلہ میں سر اٹھانے کی مجال باقی نہ رہے
اور کفر اسلام کے سامنے ہتھیار ڈال دے اور کفر میں اتنی طاقت نہ رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے کسی
دینی و دنیوی امر میں مزاحمت کر سکے۔ شروع آیت میں اصل قتال کا وجوب بیان فرمایا تھا اور اس آیت میں جہاد
و قتال کی غرض و غایت بیان فرمائی کہ جہاد سے مقصود کفر کے فتنہ کو ختم کرنا ہے۔ اس لیے کہ اللہ کی زمین پر
کفر سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں پس اگر یہ کافر شرک اور کفر کے فتنہ اور فساد سے باز آ جائیں تو پھر ان سے کوئی
زیادتی اور دست درازی نہ کی جائے اس لیے کہ دست درازی سوائے ظالموں اور ستمگاروں کے اور کسی پر
روا نہیں اور شر اور فساد سے باز آ جانے کے بعد ظالم نہیں رہے۔ عمرۂ حدیبیہ میں صحابہ کو یہ تردد تھا کہ اگر
کفار سے قتال کی نوبت آئی جیسا کہ بظاہر غالب گمان ہے تو اگر ہاتھ روکے رہیں تو مشکل اور اگر ان سے
جنگ کریں تو ایک تو مکہ میں حرم کی بے حرمتی اور دوسرے ماہ محرم یعنی ذی قعدۃ الحرام کی بے حرمتی ذی قعدہ
اور ذی الحجہ اور محرم اور رجب یہ چار مہینے اشہر حرم اور اشہر حرام کہلاتے تھے ان میں قتل و قتال ممنوع تھا۔ مکان
محترم یعنی ارض حرم کے متعلق جو تردد تھا اسکا گزشتہ آیت میں جواب دیا۔ اب ان آیات میں زمان محترم یعنی
شہر حرام کی بے حرمتی کا جو تردد تھا اس کا جواب ارشاد فرماتے ہیں۔ اور اسے مسلمانو! تم کو مکان محترم میں جنگ
و جدال کے متعلق جو تردد تھا وہ زائل کر دیا گیا۔ رہا زمان محترم یعنی شہر حرام میں
جنگ کے متعلق جو تردد ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ حرمت

والا مہینہ حرمت والے مہینہ کے بدلہ اور عوض میں ہے اگر وہ اس مہینہ کی حرمت کا لحاظ اور ادب رکھیں
اور تم سے نہ لڑیں تو تم بھی اس مہینہ کی حرمت کا ادب اور لحاظ کر کے ان سے نہ لڑو اور وجہ یہ ہے کہ
حرمت کی چیزوں میں عوض اور بدلہ ہے یعنی برابری ہے جیسا اگر وہ اس شہر حرام کا احترام ملحوظ رکھیں تو تم
بھی اسکا احترام ملحوظ رکھو اور اگر وہ اس محترم مہینہ کا احترام نہ کریں تو جیسے تم پر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی
اس پر اسی قدر زیادتی کر دو جس قدر کہ اس نے تم پر زیادتی اور دست درازی کی ہے اور زیادتی کا بدلہ لینے
میں اللہ سے ڈرتے رہو کہیں زیادتی کا بدلہ لینے میں تم سے زیادتی نہ ہو جائے کہ اپنے حق سے زائد
بدلہ لے لو اور مستقبل میں کافروں کے غلبہ کے خطرہ کو خاطر میں نہ لاؤ۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے اور یقین
رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور فتح اور کامیابی کا تمام تر دار و مدار اللہ کی معیت اور اس کی نصرت
و حمایت پر ہے اور بغیر تقوی اور پرہیزگاری اللہ کی معیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ حاصل ان آیات
شریفہ کا یہ ہے کہ حدود حرم اور شہر حرام میں تم ابتداء بالقتال نہ کرو اور اگر کفار ابتداء بالقتال کریں

تو تم قتال سے دریغ نہ کرو۔ یہ تمہارا قتل و قتال بلدِ حرام اور شہرِ حرام کی حرمت کے منافی نہیں جیسے ابتداءً کسی مسلمان کو قتل کرنا روا نہیں لیکن قصاص میں کسی مسلمان کو قتل کرنا خون ناحق نہیں کہلاتا۔

ف (۱) ربیع بن انسؓ فرماتے ہیں کہ جہاد کے بارے میں جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے یعنی وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ابتداء میں یہی حکم تھا کہ جو لوگ آپ سے قتال کریں تو آپ ان سے قتال کریں اور جو آپ سے قتال نہ کریں تو آپ بھی ان سے قتال نہ کریں۔ بعد میں یہ حکم اُقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً سے منسوخ ہو گیا یعنی تمام مشرکین سے قتال کرو خواہ وہ تم سے قتال کریں یا نہ کریں۔

اور صدیق اکبرؓ اور سعید بن جبیرؓ اور زہریؒ سے منقول ہے کہ سب سے پہلی آیت جو جہاد و قتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ سورۂ حج کی یہ آیت ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الآیۃ۔

امام ابوبکر رازیؒ فرماتے ہیں کہ جائز ہے کہ ابتداء بالقتال کرنے والوں سے قتال کی اجازت میں سب سے پہلی آیت وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ہو اور عام کافروں سے جہاد و قتال کی اجازت کے بارے میں خواہ وہ ابتداء بالقتال کریں یا نہ کریں، سورۂ حج کی آیت پہلی آیت ہو یعنی تمام کافروں سے جہاد و قتال کی اجازت میں پہلی آیت اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا الآیۃ ہو۔ کذا فی احکام القرآن صفحہ ۲۵۸ ج ۱۔

ف (۲) فی سبیل اللہ کا مطلب یہ ہے کہ محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے جہاد و قتال ہو۔ قومیت اور وطنیت کی بنا پر نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ جو قتال حمیت اور قومیت اور اپنی بہادری دکھانے کے لیے ہو وہ فی سبیل اللہ نہیں جو قتال محض اس لیے ہو کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

ف (۳) جمہور ائمہ دین کا مسلک یہ ہے کہ اشہر حرم میں قتل و قتال ابتداء میں ممنوع تھا بعد میں اجازت ہو گئی مگر بہتر اب بھی یہی ہے کہ اشہر حرم میں ابتداء بالقتال نہ کیا جائے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ آیت کا حکم اب بھی باقی ہے منسوخ نہیں ہوا اور اب بھی حرم اور شہر حرم میں ابتداء بالقتال حرام ہے اور یہی مجاہدؒ کا قول ہے۔ صحیح بخاری میں ابن عباسؓ کی روایت سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ حرم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام ہے صرف میرے لیے ایک ساعت کے واسطے حلال ہوا پھر تا قیامت تک حرام ہے یہاں کی گھاس اور تنکا بھی نہ کاٹا جائے اور نہ یہاں کا شکار بھگایا جائے۔ اور جو لوگ نسخ کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ابن خطل مسجد حرام میں قتل کیا گیا حالانکہ وہ غلاف کعبہ کے پردہ سے لٹکا ہوا تھا۔ جواب یہ ہے کہ یہ قتل اسی ساعت میں ہوا کہ جس ساعت میں مکہ میں قتل و قتال آپ کے لیے حلال کر دیا گیا تھا۔

اور یہ اعتبار کرنی غلطی ہو جائے تو معاف ہے۔ (روح المعانی)

ابوداؤد اور ترمذی میں ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے جب اسلام کو فتح دی تو ہم آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ اب تو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو غلبہ دے دیا (یعنی اب جہاد کی ضرورت نہیں) لہٰذا ہمارے جو مال لڑائیوں میں پہلے تباہ ہو چکے ہیں انکی کچھ دیکھ بھال کرلیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابوایوب انصاری ہمیشہ جہاد کرتے رہے یہاں تک کہ قسطنطنیہ کے جہاد میں شہید ہوئے اور قسطنطنیہ کی فصیل پناہ کے نیچے مدفون ہوئے۔

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ ۚ فَإِنْ أُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو

مِنَ الْهَدْيِ ۖ وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّىٰ يَبْلُغَ

میسر ہو قربانی بھیجو اور حجامت نہ کرو سر کی جب تک

الْهَدْيُ مَحِلَّهُ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ بِهِ أَذًى

پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر پھر جو کوئی تم میں مریض ہو یا اس کو

مِنْ رَأْسِهِ فَفِدْيَةٌ مِنْ صِيَامٍ أَوْ صَدَقَةٍ أَوْ

دکھ دیا اسکے سر نے تو بدلہ دیوے روزے سے یا خیرات یا

نُسُكٍ ۚ فَإِذَا أَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى

ذبح کرنا پھر جب تم کو خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھاوے عمرہ ملا کر حج کے

الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ

ساتھ تو جو میسر ہو قربانی پہنچاوے پھر جس کو پیدا نہ ہو

فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ

تو روزہ تین دن کا حج کے وقت میں اور سات دن جب پھر کر جاؤ

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ

یہ دس ہوئے پورے یہ اس کے لیے ہے جس کے گھر والے نہ

حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

ہوں رہتے مسجد حرام کے پاس اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو

اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۹۶

اللہ کا عذاب سخت ہے

حکم یازدہم متعلق حج و عمرہ

قال تعالیٰ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔

اہ صیام کے بعد حج کے مہینے شروع ہوتے ہیں اس لیے روزوں کے بعد حج کا ذکر فرمایا اور پھر حج کی مناسبت سے حج کے مہینوں میں قتل و قتال کا حکم ذکر فرمایا اب پھر حج اور عمرہ کے بقیہ احکام کو بیان فرماتے ہیں۔ نیز حج عبادت بدنیہ اور مالیہ ہے اعلیٰ ترین اعمال بدنیہ میں سے ہے اور انفاق فی سبیل اللہ اور احسان الی العباد کا بہترین عمل ہے جس کا پہلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور حج اور عمرہ کو خاص اللہ کے لیے پورا کرو نہ تو شروع کرکے درمیان میں چھوڑو اور نہ حج کا احرام باندھ کر اس کو فسخ کرکے عمرہ بناؤ جو شروع کیا ہے اس کو پورا کرو اور حج اور عمرہ کے آداب و سنن کو پورا پورا ملحوظ رکھو بغیر اس کے حج اور عمرہ ناتمام رہے گا اور حج اور عمرہ کا تمام سفر خالص اللہ کے لیے ہو۔ بغیر اخلاص کے عبادت میں حسن پیدا نہیں ہوتا اور سفر حج میں انفاق فی سبیل اللہ اور احسان سے دریغ نہ کرو سفر حج و عمرہ میں تجارت کرنے سے اضعافاً مضاعفہ اجر ملتا ہے۔ پس اگر احرام باندھنے کے بعد تم اس حج اور عمرہ کے پورا کرنے سے روک دیئے جاؤ کہ جس کے تمام کرنے کا تم کو حکم دیا گیا ہے اور کسی دشمن یا مرض یا خرچ کے ختم ہوجانے کی وجہ سے یا اور کسی عذر کے پیش آجانے کی وجہ سے تم بیت اللہ تک نہ پہنچ سکو تو ایسی حالت میں حکم یہ ہے کہ فی الحال حج اور عمرہ کو ملتوی کرو اور احرام سے حلال ہونے کے لیے جو کچھ

لہ اس لفظ سے گزشتہ آیت وَاَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے ۱۲

اختیار کرو کہ جو قربانی تم کو میسر آئے اونٹ یا گائے یا بکری کی اور بکری ادنیٰ درجہ ہے اس کو سرزمین حرم کی
طرف بھیجو تاکہ وہ قربانی حرم میں ذبح کی جائے اور سر منڈانا کہ اس وقت تک احرام کھولنے کے حلال نہ ہو جب
تک کہ وہ قربانی کا جانور اپنے خاص موقع و محل پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے اور ہدی کے ذبح کا محل اور
موقع حرم ہے کما قال تعالیٰ ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ وقال تعالیٰ هَدْيًا بَالِغَ
الْكَعْبَةِ، معلوم ہوا کہ یہ ہے کہ خون بہانا اس وقت تک عبادت نہیں جب تک کہ کسی خاص مکان یا خاص زمان
میں نہ ہو چونکہ یہ زمانہ قربانی کا نہیں اس لیے مکان میں بھیجنا ضروری ہوا، اس بنا پر محصر کے لیے یہ واجب
ہوا کہ اپنی ہدی کو حرم میں بھیجے اور ذبح کے لیے کوئی دن مقرر کرلے تاکہ جب وہ دن آئے تو اسی دن سر منڈا
کر حلال ہو جائے اور اس فوت شدہ حج اور عمرہ کی بعد میں قضا کرے۔ پھر اگر تم میں سے کوئی مریض ہو جائے
یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور اس بیماری اور تکلیف کی وجہ سے قبل از وقت ہی سر منڈانا چاہے تو اس
کے لیے اجازت ہے مگر اس پر اس جنایت اور تقصیر کا فدیہ اور بدلہ واجب ہے اس طرح سے کہ یا تو تین دن
کے روزے رکھے یا چھ مسکینوں کو صدقہ و خیرات دے اور ہر مسکین نصف صاع گیہوں یعنی بقدر صدقہ فطر
کی مقدار ہے وہ دے یا کسی جانور کی قربانی دے جس کا اعلیٰ درجہ اونٹ ہے اور اوسط درجہ گائے
اور ادنیٰ درجہ بکری ہے پس جب تم خاطر جمع ہو جاؤ یعنی احصار سے تم کو امن حاصل ہو جائے یا یہ کہ
شروع ہی سے تم امن اور بے خوف ہو تو جو شخص ایام حج میں عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر نفع حاصل کرنا
چاہے یعنی یہ چاہے کہ حج کے زمانہ میں حج بھی کرلے اور عمرہ بھی کرلے خواہ دونوں کا احرام ساتھ باندھے یا
یکے بعد دیگرے تو ایک وقت ان دو عبادتوں سے متمتع ہو۔ ایسے متمتع ہونے کے شکر میں اس کے ذمہ قربانی
واجب ہے جو بھی میسر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی کہ حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہوا اس
نعمت کے شکر میں ایک ہدی واجب ہے جیسی بھی میسر ہو اور جس شخص نے فقط حج یا فقط عمرہ کیا تو اس پر
یہ ہدی واجب نہیں پس جو شخص ان ایام میں حج اور عمرہ دونوں سے بہرہ مند ہو لیکن ناداری کی وجہ سے اس کو
ہدی میسر نہ آئے تو اس کے ذمہ تین روزے تو زمانہ حج میں واجب ہیں۔ جس کا آخری دن نویں تاریخ ذی الحجہ
ہے اور بہتر اس سے پہلے ہی تین روزے رکھ لے تو وہ بھی بالاجماع جائز ہیں اور ان تین کے علاوہ سات
روزے جب رکھو کہ جب تم حج سے فارغ ہو کر اپنے وطن واپس ہو جاؤ یہ پورے دس
دن کے روزے ہو گئے اور زمانہ حج میں عمرہ اور حج کو ملا کر تمتع اور متمتع ہونے کی یہ اجازت صرف
ان لوگوں کے لیے ہے جو مسجد حرام کے قرب و جوار اور اس کے آس پاس رہنے والے نہ ہوں یعنی حدود حرم
اور حدود مواقیت سے باہر کے رہنے والے ہوں اور جو لوگ حدود حرم کے رہنے والے ہیں وہ صرف
افراد کریں یعنی فقط حج کا احرام باندھیں اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو تاکہ حالت احرام میں کوئی
جنایت کر بیٹھو۔ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔ احرام کی حالت دربار کی حاضری کی
علامت ہے اور دربار میں حاضر ہو کر جنایت اور معصیت کا مرتکب ہونا سخت جرم ہے۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ

حج کے کئی مہینے ہیں معلوم، پھر جس نے لازم کر لیا ان میں حج

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ

تو بے پردہ ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج میں۔ اور

وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا

جو کچھ تم کرو گے نیکی اللہ کو معلوم ہو گی اور خرچ راہ لیا کرو

فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي

کیونکہ خرچ راہ میں بہتر ہے گناہ سے بچنا اور مجھ سے ڈرتے رہو اے

الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا

عقلمندو۔ کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ

فضل اپنے رب کا پھر جب طواف کو چلو

مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠

عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو نزدیک مشعر الحرام کے۔

وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ

اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا اور تم تھے اس سے پہلے

لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

ناواقف پھر سے۔ پھر طواف کو پھرو جہاں سے سب

النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

لوگ چلیں اور گناہ بخشواؤ اللہ سے۔ اللہ ہے بخشنے والا مہربان۔

تمہارے خالق نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارا خالق اور مربی بھی ہے جس کی نعمتوں کا شمار بھی نہیں ایسے متبرک مقامات میں اللہ کو یاد کرنا چاہیے تھا، آباء و اجداد کا ذکر بے سود ہے۔

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا

پھر کوئی آدمی کہتا ہے کہ اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں

وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ

اور اس کو آخرت میں کچھ حصہ نہیں ۔ اور کوئی

مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي

ان میں کہتا ہے کہ اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور

الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ

آخرت میں خوبی ۔ اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ۔ یہ لوگ

لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ

ان کو ہے حصہ اپنی کمائی سے اور اللہ جلد لیتا ہے

الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ

حساب ۔ اور یاد کرو اللہ کو کئی دن گنتی کے۔ پھر جو

تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

کوئی جلدی چلا گیا دو دن میں تو اس پر نہیں گناہ اور جو کوئی رہ گیا

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا

تو اس پر نہیں گناہ ۔ جو کوئی ڈرتا ہے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان

اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

رکھو کہ تم اسی کے پاس جمع ہوگے ۔

اہلِ ذکر اور اہلِ دعا کی اقسام

قال تعالیٰ: فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا ... الٰی ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ

ربط: گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد کا حکم تھا اب یہاں ذکر کی اقسام بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو فقط دنیا کے طالب ہیں۔ یہ لوگ فقط دنیاوی عزت اور وجاہت اور فقط مال و دولت کی دعا مانگتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں۔ اور دوسرے وہ ہیں کہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی خوبی اور بھلائی خدا تعالیٰ سے مانگتے ہیں ان کو تمام حسنات سے پورا حصہ ملے گا۔ ایک تیسری قسم اور بھی ہے وہ یہ کہ سوائے آخرت کے کچھ نہ مانگے۔ سو اول تو ایسی قسم بہت ہی قلیل اور نادر بلکہ تقریباً معدوم ہے۔ نیز یہ صورت شرعاً بھی پسندیدہ نہیں۔ انسان ضعیف اور ناتواں ہے دنیاوی فوائد سے مستغنی نہیں۔ عبدیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جوتی کا تسمہ بھی خدا سے مانگے۔ انسان کو پیدا ہی مانگنے کے لیے کیا ہے۔ نیز انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنت بھی یہی ہے کہ تمام دینی اور دنیوی آفتوں سے پناہ مانگے تاکہ عقوبتوں اور فتن سے امن کے ساتھ اللہ کی عبادت کر سکے نیز اللہ سے مانگنا عزت ہے اور مخلوق سے مانگنا ذلت ہے اللہ سے جتنا مانگیں گے اتنا ہی زیادہ خدا کے مقرب ہوں گے بخلاف مخلوق کے کہ اس سے جتنا مانگیں گے اتنا ہی زیادہ اس سے دور ہوں گے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ بعض لوگ کسی وقت جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ایسے متبرک اور مقدس مقامات میں فقط دنیا ہی کی دعا مانگتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو جو کچھ دینا ہے وہ دنیا ہی میں دے دے اس شخص نے اگرچہ ہم کو پکارا اور ہم کو یاد کیا لیکن چاہت گھٹیا ہے اگر ہم سے ہم کو نہ مانگا بلکہ دنیا کے دو دن کو مانگا اس لیے اس شخص کو جو کچھ دینا ہو گا وہ ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور آخرت میں اس کے لیے کوئی حصہ نہ ہوگا اور بعضے آخرت کے مشتاق اور خدائی ایسے ہوشیار ہیں کہ دنیا ہی میں آخرت کے طلبگار ہیں اور اپنی دعا میں یہ کہتے ہیں اے پروردگار ہم کو دنیا میں رہتے ہوئے ایسی بھلائی اور نیکی عطا فرما جو ہمارے دل کو اللہ سے بالاتر اور برتر ہو اور تیری خوشنودی اور رضامندی کا ذریعہ ہو اور آخرت میں بھی ہم کو نیکی اور بھلائی عطا فرما یعنی ثواب اور رحمت سے سرفراز فرما اور عفو اور مغفرت کے ذریعہ ہم کو عذاب دوزخ سے محفوظ فرما ایسے لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت میں بہت بڑا حصہ ہے اس چیز کے جو انہوں نے اپنی دعا اور استغفار اور اعمال صالحہ سے کمایا ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والے ہیں۔ یعنی قیامت قریب ہے تم اس سے غافل نہ ہو اور ایام تشریق میں اللہ کو یاد کرو جو گنتی کے دن ہیں۔ ایام معدودات سے ذی الحجہ

؎ یہ ترجمہ حسنۃ کی تنوین تنکیر کا ہے۔ کیونکہ وہ ہے جو معلوم نہ ہو معرفہ اس کی ضد ہے ۱۲

بمنیٰ ثلاثة بیوم النحر ویسقط عنه رمی الیوم الثالث ومن لم ینفر منها الا فی آخر الیوم الثالث حصل له بمنی مقام اربعة ایام من اجل یوم النحر الخ۔

(کذا فی احکام القرآن للقرطبی ج ۳ ص ۳)

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّعۡجِبُكَ قَوۡلُهٗ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا

اور بعضا آدمی ہے کہ خوش آوے تجھ کو بات اس کی دنیا کی زندگی میں ۔

وَيُشۡهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىۡ قَلۡبِهٖ ۙ وَهُوَ

اور گواہ پکڑتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ

اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الۡاَرۡضِ

سخت جھگڑالو ہے ۔ اور جب پھر جاوے تو دوڑتا پھرے ملک میں

لِيُفۡسِدَ فِيۡهَا وَيُهۡلِكَ الۡحَرۡثَ وَ

کہ اس میں ویرانی کرے ، اور ہلاک کرے کھیتیاں اور

النَّسۡلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الۡفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ

جانیں اور اللہ خوش نہیں رکھتا فساد کرنا اور جب کہئے اللہ

اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ

سے ڈر تو کھینچ لاوے اس کو غرور گناہ پر سو بس ہے اس کو دوزخ

وَلَبِئۡسَ الۡمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّشۡرِىۡ

اور بری تیاری ہے ۔ اور کوئی آدمی ہے جو بیچتا ہے

نَفۡسَهُ ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوۡفٌ بِالۡعِبَادِ ۝

اپنی جان تلاش کرتا خوشی اللہ کی اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر

اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ کو سن کر وہ بہت خوش ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ نے بعوض جنت ہماری جانیں خرید لیں جب ہم اس کے عوض جنت سے ملی تو فوراً ہی شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ پھر ہمیں دعویٰ ملکیت کا تھا جب ہی تو اختیار فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّ

اے ایمان والو داخل ہو اسلام میں پورے پورے اور

لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ

مت چلو قدموں پر شیطان کے بیشک وہ تمہارا صریح دشمن

مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ

ہے پھر اگر تم ڈگمگانے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے تم کو

الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ هَلْ

صاف حکم تو جان رکھو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا کیا

يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ

وہ لوگ یہی انتظار رکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں

وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

اور فرشتے اور فیصل ہو جاوے کام اور اللہ ہی کی طرف رجوع ہیں سب کام

حکم دوازدہم - استسلام تام وقبول جمیع احکام اسلام

قال تعالیٰ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا ... الیٰ ... وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ۔

ربط: گزشتہ آیات میں ایمان اور اخلاص کا ذکر تھا اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان اور اخلاص کا مقتضیٰ یہ ہے کہ دین اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں داخل ہونے کے بعد دین کے منافی کسی چیز پر دھیان نہ دو اور شیطان کی متابعت سے کوئی کام نہ کرو

دین میں داخل ہونے کے بعد دوسرے کسی دین کی طرف بھی نظر رکھنا یہ اخلاص کے منافی ہے نیز جو شخص اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرے اور اس کی رضا اور خوشنودی کا طالب ہو اور اس کی جنس خاص رحمت و رأفت کا امیدوار ہو جو مخلصین پر نازل ہوتی ہے تو اس کو چاہئے کہ اپنے اعمال میں قرآن کے بعد توریت اور انجیل کی رعایت نہ کرے ناسخ کے ہوتے ہوئے منسوخ کی رعایت بدعت اور ضلالت ہے جو باعث نقمت ہے یہ آیت عبداللہ بن سلامؓ اور دیگر علماء یہود کے بارے میں نازل ہوئی جو اسلام لانے کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہم کو احکام کی تعمیل کے ساتھ اس کی بھی اجازت دے دی جائے کہ شریعت موسویہ کے مطابق ہفتہ کی تعظیم اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے پرہیز کرتے رہیں اور توریت کی بھی تلاوت کرتے رہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ایمان و اسلام کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسلام میں کامل طور پر داخل ہو جاؤ۔ اعتقاداً و عملاً پورے پورے داخل ہو جاؤ اور اسلام میں کسی اور چیز کو جوڑ نہ لگاؤ جا ہے یہودیت اور نصرانیت کی آمیزش سے اسلام کے آب و رنگ میں ادنیٰ سا بھی کہیں فرق آتا ہے اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو ناسخ کے بعد منسوخ کی رعایت کرنا شیطان کے نشان قدم پر چلنا ہے تحقیق وہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے کہ جو چیز دین نہیں اس کو دین بنا کر تم سے کرانا چاہتا ہے اور بدعت کی حقیقت بھی یہی ہے کہ جو چیز دین نہ ہو اس کو دین سمجھ لیا جائے ان مؤمنین اہل کتاب کے دل میں شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ شریعت موسویہ میں ہفتہ کی تعظیم واجب ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں اور اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت اور دودھ حرام ہے اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں۔ اس لئے اگر ہم بدستور عملاً ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اعتقاداً اس کو واجب نہ سمجھیں اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو عملاً ترک کر دیں اور اعتقاداً اس کو حلال سمجھتے رہیں تو اس میں شریعت محمدیہ کی بھی مخالفت نہ ہوگی اور شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے گی اور وہ عمل زیادہ موجب ثواب ہوگا حق تعالیٰ نے اس آیت میں اس خیال کی اصلاح فرمائی کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد صرف اسلام ہی کی رعایت سے عمل کرنا فرض اور لازم ہے اور جو امر اسلام میں قابل رعایت نہیں اس کو دین سمجھ کر اس کی رعایت کرنا بدعت ہے جو شیطانی وسوسہ ہے اور ایک دین میں داخل ہونے کے بعد گزشتہ دین کی طرف نظر رکھنا اخلاص کے منافی ہے پس اگر تم واضح اور روشن احکام آنے کے بعد بھی پھسلے اور شیطان کے قدموں پر چلے اور شریعت محمدیہ کے احکام کے اتباع اور تعمیل میں اعتقادی اور باطنی طور پر یہودیت اور نصرانیت کی رعایت کی تو خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ غالب اور زبردست ہے ایسے لوگوں کو سخت سزا دے گا لیکن بڑا حکیم ہے کہ

لہ اس بیان میں [illegible] بالغیب کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔

ہم شریعت محمدیہ پر عامل ہیں اور باطن میں یہودیت یا نصرانیت محفوظ رہے اور بڑی حکمت والا ہے کہ ایسے لوگوں سے انتقام میں جلدی نہیں فرماتا کسی حکمت سے مہلت دے رکھی ہے کیا یہ لوگ جو اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپاتے ہیں اب صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ قیامت قائم ہو اور اولین اور آخرین جمع ہوں اور اللہ تعالیٰ ان کے حساب و کتاب اور جزاء اور سزا کے لیے خود سفید ابر کے سائبانوں میں نزول اجلال فرمائیں اور فرشتے بھی ساتھ آئیں اور ہر کسی کو اس کے عمل کے مطابق جزا اور سزا دے دی جائے اور اس میں شک اور تردد کیا ہے تمام امور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں نے اپنے باطنی انکار کو ظاہری اقرار کے پردہ میں چھپایا اس لیے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا ظہور بھی ابر کے پردہ یعنی سفید بادل کی شکل میں نمودار ہوگا۔

فائدۂ اوّل حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ اور فرشتوں کے آنے کا واقعہ قیامت کے دن پیش آئے گا جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ وَجِايٓءَ يَوْمَئِذٍۢ بِجَهَنَّمَ ۚ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَٰنُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ. وَقَالَ تَعَالٰی هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمُ الْمَلَٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ رَبُّكَ أَوْ يَأْتِيَ بَعْضُ ءَايَٰتِ رَبِّكَ۔

وعن ابن مسعودؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یجمع اللہ الاولین والآخرین لمیقات یوم معلوم قیاما شاخصۃ ابصارهم الی السماء ینتظرون فصل القضاء وینزل اللہ فی ظلل من الغمام من العرش الی الکرسی اخرجہ ابن مردویہ (تفسیر ابن کثیر)

ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اولین اور آخرین کو جمع کریں گے تمام لوگ آسمان کی طرف کھڑے دیکھتے ہوں گے اور فیصلہ کے منتظر ہوں گے اتنے میں اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں عرش سے کرسی کی طرف نزول فرمائیں گے (ابن مردویہ)

اور اسی قسم کا مضمون ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب سب لوگ شفاعت کرنے سے عذر فرمادیں گے اور شفاعت کی نوبت مجھ تک پہنچے گی تو میں کہوں گا کہ ہاں ہاں میں شفاعت کے لیے ہوں تمہاری شفاعت کروں گا اور جاکر عرش کے نیچے سجدہ میں گر پڑوں گا اور درخواست کروں گا کہ حق تعالیٰ بندوں کے درمیان فصل قضا کے لیے تشریف لائیں۔

فیشفعہ اللہ ویاتی فی ظلل من الغمام بعد ما تنشق السماء الدنیا وینزل من فیہا من الملائکۃ۔

پس اللہ تعالیٰ آپ کی درخواست منظور فرمائیں گے اور آسمان کے پھٹنے کے بعد ابر کے سائبانوں میں نزول اجلال فرمائیں گے اور فرشتے بھی اتر آئیں گے۔

اور عرش بھی اترے گا اور فرشتے یہ تسبیح پڑھتے ہوں گے سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والجبروت سبحان الحی الذی لا یموت سبحان الذی یمیت الخلائق ولا یموت سبوح قدوس رب الملائکۃ والروح سبوح قدوس سبحان ربنا الاعلیٰ سبحان ذی السلطان والعظمۃ سبحانہ سبحانہ ابداً ابداً (تفسیر ابن کثیر)

فائدہ دوم
جن آیات اور احادیث میں حق جل شانہ کا آنا اور اسی قسم کے امور کا ذکر آیا ہے ان کے بارے میں علماء سلف کا مسلک یہ ہے کہ ان کی تحقیق اور تفتیش کیا نہ کرے اور بلا تشبیہ اور بلا تمثیل کے ان پر ایمان لائے جس طرح اس کی ذات بے چون و چگون ہے۔ اسی طرح اس کے افعال بھی بے چون و چگون ہیں۔ اور علماء خلف کا مسلک یہ ہے کہ وہ عوام کے عقائد کی حفاظت کے لیے کوئی مناسب تاویل کر لیتے ہیں، تاکہ ظاہر الفاظ سے عوام کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ مثلاً اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَهُمُ اللّٰهُ میں یہ تاویل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم یا قہر کا آنا مراد ہے وغیرہ ذلک اور حضرات صوفیہ کرام یہ فرماتے ہیں کہ یَاْتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ سے حق سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات مراد ہیں۔ یعنی قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ میں تجلی ہوگا۔ جس طرح کوہ طور پر اللہ تعالیٰ کی تجلی کما قال تعالیٰ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ، بے چون و چگون تھی اسی طرح قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی تجلی ابر کے سائبانوں میں ہوگی اور جس طرح آنکھ کی پتلی میں آسمانوں کا جلوہ اور آئینہ کے پردہ میں سورج کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح ابر کے سائبانوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ کا بے چون و چگون جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ زید آ گیا اور یہ بات میرے خیال میں آ گئی اور نیند آ گئی، آنا سب جگہ بولا جاتا ہے مگر حقیقت ہر جگہ مختلف ہے۔ آنا، آنے والے کے تابع ہے۔ زید کا آنا اور قسم کا ہے اور کسی بات کا دل میں آنا اور قسم کا ہے۔ ایسا ہی خدا تعالیٰ کے آنے کو سمجھو کہ اس کا آنا اس کی شان اور عظمت کے مطابق ہوگا جیسے حق تعالیٰ شانہ کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کا آنا بھی بے چون و چگون ہوگا۔

فائدہ سوم
جب کہ دینی امور کی رعایت سے اونٹ کے گوشت کا ترک کرنا اتباع شیطانی ہوا تو سامراج ہند کی رعایت سے ذبیحہ بقر کو ترک کرنا جو اعظم شعائر اسلام میں سے ہے بدرجہ اولیٰ اتباع شیطانی ہوگا، خوب سمجھ لو۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ
پوچھ بنی اسرائیل سے کتنی دیں ہم نے ان کو آیتیں واضح اور
مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ
جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی اس کو

فَإِنَّ اللّٰهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا

تو اللہ کی مار سخت ہے ۔ رجھایا ہے منکروں کو

الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا

دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں سے

وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ

اور جو پرہیزگار ہیں ان سے اوپر ہوں گے قیامت کے دن اور اللہ روزی

مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً

دیوے جس کو چاہے بے شمار ۔ تھے لوگ دین ایک

وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِينَ وَ

پھر بھیجے اللہ نے نبی خوشی اور

مُنْذِرِينَ ۪ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ

ڈر سنانے والے اور اتاری ان کے ساتھ کتاب سچی کہ فیصلہ

بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ

کرے لوگوں میں جس بات میں جھگڑا کریں، اور کتاب میں جھگڑا

إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ

ڈالا انہیں نے مگر انہوں نے جن کو ملی تھی بعد اس کے کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم

بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا

آپس کی ضد سے پھر اب راہ دی اللہ نے ایمان والوں کو اس سچی

فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ ۗ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ

بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے اپنے حکم سے اور اللہ چلاوے جس کو چاہے

إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا

سیدھی راہ ۔ کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں

الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم

چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر آئے نہیں احوال ان کے جو آگے ہو چکے تم سے۔

مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ

پہنچی ان کو سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے

الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا

لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی مدد اللہ کی سن رکھو

إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

مدد اللہ کی قریب ہے۔

تنبیہات وتہدیدات

قال تعالیٰ: سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ... أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔

ارتباط: گزشتہ آیات میں دلائل واضحہ آجانے کے بعد حق کی مخالفت پر تنبیہ اور تہدید تھی۔ آئندہ آیات میں اور چند تنبیہات اور تہدیدات کو ذکر فرماتے ہیں کہ حق جل شانہ کے صریح اور واضح حکم کے بعد عدول حکمی موجب عذاب ہے اگر تم کو اس میں کچھ تردد ہے تو بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ ہم نے ان کو کتنی واضح اور روشن دلیلیں عطا کی تھیں تاکہ حق واضح اور روشن ہو جائے۔ یہ حق جل شانہ کی ایک نعمت کبریٰ تھی اس نعمت کا شکر یہ تھا کہ دل وجان سے حق کو قبول کرتے۔ لیکن دیدہ ودانستہ حق سے انحراف کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عذاب میں مبتلا ہوئے اور طرح طرح کی ذلتیں دیکھیں جیسا کہ پچھلے پارہ میں آ چکا ہے مثلاً عجل اور عقوبت کا بیان ہوا اور بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کی نعمت کو بعد اس کے کہ وہ نعمت خود اس کے پاس پہنچ چکی ہے یعنی وہ نعمت بلا مشقت کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملی ہے پس جو شخص ایسی نعمت کو کفر اور معصیت سے بدلے اور اس کے انعامات اور احسانات کی ناشکری کرے تو اللہ تعالیٰ بھی نعمت کو نقمت سے

اور انعام کو انتقام سے بدل دیتے ہیں۔ پس تحقیق اللہ تعالیٰ سخت عذاب والے ہیں اور ایسے ناشکرے
اسی کے مستحق ہیں کہ ان کو سخت سزا دی جائے اصل وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا پر ریجھے ہوئے اور فریفتہ
ہوئے ہیں کہ دنیاوی زندگانی ان کی نظروں میں اس درجہ مزین اور خوب صورت کر دی گئی ہے کہ آخرت
ان کو بدصورت معلوم ہونے لگی اس لیے اپنی ظاہری عیش و عشرت کے نشہ میں اُن لوگوں کو حقیر اور ذلیل
سمجھتے ہیں جو آخرت پر شیدا اور فریفتہ ہیں اور ان لوگوں سے تمسخر کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔
اور جو لوگ ایمان اور تقویٰ کے لباس فاخرہ سے آراستہ ہیں قیامت کے دن یہی لوگ ان کافروں سے بالا
اور بلند ہوں گے جن کو یہ کافر دنیا میں ذلیل اور حقیر سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے شمار
رزق دے دیتا ہے۔ دیکھ لو جن فقراء صحابہ کو تم حقیر و ذلیل سمجھتے تھے کس طرح روم اور فارس
کی سلطنت کا مالک بنا دیا معلوم ہوا کہ چند روزہ کے فانی عیش پر مغرور و مست ہو کر حق کو ٹھکرانا اور اہل حق
کو حقیر سمجھنا حماقت ہے حضرت آدم سے لے کر حضرت نوح کے زمانہ کے قریب تک تمام لوگ ایک ہی جماعت کے
سب لوگ ایک ہی دین حق پر تھے اور احکام خداوندی پر عمل کرتے تھے۔ دس قرن اسی طرح گذرے اس کے بعد
جب لوگ دنیا پر فریفتہ ہوئے اور دنیا ان کو خوب صورت معلوم ہونے لگی تو دنیاوی اور نفسانی اغراض کی
بنا پر حق میں اختلاف ڈالا۔ پس حق تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت کے لیے انبیاء کرام کو بھیجا تاکہ حق میں
کوئی اختلاف نہ رہے یا اختلاف سب مٹ کر حق پر چلیں اس لیے حق تعالیٰ نے انبیاء کو ظاہر بھیجا کہ ایمان
ماننے والوں اور حق کے قبول کرنے والوں کو خوش خبری سنائیں اور حق میں اختلاف ڈالنے والوں کو خدا کے
قہر سے ڈرائیں اور ان کے ساتھ حق تعالیٰ نے حق اور سچی کتابیں بھی اتاریں تاکہ وہ کتاب الٰہی لوگوں کے
درمیان فیصلہ کرے جس حق کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔ حق تو یہ تھا کہ کتاب الٰہی کے فیصلہ
کو دل و جان سے قبول کرتے اور اس کے حکم کے مطابق اپنے تمام اختلافات اور نزاعات کو ختم کر دیتے
مگر افسوس کہ ان لوگوں نے اسی کتاب میں اختلاف شروع کر دیا کہ جو ان کو اختلاف کے مٹانے اور ختم
کرنے کے لیے دی گئی تھی اور یہ اختلاف کسی اشتباہ اور التباس کی بنا پر نہ تھا بلکہ صریح اور واضح احکام
اور دلائل آجانے کے بعد آپس کی ضد اور ضدی کی بنا پر تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان خود غرض اور بد پرستوں
کو تو اسی باہمی اختلاف اور نزاع میں چھوڑ دیا جس کا منشاء سوائے حب دنیا کے اور کچھ نہ تھا۔ اور ان
اہل ایمان کو جن کے قلوب حب دنیا اور حسد وغیرہ سے پاک تھے حق کی راہ دکھلا دی جس میں وہ اختلاف کر
رہے تھے اور یہ ہدایت محض اس کے لطف اور عنایت سے تھی اور اللہ تعالیٰ مالک اور مختار ہے۔
جس کو چاہے اور جس طرح چاہے سیدھا راستہ بتا سکتا ہے کسی کو بغیر آیات بینات اور بغیر کسی دلیل و
برہان اور بغیر کسی استدلال و تعلم کے سیدھا راستہ بتلا دیتے ہیں اور کسی کو صاف نشانوں کے بعد بھی
گمراہ کر دیتے ہیں۔ ہدایت اسی کی ملک ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے لیکن اللہ کی
عادت اور سنت یہ ہے کہ حق کی ہدایت سے اسی کو سرفراز فرماتے ہیں جو شخص دنیا پر فریفتہ نہ ہو اور

دنیا کی زینت نے ان کو اپنا گرویدہ اور شیدائی بنا رکھا ہے کیونکہ جن کے دل دنیا کی محبت میں گرفتار
ہو چکے ہیں وہ کبھی حق کو قبول نہیں کرتے اور انبیاء کرام کی ہدایت اور نصیحت کی طرف کان نہیں لگاتے
بلکہ ایسے لوگ ہمیشہ اہل حق کو ستاتے ہیں اور طرح طرح کی ایذائیں ان کو پہنچاتے ہیں۔ اس لیے آئندہ آیت میں
مسلمانوں کی تسلی فرماتے ہیں کہ تم اہل باطل اور اہل دنیا کی ایذا رسانی سے ہرگز نہ گھبراؤ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں
ہمیشہ سے اہل باطل حضرات انبیاء اور اہل ایمان کو ایذاء پہنچاتے چلے آئے ہیں۔ یہ دنیا دار الابتلاء والامتحان ہے
امتحان ہے یہاں کے چند روزہ مصائب پر نظر نہ کرو صبر کرو جو دار آخرت میں راحتیں اور نعمتیں ملیں گی
ان پر نظر رکھو کیا تم کو یہ گمان ہے کہ جنت میں بلا محنت اور مشقت داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم پر ابھی
تک وہ احوال اور اہوال نہیں گذرے جو تم سے پہلے حضرات انبیاء اور اہل ایمان پر گذرے۔ دشمنوں کے
ہاتھ سے ان کو سخت سختیاں پہنچیں اور طرح طرح سے جھنجھوڑے گئے اور قسم قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں
سے ہلائے گئے حتی کہ زحمت یہاں تک پہنچی کہ مدد الٰہی میں تاخیر ہونے کی وجہ سے اس زمانہ کے نبی
اور ان کے ساتھی مسلمان شدائد اور مصائب سے بے چین اور گھبرا اور بے تاب اور بے قرار ہو کر یہ پکار اٹھے کہ
اللہ کی وہ مدد کب آئے گی جس کا اس نے انبیاء اور اہل ایمان سے وعدہ فرمایا ہے۔ مقتضائے بشریت
انتہائی پریشانی کی حالت میں یہ بے ساختہ کلام ان کی زبان سے نکلا اور حق تعالیٰ کا منشاء بھی یہی تھا کہ ہمارے
سوا سے بالکل مایوس اور ناامید ہو جائیں چنانچہ اسی وقت اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور ارشاد
ہوا کہ گھبراؤ نہیں ثابت قدم رہو۔ آگاہ ہو جاؤ اور سن لو کہ اللہ کی مدد بہت نزدیک ہے۔ اے مسلمانو! اسی
طرح تمہارا بھی امتحان ہو رہا ہے گھبراؤ نہیں۔ عنقریب اللہ کی مدد تم کو پہنچے گی اور تمام مصائب اور تکالیف
کا خاتمہ کر دے گی۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ
تجھ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں! تو کہہ جو چیز خرچ کرو
خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
فائدہ کی سو ماں باپ کو اور نزدیک ناتے والوں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو
وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
اور راہ کے مسافر کو۔ اور جو کچھ کرو گے بھلائی سو وہ اللہ
بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾
کو معلوم ہے

حکم سیزدہم متعلق بمصارف انفاق

قال تعالیٰ ۔ یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ..... الیٰ ..... فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ

شروع سے احکام علمیہ کا بیان چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں ضمناً ایمان اور اخلاص کی ترغیب اور دنیا کی محبت کی مذمت کا ذکر آیا۔ اب آگے پھر احکام عملیہ کی طرف رجوع فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تم اپنی جانوں کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہو تو خدا تعالیٰ کی راہ میں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جان و مال سے کسی قسم کا دریغ نہ کرو اور اس کی راہ میں جو تکلیف پیش آئے اس کا تحمل کرو۔ اب اس کے بعد کچھ مصارف انفاق اور جہاد اور نکاح اور طلاق اور رضاع وغیرہ کے احکام بیان فرماتے ہیں جو باہمی معاشرت سے متعلق ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔ اے ہمارے نبی! یہ لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ رضاء خداوندی اور ثواب کے لیے کیا خرچ کریں۔ آپ فرما دیجئے کہ یہ سوال مت کرو کہ کیا خرچ کریں یہ چیز تو بالکل واضح ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کوئی خاص شے اور خاص مقدار معین نہیں جو میسر ہو وہ خرچ کرو البتہ یہ سوال کرو کہ کہاں خرچ کریں سو آپ فرما دیجئے کہ جو مال بھی خرچ کرنا چاہو تو سب سے پہلے ماں باپ کی خدمت میں صرف کرو کیونکہ وہ تمہارے وجود ظاہری کا سبب بنے اور جس شفقت اور محبت سے تم کو پالا تم ان کا عشر عشیر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ اولاد اگرچہ والدین کی مالی اور بدنی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے لیکن والدین کی شفقت اور محبت اور تربیت کی ذرہ برابر بھی ادا نہیں کر سکتی۔ اور والدین کے بعد قرابت داروں میں خرچ کرو تاکہ صدقہ اور صلہ رحمی دونوں جمع ہو جائیں اور رشتہ داروں کے بعد یتیموں پر خرچ کرو کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے خود کمانے کے قابل نہیں اور ان کے بعد عام محتاجوں پر خرچ کرو اور عام محتاجوں کے بعد مسافروں پر خرچ کرو کہ جو وطن اور عزیز اور اقارب سے دور ہونے کی وجہ سے بمنزلہ محتاج اور فقیر کے ہو گئے۔ اور ان کے علاوہ جو بھی تم خیر و نیکی کا کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں تمہارے خرچ کی مقدار اور کیفیت اور تمہاری نیت کو خوب جانتا ہے۔

فائدہ: یہ آیت نفلی صدقات اور خیرات کے بارے میں ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ مثل صدقہ فطر کے بارے میں نہیں اس لیے کہ والدین کو زکوٰۃ دینا درست نہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ

حکم ہوا تم پر لڑائی کا اور وہ بری لگتی ہے تم کو اور شاید

أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن

تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تم کو اور شاید تم کو خوش

تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَ

لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تم کو اور اللہ جانتا ہے اور

أَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ

تم نہیں جانتے ۔ تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو

قِتَالٍ فِيهِ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ

اس میں لڑائی کرنا تو کہہ دے لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے

وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَ

اور روکنا اللہ کی راہ سے اور اس کو نہ ماننا اور

الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ

مسجد الحرام سے روکنا اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے بڑا ہے

عِندَ اللَّهِ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ

زیادہ گناہ ہے اللہ کے ہاں اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے زیادہ اور وہ تو لگے ہی

يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا

رہتے ہیں تم سے لڑنے کو یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے اگر قدرت پاویں

وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ

اور جو کوئی پھرے گا تم میں اپنے دین سے پھر مر جاوے گا کفر ہی

وہ بری ہو۔ جیسے جہاد میں مشقت اور کاہلی جو ظاہر میں راحت معلوم ہوتا ہے مگر ترک کا انجام سوائے
ذلت اور ذلت و مصیبت اور ثواب سے محرومی کے اور کچھ نہیں ان تمہاری بھلائی اور برائی کو اللہ تعالیٰ
ہی جانتا ہے اور تم اپنی مصلحتوں اور مضرتوں کو نہیں جانتے لہٰذا تم اپنی طبعی رغبت اور کراہت
کا اتباع مت کرو بلکہ احکام خداوندی کا اتباع کرو اس میں تمہارے لیے خیر اور بہتری ہے احادیث میں جہاد
کو افضل الاعمال اور سنام الاسلام یعنی اسلام کا کوہان فرمایا ہے اس لیے کہ جہاد اسلام کی اشاعت اور
خلق خدا کی ہدایت اور دین کی عزت اور رفعت کا سبب ہے۔ اور مجاہد کی کوشش سے جو لوگ اسلام میں
داخل ہوں گے ان کی حسنات اس کے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

شانِ نزول

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے عرب میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ چار مہینوں یعنی ذی قعدہ
اور ذی الحجہ اور محرم الحرام اور رجب میں باہمی قتل و قتال اور جنگ و جدل کو جائز نہیں سمجھتے تھے اور ان مہینوں
میں کسی پر چڑھائی کرنے کو معیوب جانتے تھے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر سے دو ماہ پیشتر ماہ
جمادی الاخریٰ سنہ ۲ھ میں اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں آٹھ یا بارہ مہاجرین
کی ایک جماعت کو جس میں سوائے مہاجرین کے اور کوئی نہ تھا قریش کے مقابلہ میں جانے کا حکم دیا۔ اور عبداللہ
بن جحشؓ کو ایک والا نامہ لکھ کر دیا اور یہ فرمایا کہ جب دو دن کا سفر طے کر لو اس وقت اس خط کو کھولنا
اور اپنے ساتھیوں کو سنا دینا اور کسی پر زبردستی نہ کرنا عبداللہ بن جحشؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کس
طرف جاؤں آپ نے فرمایا کہ نجد کی طرف جاؤ۔ عبداللہ بن جحشؓ وہاں سے روانہ ہوئے اور دو دن کا سفر
طے کرنے کے بعد ایک منزل پر پڑاؤ کیا اور آپ کا والا نامہ کھولا تو اس میں یہ مضمون تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اما بعد فسر على بركة الله
بمن تبعك من اصحابك حتى
تنزل بطن نخلة فترصد
بها عير قريش لعلك
ان تأتينا منه بخير.

اما بعد اللہ کی برکتوں اور رحمتوں کے ساتھ
اپنے رفقاء کو لے کر چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ
جب تم نخلہ پہنچو تو قریش کے تجارتی
قافلہ کا انتظار کرو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ
ان کا مال تم کو عطا کرے اور پھر وہ مال
تم ہمارے پاس لے آؤ۔

عبداللہ بن جحشؓ نے اس حکم نامہ کو پڑھتے ہی سمعاً و طاعۃً کہا اور اپنے ساتھیوں کو سنایا
اور یہ بھی کہہ دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ فرما دیا تھا کہ کسی پر زبردستی نہ کروں۔ اب جس کو شہادت

کا شوق اور رغبت ہو وہ میرے ساتھ چلے اور جس کا جی چاہے وہ واپس جائے یہ سب دل وجان سے تعمیل ارشاد پر راضی ہو گئے اور ایک شخص بھی واپس ہونے کے لیے راضی نہ ہوا، مگر سعد و عتبہ کے درمیان جب مقام نخلہ میں جاکر اترے تو ابھی ٹھہرنے بھی نہ پائے تھے کہ راستے میں قریش کا قافلہ دکھلائی دیا جو طائف کی تجارت کا مال زیتون کا تیل اور کشمش اور چمڑے وغیرہ لے کر آرہا تھا مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا، عمرو بن الحضرمی کو قتل کیا اور حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو گرفتار کیا باقی لوگ بھاگ گئے۔ صحابہ کرامؓ قیدیوں اور سامان کے اونٹوں کو لے کر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

یہ تاریخ یکم رجب الحرام تھی اور صحابہ کرامؓ اس کو جمادی الثانیہ کی تیسویں تاریخ سمجھے ہوئے تھے مگر چاند انتیس کا ہوچکا تھا جس کا صحابہ کو علم نہ تھا اس لیے کفار نے مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا کہ یہ لوگ شہر حرام میں بھی لڑتے ہیں۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی (تفسیر ابن کثیر) لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کے متعلق سوال کرتے ہیں آپ ان کے جواب میں کہہ دیجئے کہ بے شک خاص طور پر ان مہینوں میں بالارادہ کر کے قتال کرنا بے شک ایک امر عظیم ہے مگر مسلمانوں نے قصداً و بالارادہ ایسا نہیں کیا بلکہ صحیح تاریخ نہ معلوم ہونے کی وجہ سے یہ لغزش ہوئی تھی مشرکین کو اس اعتراض کا حق نہیں اس لیے کہ شہر حرام میں قتل و قتال بہت سے بہت گناہ کبیرہ ہے اور تم تو کفر اور شرک میں مبتلا ہو جو اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اس کے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکنا یعنی دین حق دین اسلام میں داخل ہونے سے ان کو روکنا اور خدا تعالیٰ کے ساتھ کفر اور شرک کرنا اور لوگوں کو مسجد حرام سے روکنا کہ وہاں جاکر کوئی بیت اللہ کا طواف نہ کرسکے اور خدا تعالیٰ کی عبادت اور بندگی نہ کرسکے اور جو لوگ مسجد حرام کے واقعی اور حقیقی اہل اور مستحق تھے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان ان کو حرم اور مسجد حرام سے تنگ کر کے نکالنا یہ سب امور تمام مذکورہ شناعت اور قباحت میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک شہر حرام میں بلا قصد قتال سرزد ہوجانے سے کہیں بڑھ کر ہیں اور فتنہ کفر اور شرک کا فتنہ اور فساد تو ہی قتل سے بڑھ کر ہے۔ پھر یہ کفار مسلمانوں کی ایک غلطی پر کیوں اعتراض کرتے ہیں۔ غلطی سے درگذر کیا جاسکتا ہے مگر کفر و شرک کا جرم کسی طرح اور کسی وقت بھی قابل معافی نہیں اور یہ لوگ دین حق کی عداوت اور دشمنی میں اس حد تک پہنچے ہیں کہ حق کے مٹانے کے لیے ہمیشہ تم سے برسر پیکار رہیں گے یہاں تک کہ خدانخواستہ تم کو تمہارے اس پاک دین سے پھیر دیں اگر کچھ قابو پائیں اور دین اسلام سے کسی کو مرتد بنا دینا یہ قتل سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس آیت میں دو اشارے ہیں ایک تو یہ کہ کفار دین اسلام کے مخالفت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ لہذا مسلمانوں کو متنبہ رہنا چاہیے دوسرا اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان کا قابو چلے گا نہیں ان شاء اللہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو مرتد نہیں بنا سکیں گے۔ آئندہ آیت میں ارتداد کا احکام بیان فرماتے ہیں۔

انجام ارتداد

اور اے مسلمانو! تم پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ جو شخص تم میں سے دین اسلام سے پھر جائے گا اور اسی کفر کی حالت میں مرجائے گا تو ایسے لوگوں کے تمام عمل دنیا اور آخرت میں حبط (ضائع) اور ضبط ہو جائیں گے۔ دنیا میں اعمال کے حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی وجہ سے جو جان و مال محفوظ تھے وہ محفوظ نہ رہیں گے اور نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی، اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہو سکیں گے۔ اور آخرت میں حبط ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی نیک عمل پر کوئی ثواب نہیں ملے گا اور یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں پڑے رہیں گے کبھی بھی دوزخ سے نہیں نکلیں گے۔

مسئلہ (۱) امام شافعی رح کا مذہب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دین اسلام سے مرتد ہو جائے اور پھر کفر ہی کی حالت میں مرجائے تب تو اس کے اعمال حبط ہو جائیں گے اور اگر مرتد ہونے کے بعد وہ مرنے سے پہلے تائب ہو گیا اور پھر مسلمان ہو گیا تو اس کے اعمال ضائع نہ ہوں گے کیونکہ اس آیت میں حبط اعمال کے لیے دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ارتداد یعنی وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ اور دوسرے موت علی الکفر یعنی فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ حبط اعمال کے لیے ان دونوں باتوں کا پایا جانا شرط ہے امام ابو حنیفہ رح یہ فرماتے ہیں کہ محض ارتداد سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں موت علی الکفر شرط نہیں لقولہ تعالیٰ وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ۔ وقولہ تعالیٰ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ اور اس آیت میں جس طرح شرط کی جانب میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک ارتداد اور دوسرے موت علی الکفر اسی طرح جزاء کی جانب میں بھی دو چیزیں مذکور ہیں ایک حبط اعمال فَأُولٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ اور دوسرے دخول نار وَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ پس اعمال تو محض مرتد ہونے سے حبط ہو جاتے ہیں۔ اور جہنم میں جانے کے لیے موت علی الکفر شرط ہے۔ جس طرح شرط کے دو جز ہیں اسی طرح جزاء کے دو جز ہیں۔ جزاء کا پہلا جز شرط کے پہلے جز سے متعلق ہے اور جزاء کا دوسرا جز شرط کے دوسرے جز سے متعلق ہے۔

صحابہؓ کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ ہماری اس غلطی پر کوئی مؤاخذہ نہیں تو یہ عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا یہ سفر جہاد میں شمار ہو گا اور کیا ہم کو اس پر کچھ ثواب بھی ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یعنی إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا الخ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے خدا کی راہ میں ہجرت کی اور جہاد کیا۔ ایسے لوگ اللہ کی رحمت اور عنایت کے امیدوار ہو سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے اور مہربان ہیں۔ غلطی سے درگذر فرماتے ہیں اور ایسے مخلصین کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد وہ مال غنیمت جو عبداللہ بن جحشؓ لے کر آئے تھے ابھی تک وہ اسی

طرح دل کے اختیار میں رکھا ہوا تھا آیت کے نازل ہونے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس نکال کر غانمین پر تقسیم کر دیا۔

مسئلہ (۲) اشہر حرم میں قتل و قتال ابتداء میں ممنوع تھا، جمہور علماء کے نزدیک بعد میں وہ ممانعت منسوخ ہوگئی۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب اور جوئے کا، تو کہہ ان میں گناہ

كَبِيرٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ

بڑا ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کو اور ان کا گناہ فائدے

مِن نَّفْعِهِمَا ۗ

سے بڑا ہے۔

حکم یازدہم متعلق بہ شراب و قمار

قال تعالیٰ: يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ... الخ ... وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا

ربط: جس طرح خدا کی راہ میں جان و مال کا خرچ کرنا دین اور دنیا کی عزتوں کا سبب ہے جیسا کہ پچھلی آیتوں میں اس کا ذکر ہوا اسی طرح شراب و کباب اور قمار بازی میں جو کہ مال کا خرچ کرنا دین اور دنیا کی تباہی کا سبب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور یہ لوگ آپ سے شراب اور قمار بازی کے متعلق دریافت کرتے ہیں آپ کہہ دیجئے کہ ان دونوں چیزوں کے استعمال میں نقد ایک گناہ تو یہی ہے اور اس کے اندر بہت سے بڑے بڑے گناہ مضمر اور پوشیدہ ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ معمولی فائدے بھی ہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ پیدا ہوا کہ ان دونوں چیزوں کا استعمال کیا جائز ہے یا نہ کیا جائے۔ فوائد اور منافع کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال جائز ہو اور مفاسد کا اقتضاء یہ ہے کہ استعمال ممنوع ہو آپ ان سے یہ ارشاد فرما دیں کہ شراب اور قمار کا گناہ اور ضرر ان کے نفع اور فائدہ سے کہیں زیادہ ہے شراب اور قمار سے دین اور دنیا دونوں میں بہت سی مضرتیں لاحق ہوتی ہیں۔ شراب پی کر عقل جیسی بے مثال نعمت ہاتھ سے کھو دینا اور بدمستیوں اور گالیوں میں مبتلا ہو جانا اور بغض و عداوت کی جڑ ہوتا ہے غرض

یہ کہ شراب عقل کو برباد کرتی ہے اور قمار مال کو برباد کرتا ہے، اور اگر بالفرض ان چیزوں سے دنیا میں کوئی نقصان نہ ہوتا تو گناہ کی مضرت، فوری مضرت ہے اور آخرت کی مضرت کے مقابلہ میں دنیا کے چند روزہ منافع ہیچ ہیں، اس آیت سے شراب اور قمار کی حرمت بیان کرنا مقصود نہیں بلکہ ان دونوں چیزوں کے ترک کا مشورہ دینا مقصود ہے کہ بہتر یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو چھوڑ دو کیونکہ ان کا ضرر نفع سے زیادہ ہے اور عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ دفع ضرر کو حصول نفع سے مقدم سمجھے۔

فائدہ شراب کے بارے میں چند آیتیں نازل ہوئیں، سب سے پہلی آیت جو مکہ میں نازل ہوئی وہ یہ آیت ہے وَمِنْ ثَمَرَاتِ النَّخِيلِ وَالْأَعْنَابِ تَتَّخِذُونَ مِنْهُ سَكَرًا وَرِزْقًا حَسَنًا اس آیت میں کھجور اور انگور سے نشہ آور شراب بنانے کا ذکر ہے، مگر اس کے ذکر میں البتہ شرب کی کراہت اور ناپسندیدگی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے یعنی سَكَرًا کو رِزْقًا حَسَنًا کے مقابلہ میں ذکر فرمایا، معلوم ہوا کہ جو چیز نشہ آور ہے وہ رزق حسن نہیں، مگر چونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت شراب کی ممانعت نہیں تھی اس لئے مسلمان شراب پیتے رہے، بعد ازاں حضرت عمرؓ اور معاذ بن جبلؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہمیں شراب اور جوئے کے بارے میں فتویٰ دیجئے کیونکہ یہ دونوں چیزیں عقل اور مال کو تباہ کرنے والی ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ الخ یہ دوسری آیت ہے جو اس سلسلہ میں نازل ہوئی۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے تو اثم کبیر کا خیال کر کے شراب کو چھوڑ دیا اور بعض منافع کی بناء پر پیتے رہے، ایک مرتبہ عبدالرحمن بن عوفؓ کے ہاں مہمان آگئے انہوں نے ان کو شراب پلائی اور خود بھی پی جس سے نشہ ہوا اور مغرب کی نماز کا وقت آگیا، کسی نے اسی حالت میں عبدالرحمن بن عوفؓ کو امامت کے لئے آگے کر دیا، نماز میں قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ شروع کی اور أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ پڑھا اور آخر تک اسی طرح بغیر لا پڑھتے چلے گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ یہ تیسری آیت تھی اس آیت سے نماز کے وقتوں میں شراب حرام کر دی گئی، اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بعض لوگوں نے تو شراب کو بالکل چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ ایسی چیز میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں جو نماز سے روک دے، اور بعض لوگ اوقات صلوٰۃ کے علاوہ دوسرے وقتوں میں شراب پیتے رہے کہ عشاء کی نماز کے بعد شراب پی لیتا اور صبح کی نماز تک اس کا نشہ اتر جاتا اور کوئی صبح کی نماز کے بعد پیتا تو ظہر کی نماز تک اس کا نشہ اتر جاتا۔ اس کے بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک مرتبہ عتبان بن مالکؓ نے بہت سے آدمیوں کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد اس قدر شراب پی گئی کہ لوگ مست ہو گئے اور نشہ کی حالت میں ایک دوسرے کو مارنے اور گالیاں دینے لگے اور ایک دوسرے کی مذمت میں اشعار پڑھنے لگے یہاں تک کہ ایک انصاری نے اونٹ کا جبڑا اٹھا کر سعد بن ابی وقاصؓ کے سر پر مارا جس سے سعدؓ کا سر پھٹ گیا اس حال کو دیکھ

کہ حضرت عمرؓ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ شراب کے بارے میں کوئی صاف اور واضح حکم نازل فرما۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی یہ آیت نازل فرمائی اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ الآیات یہ آخری آیت تھی جس میں صراحۃً شراب کی حرمت اور ممانعت نازل ہوئی اس آیت کے نازل ہوتے ہی یک لخت شراب کے تمام مٹکے توڑ دیئے گئے۔ مدینہ منورہ کی گلی اور کوچوں میں شراب بہتی تھی اور تمام مسلمان شراب سے فقط تائب ہی نہیں ہوئے بلکہ بیزار ہو گئے حدیث میں ہے کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ چوری اور زنا پر آمادہ کرتی ہے سورۂ مائدہ کی آیت میں جو حکم نازل ہوا وہ آخری حکم تھا اس سے پہلے جس قدر احکام نازل ہوئے وہ سب منسوخ ہو گئے اور ہمیشہ کے لیے شراب حرام ہو گئی۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ

اور پوچھتے ہیں تجھ سے کیا خرچ کریں؟ تو کہہ جو افزود ہو اسی طرح

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۱۹

بیان کرتا اللہ تمہارے واسطے حکم شاید تم دھیان کرو

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

حکم شانزدہم[۱۶] متعلق بمقدار انفاق

قال تعالیٰ۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔۔۔۔ الیٰ ۔۔۔۔ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

ربط: گزشتہ آیت میں خمر اور میسر کی حرمت کا ذکر تھا۔ اب ارشاد فرماتے ہیں کہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ سوچ سمجھ کر خرچ کرے دنیوی حاجتوں کو پیش نظر رکھے۔ بندہ محتاج ہے بغیر دنیا کی ضرورتوں کے آخرت کا کام بھی انجام نہیں کر سکتا۔ نیز بہت سی دینی حاجتیں یکے بعد دیگرے پیش آ جاتی ہیں اُن کا بھی خیال رکھے چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کہ خدا کی راہ میں ہم کیا اور کتنا خرچ کریں آپ جواب میں کہہ دیجئے کہ آخرت کی اہمیت اور اس کے لازوال منافع کی عظمت کا اقتضاء تو یہ ہے کہ سب کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالو مگر وہ ارحم الراحمین تم کو یہ حکم نہیں دیتا کہ تم سارا مال خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالو۔

بلکہ یہ حکم دیا ہے کہ اپنی دنیوی ضروریات اور حاجتوں سے جس قدر مال زائد اور فاضل ہو اتنا ہی خدا کی راہ میں خرچ کرو، تاکہ تم سارا مال دے کر پریشانی میں نہ پڑ جاؤ البتہ جو خدا کے ایسے عاشق ہیں کہ ان کو سارا ہی مال فضول اور زائد نظر آتا ہے بلکہ مال کے نہ خرچ کرنے سے ان کو پریشانی ہوتی ہے جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو ایسے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں یا یوں کہو کہ ایسے عاشق اس حکم میں داخل ہی نہیں ہیں سہ

موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جانان روانان دیگر اند

ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ اصحاب صفہؓ میں سے ایک شخص کا انتقال ہو گیا اس کے پاس سے ایک اشرفی نکلی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر یہ فرمایا کہ دوزخ کی آگ کا ایک داغ ہے۔ بعد ازاں ایک اور شخص کا انتقال ہو گیا اس کے پاس سے دو اشرفیاں نکلیں حضورؐ نے فرمایا کہ یہ دو داغ ہیں (رواہ احمد والبیہقی) شرح: ایک اشرفی اور دو اشرفی کا جمع کرنا حرام نہیں لیکن یہ دونوں حضرات اصحاب صفہؓ میں تھے یعنی حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خانقاہ کے رہنے والے تھے جنہوں نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح زاہد اور درویشانہ زندگی گذاریں گے اور آخرت لا یموت سے زائد کچھ نہ رکھیں گے اس لیے اصحاب صفہ کے منشاء عزت ذلی کر رہ کوئی درہم دینار اپنے پاس رکھ سکیں، اسی بنا پر یہ دونوں معتوب ہوئے مسجد نبوی حضور پر نور کی درسگاہ تھی اور مسجد نبوی کے متصل جو ایک صفہ (چبوترہ) اصحاب صفہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوایا تھا وہ حضور پر نور کی خانقاہ تھی جس میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے زاہد اور درویش رہتے تھے جن کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ کتاب ذکر فکر اور فقر و فاقہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور مجلس کی حاضری سے محروم نہ رہیں سے

یک لحظہ ذکر سے پائندہ — در مذہب عاشقان حرام است

اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے صاف صاف احکام کو بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا کے بارے میں اور آخرت کے بارے میں خوب غور و فکر کرو — دنیوی اور اخروی حقوق اور مصالح کو دیکھ لو اور اپنے احوال کو بھی دیکھ لو اور پھر شریعت جیسا حکم دے اس کے موافق خرچ کرو تاکہ بعد میں پریشان اور پشیمان نہ ہو اور یہ امر پیش نظر رکھو کہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے، فانی لذتوں کی بنا پر دائمی اور باقی لذتوں اور نعمتوں کو نہ چھوڑ دینا۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ

اور پوچھتے ہیں تجھ سے یتیموں کا حکم - تو کہہ سنوارنا ان کا بہتر ہے۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اور اگر خرچ ملا رکھو ان کا تو تمہارے بھائی ہیں اور اللہ کو معلوم ہے

الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ

خرابی کرنے والا اور سنوارنے والا اور اگر چاہتا اللہ تم پر مشکل ڈالتا

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۰

اللہ زبردست ہے تدبیر والا

حکم ہفدہم مخالطت یتیم

قال تعالیٰ۔ وَيَسْـَٔـلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ... الیٰ ... اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

گزشتہ آیات میں جو احکام تھے یعنی ترک خمر و میسر اور انفاق حسب مصلحت۔ وہ خود ان کے اموال اور احوال کی اصلاح کے لیے تھے اب اس آیت میں دوسروں کی اصلاح کے احکام ذکر فرماتے ہیں یعنی یتیم جو کہ خود اپنی مصلحت سے قاصر اور عاجز ہے تم اس کے مال میں جو بھی تصرف کرو اس میں یتیم کی صلاح اور مصلحت کو پیش نظر رکھو اور آپ سے یتیموں کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ یتیموں کو کس طرح علیحدہ رکھیں یا اپنے ساتھ رکھیں اگر یتیم کا کھانا علیحدہ پکائیں تو بسا اوقات یتیم کا کھانا بچ جاتا ہے اور اس طرح یتیم کا نقصان ہوتا ہے اور اگر ساتھ ملا کر پکاتے ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم زیادہ نہ کھا لیں اور یتیم کا مال کھانا آگ کا کھانا ہے اس لیے آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ یتیموں کے مال کا کس طرح انتظام کریں تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ یتیموں کی مصلحت اور خیر خواہی کو ملحوظ رکھنا بہتر ہے جس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے مال کو بالکل علیحدہ رکھو اور نہایت احتیاط سے اس کا انتظام کرو اور اگر خرچ میں ان کو شریک کرو اور شریک رکھنے ہی میں ان کی بہتری اور خیر خواہی سمجھو تو کوئی حرج نہیں وہ تمہارے دینی اور نسبی بھائی ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی خیر خواہی اور ادائے حق میں کمی نہیں کرتا اور ایک بھائی دوسرے بھائی کے مال سے کچھ نفع اٹھائے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں اور اکثر و بیشتر بھائی بھائی مل جل کر رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ خراب کار کو اصلاح کار سے خوب جانتے ہیں کہ کس نے خیانت اور یتیم کا مال خراب کرنے کی نیت سے شرکت کی ہے اور کس نے یتیم کی مصلحت اور خیر خواہی کا قصد کیا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا اور تم کو ملا جلا رکھنے کی اجازت نہ دیتا اور اگر بلا علم اور بلا قصد تم سے کوئی کمی بیشی ہو جاتی تو اس پر مواخذہ کرتا۔

لیکن اللہ نے تم پر آسانی کی کہ شرکت اور مخالطت کی اجازت دے دی اور اللہ غالب ہے جو چاہے حکم دے خواہ وہ حکم بندوں پر شاق ہو یا آسان ہو، مگر وہ بڑی حکمت والا ہے کہ اس کا کوئی حکم حکمت و مصلحت سے خالی نہیں اور کوئی حکم بندوں کو ایسا نہیں دیا جو ان کے لئے مشقت و درد و تکلیف کا باعث ہو۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ

اور نکاح مت کرو مشرک والی عورتوں سے جب تک ایمان نہ لاویں اور البتہ لونڈی مسلمان

خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا

بہتر ہے کسی شرک والی سے اگرچہ تم کو خوش آوے اور نکاح نہ کر دو

الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ

شرک والوں کو جب تک ایمان نہ لاویں اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے کسی

مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ

شرک والے سے، اگرچہ تم کو خوش آوے وہ لوگ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ

اور اللہ بلاتا ہے جنت کی طرف اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بتاتا ہے

اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝۲۲۱

اپنے حکم لوگوں کو، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

حکمِ ہشتم مناکحتِ کفار

قال تعالیٰ - وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۔

ربط: گزشتہ آیات میں یتیموں کی مخالطت کا حکم بیان فرمایا۔ اس آیت میں مشرکین اور مشرکات کے ازدواجی اختلاط کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ ازدواجی تعلق کے لئے دینی مناسبت ضروری ہے جو مرد و زن میں مفقود ہے لہٰذا اہل شرک سے ازدواجی تعلق جائز نہیں کیونکہ دل سے دل کا اختلاط اور ازدواجی

تعلقات شیر اور شکر سے زیادہ مضبوط اور پختہ ہیں کافروں سے ازدواجی اور معاشرتی تعلق کے بعد نہ تو دین باقی رہتا ہے اور نہ اسلامی تمدن، چند روز کے بعد نہ اسلامی خصلتیں باقی رہتی ہیں اور نہ عادتیں، اپنی قومیت فنا کر کے دوسری قوم کا فرد بن جاتا ہے اور اسلامی تمدن کو حقیر سمجھنے لگتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور مشرک عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں اور البتہ ایک مسلمان کنیز یعنی لونڈی اور باندی ایک مشرک عورت سے بدرجہا بہتر ہے اگرچہ وہ مشرک عورت آزاد بھی ہو اور حسین وجمیل اور مال دار بھی ہو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان کی لازوال دولت کے مقابلہ میں کسی مال اور جمال کی کوئی حقیقت نہیں اگرچہ وہ مشرک عورت اپنے مال یا حسن وجمال یا حسن عادت کی بنا پر تم کو اچھی معلوم ہو اور نہ ہی مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں اور البتہ ایک غلام مسلمان ایک آزاد کافر سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ کافر مال ودولت یا عزت ووجاہت کی وجہ سے تم کو اچھا معلوم ہو یہ مشرک لوگ آگ کی طرف بلاتے ہیں۔ یعنی ایسے اقوال وافعال شرکیہ کی طرف بلاتے ہیں جو دوزخ میں لے جا کر ڈال دیں اور زن وشوئی کا تعلق اُن کی دعوت کی تاثیر کو قوی کرنے کا بہت بڑا سبب ہے اندیشہ ہے کہ اس تعلق کی بنا پر عقائد شرکیہ تم میں سرایت کر جائیں اور اسلام کی طرف سے تم کو شبہات نہ ڈال دیں اور رفتہ رفتہ تم ہدایت اور گمراہی کو برابر سمجھنے لگو۔ اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتا ہے اپنے حکم سے اور لوگوں کے لیے اپنے احکام کو صاف اور واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ اور سمجھ لیں کہ غلام اور باندی کا تعلق جو جنت اور مغفرت کی طرف لے جائے اُس آزاد اور معزز کے تعلق سے کہیں بہتر ہے کہ جس کا تعلق جہنم کی طرف لے جائے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کی دعوت اور کافروں کی دعوت میں تضاد اور عداوت ہے خدا تعالیٰ سے اگر تعلق مقصود ہے تو اس کے دشمنوں سے ازدواجی تعلق نہ قائم کرو اجتماع ضدین عقلاً بھی محال ہے نیز مناکحت اور زوجیت کے لیے باہمی محبت اور موافقت ضروری ہے اور اختلاف دین کی وجہ سے اگر محبت نہ ہوئی تو زوجیت کا فائدہ کچھ نہ ہوا اور اگر محبت ہوئی اور کفر وایمان کا فرق اور شرک سے چشم پوشی کی گئی تو آخرت تباہ اور برباد ہوئی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مشرکین سے مناکحت کی قطعاً ممانعت کر دی۔

فوائد اس آیت میں دو حکم ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان عورت کا کسی کافر مرد سے نکاح نہ کیا جائے یہ حکم اب بھی ہے۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ مسلمان مرد کو کافر عورت سے نکاح کرنا جائز نہیں سو اس حکم میں ایک تفصیل ہے وہ یہ کہ اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے بشرطیکہ وہ اہل کتاب حقیقۃً اہل کتاب ہوں۔ ملحد اور دہریہ عقائد نہ رکھتے ہوں اور بشرطیکہ اس یہودی اور نصرانی عورت کے نکاح سے اس مسلمان مرد کے دین میں خلل آنے کا اندیشہ نہ ہو اس حکم کی تفصیل مع دلیل انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا

اور پوچھتے ہیں تم سے حکم حیض کا، تو کہہ دو گندگی ہے سو تم پرے رہو

النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ ۖ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّىٰ

عورتوں سے حیض کے وقت اور نزدیک نہ جاؤ ان سے جب تک

يَطْهُرْنَ ۖ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ

کہ پاک نہ ہو لیں پھر جب ستھرائی کر لیں تو جاؤ ان پاس جہاں سے

أَمَرَكُمُ اللَّهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ

حکم دیا تم کو اللہ نے۔ اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے اور خوش

الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ فَأْتُوا

آتے ہیں ستھرائی والے عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تمہاری۔ سو جاؤ اپنی

حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا

کھیتی میں جہاں سے چاہو اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے اور ڈرتے

اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ مُلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ تم کو اس سے ملنا ہے اور خوشخبری سنا ایمان والوں کو۔

حکم نوزدہم حرمت جماع در حالت حیض

قال تعالیٰ۔ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ... الیٰ ... وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ

ربط: گزشتہ آیت میں نکاح کا حکم مذکور تھا۔ اس آیت میں حالت حیض میں جماع اور قربان کا حکم بیان کرتے ہیں۔ یہود کا یہ دستور تھا کہ ایام حیض میں عورت سے بالکل علیحدہ رہتے نہ اس کے ساتھ کھاتے اور نہ پیتے بلکہ اس کو علیحدہ مکان میں رکھتے۔ اور اس کے برعکس نصاریٰ کا یہ دستور تھا کہ ایام حیض میں مخالطت اور ہمکنار و مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے۔ مدینہ منورہ میں ہر قسم کے لوگ رہتے

تھے اس لیے صحابہ کو یہ ہوا کہ اس مسئلہ میں خلجان پیش آیا اور حضور پرنور صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور لوگ آپ سے یہ دریافت کرتے ہیں کہ حالت حیض میں عورت کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے آپ کہہ دیجئے کہ حیض ایک گندگی اور ناپاکی ہے لہذا تم ان سے اس حالت میں علیحدہ رہو یعنی ان سے صحبت اور مجامعت نہ کرو باقی کھانے اور پینے اور ساتھ بیٹھنے میں کوئی پرہیز نہیں مقصود فقط گندگی سے علیحدہ رہنا ہے اور جب تک وہ حیض سے پاک نہ ہو جائیں اس وقت تک ان سے قربان یعنی صحبت اور مجامعت نہ کرو پس جب وہ عورتیں اچھی طرح پاک ہو جائیں کہ ناپاکی کا شبہ بھی باقی نہ رہے تو پھر ان سے مجامعت کرو مگر اس مقام سے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تم کو صحبت کرنے کی اجازت دی ہے یعنی آگے کی جانب سے نہ پیچھے کی جانب سے اور اگر غلطی سے ایام حیض میں صحبت کرلی ہے تو توبہ کرو تحقیق اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو گناہ کر گزرنے کے بعد توبہ کرتے ہیں اور جو لوگ سرے ہی سے گندگی سے پاک رہتے ہیں ان سے بھی محبت رکھتے ہیں یعنی جو لوگ سرے ہی سے ناپاکیوں سے بچتے ہیں مثلاً ایام حیض میں صحبت سے پرہیز کرتے ہیں اور جس جگہ سے صحبت کی ممانعت ہے اس جگہ سے صحبت نہیں کرتے ایسے لوگوں سے بھی اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے اور آگے کی جانب سے تم کو صحبت کا حکم اس لیے دیا گیا کہ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتوں کے ہیں. ان کے رحم میں جو نطفہ ڈالا جاتا ہے وہ بمنزلہ تخم کے ہے اور بچہ بمنزلہ پیداوار کے ہے سو تم کو اختیار ہے کہ اپنی کھیتی میں جس طرح اور جس طرف سے چاہو آؤ بیٹھ کر یا لیٹ کر مگر شرط یہ ہے کہ کھیتی سے باہر نہ جاؤ فقط حرث اور مزرع (کھیتی) میں آنے کی تم کو اجازت دی گئی ہے اور جو جگہ حرث (کھیتی) کے قابل نہیں یعنی پیچھے کی جانب اس جگہ میں تم کو جانے کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں پیچھے کی جانب سے آنا یہ قوم لوط کا عمل ہے جس پر قہر خداوندی نازل ہوا. حدیث میں ہے.

ملعون من اتی امرأۃ فی دبرھا (رواہ احمد وابو داؤد)	ملعون ہے وہ شخص کہ جو عورت کی دبر میں وطی کرے.

ایک اور حدیث میں ہے کہ جس نے حالت حیض میں وطی کی یا دبر کی جانب میں صحبت کی یا کسی کاہن اور نجومی کے پاس گیا اور اس کی تصدیق کی تو اس شخص نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ احکام کا کفر کیا. (رواہ الترمذی) شیعوں کے نزدیک بیوی سے اغلام درست ہے جو صریح قرآن کریم کے اس لفظ نساؤکم حرث لکم کے خلاف ہے اس آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے جیسے کھیت سے مطلوب پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اغلام سے اولاد کا آنا ناممکن ہے چنانچہ ترغیب نکاح کے بارہ میں جو حدیث نہایت مشہور ہے اس میں یہ جملہ ہے کہ مکاثر بکم الامم یعنی میں امت کی کثرت پر فخر کروں گا معلوم ہوا کہ ترغیب نکاح سے اولاد کی کثرت مطلوب ہے جس سے حضور پرنور کو قیامت کے دن سامان افتخار ہاتھ آئے اور یہ یاد رکھو کہ تم کو صحبت کی اجازت

محض لذت کے لیے نہیں دی گئی بلکہ مقصود یہ ہے کہ اس لذت کو ذریعہ آخرت بناؤ اور اپنے لیے آگے کی کچھ تدبیر کرو یعنی صحبت کے وقت اللہ کا نام لو تاکہ اولاد شیطان کے اثر سے محفوظ رہے اور نیک اولاد کی نیت کرو تاکہ آخرت کی کھیتی بنے اور تمہارے لیے دعا اور استغفار کرے اور قیامت کے دن تمہارے کام آئے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی حالت حیض یا بے محل صحبت کرنے سے پرہیز کرو اور یقین رکھو کہ تم کو اللہ سے ملنا ہے یعنی ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے اور تمام اعمال کا حساب دینا ہے۔ اس روز تخم کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ بے وقت اور بے محل تو اس کو ضائع نہیں کر دیا تھا اور اہل ایمان کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جنہوں نے اپنے تخم کو بروقت اور برمحل استعمال کیا ان کو اس تخم کے ثمرات وہاں مل جائیں گے مطمئن رہیں۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا

اور نہ ٹھہراؤ اللہ کو بہانہ اپنی قسمیں کھانے کا کہ سلوک نہ کرو

وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ

اور پرہیزگاری اور صلح درمیان لوگوں کے اور اللہ سنتا

عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ

ہے جانتا۔ نہیں پکڑتا تم کو اللہ ناکارہ قسموں پر تمہاری لیکن

يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

پکڑتا ہے ان کاموں پر جو کرتے ہیں دل تمہارے۔ اور اللہ بخشنے والا ہے تحمل والا۔

حکم ششم متعلق باحترام نام پاک خداوند انام

قال تعالیٰ۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ ..... الیٰ ..... وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ

ربط: گزشتہ آیت میں تقویٰ کا حکم مذکور تھا اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تقویٰ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پاک کا ادب اور احترام ملحوظ رکھو اور بات بات میں اللہ تعالیٰ کی قسم نہ کھاؤ اور نہ دنیاوی اغراض اور منافع کے لیے اللہ تعالیٰ کے نام پاک کو استعمال کرو

یہ سب ادب کے خلاف ہے۔

شانِ نزول

حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور ان کے بہنوئی بشیر بن نعمان میں کسی بات پر کچھ تکرار ہوا، عبداللہ بن رواحہؓ نے قسم کھالی کہ میں نہ تم سے ملوں گا اور نہ تم سے کلام کروں گا اور نہ تمہاری کسی بھلائی اور برائی میں دخل دوں گا۔ اس کے بعد عبداللہؓ سے جب کوئی اس بارے میں کوئی بات کرتا اور کچھ کہنا چاہتا تو یہ کہہ دیتے کہ میں نے اللہ کی قسم کھالی ہے اس لیے میں کچھ نہیں کرسکتا اس پر یہ آیت نازل ہوئی ؎ اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ یعنی رشتہ داروں میں سلوک اور احسان کرنے کے لیے اور تقویٰ و پرہیزگاری کا کام کرنے کے لیے اور لوگوں میں صلح کرانے کے لیے قسم کو بہانہ نہ بناؤ اور یہ نہ کہو کہ میں نے قسم کھالی ہے اس لیے میں یہ کام نہیں کرسکتا۔

حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی نیک عمل کے چھوڑنے اور نہ کرنے پر قسم کھالے تو اس پر واجب ہے کہ وہ نیک کام کرے اور قسم کا کفارہ دے۔ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جب آدمی کسی چیز پر قسم کھالے خواہ وہ اچھی ہو یا بری اس پر قائم رہنا چاہئے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اور بتلا دیا کہ قسم کی وجہ سے نیک کام کو نہ چھوڑو، ایسی حالت میں قسم کو توڑ کر کفارہ دے دو اور نیک کام کرو، تاکہ تم کو دو خیر کا اجر حاصل ہو اور ایسی قسم کے توڑنے میں اللہ تعالیٰ تمہارا عذر قبول کرنے والا ہے اور تمہاری نیتوں کا جاننے والا ہے کہ تمہاری نیت اللہ کے نام کی بے حرمتی نہیں بلکہ تعمیل حکم اور نیکی کرنے کے لیے قسم کو توڑا ہے اور بعد ازاں ندامت و پشیمانی اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کیا ہے یا یہ معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں کو سنتا ہے اور تمہاری نیتوں کو جانتا ہے کہ کس نیت سے قسم کھائی ہے، تمہارا لفظ اور قصد کوئی بھی اس سے مخفی نہیں لہٰذا قسم کھاتے وقت لفظوں میں احتیاط رکھو اور نیت و ارادہ کرنے میں بھی۔ حق جل و علا نے قسم کے متعلق ہمارا یہ ضابطہ بیان فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں تم سے ان قسموں پر مواخذہ اور گرفت نہ کریں گے جو بلا قصد و ارادہ تمہاری زبان سے نکل گئی ہیں یا قصد اور ارادہ تو تھا مگر تم اس کو اپنے گمان میں درست اور صحیح سمجھتے تھے۔ ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ گناہ۔ ہاں اللہ تعالیٰ تم سے ان قسموں پر آخرت میں مواخذہ فرمائیں گے کہ جن میں تمہارے دلوں نے جھوٹ بولنے اور معصیت کرنے کا قصد اور ارادہ کیا ہے یا اس قسم کو کسی بر اور تقویٰ سے علیحدہ رہنے کا ذریعہ اور بہانہ بنایا ہے اور اللہ بخشنے والا ہے کہ یمین لغو پر مواخذہ نہیں فرماتا اور حلیم اور بردبار ہے کہ باوجود بالقصد والارادہ جھوٹی قسم کھانے کے مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا شاید توبہ کرلے، توبہ کے لیے مہلت دیتے ہیں۔

؎ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ یمین لغو کی تفسیر میں فرماتے ہیں "یعنی لا واللہ و بلی واللہ بغیر قصد گوید یا غلط دانستہ سوگند خورد [illegible]" واللہ اعلم۔

فائدہ (۱): یمین یعنی قسم کی تین قسمیں ہیں ایک قسم یمین لغو ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک یمین لغو کے معنی یہ ہیں کہ جو قسم انسان کی زبان سے بلا قصد اور ارادہ نکل جائے جیسے عرب میں لا واللہ، اور بلیٰ واللہ تکیہ کلام تھا۔ ایسی قسم میں نہ گناہ ہے نہ کفارہ، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یمین لغو یہ ہے کہ کسی گذشتہ چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں اس کے خلاف ہو لیکن اس نے اپنے گمان میں اس کو سچ سمجھ کر قسم کھائی ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ کوئی گناہ۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس میں ارادہ ہو اگرچہ وہ نفس الامر کے خلاف ہو تو اس میں کفارہ واجب ہوگا۔ اگرچہ قسم کھانے والے کے گمان میں وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

دوسری قسم: یمین غموس ہے وہ یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک اس قسم پر بحسب ارشاد باری وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ گناہ ہے جس کا علاج توبہ اور استغفار ہے دنیا میں اس پر کوئی کفارہ نہیں اس لئے کہ کسی گذشتہ امر پر دیدہ و دانستہ قسم کھانا جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنے پر گناہ ہوتا ہے کفارہ نہیں، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ واجب ہے کیونکہ سورۂ مائدہ میں بجائے بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ کے بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ کا لفظ آیا ہے، معلوم ہوا کہ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ اور بِمَا عَقَّدْتُّمُ سے ایک ہی معنی مراد ہیں اور سورۂ مائدہ میں کفارہ صراحۃً مذکور ہے معلوم ہوا کہ مواخذہ سے مراد کفارہ دینا ہے۔ امام اعظمؒ کے نزدیک وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ میں اخروی مواخذہ مراد ہے یعنی دیدہ و دانستہ جھوٹ بولنے پر عذاب دینا مراد ہے کفارہ مراد نہیں۔

تیسری قسم: یمین منعقدہ ہے یعنی آئندہ فعل کے متعلق قصداً قسم کھائے کہ کروں گا یا نہیں کروں گا۔ ایسی قسم کے توڑنے پر بالاتفاق کفارہ واجب ہوتا ہے، سورۂ مائدہ میں وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ الخ سے یہی یمین منعقدہ مراد ہے کہ جو آئندہ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے متعلق قسم کھائی جائے اور اس زیر تفسیر آیت یعنی وَلٰكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ میں اسی قسم یعنی فعل آئندہ پر قسم کھانے کا حکم مذکور ہے کہ اگر تم آئندہ کے متعلق کسی گناہ اور خلاف شرع اور خلاف مروت کام کی قسم کھا بیٹھو جیسا کہ عبداللہ اپنے باپ سے یا شوہر و اہل سے بات نہ کروں گا تو تم کو لازم ہے کہ ایسی قسم کو توڑ دو اور کفارہ دو جیسا کہ اس آیت کا شان نزول اس معنی کا شاہد عدل ہے لیکن اس آیت میں فقط اخروی مواخذہ کا ذکر ہے دنیاوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر سورۂ مائدہ میں آئے گا۔

اور سورۂ نور کی اس آیت وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں بھی اسی قسم کی قسم کا ذکر ہے۔ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی تھی کہ میں مسطح کو نفقہ نہ دوں گا اس کے بارے میں یہ آیت نازل

ہوئی۔ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسطحؓ کا وظیفہ دوچند کر دیا۔

فائدہ (۲) اس آیت میں لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ میں لغو اور یمین منعقدہ کا ذکر ہے یمین غموس کا ذکر نہیں، یمین غموس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا الآیۃ اس آیت میں یمین غموس پر اُخروی مواخذہ کا ذکر ہے دنیوی مواخذہ یعنی کفارہ کا ذکر نہیں اس لیے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یمین غموس کی حقیقت جھوٹ اور افتراء ہے جو اعلیٰ درجہ کا گناہ کبیرہ ہے جس میں توبہ اور استغفار واجب ہے مگر کفارہ نہیں۔ اور مثل ہذا فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ میں بھی یمین غموس کی طرف اشارہ ہے۔

فائدہ (۳) اس آیت میں حق جل شانہ نے لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ کے مقابلہ میں ذکر فرمایا ہے جس سے بالاجماع کذب اور معصیت کا ارادہ مراد ہے معلوم ہوا کہ یمین لغو وہ ہے جو بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ کے مقابلہ میں ذکر کی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جس یمین میں کذب اور جھوٹ کا ارادہ نہ ہو بلکہ اپنے گمان میں سچ سمجھ کر قسم کھائی ہو وہ یمین لغو ہے جس پر کوئی مواخذہ نہیں نہ گناہ اور نہ کفارہ۔ اور عبداللہ بن عباسؓ اور مجاہدؒ اور ابراہیم نخعیؒ سے یمین لغو کی یہی تفسیر منقول ہے اور یہی امام اعظم ابوحنیفہؒ کا قول ہے۔ تفصیل کے لیے احکام القرآن جصاص ص ۔۔۔ کی مراجعت کی جائے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ

جو لوگ قسم کھا رہتے ہیں اپنی عورتوں سے ان کو فرصت ہے چار مہینے

فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ

پھر اگر مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر ٹھہرا لیا رخصت کرنا

فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

تو اللہ سنتا ہے جانتا۔

حکم بست ونہم - ایلاء

قال تعالیٰ: لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ... الیٰ ... فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

ربط: گزشتہ آیات میں کچھ احکام عورتوں کے متعلق مذکور ہوئے اور کچھ احکام یمین یعنی قسم کے متعلق مذکور ہوئے۔ آئندہ آیت میں ایک خاص قسم کی یمین یعنی خاص قسم کی قسم کا ذکر فرماتے ہیں جو عورتوں سے متعلق ہے یعنی ایلاء، اس میں دونوں باتیں جمع ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایلاء ایک خاص قسم کی یمین ہے جس کے احکام علیحدہ ہیں۔ اس لیے ایلاء کا حکم علیحدہ بیان فرمایا۔ یا یہ کہو کہ گزشتہ آیات میں یہ بیان فرمایا کہ اگر نیکی اور تقویٰ اور اصلاح کرنے کے لیے قسم کو توڑا جائے اور کفارہ ادا کر دیا جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مواخذہ نہیں۔ اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اسی طرح ایلاء کو سمجھو اگر کسی نے اپنی بیوی سے ایلاء کیا یعنی یہ قسم کھائی کہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا تو اگر اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ دے دے تو نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ چنانچہ فرماتے ہیں جو لوگ اپنی بیویوں کے پاس جانے سے قسم کھا بیٹھتے ہیں یعنی یہ قسم کھا لیتے ہیں کہ ہم ان سے صحبت نہ کریں گے ایسے لوگوں کے لیے چار مہینے کا انتظار لازم ہے پس اگر ان چار مہینے کے اندر اپنی قسم کو توڑ کر یہ لوگ اپنی عورتوں کی طرف رجوع کریں یعنی ان سے صحبت اور مباشرت کریں اور اس طرح اپنی قسم کو توڑ کر کفارہ دیدیں تو ان کا نکاح باقی رہے گا اور اللہ تعالیٰ قسم کے توڑنے اور عورت کو تکلیف پہنچانے کے قصور کو معاف کر دیں گے اور آئندہ کے لیے حقوق زوجیت ادا کرنے کی نیت کر لینے کی وجہ سے اس پر رحمت اور مہربانی فرمائیں گے اور اگر ان لوگوں نے قطع تعلق ہی کی ٹھان لی ہے اس لیے اس نے چار مہینے کے اندر رجوع نہیں کیا اور اسی طرح اپنی قسم پر قائم رہا تو چار ماہ گذرتے ہی اس پر طلاق پڑ جائے گی اور اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو سننے والے اور اس کی نیت کو جاننے والے ہیں اس لیے اس کے مناسب یہ حکم دیا۔

ف (۱) عرب کا یہ دستور تھا کہ جب بیوی سے خفا ہوتے تو یہ قسم کھا لیتے کہ میں اب تیرے پاس نہ آؤں گا، جاہلیت میں عورت کے ستانے کا یہ ایک طریق تھا اس سے عورت بیوہ رہتی اور نہ خاوند والی۔ شریعت اسلامیہ نے اس کی ایک حد اور مدت معین کر دی یعنی چار ماہ۔ اگر اس مدت میں رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا۔ اور اگر اس مدت میں رجوع نہ کیا تو طلاق بائن پڑ جائے گی۔

ف (۲) امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر ایلاء کرنے والا چار ماہ گذرنے کے بعد طلاق یا رجوع کرے تو وہ رجوع معتبر ہے اور امام ابوحنیفہؒ یہ فرماتے

یعنی کہ اگر چار مہینے کے اندر اندر رجوع کرے تو معتبر ہے چار ماہ گذر جانے کے بعد رجوع کا اعتبار نہیں، اس لئے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کی قراءت میں فَاِنْ فَآءُوْ فِیْهِنَّ آیا ہے یعنی ان چار مہینے کے اندر رجوع کر لیا۔ اور یہ قراءۃ اگرچہ متواتر نہیں لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک اگر قراءت شاذہ قراءت متواترہ کے معارض نہ ہو بلکہ اس کی مفسر ہو بمنزلہ حدیث کے ہو تو وہ بھی حجت اور واجب العمل ہے۔ اور تعارض اس کو کہتے ہیں کہ جہاں دونوں کو جمع ہونا ممکن نہ ہو۔ ورنہ ظاہر ہے کہ قراءت فَاِنْ فَآءُوْ فِیْهِنَّ کی قراءت فَاِنْ فَآءُوْ کے منافی نہیں بلکہ اس کی تفسیر اور بیان ہے۔

ف ۱۳: امام مالکؒ اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک محض چار مہینے گذر جانے سے طلاق نہیں پڑتی۔ چار ماہ گذر جانے کے بعد قسم کھانے والے کو یا طلاق دے یا رجوع کرے۔ طلاق کا مطالبہ اس کے طلاق دینے پر موقوف ہے اور اگر نہ طلاق دے اور نہ رجوع کرے بلکہ سکوت کرے تو حاکم اس سے زبردستی طلاق دلوائے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر چار مہینے بلا رجوع کے گذر گئے تو اس پر طلاق پڑ جائے گی۔

ف ۱۴: شریعت میں ایلاء اس قسم کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ چار مہینے یا چار ماہ سے زائد یا بلا تعیین مدت بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اور اگر چار مہینے سے کم کے لئے قسم کھائی تو وہ ایلاء شرعی نہ ہوگا۔ پہلی دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر رجوع کر لیا تو نکاح باقی رہے گا اور کفارہ قسم دینا پڑے گا اور اگر چار مہینے بلا رجوع کے گذر گئے تو طلاق بائن ہو جائے گی۔ اب رجوع درست نہیں۔ البتہ جدید نکاح بدون حلالہ کے جائز ہے اور ایلاء کی آخری صورت میں چار مہینے سے کم کے لئے اگر قسم کھائی ہے مثلاً تین مہینے کے لئے قسم کھائی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو کفارہ قسم دینا ہوگا اور نکاح باقی رہے گا اور اگر اپنی قسم کو پورا کیا یعنی تین ماہ کے اندر عورت کے پاس نہیں گیا تو تب بھی نکاح باقی رہے گا نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ کفارہ لازم ہوگا۔

ف ۱۵: امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک رجوع کے لئے فقط اتنا کافی ہے کہ یہ کہہ دے کہ میں نے رجوع کر لیا۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بدون وطی کے رجوع نہیں ہوتا۔

★ ——— ★ ═══ ★

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ

اور طلاق والی عورتیں انتظار کروائیں اپنے تئیں تین حیض تک

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ

اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان

أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

کے پیٹ میں، اگر ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر

وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَٰلِكَ إِنْ

اور ان کے خاوندوں کو پہنچتا ہے پھیر لینا اُن کا اس مدت میں اگر

أَرَادُوا إِصْلَاحًا ۚ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ

چاہیں سلوک سے رہنا اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ ان پر حق ہے

بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۗ وَاللَّهُ

موافق دستور کے اور مردوں کو ان پر درجہ ہے اور اللہ

عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾

زبردست ہے تدبیر والا۔

حکم بست و دوم و سوم۔ عدت طلاق مدت رجعت

قال تعالیٰ وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ... الیٰ ... وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

ارتباط: ایلاء میں ایک محدود مدت یعنی چار مہینے کے لیے عورت سے علیحدگی ہوتی ہے اور طلاق میں غیر محدود مدت کے لیے علیحدگی ہوتی ہے اس لیے محدود اور محصور یعنی ایلاء کے بعد غیر محدود اور غیر محصور یعنی طلاق کا ذکر مناسب ہوا نیز ایلاء میں بعض مرتبہ عزم یعنی ارادہ رجوع کا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے ان آیات میں طلاق کے ساتھ رجعت کے احکام بھی بیان فرمائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور طلاق والی عورتیں جن پر کسی طرح سے طلاق پڑ چکی ہے خواہ بذریعہ ایلاء کے یا کسی اور طریقے ان کو چاہیے کہ تین حیض کے گزرنے تک انتظار کریں یعنی جب تک یہ تین حیض نہ گزر جائیں اس وقت تک کسی دوسری جگہ نکاح نہ کریں تاکہ اگر حمل ہو تو معلوم ہو جائے اور دوسرے کی اولاد اس کے ساتھ مخلوط نہ ہو جائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان طلاق والی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس چیز کو پوشیدہ رکھیں جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے یعنی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے حیض یا حمل

کو چھپائیں کہ کسی طرح عدت جلدی پوری ہو جائے یا شوہر کو طلاق رجعی میں رجعت کا حق باقی نہ رہے۔ مطلب یہ کہ عورتوں کے لیے اپنے حمل یا حیض کو چھپانا جائز نہیں اگر وہ حقیقۃً اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ایمان خیانت کی اجازت نہیں دیتا اور طلاق رجعی کی صورت میں ان کے شوہر ان کو اپنی زوجیت میں واپس لانے کا پورا حق رکھتے ہیں، خواہ یہ عورتیں رضامند ہوں یا ناراض۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ شوہروں کو طلاق دینے کے بعد رجعت کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ ان کا مقصود اس رجعت سے اصلاح اور خیرخواہی ہو جاہلیت کی طرح عورتوں کو ستانا اور پریشان کرنا مقصود نہ ہو یا اس طریقے سے مہر کا معاف کرانا منظور نہ ہو۔ ستانے کی نیت سے رجعت اگرچہ صحیح ہے لیکن اس نیت سے رجعت کرنا گناہ ہے اور باعث سزا ہے۔ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا کی قید اور شرط اجازت خداوندی کی شرط ہے صحت رجعت کی شرط نہیں۔ رجعت ہر حال میں صحیح ہے مگر من جانب اللہ رجعت کی اجازت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ نیت خیرخواہی اور صلاح کی ہو اور اصلاح اور خیرخواہی اسی وقت مکمل ہوگی کہ جب ہر ایک دوسرے کا حق ادا کرے کیونکہ عورتوں کا بھی مردوں پر حق ہے جیسا کہ ان پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق لیکن حقوق میں مردوں کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر فضیلت دی ہے اس لیے رجعت کا حق اور اختیار مردوں کو عطا کیا عورتوں کو نہیں دیا؛ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ غالب ہے مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینے پر قادر ہے پس اگر کوئی عورت پر ظلم کرے گا تو اس سے بدلہ لے گا۔ اور بڑی حکمتوں والا ہے اس کا کوئی حکم حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں۔ حکمت اور مصلحت اسی میں ہے کہ طلاق اور رجعت کا اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں رہے۔ عورتیں کچھ تو کم عقل ہیں اور کچھ جلد باز اور بے صبری ہیں ان کے ہاتھ میں اگر طلاق اور رجعت کا اختیار دیدیا جاتا تو ہر شہر میں روزانہ ہزاروں طلاقیں پڑا کرتیں، اور پھر جب طلاق دینے کے بعد کچھ ہوش آتا اور اپنے بچوں کا اور اپنا انجام نظروں کے سامنے آتا تو سر پیٹتیں اور روتیں۔ عورتوں کو اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ اختیار نہیں دیا کیونکہ یہ اختیار ان کی تباہی کا باعث ہوتا۔ بچوں اور عورتوں کی خیرخواہی اسی میں ہے کہ ان کو اختیار نہ دیا جائے۔

ف: آیت میں لفظ مطلقات اگرچہ عام ہے مگر یہاں مطلقات سے وہ خاص عورتیں مراد ہیں کہ جو آزاد ہوں۔ لونڈی اور باندی نہ ہوں اور ان کو حیض بھی آتا ہو۔ نابالغ یا حاملہ نہ ہوں اور ان سے صحبت یا خلوت صحیحہ بھی ہو چکی ہو جن عورتوں میں یہ صفات پائی جائیں ان کی عدت تین حیض ہے اور اگر آزاد نہ ہوں بلکہ لونڈی اور باندی ہوں تو ان کی عدت دو حیض ہے اور ان کی طلاقیں بھی دو ہیں۔ اور اگر مطلقہ صغیر السن ہو یا بہت بوڑھی ہو گئی کہ حیض نہ آتا ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے اور اگر صحبت یا خلوت صحیحہ

سے پہلے ہی اس کو طلاق دے دی گئی تو اس پر عدت نہیں۔

ف (۱۲) لفظ قُرُوْءٌ اضداد میں سے ہے باتفاق ائمۂ لغت حیض اور طہر دونوں پر بولا جاتا ہے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں قروء سے طہر کے معنی مراد ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں قروء سے حیض کے معنی مراد ہیں۔ خلفاء راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ اور تابعینؒ سے بھی یہی منقول ہے کہ قروء سے حیض کے معنی مراد ہیں (تفسیر ابن کثیر) نیز عدت کی مشروعیت سے غرض یہ ہے کہ رحم کا بچہ سے خالی ہونا معلوم ہو جائے اور یہ بات حیض ہی سے معلوم ہو سکتی ہے طہر سے معلوم نہیں ہو سکتی۔

ف (۱۳) وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۔ سے صاف ظاہر ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے اور جو لوگ مرد اور عورت کی مساوات پر تقریریں کرتے ہیں وہ بے علم ہیں اور بے عقل بھی۔ اور جن پر نفسانی شہوتوں کا غلبہ ہے ان کے نزدیک عورت کا درجہ مرد سے بڑھا ہوا ہے اللہ تعالیٰ عقل اور ہدایت دے۔ آمین

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ

طلاق ہے دو بار تک پھر رکھنا موافق دستور کے یا رخصت کرنا

بِاِحْسَانٍ ؕ

نیکی سے

حکم بست و چہارم عدد طلاق رجعی

قال تعالیٰ۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ... الیٰ ... اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ

ربط: گزشتہ آیت میں مرد کے لیے حق رجعت کا بیان تھا اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ رجعت کا حق کب تک رہتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ جس طلاق کے بعد رجعت ہو سکتی ہے وہ دو مرتبہ ہے۔ پھر دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد تم کو دو اختیار ہیں یا تو دستور اور حسن اسلوب کے ساتھ روک لو یعنی رجعت کر کے اس کو اپنے نکاح میں رہنے دو اور یا حسن اسلوب کے ساتھ اس کو چھوڑ دو کہ اس کی عدت گزر جائے اور جہاں چاہے وہ نکاح کر لے تم اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا

اور تم کو روا نہیں کہ لے لو کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں کو مگر

إِلَّا أَنْ يَخَافَا أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۖ فَإِنْ خِفْتُمْ

جب کہ دونوں ڈریں کہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے، پھر اگر تم لوگ ڈرو

أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ

کہ وہ نہ ٹھیک رکھیں گے قاعدے اللہ کے، تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر جو بدلہ دے

بِهِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا ۚ وَمَنْ يَتَعَدَّ

کر چھوٹ جاوے عورت، یہ دستور باندھے ہوئے ہیں اللہ کے سو ان سے آگے مت بڑھو اور جو کوئی بڑھ

حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۲۹﴾

چلے اللہ کے قاعدوں سے، سو وہی لوگ ہیں ظالم۔

حکم بست و ہشتم ۲۸ خلع

قال تعالیٰ: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا... الیٰ... فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ

ربط: گزشتہ آیت میں طلاق کا ذکر فرمایا۔ اب اس آیت میں خلع کا ذکر فرماتے ہیں جو ایک قسم کی طلاق ہے یا طلاق کی طرح ایک قسم کا فسخ نکاح ہے۔ نیز گزشتہ آیت میں تسریح باحسان کا حکم تھا اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر بیوی سے خلع کی نوبت آئے تو اس کو حسن سلوک اور خوبصورتی کے ساتھ رخصت کرو۔ یعنی مہر وغیرہ جو کچھ اس کو دے چکے ہو وہ اس سے واپس نہ لو۔ دیے ہوئے کو واپس لینا تسریح باحسان کے خلاف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اور تمہارے لیے یہ حلال نہیں کہ بیویوں سے چھوڑنے کے وقت ان سے اس مال میں سے کچھ بھی واپس لو جو تم ان کو نکاح کی حالت میں دے چکے ہو مگر جب کہ میاں بیوی دونوں کو یہ خوف ہو کہ ہم اللہ کی مقرر کردہ حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے یعنی آپس میں حقوق زوجیت نہ ادا کر سکیں گے تو ایسی صورت میں اگر مرد عورت سے کچھ مال لے کر اس کو چھوڑ دے اور عورت مال دے کر اپنے آپ کو اس کے نکاح سے چھڑا لے تو کوئی گناہ نہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کو خلع کہتے ہیں۔ سو اگر تم کو اندیشہ ہو کہ میاں اور بیوی باہمی

منافرت اور کراہت کے باعث حقوق زوجیت کے بارے میں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں کہ عورت کچھ فدیہ یعنی بدل دے کر نکاح سے اپنا پیچھا چھڑا لے تاکہ دونوں گناہ سے بچ جائیں ایسی صورت میں عورت کے لیے مال کا دینا اور مرد کے لیے مال کا لینا جائز ہے بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں پس ان سے آگے نہ بڑھنا اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ سراسر ظالم ہیں اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیسؓ کی بیوی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیسؓ کے دین اور اخلاق اور عادات پر کوئی عیب نہیں لگاتی مگر میں اور وہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں نے برقع اٹھا کر بہت سے لوگوں میں ان کو آتے ہوئے دیکھا تو سب سے زیادہ سیاہ فام اور پست قد اور بدصورت ثابت ہی نظر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم ان کو وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو جو اس نے تم کو دیا ہے کہا ہاں وہ بھی اور کچھ زیادہ بھی دے سکتی ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیسؓ کو بلایا اور فرمایا کہ تم اس سے وہ باغیچہ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو اس پر یہ آیت نازل ہوئی یہ اسلام میں پہلا خلع تھا۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ

پھر اگر اس کو طلاق دے تو اب حلال نہیں اس کو وہ عورت اس کے بعد جب تک نکاح

زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ

نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں

يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَ

ان دونوں پر کہ پھر مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے حکموں کو اللہ کے اور

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿٢٣٠﴾

یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی بیان کرتا ہے واسطے جاننے والوں کے۔

حکم بست و ششم جواز و طلاق ثالث

قال تعالیٰ: فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ... الیٰ ... لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ۝

ربط: گزشتہ آیات میں دو طلاق کا حکم بیان فرمایا یعنی دو طلاق کے بعد تم کو امساک بمعروف اور تسریح باحسان کا اختیار ہے اب اس آیت میں تیسری طلاق کا حکم بیان فرماتے ہیں کہ تیسری طلاق کے بعد تم کو رجعت وغیرہ کا کوئی حق اور اختیار باقی نہیں رہتا بلکہ ان معاملات کے تمہاری طرف رجوع نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ فرماتے ہیں پس اگر دو طلاق دینے کے بعد تیسری طلاق بھی دیدے تو اس عورت کا تعلق اس سے بالکلیہ منقطع ہو جائے گا اس لیے کہ دو طلاق کے بعد تو رجعت کا امکان تھا اور جب تیسری طلاق بھی دے دی تو اب رجعت کا کوئی موقعہ نہیں رہا طلاق کی وضع ہی مفارقت اور انقطاع کے لیے ہے تیسری طلاق سے نکاح کی علت بالکلیہ ختم ہوگئی اور یہ عورت اس کے لیے بالکل حلال نہ رہے گی۔ اب اس عورت سے نہ رجعت ہوسکتی ہے اور نہ نکاح جدید جائز ہے تاوقتیکہ یہ عورت عدت کے بعد پہلے شوہر کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے پھر اگر یہ دوسرا شوہر ہم بستری کے بعد اس کو طلاق دے دے اور عدت بھی گذر جائے تو پھر کوئی گناہ نہیں کہ یہ عورت اور پہلا شوہر جدید نکاح کرکے بدستور سابق حالت کی طرف لوٹ جائیں اور زن و شوئی کے تعلقات قائم کرلیں، بشرطیکہ دونوں کو گمان غالب ہو کہ ہم اللہ کی حدود کو قائم رکھ سکیں گے اس لیے کہ آئندہ ہونے کے متعلق جزم اور یقین کا حاصل ہونا نہایت مشکل ہے، اس لیے کہ غیب کا علم کسی کو نہیں کہ آئندہ کیا ہوگا اور یہ یعنی تیسری طلاق کے بعد دوسرے شوہر سے نکاح کرنا اور پھر اس کا ہم بستری کے بعد طلاق دینا اور پھر شوہر اول اور عورت کا یہ گمان غالب ہونا کہ ہم دوبارہ نکاح کے بعد ایک دوسرے کے حقوق زوجیت میں کمی کرنے کے گناہ میں مبتلا نہ ہوں گے۔ غرض یہ کہ یہ امور اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں جن سے تجاوز اور انحراف جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان حدود اور احکام کو ایسے لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم اور فہم رکھتے ہیں اور اس بات کو سمجھتے ہیں کہ تیسری طلاق سے زوجیت اور محبت کا تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور محبت اور موافقت مبدل بکراہت و منافرت ہو جاتی ہے اس لیے اس کراہت و منافرت کے ازالہ کے لیے یہ ضروری ہوا کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے اور اس کی لذت چکھنے کے بعد اگر طلاق ہو جائے تو پھر شوہر اول سے تعلق کی تجدید ہوسکتی ہے۔

فائدہ آیت قرآنیہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ تین طلاق کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا خواہ وہ تین طلاقیں علیحدہ علیحدہ دی گئی ہوں یا اکٹھی دی گئی ہوں۔ تمام صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے کہ تین طلاقیں جس طرح بھی دی جائیں خواہ مجتمعا اور خواہ متفرقا

ف طلاق رجعی میں رجعت ہوسکتی ہے اور طلاق بائن میں اسی شوہر سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے اور تیسری طلاق کے بعد اسی شوہر سے تجدید نکاح بھی جائز نہیں جب تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے، وہ اس کو طلاق دے تب شوہر اول سے تجدید نکاح ہوسکتا ہے۔

حدیث ابن عباسؓ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکرؓ کے زمانہ میں اور عمرؓ کے زمانہ خلافت میں دو سال تک تین طلاقیں ایک شمار کی جاتی تھیں پھر حضرت عمرؓ نے تین طلاقیں جاری کر دیں۔ بعض ظاہر پرست اس روایت کو دیکھ کر اس طرف چلے گئے کہ تین طلاق دینے سے ایک ہی طلاق واقع ہوتی ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے کسی مصلحت سے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے دیا تھا ابن تیمیہ حنبلیؒ اور ان کے شاگرد ابن قیم حنبلیؒ اپنے امام احمد بن حنبلؒ کے برخلاف اور تمام صحابہؓ و تابعینؒ کے اجماع کے برخلاف اور ائمہ مجتہدین کے برخلاف اور تمام اہل سنت والجماعت کے برخلاف شذوذ اور تفرد میں مبتلا ہوئے اور شیعوں کی طرح تین طلاق کے ایک طلاق ہونے کے قائل ہوئے مگر اہل سنت والجماعت کا اجماعی مسلک یہ ہے کہ تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہوتی ہیں اور تین طلاق سے عورت مغلظہ بائنہ ہو جاتی ہے سب سے پہلے شیخ تقی الدین سبکیؒ اور عز بن جماعۃ وغیرہ جیسے ائمہ نے ابن تیمیہ کا رد کیا جو ابن تیمیہ کے معاصر اور ہم عصر تھے اور یہ واضح کر دیا کہ ابن تیمیہؒ کا مسئلہ طلاق میں تفرد و شذوذ ابن تیمیہ کے ان مسائل میں سے ہے جن میں ابن تیمیہؒ نے اجماع صحابہؓ اور اجماع ائمہ اربعہؒ کے خلاف کیا ہے اور مذاہب اربعہ میں سے کوئی امام اس کا قائل نہیں ہوا اور ہر زمانہ میں علماء نے اس مسئلہ کی تردید میں کتابیں اور رسالے لکھے۔ امام نووی اور مسلم کے شارحین نے خاص طور پر شرح حدیث میں اس مسلک کا بطلان اور ابن تیمیہؒ کی تردید کی ہے۔

اہل سنت والجماعت کے دلائل

(۱) تمام صحابہؓ و تابعینؒ سے اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ - اور فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ کی تفسیر اس طرح منقول ہے کہ دو طلاق کے بعد خواہ مجتمع ہوں یا متفرق رجوع کر کے رجعت کا حق رہتا ہے اور تین طلاق کے بعد خواہ وہ مجتمع ہوں یا متفرق رجعت کا حق باقی نہیں رہتا نیز روایات سے پتا چلتا ہے کہ شروع اسلام میں لوگوں کی یہ عادت تھی کہ جب چاہتے طلاقیں دے دیتے تھے حتیٰ کہ سو سو اور ہزار ہزار طلاقیں دے دیتے تھے اور جب عدت گزرنے کے قریب ہوتی تو اس سے رجعت کر لیتے پھر اسی طرح ستانے کے لیے اس کو طلاق دیتے پھر رجعت کر لیتے اس پر یہ حکم نازل ہوا۔ الطلاق مرتان الی اخرہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کی حد مقرر کر دی کہ آخری حد تین ہے ایک دو طلاق کے بعد تو رجعت کا حق ہے اور تین یعنی تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں رہتا (تفسیر ابن کثیرؒ ج ۱)

(۲) صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں ہے کہ عویمر عجلانیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی کو لفظ واحد سے تین طلاقیں دیں اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر

کو کوئی انکار نہیں فرمایا۔

(۳) صحیح بخاری، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کرلیا اور اس دوسرے شوہر نے اس کو مباشرت سے پہلے طلاق دے دی، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کرسکتی ہے آپ نے فرمایا: نہیں جب تک دوسرا شوہر پہلے شوہر کی طرح صحبت اور مباشرت نہ کرے (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

(۴) حدیث عائشہ صدیقہؓ در قصہ رفاعہ قرظیؓ جس کا مضمون گذشتہ روایت سے قریب قریب ہے، امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں آیت مذکورہ کو اور ان تینوں حدیثوں کو ذکر فرمایا اور اشارہ اس کے مطابق طلاق ثلاث کے جواز کے لیے ایک ترجمہ منعقد فرمایا (باب من اجاز الطلاق الثلاث) دیکھو فتح الباری ص ۲۹۶ ج ۹۔ علاوہ ازیں امام بخاریؒ نے ایک اور باب منعقد فرمایا وہ یہ ہے باب اذا طلقھا ثلاثا ثم تزوجت بعد العدۃ زوجا غیرہ فلم یمسہا۔ اور اس باب میں روایت رفاعہ کو نقل فرمایا دیکھو فتح الباری ص ۳۹۳ ج ۹۔

(۵) امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں ایک باب قصہ فاطمہ بنت قیسؓ کے عنوان سے منعقد کیا۔ فاطمہ بنت قیسؓ کو اس کے شوہر نے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم کے زمانہ میں تین طلاقیں دے دی تھیں چونکہ فاطمہ بنت قیسؓ کے مزاج میں کچھ شدت تھی اس لیے نبی کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم نے اس کو دوسرے گھر میں عدت گزارنے کی اجازت دے دی تھی دیکھو فتح الباری ص ۳۸۸ ج ۹۔

(۶) معجم طبرانی اور سنن بیہقی میں سوید بن غفلہؓ سے مروی ہے کہ عائشہ خثعمیہؓ امام حسن بن علیؓ کی زوجیت میں تھیں جب علی کرم اللہ وجہہ شہید ہوئے تو خثعمیہ نے امام حسن کو مبارک باد دی اور یہ کہا لتہنک الخلافۃ خلافت آپ کو مبارک ہو۔ امام حسنؓ کو سخت ناگوار گزرا اور کہا کیا تجھ کو علیؓ کے قتل سے خوشی ہوئی اذھبی فانت طالق ثلاثا۔ جا تجھے تین طلاق۔

اور امام حسنؓ نے بقیہ مہر ان کا بھیج دیا اور مزید برآں دس ہزار درہم اور بھیجے عائشہ خثعمیہؓ کو بہت صدمہ ہوا اس پر امام حسنؓ نے یہ فرمایا کہ اگر میں اپنے جد امجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہ سنے ہوئے ہوتا تو رجوع کرلیتا وہ قول یہ ہے۔

جو شخص اپنی بیوی کو تین طلاق دے حیض کے وقت یا اور کسی طرح تو وہ اس کے لیے حلال نہیں یہاں تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔	ایما رجل طلق امرأتہ ثلاثا عند الاقراء او ثلاثا مبہمۃ لم تحل لہ حتی تنکح زوجا غیرہ۔

(۷) مسند امام احمد میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں پھر اس عورت نے دوسرے شخص سے نکاح کر لیا اور اس نے اس کو طلاق قبل از دخول دے دی تو کیا یہ عورت اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے آپ نے فرمایا نہیں، جب تک شوہر ثانی شوہر اول کی طرح مباشرت نہ کرے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

(۸) اور اسی طرح کے مضمون کی ایک حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کو ابن جریرؒ نے روایت کیا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۷۷ ج ۱)

حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ و حضرت علی رضی اللہ عنہم

محلی ابن حزم میں، و در زاد المعاد و در اغاثۃ اللہفان لابن القیم میں اور سنن بیہقی میں حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا باسانید صحیحہ یہ قول نقل کیا ہے کہ تین طلاق دینے سے عورت مغلظہ بائنہ ہو جاتی ہے بدون حلالہ کے اس سے نکاح صحیح نہیں، شیخ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ سے صراحۃً یہ ثابت ہے کہ تین طلاق دینے سے تینوں ہی واقع ہوتی ہیں۔

اجماع صحابہ کرامؓ

اور اسی پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے کہ تین طلاق دینے سے تینوں طلاق واقع ہو جاتی ہیں جیسا کہ علامہ زرقانیؒ نے شرح مؤطا میں حافظ ابن عبد البرؒ سے اجماع نقل کیا ہے اور قاضی ابوالولید باجیؒ نے منتقی میں اور امام ابوبکر رازی جصاصؒ نے احکام القرآن میں اور امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا ہے۔

فالراجح فی الموضعین تحریم المتعۃ وایقاع الثلاث للاجماع الذی انعقد فی عہد عمرؓ علی ذلک ولا یحفظ ان احدا فی عہد عمر خالفہ فی واحدۃ منہما وقد دل اجماعہم علی وجود ناسخ وان کان خفی عن بعضہم قبل ذلک حتی ظہر لجمیعہم فی عہد عمر فالمخالف بعد ہذا الاجماع منابذ لہ والجمہور علی عدم اعتبار من احدث الاختلاف بعد الاتفاق واللہ اعلم۔ (فتح الباری ص ۳۶۲ ج ۹)

اور حافظ ابن رجب حنبلیؒ جو بچپن سے حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن قیمؒ کی صحبت میں رہے جب ان پر یہ منکشف ہوا کہ ہمارے استاذ ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ بہت سے مسائل میں سلف صالحین کے خلاف ہیں تو اپنی تصانیف میں انکار کیا اور اسی مسئلہ یعنی طلاق ثلاث کے بارہ میں ایک خاص کتاب ان کے رد میں لکھی جس کا نام "بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلث واحدۃ" رکھا۔ اسی کتاب مذکور میں حافظ ابن رجب حنبلیؒ لکھتے ہیں۔

اعلم انه لم يثبت عن احد من الصحابة ولا من التابعين ولا من ائمة السلف المعتد بقولهم في الفتاوى في الحلال والحرام شيء صريح في ان الطلاق الثلاث بعد الدخول يحسب واحدة اذا سيق بلفظ واحد اه كذا في الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثري ص۳۲ وقال ابن رجب لا نعلم من الامة احدا خالف في هذه المسألة مخالفة ظاهرة ولا حكما ——— ولا قضاء ولا علما ولا افتاء ولم يقع ذلك الا من نفر يسير جدا وقد انكر عليهم من عاصرهم غاية الانكار وكان اكثرهم يستخفي بذلك ولا يظهره فكيف يكون اجماع الامة على اخفاء دين الله الذي شرعه على لسان رسوله واتباع اجتهاد من خالفه برأيه في ذلك هذا لا يحل اعتقاده البتة اه. ولعلك فهمت بهذا البيان ان امضاء الثلاث حكم شرعي مستمد من الكتاب والسنة وقد انعقد اجماع فقهاء الصحابة ثم تلقاه التابعون ومن بعدهم وليس بعقوبة سياسية بل هو حكم شرعي يلزم على امضائه ثم لا خارج عن ذلك بعده والله اعلم. كذا في الاشفاق على احكام الطلاق للعلامة الكوثري ص۳۶.

حدیث ابن عباسؓ کا جواب

حافظ عسقلانیؒ نے فتح الباری ص۳۶۳ ج۹ میں جمہور کی طرف سے حدیث ابن عباسؓ کے آٹھ جواب دیئے ہیں جن میں سے چند ہدیہ ناظرین کرتے ہیں

جواب اول ابن عباسؓ کی یہ حدیث جس کو طاؤسؒ نے روایت کیا ہے شاذ ہے آیت قرآنیہ اور احادیث صحیحہ مشہورہ اور اجماع صحابہ اور خلفاء راشدین کے فیصلہ کے خلاف ہے امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ سعید بن جبیرؒ اور مجاہدؒ اور عطاءؒ اور عمرو بن دینارؒ اور مالک بن حویرثؒ اور محمد بن ایاسؒ اور نعمان بن ابی عیاشؒ یہ تمام اکابر ثقات ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جو شخص اپنی عورت کو تین طلاق دے دے تو اس کے بارہ میں ابن عباسؓ کا فتویٰ یہ تھا کہ اس شخص نے خدا کی نافرمانی کی کہ یکدم تین طلاقیں دے دیں۔ اس کی بیوی اس سے بائنہ ہوگئی بغیر دوسرے شخص سے نکاح کئے اور طلاق حاصل کئے بغیر پہلے خاوند سے نکاح نہیں کر سکتی ان ائمہ کبار نے ابن عباسؓ سے جو کچھ روایت کیا ہے وہ جماعت صحابہ و تابعین کے مطابق ہے اور اس امر کی دلیل ہے کہ طاؤسؒ وغیرہ نے ابن عباسؓ سے جو روایت نقل کی ہے [یعنی طلاق ایک سمجھی جاتی تھی] وہ بالکل ضعیف اور کمزور ہے یہ ممکن نہیں کہ ابن عباسؓ صحابہ کرامؓ کے خلاف کریں۔ حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ طاؤسؒ کی روایت وہم اور غلط ہے۔ حجاز اور شام اور عراق اور مشرق اور مغرب کے فقہاء میں سے کوئی بھی اس طرف

تمام احادیث صحیحہ صریحہ اور آیت قرآنیہ تین طلاق کے تین ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور حضرت فاروقؓ کی مجلس میں یہ مسئلہ پیش ہوا تو فاروق اعظمؓ نے بمشورہ عثمان غنیؓ و علیؓ و دیگر اکابر صحابہؓ ان روایتوں کو ترجیح دی جو تین طلاق کے تین طلاق واقع ہونے پر دلالت کرتی تھیں تو امت کا فریضہ یہ ہے کہ اگر بالفرض مختلف فیہ بھی ہو تو جس جانب کو خلفاء راشدینؓ اور تمام صحابہ کرامؓ بلا اختلاف اختیار کرلیں اگر چہ وہ حدیث اسناد کے ضعیف ہو اسی جانب کا اتباع ضروری ہوگا اور جس چیز پر خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ متفق ہوگئے ہوں تو اس کی مخالفت ناجائز ہوگی اور یہی ائمہ اربعہ اور تمام محدثین کا مسلک ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ تین طلاق دینے سے تین طلاق کا واقع ہونا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور اجماع صحابہؓ اور فاروق اعظمؓ کے حکم اور عثمانؓ اور علیؓ اور فقہاء صحابہؓ کے اتفاق سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ فاروق اعظمؓ کے حکم سے انکار کرلینا اور اجماع صحابہؓ کی مخالفت کرنا تو فرقہ رافضیہ اور شیعوں کا شیوہ ہے اللہ تعالیٰ ہم کو اس سے پناہ میں رکھے آمین ثم آمین۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو ، پھر پہنچیں اپنی عدت تک

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا

تو رکھ لو ان کو دستور سے یا رخصت کرو دستور سے ، اور مت

تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ

بند کرو ان کے ستانے کو تا زیادتی کرو۔ اور جو کوئی یہ کام کرے

فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ

اس نے برا کیا اپنا ۔ اور مت ٹھہراؤ حکم اللہ کے ہنسی ،

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ

اور یاد کرو احسان اللہ کا جو تم پر ہے اور وہ جو اتاری تم پر کتاب

الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا

اور علم کی باتیں کہ تم کو سمجھاوے اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان

إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۳۱﴾

رکھو کہ اللہ سب چیز جانتا ہے۔

★ حکم بست و ہفتم (۲۷) منع از اضرار نساء و زجر از لعب با احکام خداوندی

قال تعالیٰ۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ ... الیٰ ... وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔

ربط: گزشتہ آیت یعنی الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ میں یہ بیان فرمایا تھا کہ طلاق رجعی میں تم کو دو اختیار ہیں یا تو حسن اسلوب کے ساتھ اس کو روک لو یا خوبصورتی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو کچھ بھی کرو بھلائی کا قصد رہے لیکن عورتوں کو تکلیف اور ضرر پہنچانے کے ارادہ سے نہ روکو چنانچہ فرماتے ہیں اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق رجعی دو اور پھر وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب ہو جائیں یعنی ان کی عدت اور میعاد قریب الختم ہو مگر ابھی ختم نہ ہوئی ہو۔ پس اگر ان کو اپنے نکاح میں رکھنا منظور ہے تو اچھے طریق سے ان سے رجعت کر کے ان کو اپنے نکاح میں روک لو یا ان کو اپنی زوجیت میں رکھنا مقصود نہ ہو تو پھر خوبصورتی کے ساتھ ان کو رخصت کر دو کہ وہ اپنی عدت گزار کر جہاں چاہیں نکاح کر لیں اور دست تعدی بغرض ایذاء رسانی ان کو نہ روکو یعنی ایذا پہنچانے کی غرض سے ان سے رجعت نہ کرو تاکہ روک کر ان پر کچھ ظلم اور زیادتی کرو جیسا کہ جاہلیت کا طریقہ تھا کہ بیوی کو ستانے کی غرض سے طلاق دیتے اور پھر جب عدت پوری ہونے کے قریب ہوتی تو رجعت کر لیتے اور پھر طلاق دیتے اور پھر اسی طرح کرتے رہتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ ایسا مت کرو اور جو شخص ایسا کام کرے گا یہ جان رکھے کہ بلاشبہ اس نے اپنی ہی جان پر ظلم کیا اور اے مسلمانو تم ان جاہلوں کی طرح اللہ کے احکام کو تمسخر اور تماشہ نہ بناؤ۔

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ پہلے لوگوں کی حالت یہ تھی کہ اول طلاق دے دیتے اور پھر یہ کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اور اسی طرح غلام اور باندی کو آزاد کر دیتے اور پھر کہتے کہ ہم نے تو مذاق کیا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللّٰهِ هُزُوًا۔

اور حدیث شریف میں ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا جد یعنی حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ مگر ان کا ہزل یعنی ان کا ہنسی اور مذاق کے طور پر کہنا بھی حقیقت ہی کا حکم رکھتا ہے وہ تین چیزیں یہ ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجعت۔ یعنی ان چیزوں میں تمہارے الفاظ کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں بندہ کے جن افعال کا تعلق حق تعالیٰ سے ہے وہاں شریعت نے نیت کا اعتبار کیا ہے اور

جو معاملات ایسے ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے وہاں الفاظ کی ظاہری دلالت کا اعتبار ہے نیت کا اعتبار نہیں، طلاق اور رجعت بھی اسی قبیل سے ہیں۔ طلاق اور رجعت میں الفاظ کا اعتبار ہوگا نیت کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ اگر معاملات اور معاشرت میں ان ظاہر الفاظ کے خلاف نیت کا اعتبار کیا جائے تو دوسروں کے حقوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ معاشرت اور معاملات میں اگر الفاظ کی دلالت کا اعتبار نہ ہو اور لوگوں کی نیت کے مطابق فیصلے ہونے لگیں تو کاروبار عالم درہم برہم ہو جائے۔ خود غرض لوگ طلاقیں دیں گے اور پھر عورتوں کو روکنے کے لیے اپنی نیتوں کو بہانہ بنائیں گے اور اس طرح عورتوں کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنائیں گے اور اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ اس نے تم پر احسان کیا کہ تم کو عورتوں پر حاکم بنا دیا اور اگر وہ چاہتا تو تم کو عورتوں کے ماتحت کر دیتا اور پھر وہ بھی اسی طرح تمہارے سامنے بے قاعدگی کرتیں اس لیے تم کو چاہیے کہ اللہ کی نعمت کا شکر کرو اور اس کی نعمت کو یاد کرو کہ جس نے تم پر کتاب اور حکمت کو اتارا یعنی قرآن کریم اور سنت نبویؐ تم کو عطا کی تاکہ تم اپنے عبادات عمل کی اصلاح کرو۔ اللہ تعالیٰ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ کتاب و سنت کے مطابق پر چلو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے طلاق اور رجعت سے جو نیت بھی کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں۔

وَ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب

تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا

نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کر لیں اپنے خاوندوں سے جب راضی ہو جاویں

بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ

آپس میں، موافق دستور کے۔ یہ نصیحت اس کو ہے جو کوئی تم میں

يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَ

یقین رکھتا ہے اللہ پر اور پچھلے دن پر اس میں سنوار زیادہ ہے تم کو

أَطْهَرُ وَ اللَّهُ يَعْلَمُ وَ أَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۲۳۲﴾

اور ستھرائی اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حکم بست و ہشتم منع از اضرار زنان بعد از عدت

قال تعالیٰ: وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ ... الیٰ ... وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝

ربط: گزشتہ آیات میں اثناء عدت عورت کو ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان تھا۔ اس آیت میں عدت گزرنے کے بعد ضرر پہنچانے کی ممانعت کا بیان ہے کہ عدت گزرنے کے بعد عورتوں کو نکاح سے نہ روکو چنانچہ فرماتے ہیں اور جب تم یعنی تمہارا کوئی عزیز عورتوں کو طلاق دے دے اور پھر وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی ان کی عدت پوری ہو جائے اور وہ پھر اپنے سابق شوہر سے یا کسی دوسری جگہ نکاح کرنا چاہیں تو تم ان کو اپنے پہلے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ شریعت اور مروت کے دستور کے مطابق نکاح کرنے پر باہم رضامند ہو جائیں۔ البتہ اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرنے لگے یا عدت کے اندر کسی دوسرے سے نکاح کرنے لگے تو پھر اولیاء اور اقارب کو ایسے نکاح سے روکنے کا حق حاصل ہے۔

یہ آیت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ معقل نے اپنی بہن کا ایک شخص سے نکاح کر دیا تھا۔ بعد چندے اس شخص نے ان کی بہن کو طلاق دے دی عدت گزرنے پر پھر اسی شخص نے پیغام دیا۔ معقل نے کہا کہ میں نے پہلے تم سے اپنی بہن کا نکاح کیا اور تمہارا گھر بسایا مگر تم نے اس کو طلاق دے دی اور اب پھر پیغام دے کر آئے ہو۔ خدا کی قسم اب وہ تمہارے گھر ہرگز نہیں جا سکتی۔ معقل کہتے ہیں کہ وہ آدمی کچھ برا نہ تھا اور میری بہن بھی اس کے یہاں جانا چاہتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ الآیۃ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ خدا کی قسم میں ضرور اسی سے نکاح کر دوں گا۔ اور پھر میں نے اسی شخص سے اپنی بہن کا نکاح کر دیا۔ یہ نصیحت اس شخص کو کی جاتی ہے کہ جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ نصیحت اسی کو فائدہ دیتی ہے جسے خدا کا خوف اور آخرت کا یقین ہو۔ اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو کچھ تم کو نصیحت اور ہدایت کی گئی ہے یہ تمہارے لیے خیر اور برکت اور طہارت اور نزاہت کا ذریعہ ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ عورتوں کو نکاح سے روکنے میں کیا مفسدے اور کیا خرابیاں ہیں اور تم پیش آنے والے مفاسد کو نہیں جانتے اگر باوجود باہمی رضامندی اور رغبت کے تم نے عورتوں کو نکاح سے روکا تو شیطان طرفین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈالے گا اور اس طرح سے دلوں کی طہارت اور نزاہت کو مکدر کرے گا اور عجب نہیں کہ نکاح سے روکنا خود اپنے خاندان سے ناجائز تعلقات کا ذریعہ بن جائے۔ ذٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ کے یہی معنی ہیں خوب سمجھ لو۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ

اور بچے والیاں دودھ پلاویں اپنے لڑکوں کو دو برس پورے

لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ

جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت اور لڑکے والے پر ہے

رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ

کھانا اور کپڑا ان کا موافق دستور کے۔ تکلیف نہیں کسی کو مگر

اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا

مگر جو اس کی گنجائش ہے نہ ضرر پہنچایا جائے ماں کو اس کی اولاد کی وجہ سے اور نہ

مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ

لڑکے والے کو اس کی اولاد کی وجہ سے اور وارث پر بھی یہی ذمہ ہے۔

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ

پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑالیں آپس کی رضا سے اور مشورہ سے تو

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ

ان پر کچھ گناہ نہیں۔ اور اگر تم لوگ چاہو کہ

تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ

دودھ پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں جب حوالہ کردو

مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ

جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا موافق دستور کے اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ

اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اللہ تمہارے سب کام کو دیکھتا ہے۔

حکم بست و نہم متعلق برضاع

قال تعالیٰ: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ ... الی ... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

ربط: گزشتہ آیات میں عورتوں کے احکام کا بیان تھا یعنی طلاق اور عدت اور رجعت کے احکام کا ذکر تھا. اب ان آیات میں بچوں کے احکام بیان فرماتے ہیں یعنی رضاعت کی مدت اور اس کی اجرت کے احکام بیان فرماتے ہیں کہ بچہ والی عورتوں کو چاہئے کہ اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں. اگرچہ ان کے شوہروں نے ان کو طلاق دے دی ہو اور یہ مدت اس کے لئے ہے کہ جو شیر خوارگی کو مکمل کرنا چاہے اور جو مدت رضاعت کو پورا کرنا نہ چاہے تو اس کو اختیار ہے کہ دو سال سے پہلے ہی دودھ چھڑا دے اور باپ پر جس کے لئے دراصل یہ بچہ پیدا کیا گیا کیونکہ بچہ باعتبار نسب کے باپ ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے. ان دودھ پلانے والیوں کا کھانا اور پہننا دستور کے مطابق واجب ہے حق تعالیٰ کی طرف سے کسی شخص کو کسی حکم کا مکلف نہیں بنایا جاتا مگر اس کی طاقت اور گنجائش کے موافق لہٰذا ماں کو بچہ کی وجہ سے کوئی ضرر اور نقصان نہ پہنچایا جائے اور نہ باپ کو لڑکے کی وجہ سے کوئی تکلیف دی جائے یعنی طلاق ہو جانے کے بعد ماں کو یہ نہ چاہئے کہ دودھ پلانے میں انکار کرے اور شوہر سے نفقہ اور اجرت دستور سے زیادہ مانگے یا بچہ کی خبرگیری میں کمی کرے اور نہ باپ کو یہ چاہئے کہ محض اس کے ستانے کے لئے کسی انا سے دودھ پلوائے اور اس کو اجرت دے مگر ماں کو دودھ پلانے کی اجازت نہ دے یا اس کی اجرت میں کمی کرے.

غرض یہ کہ دودھ پلانے کا خرچہ باپ کے ذمہ ہے اور اگر باپ زندہ نہ ہو تو پھر اسی طرح کا خرچ وارث کے ذمہ ہے. وارث کی تفسیر میں اختلاف ہے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وارث سے ذی رحم محرم مراد ہے اس لئے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں وعلی الوارث ذی الرحم المحرم مثل ذلک آیا ہے. اور ایک قرأت دوسری قرأت کی تفسیر ہوتی ہے یعنی وارث سے وہ ذی رحم محرم مراد ہے کہ اگر بچہ مر جائے تو یہ اس کا وارث بنے بقدر میراث کے حصہ پر خرچ لازم ہوگا. مثلاً اگر ذی رحم محرم ماں اور بھائی ہوں تو دونوں سے نصف نصف لیا جائے گا اور اگر ایک بھائی اور ایک ماں ہے تو بھائی سے دو ثلث اور ماں سے ایک ثلث لیا جائے گا اور وارثوں پر خرچہ اس صورت میں ہے کہ خود بچہ کے پاس مال نہ ہو ورنہ اگر بچہ کے پاس مال ہے تو پھر تمام خرچ بچہ ہی کے مال میں سے دیا جائے گا اور امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وارث سے خود دودھ پیتا بچہ ہی مراد ہے جو اپنے متوفی باپ کا وارث ہے اس کے دودھ پلانے کی اجرت اسی کے مال میں سے لی جائے گی اور اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو پھر ماں کے ذمہ ہے اور بچہ کے نفع کے لئے سوائے والدین کے کسی پر جبر نہیں کیا جا سکتا پس اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور مشورہ سے دو برس سے پہلے ہی دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر اس بارہ میں کوئی گناہ نہیں اور اگر تم کسی ضرورت یا مصلحت کی وجہ سے

یہ ارادہ کرو کہ اپنے بچوں کو بجائے ماں کے کسی دایہ کا دودھ پلواؤ تو بشرطیکہ تم حوالہ کردو جو کچھ تم نے دینا مقرر کیا تھا دستور کے موافق یعنی دودھ پلانے والی کا حق پورا دے دیا اس میں سے کچھ کمی نہ کرنا کسی کا حق مارنا یا گھٹانا بہت بڑی بات ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو کہ جو احکام نازل ہوئے اور دودھ پلانے والیوں کے متعلق دیئے گئے ہیں ان کی خلاف ورزی نہ ہو اور اس بات کو پیش نظر رکھو کہ تحقیق اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے کہ طلاق دے دینے کے بعد ماں سے دودھ پلواتے ہیں یا ماں کے ہوتے ہوئے کسی انا سے بچہ کو دودھ پلوانے میں کوئی نفسانی غرض تو شامل نہیں کوئی دیکھے یا نہ دیکھے مگر حق تعالیٰ تمہارے دل کے خیالات اور نفس کے خطرات کو بھی دیکھتا ہے۔

ف ۱: طلاق کے بعد اکثر و بیشتر میاں اور بیوی کے درمیان میں ایک قسم کی عداوت اور مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص کر جب کہ طلاق ایسی حالت میں ہو کہ گود میں شیر خوار بچہ بھی ہو تو یہ باہمی منافرت اور کدورت ایک قسم کی منازعت اور مخاصمت کا سبب بن جاتی ہے۔ اور جب شوہر کو بچہ کی پرورش میں عجب دشواری پیش آتی ہے۔ کبھی مرد یہ چاہتا ہے کہ بچہ کو ماں سے چھین کر کسی اور عورت سے دودھ پلوائے اور اس طرح بیچاری ماں کو فراق میں تڑپائے اور کبھی عورت بچہ کو دودھ پلانے سے اس لیے انکار کر دیتی ہے کہ ظاہر میں کوئی اور دودھ پلانے والی موجود نہیں ہے شوہر مجبور ہو کر میری خوشامد کرے گا اور جو مطالبہ کروں گی وہ مجبوراً دے گا اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں فیصلہ فرمایا کہ مائیں دو برس تک بچہ کو دودھ پلائیں اور باپ کے ذمہ ان کے معاوضہ میں ان کا کھانا اور پہننا واجب ہو گا ایک دوسرے کو ضرر اور نقصان پہنچانے کا ارادہ نہ کرے اور نہ کسی کا حق مارے۔

ف ۲: مدت رضاعت جمہور کے نزدیک دو سال ہیں اور امام اعظمؒ کے نزدیک ڈھائی سال یعنی تیس مہینے ہیں جیسا کہ حَمْلُهٗ وَفِصَالُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا میں مذکور ہے تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھی جائے۔

ف ۳: یہ آیت اگرچہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی مگر بیوی بھی اس حکم میں داخل ہے اور اگر بچہ کو دودھ پلانے کی وجہ سے بیوی کو کچھ دیا جائے تو حق زوجیت اس کے لیے مانع نہیں۔

ف ۴: ماں اگر معذور نہ ہو تو دیانۃً اس کے ذمہ بچہ کو دودھ پلانا واجب ہے اور منکوحہ کے لیے یا اس مطلقہ کے لیے جو ابھی تک عدت میں ہو اجرت لینا جائز نہیں البتہ عدت گزرنے کے بعد اجرت دینا واجب ہوگی۔

ف ۵: ماں کا دودھ اگر بچہ کے لیے مضر ہو تو ایسی صورت میں کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانے میں کوئی حرج نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا

اور جو لوگ مر جائیں تم میں اور چھوڑ جائیں عورتیں

يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا

وہ انتظار کروا رکھیں اپنے تئیں چار مہینے اور دس دن

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ

پھر جب پہنچ چکیں اپنی عدت کو تو تم پر نہیں گناہ

فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

جو وہ اپنے حق میں کریں موافق دستور کے

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور اللہ کو تمہارے کام کی خبر ہے۔

حکم سی ام، عدت وفات زوج

قال تعالیٰ: وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ... الیٰ ... وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔

ربط: گزشتہ آیات میں عدت حیات یعنی عدت طلاق کو بیان فرمایا اور اسی کے ساتھ اثناء عدت میں مدت رضاعت اور اجرت رضاعت کا حکم بیان فرمایا۔ اب ان آیات میں عدت حیات کے بعد عدت وفات کو بیان فرماتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ عدت وفات اور عدت حیات الگ الگ ہیں اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر کو پوری کر کے دنیا سے چلے جائیں اور بیبیوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان کو چاہئے کہ چار مہینے اور دس دن اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں جب تک یہ عدت نہ گزر جائے کہیں نکاح نہ کریں۔ پس جب کہ وہ اپنی مدت اور عدت پوری کر لیں تو اے وارثان میت تم پر اب کوئی گناہ نہیں اس کام میں جو وہ اپنی ذات کے لیے دستور کے مطابق کریں اب ان کو زینت کرنے کی اور نکاح کرنے کی اجازت ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام احوال سے باخبر ہے اگر تم نے کسی امر مشروع پر ان کو ملامت کی یا ان کی کسی بات میں حارج اور مزاحم ہوئے تو اللہ تعالیٰ تم کو اس کی سزا دے گا۔

ف ۱۱ یہ عدت اس بیوہ کی ہے کہ جو حاملہ نہ ہو اس لیے کہ حاملہ کی عدت وضع حمل یعنی ولادت ہے. کما قال تعالیٰ. وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ.

ف ۱۲ آئندہ ایک آیت میں آتا ہے کہ عدت وفات ایک سال ہے وہ حکم پہلے تھا جو اس آیت سے منسوخ ہو گیا. یہ آیت اگرچہ تلاوت کے اعتبار سے مقدم ہے مگر نزول کے اعتبار سے مؤخر ہے.

ف ۱۳ شریعت نے عدت کا حکم پہلے نکاح کی عزت و حرمت، نسب اور حمل کی حفاظت کے لیے دیا.

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ

اور گناہ نہیں تم پر جو پردہ میں کہو پیغام نکاح عورت

النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ

کا یا چھپا رکھو اپنے دل میں معلوم ہے اللہ کو کہ تم

سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ

البتہ ان کا دھیان کرو گے لیکن وعدہ نہ کرو ان سے چھپ کر مگر

اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ڛ وَلَا تَعْزِمُوْا

یہی کہ کہہ دو ایک بات جس کا رواج ہے اور نہ باندھو

عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ

گرہ نکاح کی جب تک پہنچ چکے حکم اللہ کا اپنی مدت کو

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دل میں ہے

فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع

تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے تحمل والا۔

بڑا بخشنے والا ہے کہ معاف کیا اور رخصت پر مواخذہ نہیں فرمایا اور جو قصداً زیادتی کے بعد سزا کے خوف کی وجہ سے ذکر سے اس کو معاف کر دیتا ہے اور بڑا تحمل والا ہے کہ خلاف حکم کرنے والے پر مواخذہ میں جلدی نہیں کرتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ

گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو عورتوں کو

مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً

جب تک کہ نہیں کہ ان کو ہاتھ لگایا ہو یا مقرر کیا ہو ان کا کچھ حق

وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ

اور ان کو خرچ دو وسعت والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے

قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ﴿٢٣٦﴾

پر اس کے موافق جو خرچ دستور ہے لازم ہے نیکی والوں کو۔

وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ

اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا

فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

چکے ہو ان کا حق تو لازم ہو آدھا جو کچھ ٹھہرایا تھا۔

إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ

مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے جس کے ہاتھ گرہ ہے

النِّكَاحِ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى وَلَا تَنْسَوُا

نکاح کی اور تم مرد درگزر کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے اور مت بھلا دو

الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٣٧﴾

بھلائی رکھنی آپس میں۔ تحقیق اللہ جو کرتے ہو سو دیکھتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۔	اے ایمان والو! مال اور اہل و عیال کہیں تم کو خدا کی عبادت اور یاد سے غافل نہ کر دے۔ اور جو ایسا کریں وہ خاسرین میں سے ہوں گے۔

وَقَالَ تَعَالٰی: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۔

انما اموالکم را یاد گیر مال و طفل این جہان بر باد گیر

یا یوں کہو کہ گذشتہ آیات میں حقوق العباد کا ذکر تھا، اس آیت میں حق اللہ کا ذکر ہے۔

یا یوں کہو کہ گذشتہ آیت میں یعنی لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ میں یہ حکم تھا کہ باہمی سلوک اور احسان کو فراموش نہ کرو اور اس آیت میں اشارہ اس طرف ہے کہ اپنے نفس کے ساتھ سلوک اور احسان سے دریغ نہ کرو، جس نے نماز ادا کی اس نے اپنے نفس پر احسان کیا اور جس نے نماز سے غفلت برتی اس نے اپنے نفس کو فراموش کیا کہ آخرت کے منافع سے اس کو محروم کیا۔

یا یوں کہو کہ گذشتہ آیات میں طلاق کی اجازت مذکور تھی اور احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ طلاق اگرچہ بوجہ ضرورت شرعاً جائز ہے مگر حق تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے اور ایک ناپسندیدہ امر کے ضمن میں کتنے ناپسندیدہ امور کا ارتکاب ہو جاتا ہے وہ اللہ ہی کے علم میں ہے اس لیے آئندہ آیت میں نماز کا حکم نازل کیا کہ نماز کی محافظت ناپسندیدہ امور کے ارتکاب کا کفارہ بن سکے۔ کما قال تعالیٰ

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۔	بیشک نیک کام (یعنی نماز اعمال) مٹا دیتے ہیں برے کاموں کو۔

نماز دین کا ستون ہے گناہوں کو مٹاتی ہے۔ اور دلوں کے زنگ کو دور کرتی ہے اہل و عیال کی وابستگی سے جو دلوں پر میل کچیل آ جاتا ہے وہ نماز کی محافظت سے صاف ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ رات دن میں پانچ نمازوں کا ادا کرنا ایسا ہے جیسا کہ کسی کے دروازہ کے آگے نہر بہتی ہو اور وہ ہر روز اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ یعنی سر اور بدن پر پانی بہانے سے بھی غسل ہو جاتا ہے لیکن غسل کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ بجائے اپنے اوپر پانی بہانے کے خود نہر کے اندر گھس جائے کہ جس کا پانی تیزی سے چل رہا ہو ایسی نہر میں جس کا پانی نہایت تیزی کے ساتھ چل رہا ہو غسل کرنے سے میل باقی نہیں رہ سکتا چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ اور تمام نمازوں کی محافظت کرو اور خصوصاً درمیانی نماز کی یعنی عصر کی۔ نمازوں کی محافظت اور نگرانی کے معنی یہ ہیں کہ نمازوں کو اپنے وقتوں پر ادا کرو اور نماز کے ارکان اور واجبات اور سنن اور آداب کا پورا پورا لحاظ رکھو۔ تم نماز کی حفاظت کرو نماز تمہاری حفاظت کرے گی۔ اسی وجہ سے حَافِظُوْا باب مفاعلہ کا صیغہ لایا گیا جو مشارکت پر دلالت کرتا ہے۔ جس درجہ تم نماز کی محافظت اور خبر گیری کرو گے اسی درجہ نماز تمہاری حفاظت کرے گی اور فکر سے

رہو اللہ کے سامنے بہت ادب اور احترام کے ساتھ نماز میں نہایت خاموشی کے ساتھ کھڑے رہو۔ کسی سے کوئی بات نہ کرو، نگاہ نیچی رکھو، ادھر ادھر نہ دیکھو، دنیاوی خیالات سے قلب کو محفوظ رکھو، زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ابتداء میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے پیچھے نماز میں بات چیت بھی کر لیتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ تو ہم کو خاموش رہنے کا حکم ہو گیا اور باتیں کرنے سے ہم کو منع کر دیا گیا (بخاری و مسلم وغیرہ) اس لئے کہ نماز کی حقیقت مناجات خداوندی ہے آپس میں باتیں کرنے سے خلل آنے سے مناجات باقی نہیں رہ سکتی۔

حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرح وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز اس طرح ادا کرے کہ اس نماز میں اپنے دل سے باتیں نہ کرے تو اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے (بخاری شریف)

معلوم ہوا کہ نماز تو وہ ہے کہ جس میں دل سے بھی باتیں نہ ہونا چہ جائیکہ زبان سے باتیں اور گفتگو سے اشتغال ہو، پس اگر تم کو کسی دشمن وغیرہ کا خوف ہو جس کی وجہ سے تم نماز کے آداب اور سنن کی پوری حفاظت نہ کر سکو تو پھر جس طرح بھی ممکن ہو، پیادہ یا سوار نماز پڑھ لو اور اس طرح اصل نماز کی حفاظت کرو۔ گو تم اس خوف کی حالت میں رکوع اور سجدہ اور خشوع اور خضوع اور استقبال قبلہ کی پوری رعایت اور حفاظت نہ کر سکو تو پھر جب تم کو امن اور سکون حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کو پورے سکون اور اطمینان اور آداب کے ساتھ یاد کرو جس طرح اس نے تم کو اپنی بندگی اور یاد کے طریقے سکھائے ہیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ خوف کی حالت مجبوری کی حالت ہے اس لئے حق تعالیٰ نے اس حالت میں بغیر رکوع و سجود کے اشارہ سے نماز کی اجازت دے دی اگرچہ منہ بھی قبلہ کی طرف نہ ہو۔

ف (۱) صلوٰۃ وسطیٰ کی تعیین میں اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ نماز صبح مراد ہے۔ جو رات کی نماز یعنی عشاء اور دن کی نماز یعنی ظہر کے درمیان ہے، ابو قبیصہ بن ذویب کہتے ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مغرب کی نماز مراد ہے کیونکہ یہ نماز ثلاثی ہے (تین رکعت والی ہے) ثنائی اور رباعی کے درمیان ہے یعنی دو رکعت والی سے زائد اور چار رکعت والی نماز سے کم ہے۔ اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ پانچ نمازوں میں سے ایک نماز بلا تعیین کے صلوٰۃ وسطیٰ ہے، اسم اعظم اور شب قدر اور ساعت جمعہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو پوشیدہ رکھا ہے۔ جمہور علماء کے نزدیک صلوٰۃ وسطیٰ سے عصر کی نماز مراد ہے اور بہت سی احادیث صحیحہ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور یہی امام ابو حنیفہ کے نزدیک مختار ہے۔

ف (۲) عصر کی تخصیص و تاکید اور اہتمام کے لئے کی گئی کیونکہ یہ وقت لوگوں کے بازاروں میں مشغول رہنے کا ہے۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ یہ نماز فوت نہ ہو جائے یا بغیر جماعت کے ادا کی جائے یا تاخیر سے پڑھی جائے۔

ف (۴) امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک خوف کی حالت میں نماز پیروں پر کھڑے ہو کر یا سواری پر جائز ہے مگر چلتے چلتے نماز جائز نہیں اس لیے کہ رجالاً، راجل کی جمع ہے اور راجل کے معنی لغت میں چلنے والے کے نہیں بلکہ لغت میں راجل پیروں پر کھڑے ہونے والے کو کہتے ہیں اور اس آیت میں راجل کو مقابلہ میں راکب کے ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ راجل سے مراد وہ شخص ہے کہ جو سوار نہ ہو۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر دشمن کا خوف شدید ہو تو چلتے چلتے بھی نماز درست ہے جس طرح گھوڑے پر نماز پڑھ سکے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر خوف اتنا شدید ہے کہ ایک جگہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو پھر نماز کو مؤخر کرے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خندق میں نمازوں کو مؤخر فرمایا اور چلتے چلتے نمازیں نہیں پڑھیں۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ

اور جو لوگ تم میں مر جاویں اور چھوڑ جاویں عورتیں

وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ

وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک نہ نکال دینا

فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا

پھر اگر وہ نکل جاویں تو گناہ نہیں تم پر اس میں جو کچھ

فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ وَاللّٰهُ

کریں اپنے حق میں دستور کی بات اور اللہ

عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (۲۴۰)

زبردست ہے حکمت والا۔

حکم سی وچہارم (۳۴)، وصیت برائے سکونت بیوہ

قال تعالیٰ۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا الی۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

(ربط) احکام معاشرت کے ضمن میں محافظت صلوات پر تنبیہ فرمایا۔ اب اسی تنبیہ کے بعد پھر

کچھ احکام بیان فرماتے ہیں۔ گزشتہ آیات میں مطلقات کے متعہ کا ذکر فرمایا اب اس آیت میں بیوہ کے
متعہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ اور جو لوگ تم میں سے اپنی عمر پوری کر کے دارِ دنیا سے دارِ آخرت کی طرف
انتقال کر جائیں اور عورتوں کو دنیا میں چھوڑ جائیں تو ان پر یہ شرعاً واجب ہے کہ وہ بیبیوں کے لیے
ایک سال تک خرچ دینے کی وصیت کر جائیں اس طرح پر کہ وہ عورتیں انہیں کے مکانوں میں رہیں اور
ایک سال تک ان کو نان و نفقہ ملتا رہے بغیر اس کے کہ ان کو ایک سال کے اندر گھر سے نکال دیا جائے۔ شوہر
کو چاہیے کہ وصیت نامہ میں اس کی بھی تصریح کر دے کہ ان عورتوں کو ایک سال تک گھر سے نہ نکالا جائے
پھر اگر وہ عورتیں ایک سال پورا کیے بغیر نکل جاویں اور چار مہینے دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد خود بخود کسی ضرورت
کی وجہ سے بغیر وارثوں کے نکالے ہوئے نکل جائیں تو تم وارثوں پر اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جو یہ عورتیں شریعت کے
دستور کے مطابق اپنے بارے میں کریں۔ مثلاً زیب و زینت کریں یا نکاح کر لیں تو تم کو منع کرنے کا
کوئی حق نہیں۔ البتہ عدت کے بیچ میں گھر سے چلے جانے کے بعد عورت کا خرچ اگر بند کر دیا جاوے تو کر
سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے خلاف حکم کرنے والوں سے بدلہ لینے پر قادر ہے۔ حکمت والا ہے مروت
اور مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔

فائدہ عورتوں کے لیے ایک سال کی وصیت کا حکم ابتداء اسلام میں تھا کہ جب وارثوں کے
حصے مقرر نہ تھے اور آیت میراث ابھی نازل نہ ہوئی تھی بلکہ مردہ کے اختیار پر تھا کہ
وہ جس قدر وارثوں کو دلوانا چاہے اس کے مطابق وصیت کر جائے۔ شروع اسلام میں والدین اور اقارب
کا کوئی حصہ مقرر نہ تھا مرنے والے پر وصیت واجب تھی۔ کما قال تعالیٰ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ
أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ الآیۃ
اسی طرح مرنے والے پر واجب تھا کہ بیبیوں کے لیے وصیت کرنا واجب تھا کہ وہ ایک سال تک اس کے مال میں
سے کھانے پینے کا فائدہ اٹھاتی رہیں اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا اس لیے اس کو اختیار تھا کہ چاہے سال بھر
شوہر کے گھر میں رہ کر وارثوں سے اپنا حق وصول کرے یا چار مہینے اور دس دن پورے کر کے چلی جائے اور اپنا
حق چھوڑ دے عورت کے لیے اپنے اختیار سے چلا جانا جائز تھا مگر وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا۔
غرض یہ کہ اس آیت کی رو سے مرنے والوں پر واجب تھا کہ بیبیوں کے لیے ایک سال کے نفقہ اور سکنیٰ
کی وصیت واجب تھی بعد میں جب آیت میراث نازل ہوئی اور والدین اور اقارب اور بیوی کا حصہ
میراث میں مقرر ہو گیا تو بیوی وغیرہ کے لیے وصیت کرنے کا حکم منسوخ ہو گیا اور آں حضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے اعلان فرما دیا۔

الا لا وصیۃ لوارث۔ آگاہ ہو جاؤ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔

غرض یہ کہ شروع اسلام میں عورت کی عدت ایک سال تھی اور عورت کے لیے کوئی میراث نہ تھی
صرف یہی ایک سال کا نان و نفقہ تھا آیت میراث کے نازل ہونے کے بعد نان و نفقہ کی وصیت

حکم سی و نہم ۔ متعہ برائے مطلقات

قال تعالیٰ۔ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۔۔ الیٰ ... لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔

ربط: گزشتہ آیات میں ان مطلقات کے متعہ کا ذکر تھا جن کا مہر نہ مقرر ہوا ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی ہو۔ اب اس آیت میں تمام طلاق والی عورتوں کے متعہ کا ذکر فرماتے ہیں اور تمام طلاق والیوں کے لیے دستور کے مطابق کچھ نہ کچھ نفع پہنچانا ہے من جانب اللہ یہ حق کر دیا گیا ہے پرہیزگاروں پر یعنی تمام مسلمانوں پر جو کفر اور شرک سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کو بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو اور اس کے احکام کی حکمتوں میں غور و فکر کرو کہ اس کے احکام کیسی کیسی حکمتوں اور مصلحتوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک نکاح اور طلاق کے احکام تمام ہوئے فللہ الحمد۔

ف (۱): جس عورت کا کوئی مہر نہ ٹھہرا ہو اور ہاتھ لگانے سے پہلے اس کو طلاق دے دی گئی تو اس کو جوڑا دینا واجب ہے جیسا کہ گزشتہ آیات میں گزرا۔ باقی اور طلاق والی عورتوں کو جوڑا دینا واجب نہیں صرف مستحب ہے اس لیے کہ جو عورت مستحق مہر کی ہے وہ مستحق متعہ کی نہیں جس کے لیے پورا مہر یا آدھا مہر واجب ہے اس کے لیے متعہ واجب نہیں۔

ف (۲): اس آیت میں تمام مطلقات کے متعہ کا ذکر ہے جو واجب اور غیر واجب سب کو شامل ہے اور بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ "وَلِلْمُطَلَّقٰتِ" میں الف لام عہد کا ہے اس سے وہی مطلقات مراد ہیں جن کا پہلے ______ ذکر ہو چکا ہے یعنی جن کا مہر نہ مقرر ہوا ہو اور خلوت سے پہلے ان کو طلاق دے دی گئی ہو ان کے لیے متعہ واجب ہے۔ اور یہ آیت عام نہ ہوگی بلکہ پہلی ہی آیت کے حکم کی تاکید ہوگی اس لیے کہ پہلی آیت کے اخیر میں یہ تھا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ جس سے بعض صحابہ کو یہ شبہ ہوا کہ یہ متعہ دینا محض احسان اور تبرع ہے واجب اور لازم نہیں اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ جس میں حق لازم ہونے کی عام مومنین پر تصریح فرما دی۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ

تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جو نکلے اپنے گھروں سے اور وہ

أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ

ہزاروں تھے، موت کے ڈر سے۔ پھر کہا ان کو اللہ نے مرجاؤ پھر

أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ

ان کو جلا دیا، اللہ تو فضل رکھتا ہے لوگوں پر اور لیکن

أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

خاتمۂ احکام معاشرت بر تذکیر آخرت

حکایت قصہ گریزندگان از موت و برائے تنبیہ شیفتگان حیات دنیا و تمہید تشجیع بر جہاد و قتال و ترغیب انفاق مال

قال تعالیٰ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ ... الٰی ... وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ۔

(ربط) یہاں تک ابواب تدبیر المنازل کے متعلق مختلف الانواع و مختلف الاقسام احکام مذکور ہوئے قرآن اور اسلام میں سب سے زیادہ اہم اور عظیم الشان اور نفس پر شاق اور گراں دو حکم ہیں ایک جہاد و قتال کا اور دوسرا انفاق مال کا۔ چنانچہ حصول بر کے بیان میں وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ اور الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ کو خاص طور پر ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ انسان کو خداوند ذوالجلال کی اطاعت سے روکنے والی زیادہ تر دو ہی چیزیں ہوتی ہیں ایک حب دنیا اور ایک کراہت موت۔ یہی دو چیزیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں حائل اور مزاحم ہوتی ہیں اس لیے حق جل شانہ نے اولاً بنی اسرائیل کا ایک قصہ ذکر فرمایا جو موت اور وبا کے ڈر سے اپنے گھروں سے نکل بھاگے اور خلاف توقع زندگی سے سب ہلاک ہوئے اور پھر حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوئے تاکہ ان کا بلا سبب موت اور بلا سبب حیات کے مشاہدہ سے یہ یقین کرلیں کہ موت اور حیات کسی ظاہری سبب پر موقوف نہیں۔ موت اور حیات کا خالق اور مالک صرف خدا تعالیٰ ہے وہ بغیر وبا اور طاعون کے اور بغیر میدان کارزار کے بھی موت دے سکتا ہے بس موت کے خوف سے بھاگنا بے سود ہے۔ نیز ان کا بلا سبب موت اور دوبارہ زندگی کے مشاہدہ سے گویا آخرت

اور حشر و نشر اور قیامت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرلیا جس سے آخرت کے بارے میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی اور اب تک آخرت اور قیامت کے بارے میں جو ایمان استدلالی اور برہانی تھا اب وہ اس دوبارہ زندگی کے مشاہدہ کے بعد بصری و شہودی اور عیانی کے ہوگیا جس میں تردد کا احتمال نہیں۔ استدلال میں احتمال کی گنجائش ہے مشاہدہ اور معاینہ میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے

پائے استدلالیاں چوبیں بود — پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

نیز یہ قصہ ان دو حکموں کی تمہید ہے جو آئندہ آیات میں مذکور ہوں گے۔ ایک جہاد و قتال کا حکم جو اس قصہ کے متصل مذکور ہے یعنی وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ دوسرا حکم انفاق مال کا ہے جس کو مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا الخ سے بیان فرمایا پھر ان دو حکموں کے بعد اولاً جہاد و قتال کی ترغیب اور تاکید کے لیے قصہ طالوت و جالوت ذکر فرمایا اور ثانیاً خدا کی راہ میں صدقہ اور خیرات کے احکام اور فضائل بیان فرمائے جو دور تک چلے گئے اور پھر احکام صدقات سے فراغت کے بعد ربا اور سود کے احکام بیان فرمائے اس لیے کہ ربا اور سود صدقہ اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اور پھر اس سورت کو ایمان اور اطاعت اور دعا و رحمت و مغفرت پر ختم فرمایا۔

اس سورت کا آغاز بھی ایمان اور ہدایت اور تقویٰ اور فلاح سے ہوا تھا هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ۔ الخ۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اور خاتمہ بھی ایمان اور اطاعت اور دعا و رحمت پر ہوا جو کہ عین فلاح اور عین ہدایت اور عین سعادت ہے۔

بیان ربط بطریق دیگر دور سے نکاح اور طلاق کے احکام کا سلسلہ چلا آرہا تھا جن کا ذکر احکام معاشرت پہلے سے ہو رہے۔ اس لیے اب احکام معاشرت کے بعد ایک قصہ تذکیر آخرت کے لیے ذکر فرمایا جس کو عدت وفات کے احکام سے خاص مناسبت ہے

یعنی اگر تم نے کسی عورتوں کا عرصۂ حیات تنگ کردیا اور ان کے مہر اور متعہ کے دینے میں کوتاہی کروگے تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس عدول حکمی کی سزا میں تمہارے اموال اور ذخائر کو اور تمہاری مستعار حیات کو تم سے واپس لے لے جیسا کہ پہلی امتوں میں اس قسم کے واقعات پیش آچکے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا اے دیکھنے والے اور سننے والے تو نے بہت کچھ دیکھا اور بہت کچھ سنا مگر کیا تو نے ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل گئے تھے پس اللہ تعالیٰ نے بطور سزا اور تنبیہ یہ حکم دیا کہ مر جاؤ یہ حکم تکوینی تھا اسی وقت سب مر گئے اور جس موت کے ڈر سے بھاگے تھے اسی میں اچانک پکڑے گئے پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک نبی کی درخواست اور استدعا پر دوبارہ زندہ کردیا۔ جمہور علماء کا قول یہ ہے کہ یہ لوگ طاعون سے بھاگ کر نکلے تھے۔

ایک جگہ جا کر اُترے اور یہ گمان کیا کہ اب ہم سلامتی اور تندرستی کی جگہ پہنچ گئے، سب بحکمِ خداوندی سب کے سب وہیں مرگئے۔ اور ایک ہفتہ یا کچھ عرصہ بعد حزقیل علیہ السلام جو انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے وہاں سے گذرے اور یہ منظر دیکھا کہ ہزاروں ہزار آدمی مرا پڑا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعا قبول فرمائی، اور اُن سب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔ بغوی نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح منقول ہے۔

ضحاک اور مقاتل اور کلبی سے یہ منقول ہے کہ یہ لوگ جہاد سے بھاگے تھے کہ قتل سے ڈر گئے تھے موت کے ڈر سے وطن چھوڑ کر نکل گئے، بھاگ کر جہاں پہنچے اللہ کے حکم سے موت میں وہیں پہنچ گئی اور سب کا کام تمام کیا۔ پھر بعد چندے اُس زمانہ کے پیغمبر کی دعا سے دوبارہ زندہ ہوگئے۔

نکتہ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ یہ موت موتِ عقوبت تھی یعنی بطور سزا و تنبیہ تھی، موتِ اجل نہ تھی جو کہ عمر پوری ہونے کے بعد آتی ہے اس لیے سزا اور تنبیہ کے بعد دوبارہ حیات عطا کر دی گئی تاکہ اپنی عمروں کو پورا کریں اور اگر یہ موت موتِ اجل ہوتی یعنی عمریں پوری کر چکے ہوتے تو پھر حیات واپس نہ ہوتی اس لیے کہ موتِ اجل کے بعد دوبارہ زندہ نہیں کیا جاتا۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۳۲ ج ۳)

فائدہ اللہ کے یہاں عام قاعدہ تو یہی ہے کہ کوئی مرنے کے بعد قیامت سے پہلے دنیا میں نہیں آتا لیکن بطور خرقِ عادت کبھی کبھی اللہ تعالیٰ مردہ کو دنیا میں زندہ کر دیتے ہیں تاکہ اس کی قدرت کا کرشمہ ظاہر ہو اور منکرین قیامت پر حجت تمام ہو۔

اور تحقیق بتحقیق اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے کہ اس طرح دوبارہ زندہ کر کے اپنی قدرت کا کرشمہ اور قیامت کا نمونہ ایک نبی کی نبوت کی دلیل اور معجزہ لوگوں کو دکھا دیا تاکہ ملاحدہ اور منکرین قیامت اور مکذبین نبوت و رسالت عبرت حاصل کریں اور سمجھ جائیں کہ تو مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا محال ہے، ورنہ خدا کے کسی برگزیدہ بندے کے ہاتھ پر اس خارقِ عادت کرشمہ کا ظاہر ہونا ناممکن ہے۔ اور ایمان کے اصل اصول یہی تین امر ہیں۔ یعنی ایمان باللہ اور ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرت جو اس واقعہ سے ثابت ہوئے اور وَاِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً میں جو قصہ ذکر کیا گیا وہ بھی اسی طرح ان تینوں امور کی دلیل تھا اور آئندہ پارہ میں حضرت ابراہیمؑ کا جو قصہ آنے والا ہے وہ بھی ان ہی تین امور کی دلیل و حجت ہے اب دیکھو تو کس طرح سے سورۃ کا اول اور آخر اور اوسط باہم متناسب اور مرتبط ہیں۔ مقصود کہنا یہ تھا کہ اس واقعہ کو سامانِ ہدایت سمجھتے اور اس کو خدا کی نعمت جان کر شکر ادا کرتے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے اور ایسے واقعات سے عبرت اور ہدایت حاصل کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہ واقعہ کوئی معمولی نعمت نہ تھا کہ ایمان بالغیب کو شہود اور عیان بنا دیا، اور بیشمار لوگوں کو طعمۂ موت سے نکال دیا اس نعمت پر تو شکر یہ تھا کہ ہزاروں جانیں بھی قربان ہو جاتیں

تو بہت کم ہیں۔ اور آپ نبی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں جن کی توجہ اور دعا سے یہ نعمت ہمیں میسر آئی۔ صلوات اللہ وسلامہ علیہ وعلیٰ جمیع الانبیاء والمرسلین وعلیٰ سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وعلینا معہم یا ارحم الراحمین۔

ف (۱) اَلَمْ تَرَ کے معنی ہیں کیا تو نے نہیں دیکھا، مگر محاورہ میں اس کے معنی اَلَمْ تَعْلَمْ کے ہیں کیا تم کو معلوم نہیں۔ ظاہر ہے چونکہ رؤیت بصری علم کا ذریعہ ہے اس لیے لفظ رؤیت بول کر علم کے معنی مراد لیے گئے۔ بعض اہل علما کے نزدیک یہ لفظ تعجب اور تشویق کے لیے مستعمل ہوتا ہے یعنی متنبہ کرنے اور شوق دلانے کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے، اسی وجہ سے سیبویہ سے منقول ہے کہ اَلَمْ تَرَ کے معنی تَنَبَّهْ یعنی اے مخاطب تو ہوشیار ہو جا (تفسیر القرطبی ص ۲۳۰ ج ۳) یعنی یہ واقعہ عجیب وغریب ہے اس قابل ہے کہ اس کو شوق اور رغبت کے ساتھ سنا جائے یہ چیز قابل دید تھی۔

اور چونکہ یہ واقعہ شہرت اور تواتر کی وجہ سے بمنزلہ محسوس اور مشاہد کے تھا اس لیے بجائے اَلَمْ تَعْلَمْ کے لفظ اَلَمْ تَرَ لایا گیا۔ جیسا کہ حضرات فقہاء اور متکلمین نے لکھا ہے کہ خبر متواتر سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بمنزلہ مشاہدہ اور رؤیت بصری کے ہوتا ہے اس لیے کہ جو امور خبر متواتر سے ثابت تھے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں جا بجا ان کو اَلَمْ تَرَ سے تعبیر کیا ہے۔

ف (۲) یہ بھاگنے والے بنی اسرائیل میں سے ایک قوم تھی جو واسط کے قریب قصبہ داوردان میں رہتی تھی۔

ف (۳) وَهُمْ أُلُوفٌ۔ اور یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چالیس ہزار تھے بعض کہتے ہیں کہ تیس ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ آٹھ ہزار تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ چار ہزار تھے اور بعض کہتے ہیں کہ تین ہزار تھے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں۔

والصحیح انہم زادوا علی عشرۃ الاف لقولہ تعالیٰ وھم الوف وھو جمع الکثرۃ ولا یقال فی عشرۃ فما دونھا الوف۔

صحیح یہ ہے کہ دس ہزار سے زیادہ تھے۔ اس لیے کہ الوف جمع کثرت ہے اس کا اطلاق دس اور دس سے کم پر نہیں آتا۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۳۱ ج ۳)

ف (۴) حدیث میں ہے کہ جب تم یہ سنو کہ فلاں زمین میں وبا اور طاعون ہے تو تم اس زمین میں داخل نہ ہو اور اگر وبا اور طاعون اس زمین میں پھیل جائے جس میں تم رہتے ہو تو تم اس سے بھاگ کر نہ نکلو۔ (بخاری ومسلم وغیرہ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ملک شام تشریف لے گئے تو مقام سرغ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ شام میں طاعون اور وبا پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت عبدالرحمن بن عوفؓ نے یہ حدیث سنائی۔ حضرت عمرؓ یہ حدیث سن کر سرغ سے واپس آ گئے۔ ابو عبیدہؓ نے کہا۔

أَفِرَارًا مِّنْ قَدَرِ اللّٰهِ — اے امیر المؤمنین کیا اللہ کی قضا و قدر سے بھاگتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لَوْ غَيْرُكَ قَالَهَا يَا اَبَا عُبَيْدَةَ، نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ۔ — کاش! تیرے سوا کوئی یہ شبہ کرتا۔ (یعنی یہ شبہ تیری شان کے مناسب نہیں) ہاں ہم اللہ کی ایک قضا و قدر سے خدا کی دوسری قضا و قدر کی طرف بھاگ رہے ہیں

جس طرح بیماری میں علاج کرنا ایک قضا و قدر سے دوسری قضا و قدر کی طرف بھاگنا ہے اس لئے کہ بیماری بھی اللہ کی قضا و قدر سے ہے اور علاج اور دوا بھی اللہ کی قضا و قدر ہے اسی طرح وبائی زمین میں داخل نہ ہونا اور وطن کی طرف لوٹ جانا ایک قدر سے دوسری قدر کی طرف جانا ہے۔

ف ۵: یہ آیت معاد جسمانی کے ثبوت کے لیے نص و دلیل ہے۔ معاد جسمانی کا اقرار اصول ایمان میں سے ہے اور معاد جسمانی کا منکر باجماع امت بلا شبہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

اور لڑو اللہ کی راہ میں، اور جان لو کہ اللہ سنتا ہے جانتا۔

تشجیع شاکرین بر جہاد و قتال کا ذکر

قال تعالیٰ۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

گزشتہ آیت میں حکم جہاد کی تمہید تھی۔ اس آیت میں اصل مقصود کو بیان کرتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت شاکرین اور غیر شاکرین کے بیان پر مشتمل تھی اب اس آیت میں شکر کا طریقہ بتلاتے ہیں کہ جہاد و قتال کرنے کا حکم دیتے ہیں اور اب تو تم نے دیکھ لیا کہ موت سے بھاگنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ لہذا خدا کی راہ میں خوب دل کھول کر لڑو۔ خدا کی راہ میں اگر موت بھی آتی ہے تو حقیقت

اس کی حیات ہوتی ہے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے جہاد میں جانے اور نہ جانے کی بابت جو باتیں کرتے ہو وہ سب سنتا ہے اور جو نیت دل میں چھپاتے ہو اس کو جانتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ

کون شخص ہے ایسا جو کہ قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دو گنا کر دے اس کو

لَہٗۤ اَضْعَافًا کَثِیْرَةً ؕ وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُۜطُ

کر دے بہت برابر ! اور اللہ تنگی کرتا ہے اور کشائش

وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

اور اسی کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

ترغیب انفاق مال در راہ خداوند ذوالجلال

قال تعالیٰ۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔

گزشتہ آیت میں خدا کی راہ میں جان دینے کا بیان تھا اب اس آیت میں مال دینے کا بیان ہے کون شخص ہے جو اللہ کو نہایت عمدہ اور اچھا قرض دے یعنی حلال مال سے اخلاص اور خوش دلی کے ساتھ دے پس اللہ تعالیٰ اس کو کئی گنا بڑھا کر دیں گے۔ دنیا کی طرح برابر سرابر نہ دیا جائے گا۔ خداوند ذوالجلال معاذ اللہ حاجت کی بنا پر قرض نہیں مانگتا بلکہ تم سے اس لیے قرض مانگتا ہے کہ تم سے ایک لے کر بے شمار اس کے عوض عطا کرے جیسے باپ کبھی اپنے خورد سال بچے کو ایک پیسہ دیتا ہے اور پھر کہتا ہے کہ بیٹا یہ پیسہ ہم کو قرض دے دو۔ جب وہ بچہ باپ کے ہاتھ پر وہ رکھ دیتا ہے تو باپ بصد ہزار محبت و پیار اس کے ہاتھ پر ایک دینار رکھ دیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ غنی مطلق اور مالک مطلق ہے اس کو کسی کے قرض کی ذرہ برابر حاجت نہیں وہ اپنے خزانہ سے جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے وسعت اور کشائش کے ساتھ دیتا ہے اور جس طرح تم دنیا میں خالی ہاتھ آئے تھے اسی طرح تم خالی ہاتھ اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اگر خدا تعالیٰ تم سے قرض کے نام سے بھی نہ مانگتا اور نہ کسی معاوضہ کا وعدہ فرماتا تب بھی تم کو تمام مال اس کے لیے حاضر کر دینا تھا یہ مال اور جان اور یہ وجود سب اسی کا عطیہ ہے۔

ف: خدا کی راہ میں دینے کو مجازاً قرض کہا گیا اس لیے کہ قرض دینے کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو اپنا مال اس شرط پر دے کہ پھر وہ برابر سرابر اس کے پاس واپس آجائے اور بندہ حقیقۃً کسی چیز کا مالک نہیں سب چیز اللہ کی ہے۔ آقا کو غلام سے قرض مانگنے کی کیا ضرورت۔ جو غلام اس کا مملوک ہے۔

محض تلطف اور اظہار عنایت کے لیے اس کا نام قرض رکھ دیا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کرو گے من جانب اللہ اس کا معاوضہ ملے گا جیسا کہ إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ میں نفوس اور اموال کے عوض میں جنت دینے کا نام بیع وشراء رکھا۔ حالانکہ جان اور مال اور جنت سب کے وہی مالک ہیں۔ بیع وشراء کے لیے یہ ضروری ہے کہ بائع اور مشتری کی ملک علیحدہ علیحدہ ہو پس جس طرح اس آیت میں اللہ درحقیقت مالک بائع اور وہی مشتری ہیں محض ظاہر کے اعتبار سے بندہ کو بائع اور اپنے کو مشتری مجازاً قرار دیا اسی طرح اس آیت میں سمجھو کہ لینے والے اور دینے والے سب وہی ہیں مجازاً اس کو قرض سے تعبیر کر دیا تاکہ اس ظلوم وجہول کا دل خوش ہو جائے اور اگر کچھ عقل ہے تو غیرت سے زمین میں گڑ جائے کہ اللہ اکبر خود اپنے فضل وکرم سے مال ودولت ہم کو دیتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ فرماتے ہیں کہ لاؤ اس میں سے کچھ ہم کو قرض دے دو اور حکم بھی بصورت امر نہیں بلکہ استفہام کی صورت میں ہے کہ کون ہے جو خدا تعالیٰ کو قرض دے یہود بے بہبود بڑے ہی نادان تھے کہ اس تلطف اور عنایت کو نہ سمجھے بلکہ الٹا یہ سمجھے کہ معاذ اللہ خدا محتاج ہے۔ اس لیے ہم سے قرض مانگتا ہے۔ کما قال تعالیٰ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ الآیہ۔ بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ آیت میں مضاف مقدر ہے ای من ذا الذی یقرض عباد اللہ یعنی کون ہے جو اللہ کے بندوں کو قرض دے اللہ کو قرض دینے سے اس کے بندوں کو قرض دینا مراد ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے۔

یا ابن آدم مرضت فلم تعدنی	اے آدم کے بیٹے: میں بیمار ہوا تو نے میری
واستطعمتک فلم تطعمنی و	عیادت نہ کی۔ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو
استسقیتک فلم تسقنی قال	نے مجھ کو کھانا نہیں دیا۔ میں نے تجھ سے پانی
یارب کیف اسقیک وانت	مانگا تو نے مجھ کو پانی نہیں دیا۔ بندہ عرض کرے
رب العالمین قال استسقاک	گا اے پروردگار! آپ کو کیسے پلاتا آپ
عبدی فلان فلم تسقہ	تو تمام عالم کے مربی اور کھلانے والے ہیں۔
اما انک لو سقیتہ لوجدت	اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے فلاں بندے نے
ذلک عندی الحدیث اخرجہ	تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے اسے کھانا نہیں

صرف اضعافاً مضاعفۃ اجر اور ثواب کی امید پر قرض دیا ہے لہٰذا اس وقت تو خود مع بچوں کے باغ سے باہر نکل جا اب یہ باغ خدا تعالیٰ کا ہو چکا ہے ہمارا نہیں رہا۔

وَالْبِرُّ لَا شَكَّ فَخَيْرُ زَادِ قَدَّمَهُ الْمَرْءُ إِلَى الْمَعَادِ

اور آخرت کا بہترین توشہ وہ خدا کی راہ میں نیکوکاری ہے یعنی اپنی محبوب چیز کو خدا کی راہ میں دے دینا ہے کما قال تعالیٰ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۔

ام دحداحؓ نے شوہر کا یہ کلام سنتے ہی اول تو مبارک باد دی اور یہ کہا۔

رَبِحَ بَيْعُكَ بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ — تیری تجارت نفع مند ہوئی اللہ تعالیٰ
فِيمَا اشْتَرَيْتَ — برکت دے اس میں جو تو نے خریدا ہے۔

بعد ازاں شوہر کی نظم کا جواب نظم ہی میں دیا اور یہ شعر پڑھنے شروع کیے۔

بَشَّرَكَ اللّٰهُ بِخَيْرٍ وَفَرَحٍ مِثْلُكَ أَدّٰى مَا لَدَيْهِ وَنَصَحَ

تجھ کو خیر و فرحت کی بشارت ہو تجھ جیسا ہی ایسے مصلحت کے کام کرتا ہے

قَدْ مَتَّعَ اللّٰهُ عِيَالِي وَمَنَحَ بِالْعَجْوَةِ السَّوْدَاءِ وَالزَّهْوِ الْبَلَحِ

اللہ تعالیٰ نے میرے بچوں کو قسم قسم کی کھجوریں دی ہیں۔ اگر ایک باغ خدا کو دے دیا تو کیا ہوا۔

وَالْعَبْدُ يَسْعٰى وَلَهُ مَا قَدْ كَدَحَ طُولَ اللَّيَالِي وَعَلَيْهِ مَا اجْتَرَحَ

بندہ جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اپنی ہی منفعت اور آخرت کی درستی کے لیے کرتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کو کوئی حاجت نہیں نیکی سے بندہ کو ثواب ملتا ہے اور گناہ کا وبال اسی پر پڑتا ہے۔

بعد ازاں ام دحداحؓ بچوں کی طرف متوجہ ہوئیں بچے جو پھل دامنوں میں لے رہے تھے وہ دامن جھٹک دیے اور جو کھجوریں بچوں کے منہ میں تھیں وہ انگلی ڈال کر نکال دیں اور بچوں سے کہا کہ اس باغ سے نکلو اور اسی وقت دوسرے باغ میں منتقل ہو گئیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔

كَمْ مِنْ عِذْقٍ رَدَاحٍ وَدَارٍ فَيَاحٍ — نہ معلوم ابو الدحداحؓ کے لیے آخرت میں
لِأَبِي الدَّحْدَاحِ (تفسیر قرطبی — کتنے بے شمار کھجور کے لمبے لمبے درخت
ص ۲۳۸ ج ۳) — ہیں اور کتنے وسیع اور کشادہ مکانات ہیں۔

ف (۳۰) قرض دینے کا بڑا اجر عظیم ہے مسلمانوں کی پریشانی اس سے دور ہوتی ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے شب معراج میں جنت کے دروازہ پر لکھا ہوا دیکھا۔

الصدقة بعشر امثالها والقرض بثمانية عشر — صدقہ کا بدلہ دس گنا ہے اور قرض کا اٹھارہ گنا۔

میں نے جبرئیل سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ قرض کو صدقہ سے افضل قرار دیا گیا، جبرئیل نے کہا سائل سوال کرتا ہے اور اس کے پاس کچھ ہوتا ہے، اور قرض مانگنے والا بغیر حاجت کے قرض نہیں مانگتا۔
(تفسیر قرطبی ص ۲۴۱ ج ۳)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

تو نے نہ دیکھا ایک جماعت بنی اسرائیل میں

مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰی ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ

موسیٰ کے بعد جب کہا انہوں نے اپنے نبی کو

ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ

مقرر کر دے ہم کو ایک بادشاہ کہ ہم لڑیں اللہ کی

اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ

راہ میں، وہ بولا کیا یہ بھی توقع ہے تم سے کہ اگر حکم ہو تم کو

الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ

لڑائی کا تب تم نہ لڑو، وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ

اللہ کی راہ میں، اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور

اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا

بیٹوں سے، پھر جب حکم ہوا ان کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے مگر

قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَقَالَ

تھوڑے سے ان میں سے، اور اللہ کو خوب معلوم ہیں گنہگار، اور کہا

لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا

ان کو ان کے نبی نے اللہ نے کھڑا کر دیا تم کو طالوت بادشاہ بولے

قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ

کہاں ہوگی اس کو سلطنت ہمارے اوپر اور ہم زیادہ حق

بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ

ہے سلطنت میں اس سے اور اس کو ملی نہیں کشائش مال کی کہا

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي

اللہ نے اس کو پسند کیا تم سے اور زیادہ کشائش دی عقل

الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ

میں اور بدن میں اور اللہ دیتا ہے اپنی سلطنت جس کو چاہے

وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ

اور اللہ کشائش والا ہے سب جانتا۔ اور کہا ان کو ان کے نبی نے نشان اس

مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن

کی سلطنت کا یہ کہ آوے تم کو صندوق جس میں ہے دل جمعی تمہارے

رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ

رب کی طرف سے اور کچھ بچی چیزیں جو چھوڑ گئے موسیٰ اور ہارون کی اولاد

تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم

اٹھا لاویں اس کو فرشتے اس میں نشانی پوری ہے تم کو اگر یقین

مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ

رکھتے ہو۔ پھر جب باہر ہوا طالوت فوجیں لے کر کہا اللہ تم

اللّٰهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي

کو آزماتا ہے ایک نہر سے پھر جس نے پانی پیا اس کا وہ میرا نہیں

وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ

اور جس نے اس کو نہ چکھا وہ ہے میرا مگر جو کوئی بھرے

غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ

ایک چلو اپنے ہاتھ سے پھر پی گئے اس کا پانی مگر تھوڑے سے ان میں

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا

پھر جب پار ہوا وہ اور ایمان والے ساتھ اس کے کہنے لگے

طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ

قوت نہیں ہم کو آج جالوت کی اور اس کے لشکروں کی بولے جن کو

يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللّٰهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ

خیال تھا کہ ان کو ملنا ہے اللہ سے بہت جگہ جماعت تھوڑی

غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ

غالب ہوئی ہے جماعت بہت پر اللہ کے حکم سے اور اللہ ساتھ

الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا

ہے صبر والوں کے اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اس کی فوجوں کے تو بولے

رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا

اے رب ہمارے ڈال دے ہم میں صبر اور جمائے رکھ ہمارے قدم اور مدد کر

عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللّٰهِ وَ

ہماری اس کافر قوم پر پھر شکست دی ان کو اللہ کے حکم سے اور

فَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ

اور مارا داؤد نے جالوت کو اور دی اس کو اللہ نے سلطنت اور حکمت

وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ

اور سکھایا اس کو جو چاہا . اور اگر دفع نہ کرواتے اللہ لوگوں کو

بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

ایک کو ایک سے تو خراب ہو جاوے ملک لیکن اللہ

ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْھَا

فضل رکھتا ہے جہان کے لوگوں پر . یہ آیتیں اللہ کی ہیں ہم تجھ

عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

کو سناتے ہیں تحقیق اور تو بے شک رسولوں میں ہے .

قصۂ طالوت و جالوت

برائے ترغیب جہاد و قتال و رعایت آداب جہاد

قال تعالیٰ۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ... الٰی ... وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ

(ربط) حق جل شانہ ان آیات میں بنی اسرائیل کا دوسرا قصہ بیان فرماتے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تخمیناً اور اندازاً گیارہ سو سال پہلے گذرا ہے اس قصہ سے جہاد و قتال کی ترغیب اور آداب جہاد کی تعلیم اور صبر و تحمل کی تلقین مقصود ہے نیز گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا قابض اور باسط ہونا مذکور ہوا وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۔ اب ان آیات اور اس قصہ میں جو جہاد مذکور ہو: اس سے قبض اور بسط کی دلیل ہے کہ وہ مالک الملک ایسا قابض اور باسط ہے کہ جب چاہتا ہے فقیر کو بادشاہ اور بادشاہ کو فقیر بنا دیتا ہے۔ بادشاہت کا دینا اور چھیننا سب اس

۱؎ کما فی التفسیر الحقانی۔

کے ہاتھ میں ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا اے مخاطب! تو نے بنی اسرائیل کے سربرآوردہ اور اشراف لوگوں کی جماعت کو نہیں دیکھا جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کے ایک زمانہ بعد اپنے زمانہ کے ایک نبی سے جن کا نام شمویل تھا یہ کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیجیے جس کے ساتھ ہو کر ہم راہ خداوندی میں جہاد و قتال کریں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک مدت تک بنی اسرائیل کا حال درست رہا اور ان کا کام بنا رہا۔ رفتہ رفتہ جب وہ احکام توریت سے دور ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے ان کے دشمنوں کو ان پر مسلط کیا اور جالوت ان پر غالب آ گئے اور جالوت جو کافر بادشاہ تھا اس نے بنی اسرائیل کے بہت سے شہروں پر قبضہ کر لیا اور سینکڑوں بچوں کو پکڑ کر لے گیا اور ان کو غلام اور لونڈی بنا لیا۔ اور بنی اسرائیل سے توریت بھی چھین کر لے گئے۔ جب ذلت اور رسوائی یہاں تک پہنچ گئی تو بنی اسرائیل کے اشراف اور سرداروں کو خیال پیدا ہوا کہ اس ذلت کا کوئی مداوا ہونا چاہیے اپنے نبی سے جن کا نام شمویل تھا بادشاہ مقرر کرنے کی درخواست کی۔ حضرت شمویل نے ان کو یہ جواب دیا کہ کیا تم سے اس کی توقع ہے کہ اگر تم کو جہاد و قتال کا حکم ہو جائے تو تم لڑو۔ یعنی تمہاری حالت سے مجھے توقع نہیں کہ اگر تم پر جہاد و قتال فرض ہو جائے تو تم بادشاہ کے ساتھ ہو کر جہاد و قتال کرو۔ بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمیں کیا ہوا کہ خدا کی راہ میں جہاد و قتال نہ کریں اور حالانکہ جہاد کے لیے اس وقت ایک خاص داعیہ اور سبب بھی موجود ہے وہ یہ کہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے جدا کر دیے گئے۔ غرض یہ کہ اس طرح لوگوں نے جہاد پر اپنی پختگی اور آمادگی کو ظاہر کیا پس جب ان کے اصرار اور اظہار آمادگی کے بعد ان پر جہاد و قتال فرض کیا گیا تو سوائے چند آدمیوں کے سب پھر گئے اور وہ چند آدمی وہ تھے کہ جو نہر سے پار اترے جن کا بیان عنقریب آئے گا اور اللہ تعالیٰ ظالموں اور حکم سے روگردانی کرنے والوں کو خوب جانتا ہے ظلم اور معصیت آدمی کو بزدل بنا دیتی ہے۔ اور ظلم و ستم کی اصل جڑ نبی پر اعتراض کرنا ہے جس نے نبی کی بات کو بے چون و چرا قبول کیا اس نے اپنی جان پر رحم کیا اور جس نے نبی کی بات پر اعتراض کیا اس نے اپنی جان پر ظلم عظیم کیا۔ چنانچہ جس وقت ان کے نبی نے ان کے جواب میں یہ کہا کہ (اول) تو یہ ہے کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے یعنی تمہاری عزت اور سرداری کے حصول کے لیے طالوت بادشاہ مقرر کیا ہے سنتے ہی نبی پر اعتراضات شروع کر دیے اور یہ کہا کہ طالوت کو ہم پر حکومت اور سلطنت کا کیا حق حاصل ہے طالوت ایک فقیر آدمی ہے قوم کا سقا یا

۱؎ یہ ترجمہ لفظ ملأ کا ہے اس لیے کہ ملأ لغت میں اشراف اور سرداروں کی جماعت کو کہتے ہیں جو اپنی عظمت اور ہیبت سے مجلس کو بھر دے۔ ۲؎ جمہور کا قول یہی ہے کہ ان کا نام شمویل تھا بعض کہتے ہیں کہ وہ بنی شمعون تھے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ان کا نام یوشع بن نون تھا اور یہ صحیح نہیں اس لیے کہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے قریب زمانہ کا ہے اور یوشع بن نون حضرت موسیٰ کے کچھ عرصہ بعد وفات پا گئے تھے۔

بلکہ غریب ہے۔ شاہی خاندان سے نہیں، اور ہم سلطنت کے اُس سے زیادہ مستحق ہیں، کیونکہ ہم شاہی خاندان سے ہیں اس لیے کہ ہم یہودا کی اولاد میں سے ہیں جن میں بادشاہت چلی آرہی ہے اور علاوہ ازیں طالوت کو مال و دولت کی فراخی اور فراوانی بھی حاصل نہیں اور ہم دولت مند اور اصحاب ثروت ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کو کہ جس کو خاندانی وجاہت حاصل ہو نہ مالی عزت حاصل ہو بادشاہ بنانا کسی طرح مناسب نہیں اللہ کے نبی نے ان کے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ تمہارے یہ اعتراض سب مہمل اور باطل ہیں۔ تحقیق اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تم پر تمہارے نفع اور فائدہ کے لیے چن لیا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جس کو سلطنت کے لیے پسند فرمائیں گے اُس سے بڑھ کر کوئی شخص سلطنت اور حکمرانی کا اہل نہیں ہو سکتا اور خصوصاً جب کہ ارادہ خداوندی تمہارے نفع اور خیر کا ہے جیسا کہ لفظ علیکم سے صاف ظاہر ہے تو ایسی صورت میں تو کسی شر اور فساد کا احتمال ہی نہیں رہتا۔ معلوم ہوا کہ طالوت کی سلطنت تمہارے لیے سراپا خیر و برکت ہوگی اور دینی اور دنیوی ہر اعتبار سے تمہارے لیے باعث عزت ہوگی۔

حق جل شانہ جب کسی قوم کی تباہی اور بربادی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس پر ظالموں اور جفا کاروں کو حاکم بنا دیتے ہیں اور جب کسی قوم کی فلاح اور بہبودی کا ارادہ فرماتے ہیں تو پاکیزہ اور پسندیدہ حکمران اُن کے لیے مقرر فرماتے ہیں۔ غرض یہ کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خیر اور نفع اور مصلحت کے لیے پسند کیا ہے اور تم اپنی مصلحتوں کو کما حقہ نہیں سمجھ سکتے اس لیے اس انتخاب خداوندی میں تم کو تردد اور وسوسہ نہ کرنا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ سلطنت اور بادشاہت کا اصل دار و مدار عقل سلیم اور جسم سلیم پر ہے حسب و نسب اور مال و دولت پر نہیں جس شخص کے قوائے عقلیہ اور آئینہ قوائے جسمانیہ صحیح اور تندرست ہوں وہی بادشاہ بنائے جانے کا مستحق ہے اور یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطا کی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو علم و فہم اور عقل و دانش میں وسعت اور زیادتی عطا کی ہے اور قوت جسمانیہ اور بدنیہ میں بھی اس کو زیادتی عطا فرمائی ہے اور بادشاہ ہونے کے لیے انہی دو صفتوں کی ضرورت ہے علم اور فہم سے ملکی انتظام پر قدرت ہوگی اور بدنی قوت اور جسامت شجاعت اور بہادری کی علامت ہے اور ظاہر ہے کہ جب فہم و فراست کے ساتھ شجاعت بھی مل جائے گی تو کارہائے سلطنت نہایت خیر و خوبی کے ساتھ چلیں گے۔ اس لیے کہ سلطنت چلانے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ بادشاہ کی عظمت اور ہیبت لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو۔ اگر لوگوں میں بادشاہ کی عظمت اور ہیبت نہ ہو تو لوگ اطاعت اور فرمانبرداری نہ کریں گے اور کارخانۂ سلطنت نہ چلے گا اور حقیقی عظمت و ہیبت کا مدار فہم و فراست اور قوت و شجاعت پر ہے اور یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے طالوت کو عطا کی ہیں طالوت علم اور فہم میں بھی سب سے بڑھے ہوئے تھے۔ اور قوت جسمانیہ کا یہ حال تھا کہ طالوت تمام بنی اسرائیل میں سب سے زیادہ خوبصورت اور قد آور اور بہادر تھے اور اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰىهُ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالوت مُنْتَخَبٌ مِّنَ اللّٰہِ

گیا تھے یعنی صاحب اہل امر میں تھے اس لیے قرآن کریم میں جس کسی کو شانِ اصطفاء سے ممتاز کیا ہے وہ خواہ صاحبِ نبوت
اور صاحبِ کشف و کرامت ہو یہ ایک حقیقی تعلیم کا لفظ ہے جو تمام اصناف کی جامع ہے علم ظاہری اور علم باطنی اور علم شریعت اور
علم سلطنت اور علم سیاست سب کو شامل ہے یہ تمام ایسی صفات ہیں جس سے دین اور دنیا دونوں کی بہتری ہوتی ہو وہ جب
ہو سکتی ہے کہ جب بادشاہ اوصاف مذکورہ کا حامل ہو۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ یعنی اللہ تعالیٰ مالک الملک ہیں اس کی عطاء
اور بخشش کے لیے کسی حیثیت اور قابلیت کی شرط نہیں بلکہ حیثیت اور قابلیت کے لیے اس کی
عطاء شرط ہے کسی کی کیا مجال ہے جو اس خداوند ذوالجلال سے سوال کر سکے وہ مالک مطلق ہیں، جس کو چاہتے
ہیں بادشاہی عطا کرتے ہیں اور اگر وہ شخص بادشاہت کی ذرہ برابر لیاقت بھی نہ رکھتا ہو تو اس کو
سلطنت کی لیاقت اور قابلیت عطا فرما دیتے ہیں اور غیب سے اس کی مدد فرماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ
بڑی وسعت اور کشائش والے ہیں اس کے خزانوں کی کوئی حد اور نہایت نہیں جس کسی فقیر کو امیر بنا دینا
کیا مشکل ہے اور سب کچھ جاننے والے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ کون بادشاہت کے لائق ہے
اور کون اس کے لائق نہیں حق تعالیٰ نے اس آیت میں طالوت کی بادشاہی کے چار سبب بیان کیے
اول اس کی خداداد صلاحیت جس کو اصطفاء سے تعبیر کیا دوم وسعت علم جس پر حکمرانی و تدبیر ملک کا دارومدار
ہے سوم توانائی جسم جو شجاعت اور ہیبت اور قدرت علی الانتقام کا موجب ہے چہارم تائید غیبی
جس کو وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَاۗءُ اور اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖ الخ سے ظاہر فرمایا۔

چونکہ بنی اسرائیل کے سرداروں نے طالوت کے بادشاہ بنانے کو بہت بعید سمجھا اس لیے ان
کے رد میں قدرے تفصیل فرمائی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ کہ بادشاہت کا اصلی اور حقیقی سبب اللہ تعالیٰ کی عطاء اور بخشش اور اس کا اصطفاء اور
برگزیدگی ہے خدا تعالیٰ نے جس کو بادشاہت کے لیے پسند فرمالے وہی بادشاہ ہے اور خدا تعالیٰ
جس کو پسند فرمالے وہ کبھی نامستحق نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اور اگر تمہاری نظر ظاہری اسباب پر ہے تو سمجھ لو کہ سلطنت کا مدار حسب و نسب اور مال و
دولت پر نہیں اس لیے کہ مال آنے جانے والی چیز ہے صبح آتا ہے اور شام جاتا ہے۔ بلکہ سلطنت کا اصلی
سبب یہ ہے کہ علم اور فہم ہو اور اس کے ساتھ قوت و تدبیر ہو تاکہ اس قوت جسمانی سے علم اور فہم کے
مراد حاصل کرنے کی قدرت حاصل ہو سکے ورنہ علم بغیر قدرت اور قوت کے بیکار ہے خصوصاً بادشاہ
سلطنت محض علم سے بدون قدرت کے نہیں چلتا۔ اور تیسرے یہ کہ قلب و رائے کے درستی کے حکم کے
بعد کسی کو مجال دم زدنی نہیں۔ وہ تمام سلطنتوں کو تم سے زیادہ جانتا ہے اور وہ ارحم الراحمین ہے وہ
تم پر تم سے زیادہ مہربان ہے۔ پس اب تم کو طالوت کی بادشاہت میں کوئی حجت نکالنا روا اور
زیبا نہیں۔ مگر یہ ظالم کب خاموش ہونے والے تھے اللہ کے نبی سے نشان طلبی کے اعتراض کا جواب نہ

عہ۔ جس لفظ کلام کی گزشتہ آیت اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔

رخصت ہے۔ اب آئندہ آیت میں اس امتحان کی تفصیل ہے، پس جو شخص اس نہر سے سیر ہو کر پانی پی
لےگا اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں یعنی میرے گروہ سے نہیں ہوگا اور جس شخص نے اس کا مزہ بھی
نہ چکھا یعنی پینا تو در کنار منہ سے بھی نہ لگایا تو وہ بلاشبہ میرے سے وابستہ ہے اور میرے خاص رفقاء اور
ساتھیوں میں سے ہے مگر وہ شخص جو اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے سو وہ میرے گروہ سے خارج نہ ہوگا
عزیمت اور اصل حکم تو یہی تھا کہ پانی کو بالکل نہ چکھتا بمقدار ایک چلو کے رخصت ہے یعنی جس نے
سیر ہو کر تو پانی نہیں پیا اور صرف جان بچانے کے لیے ہی برائے نام پی لیا تو وہ بھی فی الجملہ مقبول ہے
اور رخصت ہے پس جب اس نہر پر پہنچے تو سب نے پیٹ بھر کر اس نہر سے منہ لگا کر پانی پی لیا مگر تھوڑے سے
آدمیوں نے جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی انہوں نے عزیمت اور رخصت پر عمل کیا اور اجازت سے
تجاوز نہ کیا۔ جن لوگوں نے چلو سے پانی پیا ان کی پیاس بجھ گئی اور ان کا دل قوی ہو گیا اور جن لوگوں
نے زیادہ پیا وہ بزدل اور دل مردہ ہو گئے اور نہ ان کی پیاس بجھی اور نہ وہ اس قابل رہے کہ نہر سے
پار ہو سکیں پس جب طالوت اور ان کے رفقاء مومنین نہر سے پار ہو گئے اور دیکھا کہ ہم ایک مٹھی
بھر جماعت ہیں اور جالوت کا لشکر ایک لاکھ سے بھی متجاوز ہے اس لیے بعض ضعیف القلب یہ کہنے
لگے کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ دشمن کی طاقت بہت ہے
اور ہم بہت تھوڑے ہیں البتہ ان میں کے جو لوگ اولوالعزم اور اہل ہمت تھے اور یہ یقین رکھتے تھے
کہ ایک دن خدا سے ملنا ہے اور اس کو منہ دکھانا ہے اور خدا تعالیٰ نے جو فتح اور نصرت کا وعدہ
کیا ہے وہ بالکل حق ہے۔ ان لوگوں نے کمزوروں کو ہمت دلائی اور یہ کہا کہ گھبراؤ نہیں فتح و نصرت کا
دارومدار قلت و کثرت پر نہیں بسا اوقات ایسا ہوا ہے کہ بہت تھوڑی اور چھوٹی سی جماعت بڑی
سے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے غالب آئی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے [اور خدا
تو جس کے ساتھ ہو وہ کبھی مغلوب نہیں ہو سکتا۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں کے مقابلے کے
لیے میدان میں نکلے تو اپنی ہمت اور شجاعت پر نظر نہیں کی بلکہ خداوند ذوالجلال کی طرف متوجہ ہوئے
اور یہ دعا مانگنی شروع کی اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر کو پانی کی طرح بہا دے کہ سر سے پیر
تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی برودت اور ٹھنڈک ہمارے ظاہر اور باطن میں سرایت کر جائے
اور کافروں کے مقابلے میں ہم کو ثابت قدم رکھ اور کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما اور ہم
کو فتح دے، پس اس صبر اور تحمل اور اللہ پر اعتماد اور توکل کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تھوڑے سے آدمیوں
نے جالوت کی فوجوں اور لشکروں کو اللہ کی تائید سے شکست دی اور داؤد علیہ السلام نے جو

لہ اشارہ اس طرف ہے کہ اَفْرِغْ عَلَيْنَا میں استعارہ ہے۔ افراغ اصل میں پانی بہا دینے کو کہتے ہیں
اور کلمہ علیٰ علینا میں استعلاء کے لیے ہے یعنی وہ صبر ہماری کمزوری پر غالب آجائے۔

اس وقت مع اپنے والد اور چھ بھائیوں کے طالوت کے لشکر میں تھے اور ابھی تک ان کو نبوت نہیں ملی تھی جالوت کو قتل کر ڈالا۔ داؤد علیہ السلام اپنے سب بھائیوں میں چھوٹے تھے جب میدان کارزار سامنے آیا تو جالوت نہایت کروفر کے ساتھ زرہ اور خود پہن کر میدان میں آیا اور بنی اسرائیل سے مبارزت اور مقابلہ طلب کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام بغیر زرہ اور بغیر ہتھیار کے صرف تین پتھر لے کر اس کے مقابلہ کو نکلے۔ جب سامنے گئے تو ان پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر جالوت کی پیشانی پر مارا وہ پتھر جالوت کی کھوپڑی کی جانب سے نکل گئے۔ اور جالوت منہ کے بل زمین پر گر پڑا فوراً اس کی تلوار نکال کر اس کا سر قلم کیا۔

کہا جاتا ہے کہ راستہ میں داؤد علیہ السلام کو ایک پتھر نے آواز دی۔

یا داؤد خذنی فبی تقتل جالوت۔ — اے داؤد مجھ کو اٹھا لو میرے ذریعہ سے تم جالوت کو مارو گے۔

پھر اسی طرح ایک اور پتھر نے آواز دی۔ اور پھر ایک اور پتھر نے آواز دی داؤد علیہ السلام نے تینوں پتھروں کو اپنے تھیلے میں ڈال لیا اور روانہ ہوگئے۔ جب جالوت گھوڑے پر سوار ہو کر اور زرہ اور تلوار لگا کر میدان میں نکلا تو داؤد علیہ السلام فقط یہ تین پتھر لے کر آگے بڑھے اور یہ کہا اگر اللہ تعالیٰ مدد کرے تو گھوڑا اور ہتھیار کس لیے کار ہے۔ جالوت نے داؤد علیہ السلام سے کہا کہ تم تو فقط پتھر لے کر میرے سامنے آئے ہو جیسے کوئی کتے کے مارنے کے لیے نکلتا ہے۔ فرمایا تو کتے سے بھی بدتر ہے اور اللہ کا نام لے کر وہ تینوں پتھر جالوت کے مارے جو ماتھے میں لگے اور کھوپڑی کے پیچھے سے نکل گئے۔ (تفسیر قرطبی ص ۲۵۷ ج ۳)

طالوت نے اس خوشی میں اپنی بیٹی حضرت داؤد علیہ السلام کے نکاح میں دے دی اور پھر اللہ تعالیٰ نے طالوت کے مرنے کے بعد داؤد علیہ السلام کو سلطنت عطا کی اور طالوت کے مرنے کے بعد تمام بنی اسرائیل پر داؤد علیہ السلام بادشاہ مقرر ہوئے۔ داؤد علیہ السلام سے پہلے بنی اسرائیل کسی کی بادشاہت پر اتنے مجتمع نہیں ہوئے جتنا کہ داؤد علیہ السلام کی بادشاہت پر ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو سلطنت اور بادشاہت کے ساتھ علم اور حکمت یعنی نبوت بھی عطا کی اور داؤد علیہ السلام سے پہلے کبھی کسی آدمی میں سلطنت اور نبوت جمع نہیں ہوئی۔ سلطنت شاہی خاندان میں رہتی تھی اور نبوت نبی کے خاندان میں رہتی تھی اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو جو امور چاہے سکھلائے جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا سکھایا اور لوہے کو مثل موم کے ان کے لیے نرم کر دیا کہ اپنے ہاتھ سے کام کرتے اور اس کی مزدوری سے کھاتے اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بولی اور زبان سکھائی اور خوش آوازی عطا کی۔

ف | نبی اگرچہ نبی ہونے سے پہلے نبی نہیں ہوتا مگر ولی ضرور ہوتا ہے اور دنیا کی لذتیں

حق ہیں۔ جیسا کہ کتاب اللہ اور سنت متواترہ اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ محض تین چھڑیوں سے جالوت کو مارنا یہ داؤد علیہ السلام کی کرامت تھی اور آئندہ نبوت کا ارہاص یعنی پیش خیمہ تھی اور حضرت داؤد کی یہ کرامت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معجزہ کا نمونہ تھی جو حضور سے جنگ حنین میں ظاہر ہوا کہ ایک مشت خاک سے ہوازن سراسیمہ ہوگئے (تفسیر قرطبی ص ۲۵۸ ج ۳)

اور اسی معجزہ مستقل کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک عظیم الشان سلطنت عطا کی جو داؤد کی سلطنت کا نمونہ تھی۔

بیان حکمت مشروعیت جہاد

اب اس واقعہ جہاد کے ذکر کے بعد جہاد کی عام حکمت اور مصلحت کو بیان فرماتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں یعنی کافروں کے شر اور فساد کو اپنے بعض بندوں یعنی اہل ایمان کے ذریعہ دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتے اور کفر اور شرک غالب آجاتے اور مسجدیں ویران ہو جاتیں اور کوئی خدا کا نام لینے والا باقی نہ رہتا لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں تمام جہان والوں پر۔ اسی لیے اس نے تم پر جہاد فرض کیا تاکہ کفر کا فتنہ و فساد دفع ہو اس لیے کہ کفر اور شرک سے بڑھ کر کوئی فتنہ و فساد نہیں جہاد سے اس فساد کا دفع کرنا اور اسی طرح فتنہ کا ازالہ مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ اگر مسلمانوں کو کافروں سے جہاد کا حکم نہ دیتے تو بڑا فساد پھیل جاتا جہاد اس فساد کی اصلاح اور انسداد کے لیے مقرر ہوا ہے۔
اس لیے جہاد کو اللہ کا بڑا فضل سمجھو۔

اثبات رسالت محمدیہ

یہ واقعات جن کا ذکر کیا اللہ کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک ٹھیک ان کے ساتھ پڑھ کر ہم آپ کو سناتے ہیں جن میں ذرہ برابر شک نہیں۔ یہ واقعات جس طرح ہم نے بیان کیے اسی طرح حق اور صدق ہیں اہل کتاب جس طرح بیان کرتے ہیں وہ قابل اعتبار نہیں۔ اور یہ تمام واقعات اللہ کی قدرت اور پھر آپ کی نبوت کے دلائل ہیں کیونکہ پچھلے قدیم زمانے کے واقعات کو بغیر کسی سے پڑھے اور بغیر کسی سے سنے ٹھیک ٹھیک بیان کرنا بغیر وحی خداوندی کے ممکن نہیں۔ اور بے شک آپ البتہ رسولوں میں سے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اپنے دشمنوں سے جہاد کا حکم دیا اور بدر جیسے معرکہ میں آپ کے کافروں کے بڑے بڑے لشکروں کو ان کے غلام اور فقراء کے ہاتھ سے تہ و بالا کر دیا۔ جہاد انبیاء کی سنت ہے اور وہ لوگ نادان ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد و قتال نبیوں کا کام نہیں جہاد ہمیشہ سے ہے مگر جہاد تو حضرت عیسیٰ نے ترک کر دیا۔

الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات۔ والصلوٰۃ والسلام
علیٰ سید الموجودات وخلاصۃ الکائنات وعلیٰ آلہ
واصحابہ وازواجہ الطاھرات المطہرات

۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۳ھ بعد صلاۃ المغرب ـــ جامعہ اشرفیہ ـــ لاہور

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں ایک کو ایک سے کوئی ہے کہ

مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا

کلام کیا اس سے اللہ نے اور بلند کیے بعضوں کے درجے اور دی ہم نے

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ

عیسیٰ مریم کے بیٹے کو نشانیاں صریح اور زور دیا اس کو روح پاک سے۔

وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ

اور اگر چاہتا اللہ نہ لڑتے ان کے پچھلے بعد اس کے کہ پہنچے

بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ

ان کو صاف حکم لیکن وہ پھٹ گئے پھر کوئی

مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ

ان میں یقین لایا اور کوئی منکر ہوا۔ اور اگر چاہتا اللہ نہ لڑتے

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝

لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے

ذکر فضائل رسل و بیان حال امم

قال تعالیٰ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۔ الیٰ ... وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ۔

ربط: گذشتہ آیت وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں انبیاء و مرسلین کا اور ان کی امتوں کے معاملات کا ذکر فرمایا اور گذشتہ قصوں سے ان کے جہاد اور قتال کے واقعے اور ان کی بے مثال اور خارق عادت فتح و نصرت اور تائید غیبی کا ذکر کیا۔ اسی طرح اب آئندہ آیات میں رسل کے فضائل و درجات اور ان کے کمالات اور معجزات کے ساتھ ان کی امتوں کے احوال اور انبیاء و رسل کے بعد ان کا اختلاف

کو بیان فرماتے ہیں کہ باوجود آیات بینات اور دلائل واضحات کے دیکھ لینے کے پھر بھی ایمان نہ
لائے اور حق سے اختلاف کیا اور انبیاء و رسل کی مخالفت کی اور حق کی دعوت اور تبلیغ میں مزاحم
ہوئے اور اس لیے حق تعالیٰ نے ان کا شر اور فساد دفع کرنے کے لیے حضرات مرسلین کو جہاد کا حکم
دیا تاکہ اہل باطل کی طرف سے حضرات انبیاء کی مخالفت جہاد و قتال کی مشروعیت کا سبب بنی حضرات انبیاء
اور ان کے اصحاب نے دین حق اور ہدایت کی بقاء اور حفاظت کے لیے اور حق اور پرہیزگاروں اور
خدا کے پرستاروں کے تحفظ کے لیے جہاد کیا تاکہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب اور اس کی نازل فرمودہ ہدی
یعنی ہدایت اور اس کی ہدایت پر چلنے والے متقی اور پرہیزگار دنیا میں گروہ اور جتھے کفار و نابکار کی
مزاحمت سے محفوظ اور مامون ہو جاویں اور کفر کی یہ مجال نہ رہے کہ وہ دین حق کی طرف نظر اٹھاسکے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ گزشتہ آیات میں کافروں سے جہاد و قتال کا ذکر تھا اب اس آیت میں کافروں
سے جہاد و قتال کا سبب بیان کیا گیا ہے وہ یہ کہ انبیاء کرام کی مخالفت اور ان کی بے چون و چرا اطاعت
سے سرتابی اور گردن کشی کی وجہ سے کافروں کی سرکوبی اور گردن کشی کا حکم نازل ہوا اس تقریر سے
انشاء اللہ تعالیٰ ان آیات کا سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیات (ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى
لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ) کے ساتھ بھی ربط ظاہر ہو جائے گا۔
جو مزید غور و فکر کا بھی محتاج نہیں۔ اور آئندہ آیات یعنی يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ
میں چونکہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہے جس میں جہاد میں مالی امداد کرنا بھی داخل ہے اس لیے ان
آئندہ آیات کو بھی جس طرح گزشتہ آیات جہاد و قتال سے ربط ہے اسی طرح ان آیات کو سورۂ بقرہ
کی ابتدائی آیات وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے بھی ربط ہے۔

اور يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ سے دور تک صدقات اور
راہ خداوندی میں خرچ کرنے کی ترغیبات کا سلسلہ چلا گیا ہے اور اس کے بعد حق تعالیٰ نے ربا
(سود) کے احکام ذکر فرمائے چونکہ سود صدقہ اور خیرات کی ضد ہے اس لیے صدقات اور خیرات کے بعد
سود کے احکام بیان فرمائے اور سود کی کاروبار کرنے کو خدا اور اس کے رسول سے اعلان جنگ قرار دیا۔
اس لیے عجب نہیں کہ سودخواری کا انجام دلوں پر مہر لگ جانا ہو کہ جس سے حق اور باطل اور حلال
اور حرام کا فرق اس کو نظر نہ آئے پس جس طرح آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ
سورۂ بقرہ کی اس ابتدائی آیت یعنی وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ سے مرتبط ہے اسی طرح عجب نہیں کہ
اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا الخ کی آیتوں کو خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ
وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ کے ساتھ کوئی خاص ربط ہو اور تجربہ اور مشاہدہ بھی اس کا شاہد ہے اس لیے
دیکھا گیا ہے کہ سودخواروں کو کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی اور ان کی حالت سَوَاۗءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ کا نمونہ ہوتی ہے۔ ع جز بعقد صحیح دیدہ ہر شخصے

نیز اول پارہ میں زیادہ تر یہود ہی کی بیہودگی اور شناعتوں کا بیان تھا۔ قرآن کریم میں ہے کہ
یہود کے ملعون اور مغضوب ہونے کے اسباب میں سے ایک سبب ان کی سود خواری بھی ہے کما قال تعالیٰ
وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ۔ اور حرام مال خوری کو قسی قلب، سنگ دلی اور بے رحمی
بنا دیتا ہے اور قساوت قلب سے بڑھ کر دین و دنیا کو تباہ کرنے والی کوئی چیز نہیں اس لیے حق تعالیٰ
نے اس امت کو سود سے نہایت سختی کے ساتھ منع فرمایا کہ مبادا یہود کی طرح قسی القلب اور سنگدل
نہ ہو جائیں اور اس اعتبار سے آیات ربا کو ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً سے بھی کمال مناسبت ہے۔ الحمد للہ کہ ان آیات کا ربط گذشتہ
آیات سے بھی ظاہر ہو گیا اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی آیتوں سے بھی مرتبط ہونا معلوم ہو گیا۔

ربط دیگر

گذشتہ آیت (وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) میں حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا بیان تھا کہ آپ اللہ کے بلاشبہ رسول ہیں مگر معاندین باوجود دلائل نبوت اور
شواہد رسالت کے مشاہدہ کے آپ کی رسالت کو نہیں مانتے۔ ان آیات میں آپ کی تسلی کا مضمون مذکور ہے کہ
آپ ان معاندین کی تکذیب سے رنجیدہ نہ ہوں، پہلے بھی بہت سے پیغمبروں کو قسم قسم کے دلائل نبوت
اور شواہد رسالت دیئے گئے مگر پھر بھی سب ایمان نہیں لائے۔ آپ کا انکار کوئی نئی بات نہیں اور کوئی قابل
تعجب امر نہیں۔ کوئی پیغمبر ایسا نہیں گزرا کہ سب ہی ایمان لے آئے ہوں۔ لہٰذا آپ معاندین کی تکذیب
اور کفر سے رنجیدہ نہ ہوں۔ یہ آپ کی رسالت کا قصور نہیں۔ یہ تقدیر خداوندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی
مشیت بھی اسی طرح ہے کہ کوئی ایمان لائے اور کوئی کفر کرے ؂

در کارخانۂ عشق از کفر ناگزیر است   دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

باقی رہا یہ امر کہ اس میں حکمت اور مصلحت کیا ہے سو وہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ یہ قضا و قدر کا سربستہ
راز ہے جو آج تک کسی پر منکشف نہیں ہوا۔ وہ مالک مطلق ہے جس کو چاہے ہدایت دے اور
جس کو چاہے گمراہ کرے۔ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ

کز راز حسد آں کہ او ہم تو   گفتا بہ زبان جز بہ تسلیم تو
تدبیر ناقص کردنت با قرار تو   بیگانگی علت از کار تو

یہ سوال کرنا کہ آپ نے کسی کو مومن اور کسی کو کافر کیوں بنایا؟ یہ ایسا ہی سوال ہے کہ اس کو بینا اور
اس کو نابینا کیوں بنایا جس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ اسی کا کام ہے۔

اب ان آیات میں خبر دیتے ہیں کہ ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی تاکہ خدا کی قدرت
کا کرشمہ اور ہر رسول کی شان جداگانہ ایک نیا رنگ دنیا کو نظر آئے۔ ؏

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

یہ پیغمبروں کی جماعت جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا تِلْكَ الرُّسُلُ میں ذکر کیا جن میں آپ بھی داخل ہیں اگرچہ وصف نبوت و رسالت میں سب مشترک ہیں لیکن ہم نے علاوہ نبوت و رسالت بعض کو بعض پر ایک خاص فضیلت دی ہے یعنی ہر رسول کو کسی خاص خصوصیت اور خاص فضیلت کے ساتھ مخصوص کیا ہے جو دوسرے میں نہ پائی جائے تاکہ ہر ایک کا فضل و کمال الگ الگ نظر آئے کما قال تعالیٰ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا اور جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں آسمانوں پر انبیاء کرام کو درجہ بدرجہ دیکھا مطلب یہ ہے کہ انبیاء کرام اگرچہ نفس نبوت کی حیثیت سے برابر ہیں مگر طبقات اور مراتب کے اعتبار سے مختلف ہیں اور ان کے درجات جدا جدا ہیں۔ فضائل و کمالات میں تمام انبیاء برابر نہیں چنانچہ بعض ان میں سے ایسے ہیں جن سے اللہ نے بلا واسطہ فرشتہ کے کلام فرمایا جیسے موسیٰ علیہ السلام اور ابتداء میں حضرت آدم علیہ السلام سے بلا واسطہ فرشتوں کے کلام فرمایا جیسا کہ یٰآدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ میں گزرا اور اخیر میں خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے شب معراج میں بلا واسطہ کلام فرمایا اور بعضوں کو اپنی ہم کلامی کا شرف تو نہیں عطا کیا لیکن ان کو دوسرا شرف عطا کیا اور طرح طرح سے ان کے درجے بلند کیے جیسے داؤد علیہ السلام کو نبوت و رسالت کے ساتھ بے مثال بادشاہت بھی عطا کی۔

فائدہ: بعض علماء کا قول ہے کہ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ میں بعض سے حضرت ابراہیم علیہ السلام مراد ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنا خلیل بنایا اور مقام خلت سے ان کو سرفراز فرمایا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ادریس علیہ السلام مراد ہیں کما قال تعالیٰ وَرَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا اور ابن عباسؓ اور شعبیؒ اور مجاہدؒ سے منقول ہے کہ بعضھم سے سرور عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر یک درجہ نہیں بلکہ تمام درجات اور فضائل و کمالات میں بلند اور برتر کیا۔ (۱) آپ کو تمام انبیاء کا امام اور خطیب اور سردار بنایا (۲) اور تمام امتوں کا شفاعت کرنے والا (۳) اور تمام نبیوں کا خاتم اور آخر بنایا (۴) اور آپ کو سب سے افضل اور اکمل کتاب عطا کی (۵) اور آپ کی شریعت کو سب شریعتوں سے زیادہ جامع بنایا (۶) اور تمام انبیاء سے بڑھ کر آپ کو معجزات عطا کیے (۷) اور آپ کو تمام عالم جن اور انس کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا (۸) اور آپ کے پیرو تمام انبیاء کے پیروؤں سے زیادہ ہوں گے (۹) اور سب سے پہلے آپ اپنی امت کو لے کر پل صراط سے گزریں گے (۱۰) اور سب سے پہلے آپ اپنی امت کو لے کر جنت میں داخل ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔

اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو ان کی نبوت و رسالت کی صریح اور واضح نشانیاں عطا کیں تاکہ ان کی نبوت و رسالت میں کسی کو شبہ نہ رہے اور روح القدس یعنی جبریل امین کو ان کی تائید اور تقویت کے لیے

لے یعنی تِلْكَ الرُّسُلُ کا اشارہ بتانیث جماعت رسل کی طرف ہے۔

مقرر کیا کہ ہر وقت ہمراہ رہے اُن کی حفاظت کریں تاکہ مُردوں کے زندہ کرنے اور مادر زاد نابینا اور کوڑھیوں کے تندرست کرنے سے کسی کو اُن کی الوہیت (خدائی) کا شبہ نہ ہو اس لئے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا ہوتے تو اوّل تو دشمنوں سے کیوں ڈرتے؟ دوم یہ کہ اُن کو جبرئیل امینؑ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہوتی معاذ اللہ کیا خدا بھی کسی کی حفاظت کا محتاج ہوتا ہے؟ چونکہ یہود حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت کے قائل نہ تھے اور نصاریٰ اُن کی الوہیت کے قائل تھے اس لئے پہلے جملہ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ میں یہود کے رد کے لئے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت و رسالت کو بیان کیا اور دوسرے جملہ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ میں اُن کی الوہیت کا رد کیا جس کے نصاریٰ قائل تھے اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو سب کو ایک دین حق پر متفق کر دیتا اور پھر لوگ پیغمبروں کے بعد دین میں اختلاف نہ کرتے اور نہ آپس میں لڑتے خصوصاً دلائل واضحہ کے بعد تو اختلاف کا نام و نشان بھی نہ ہوتا اس لئے کہ دلائل واضحہ کا اقتضاء یہ تھا کہ سب حق پر متفق ہو جاتے۔ لیکن باوجود دلائل واضحہ کے پھر حق کے قبول کرنے میں اختلاف کیا سو بعضے ان میں سے ایمان لائے اور بعضوں نے کفر اختیار کیا اور نوبت قتل و قتال اور جنگ و جدال تک پہنچی اور اگر اللہ چاہتا تو باوجود ایمان اور کفر کے اختلاف کے پھر بھی یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے ایک دوسرے سے تعرض نہ کریں لیکن اللہ کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ یہ دنیا حق اور باطل کا میدان کارزار بنی رہے وہ حکیم مطلق عالم مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ کوئی اس پر اعتراض کر سکے کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا!۔

اس تمام کلام سے مقصود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ انبیاء سابقین کی طرح آپ کی نبوت و رسالت بھی دلائل اور براہین اور آیات بینات سے ثابت ہے اور جس طرح بہت سے لوگ انبیاء سابقین پر باوجود آیات بینات ایمان نہیں لائے اسی طرح اگر بہت سے لوگ آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق نہ کریں تو تعجب نہ کیجئے ایمان عام کسی امت میں نہیں ہوا کسی نے تصدیق کی اور کسی نے تکذیب اور اس میں اللہ کی حکمتیں ہیں جن کا علم سوائے اس کے کسی کو نہیں۔ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا (تفسیر غرائب البیان نیسابوری ص ۳۲۰)

فائدہ : شروع آیت میں وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ الخ اور پھر آخر آیت میں وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا فرمایا مفسرین کی ایک جماعت کے نزدیک یہ آیت تاکید کے لئے مکرر لائی گئی ہے اور شیخ الاسلام ابو السعود فرماتے ہیں کہ یہ تکرار تاکید کے لئے نہیں بلکہ

ف والمعنی علی ما فی النیسابوری تلک الرسل - الخ ، وایدناہ بروح القدس ... قد رفعنا ... فلم تنفعهم ما ذکرنا وذلک بعد مشاهدة المعجزات بانت رسولهم فلم تغن عنهم ... ولو شاء الله لم يختلف الامم ... ولكن ما قضاه الله فهو كائن وما قدره فهو واقع . تفسیر نیسابوری ص ۲۰

اس تعبیر کے لیے اس آیت کو مکرر لایا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ لوگوں کا اختلاف، مذہبی ہو یا قتل و قتال سب اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہے کوئی شئ علیحدہ اس کی مشیت کے نہیں ہو سکتی۔

ف ۱۴ اور جس حدیث میں یہ آیا ہے کہ پیغمبروں کے درمیان تفضیل اور مفاضلہ کرو اس سے مراد اس تفضیل کی ممانعت ہے جو محض عصبیت اور قومی حمیت کی بنا پر ہو یا ایسی تفضیل کی ممانعت مراد ہے جو دوسرے نبی کی تنقیص و تحقیر کا سبب بنے اس طرح بحمد اللہ تعالیٰ آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہ رہے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ

اے ایمان والو خرچ کرو کچھ ہمارا دیا پہلے اس دن

يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ

کے آنے سے کہ جس میں نہ بکنا ہے اور نہ آشنائی ہے اور نہ سفارش،

وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اور جو منکر ہیں وہی ہیں گنہگار۔

ترغیبات و ترہیبات دربارۂ صدقات و نفقات

قال تعالیٰ۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا ... الیٰ ... هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔

ربط: اس رکوع سے پیشتر حق تعالیٰ نے دو حکم دیئے تھے ایک جہاد[1] اور دوسرا خدا تعالیٰ کو قرض[2] دینے کا۔ پہلے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے طالوت اور جالوت کا قصہ ذکر فرمایا۔ اب دوسرے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیبات اور ترہیبات کو بیان فرماتے ہیں۔ یہ بیان دور تک چلا گیا ہے۔

نیز گزشتہ آیت فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ میں مکلفین کو دو قسموں پر منقسم فرمایا۔ مومن اور کافر۔ اب اس آیت میں اہل ایمان کو اپنے خطاب سے عزت دی اور ان کو

[1] وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ [2] مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۔

اہل ایمان کے لقب سے مخاطب فرمایا اے ایمان والو! کہ رزق میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے .
کچھ ہماری راہ میں بھی خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آ جائے جس میں نہ تو سودے کے تبادل کی کوئی سبیل نہیں
یعنی مرنے سے پہلے اس لیے کہ نہ مست میں تو کوئی خرید فروخت ہے اور نہ کوئی دوستی کارآمد ہے .
اور نہ کوئی سفارش کارگر ہے اور کافر ہی ظالم ہیں کہ جان اور مال سب بے موقع صرف کر رہے ہیں
پس اے ایمان والو! تم ان کافروں کی طرح اپنی جانوں اور مالوں پر ظلم نہ کرنا.

اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُۥ سِنَةٌ
الله: اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں جیتا ہے سب کا تھامنے والا نہیں پکڑتی اس کو
وَلَا نَوْمٌ ۚ لَّهُۥ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ مَن
اونگھ اور نہ نیند اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون
ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُۥٓ إِلَّا بِإِذْنِهِۦ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
ایسا ہے کہ سفارش کرے اس کے پاس مگر اس کی اجازت سے جانتا ہے جو خلق
أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ
کے روبرو ہے اور پیچھے اور وہ نہیں گھیر سکتے اس کے علم میں
عِلْمِهِۦٓ إِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ
سے کچھ مگر جو وہ چاہے گنجائش ہے اس کی کرسی میں آسمان اور
الْأَرْضَ ۖ وَلَا يَـُٔودُهُۥ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾
زمین کو اور تھکتا نہیں ان کے تھامنے سے اور وہی ہے اوپر سب سے بڑا.

اثبات توحید ذات و کمال صفات

(آیت الکرسی)

قال تعالیٰ . اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ .... الیٰ .... وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ

گزشتہ رکوع کی آیت وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں اثبات رسالت کا ذکر تھا اور اس آیت میں اثبات توحید کا بیان ہے نیز وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ میں حق تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کا ذکر تھا۔ وہاں اس کا بیان تھا کہ قیامت کے دن کوئی سفارش اور کوئی دوستی کام نہ آئے گی جس سے خدا تعالیٰ کی کبریائی اور عظمت ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کسی کو مجال دم زدن نہیں۔ اس لئے اس آیت میں حق تعالیٰ کی توحید ذات اور کمال صفات بیان فرماتے ہیں۔ نیز گزشتہ آیت کی وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ میں کافروں کو ظالم بتلایا تھا۔ اب اس آیت میں ان کے ظلم کی وجہ بیان فرماتے ہیں کہ کافر اور مشرک اس لئے ظالم ہیں کہ حق تعالیٰ کے ساتھ شریک گردانتے ہیں۔ اور صحیح عقیدۂ توحید کو بیان فرماتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم کافروں کی طرح شرک کر کے ظالم نہ بنو بلکہ عقیدۂ توحید کو حرز جان بناؤ۔ چنانچہ فرماتے ہیں اللہ وہ ذات ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں صرف وہی عبادت کا مستحق ہے استحقاق عبادت میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں اس لئے کہ صرف خدا تعالیٰ اپنی ذات سے خود بخود زندہ اور موجود ہے، اس کی حیات اور بقاء ذاتی اور ابدی ہے، اس کی حیات کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ انتہاء اور اس کے سوا ہر چیز اپنی ذات سے مردہ اور معدوم ہے۔ وہاں کی حیات مستعار کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی۔ اس لئے کوئی شے بھی ذات سے قائم نہیں خدا تعالیٰ ہی ہر شے کا تھامنے والا ہے۔ ہر شے اپنی حیات اور بقاء اور وجود میں اس کی محتاج ہے جیسے سایہ اپنی اصل کا محتاج ہوتا ہے مخلوقات اپنے وجود اور بقاء میں اس سے کہیں زیادہ محتاج ہیں۔ مخلوقات کی حیات اور وجود اسی واجب الوجود کی حیات کا ایک ادنیٰ سا عکس اور پرتو ہے۔

کل ما فی الکون وھم او خیال   او عکوس فی المرایا او ظلال

غرض یہ کہ حق تعالیٰ تمام عالم کا تھامنے والا اور اس کی تدبیر کرنے والا ہے ایک لمحہ بھی تدبیر سے غافل نہیں اس لئے کہ اس کو نہ اونگھ اور نہ نیند نہیں پکڑتی۔ اس لئے کہ نیند ایک قسم کا تغیر ہے جو وجوب کے منافی ہے۔ اور حیات کو ضعیف اور کمزور بنا دیتا ہے پس جس کو اونگھ اور نیند آئے گی اس کی حیات بھی ناقص اور کمزور ہوگی اور وہ دوسروں کی تدبیر بھی نہ کرسکے گا کیونکہ نیند موت کی بہن ہے لہٰذا نیند کی وجہ سے اس کی حیات بھی ناقص ٹھہرے گی اور اس کی شان قیومیت میں بھی قصور اور نقصان لازم آئے گا اور چونکہ وہی سب کے وجود اور حیات کا تھامنے والا ہے اس لئے ثابت ہوا کہ آسمان اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی کی ملک ہے اور بندے ہیں۔ سب پر ہمیشہ اسی کی حکومت اور بادشاہی ہے اس لئے کہ اصل مالک وہ ہے جو وجود اور حیات کا مالک ہو اور اس کی عظمت اور جلال اور شان کبریائی کا یہ عالم ہے کہ اس کی بارگاہ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش بھی کر سکے۔ چہ جائیکہ کوئی اس کے حکم کو ہٹا سکے یا ٹلا سکے۔ یہ تو اس کی عظمت اور جلال کا بیان ہوا اور اس کے

علم کی یہ شان ہے کہ وہی تمام مخلوقات کے تمام اگلے اور پچھلے احوال کو خوب جانتا ہے تمام عقلاء عالم مل کر بھی معلومات خداوندی میں سے کسی ایک معمولی چیز کے علم اور ادراک کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جتنی مقدار وہ خود ان کو علم دینا چاہے۔ فقط اتنی مقدار علم اس چیز کو جان لیتے ہیں اصل کنہ اور حقیقت کا علم اور اس کا علمی احاطہ وہ حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

غرض یہ کہ خداوند ذوالجلال کا علم ذاتی اور تام ہے اور مخلوق کے تمام احوال کو محیط ہے جو اس کی وحدانیت اور قیومیت اور کمال عظمت پر دال ہے اور بندوں کا علم نہایت قلیل اور ناتمام بلکہ برائے نام ہے بندہ بدون اس کی تعلیم کے ایک ذرہ کو بھی نہیں جان سکتا اور ایک ذرہ کے بھی تمام احوال اور کیفیات اور جہات اور حیثیات کا احاطہ نہیں کر سکتا اگر ایک حال کو جان لیتا ہے تو سو حال سے جاہل اور بے خبر رہتا ہے اور اس علم ناتمام کے ساتھ اس بارگاہ میں شفاعت کرنا جس کا علم ذاتی اور تام ہو اور تمام اشیاء کی حقیقت اور کنہ اور تمام احوال کو محیط ہو بغیر اس کی اجازت کے ممکن نہیں اس لیے کہ شفاعت وہاں ہوتی ہے جہاں شفاعت کرنے والا بادشاہ کو ایسی چیز سے آگاہ کرے جس کی بادشاہ کو خبر نہ ہو یا اس کو مجرم کی معذرت کی خبر نہ ہو اور بارگاہ خداوندی میں یہ ناممکن ہے کہ اس کو کسی شے کا علم نہ ہو اور اس کی مالکیت تمام کائنات کو محیط ہے اس لیے کہ اس کی کرسی جو اس کے عرش سے کم ہے وہ بھی تمام آسمانوں اور زمینوں کو محیط ہے اور اپنے اندر سمائے ہوئے ہے جس طرح چاہے زمین اور آسمان میں تصرف کرتا ہے کسی کی مجال کیا ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے کوئی سفارش کا کلمہ زبان سے نکال سکے شافع اور مشفوع لہ سب اسی کی ملک ہیں اور اسی کی قدرت و قیومیت کا یہ عالم ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی حفاظت اور نگہبانی اس پر ذرہ برابر بھی شاق اور گراں نہیں اور کیسے اس پر گراں ہو سکتی ہے وہ بڑا عالی شان اور بلند مرتبہ ہے۔ ذات اور صفات میں کوئی بھی کسی طرح اس کے برابر نہیں وہ اتنا بلند مرتبہ ہے کہ اس کی شان کے مطابق کوئی حمد و ثنا بھی نہیں کر سکتا بڑی عظمت والا ہے کہ ہر چیز اس کے سامنے حقیر اور ہیچ ہے۔

وہ اپنے افعال میں کسی کا محتاج نہیں عظمت و جلال کی وجہ سے سب سے مستغنی اور بے نیاز ہے پس جس ذات پاک کی یہ صفات ہوں کیا اس کا انکار کرنا یا اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ظلم عظیم نہ ہوگا کما قال تعالیٰ فی الآیۃ الاولیٰ وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۔

فوائد و لطائف

اس آیت کو آیت الکرسی کہتے ہیں جس میں حق تعالیٰ شانہ کی توحید ذاتی اور صفاتی کا ذکر ہے توریت اور انجیل اور کتب سابقہ کے دیکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی کمال ذات اور

کمال صفات کے متعلق جیسا اس آیت میں ذکر ہے اس کا نظیر بھی کسی کتاب میں مذکور نہیں۔

اس آیت میں سب سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی توحید ذاتی کو بیان فرمایا۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ بعد ازاں ان صفات کو بیان فرمایا۔

(۱) اَلْحَیُّ

کمالات وجودیہ میں سب سے پہلا حیات ہے۔ حی لغت میں اس زندہ شے کو کہتے ہیں جو واقف ہو دیکھتا اور سنتا اور قادر ہو یہی صفت حیات تمام صفات کمال کا مبدء ہے۔

(۲) اَلْقَیُّوْمُ

یعنی کائنات کو قائم اور باقی رکھنے والا۔ حی سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا اور قیوم سے خدا کا موجب الوجود ہونا بیان کیا یعنی بذاتہ اور بنفسہ وہ واجب الوجود ہے اور دوسروں کو وجود اور حیات دینے اور عطا کرنے والا ہے ممکن میں جو وجود بھی ہے وہ اسی واجب الوجود کا دیا ہوا عطیہ ہے صفت حیات کو ذکر کر کے کمال وجود کو بیان فرمایا۔ اور صفت قیومیت کو ذکر کر کے کمال ایجاد کو بیان فرمایا۔

(۳) لَا تَاْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

اس کو نہ اونگھ پکڑتی ہے اور نہ نیند اس سے حق تعالیٰ کا تغیرات اور حوادث اور نقائص سے پاک اور بری ہونا بیان فرمایا۔ یہ جملہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کی تکمیل ہے کیونکہ اونگھ اور نیند سے حیات میں نقصان آتا ہے اس لئے کہ نیند موت کی بہن ہے اور خدا تعالیٰ موت کے شائبہ سے بھی پاک اور منزہ ہے۔ علاوہ ازیں جس کی حیات ناقص ہوگی اس کی قیومیت یعنی حفاظت اور نگرانی بھی ناقص اور کمزور ہوگی لہٰذا لَا تَاْخُذُہٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایسا قیوم اور مدبر ہے کہ ایک لحظہ بھی تدبیر سے غافل نہیں ہو سکتا وہ اپنی قیومیت میں سہو اور نسیان اور غفلت اور سستی سے پاک اور منزہ ہے۔

(۴) لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اس جملہ سے صفت مالکیت کو ثابت کرنا ہے کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس لئے کہ مالک حقیقی وہی ہے جو وجود عطا کرے پس جس نے آسمانوں اور زمینوں کو وجود عطا کیا اور ان کے وجود کو قائم رکھنے والا اور تھامنے والا ہے وہی ان کا مالک حقیقی ہے۔

(۵) مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

اس جملہ سے اس کی حاکمیت اور جلال اور کبریائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کی بارگاہ عالی میں کسی کی مجال نہیں کہ بغیر اس کی اجازت کے لب کشائی کر سکے۔

(۶) يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ

اس جملہ میں اس کے علم محیط کو بیان فرمایا کہ اس کا علم مخلوقات کے تمام احوال کو محیط ہے۔

(۷) وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ

اس جملہ میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جس طرح مخلوقات کا وجود عطیۂ خداوندی ہے اسی طرح مخلوقات کا علم بھی عطیۂ خداوندی ہے۔ بندے فقط اتنی مقدار جان سکتے ہیں جتنا وہ چاہے۔ بندوں کا علم اس کی مشیت کے تابع ہے۔ بندوں کا علم نہایت ہی قلیل اور محدود ہے۔ اور ان کا جہل بالفعل غیر محدود اور غیر متناہی ہے۔

(۸) وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اس جملہ میں یہ بتلایا کہ حق تعالیٰ کی حاکمیت اور مالکیت آسمانوں اور زمینوں سے بھی متجاوز ہے۔ بلکہ بندوں کے وہم و خیال سے بھی۔

فائدہ (۱) احادیث شریفہ اور اقوال صحابہ و تابعین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرسی ایک جسم ہے جو آسمانوں اور زمینوں سے بڑا ہے اور عرش سے چھوٹا۔ حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ ساتوں آسمان کرسی کے اندر ایسے ہیں جیسے کسی ڈھال میں سات درہم ڈال دیئے جائیں۔ کرسی کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی ہے جیسے عرش اللہ اور بیت اللہ کی نسبت ہے بظاہر وہ کوئی خاص قسم کی تجلی ہے اور جس طرح تجلیات کی انواع اور اقسام میں ہر شے کی تجلی علیحدہ ہے اسی طرح عجب نہیں کہ کرسی اور عرش کی تجلیات علیحدہ علیحدہ ہوں اور ایک دوسرے سے ممتاز ہوں۔ جمہور سلف کے نزدیک آیت میں کرسی سے ظاہری اور متبادر معنی مراد ہیں۔ اور بعض علماء ادھر گئے ہیں کہ کرسی اس کی عظمت اور سلطنت کی تصویر اور محض ایک مثال ہے ورنہ درحقیقت نہ کوئی کرسی ہے اور نہ وہاں کوئی بیٹھنے والا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ لفظ سے حقیقی ہی معنی مراد لیے جائیں قرآن کریم میں بسا اوقات مجازی اور کنائی معنی مراد لیے گئے ہیں۔

(۹) وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا

اور اللہ تعالیٰ کو آسمان اور زمین کی حفاظت ذرہ برابر گراں نہیں۔ اس جملہ سے یہ بتلانا ہے کہ اس کی

صفت قدرت اور قیومیت ضعف اور نقصان سے پاک اور منزہ ہے۔

(۱۰) وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ۔

اس جملہ میں اللہ کی صفت علو اور عظمت کو بیان فرمایا۔

ف ۱۲۸ مستدرک حاکم میں ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

سُورَةُ الْبَقَرَةِ فِيهَا آيَةٌ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ لَا تُقْرَأُ فِي بَيْتٍ فِيهِ شَيْطَانٌ إِلَّا خَرَجَ مِنْهُ (آيَةُ الْكُرْسِيِّ)	سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو تمام آیات قرآنی کی سردار ہے وہ آیت الکرسی ہے جب گھر میں وہ پڑھی جاتی ہے شیطان اس سے نکل جاتا ہے۔

صحیح مسلم وغیرہ میں ابی بن کعبؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے ان سے دریافت فرمایا کہ اے ابو المنذر قرآن میں سب سے اعظم یعنی سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ میں نے کہا اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنتے ہی میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا اے ابو المنذر علم تمہیں مبارک ہو۔[1]

اور اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ سے منقول ہے کہ تمام آیتوں کی سردار اور سب سے بڑی آیت، آیت الکرسی ہے۔ (در منثور ص ۳۲۳ ج ۱)

اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اسم اعظم اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب مُردوں کے زندہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ پڑھ کر دعا فرماتے اور آصف بن برخیا نے جب بلقیس کے تخت کو لانے کا ارادہ کیا تو یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ پڑھ کر دعا مانگی (تفسیر قرطبی ص ۲۷۱ ج ۳)

ف ۱۲۹ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ آیت الکرسی سورۂ بقرہ کا قلب ہے اور الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ بمنزلہ روح اور جان کے ہے اور باقی آیات بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں اس سورت کے تمام مطالب اس آیت کے گرد گھومتے ہیں۔ جس طرح اعضاء اور جوارح جان کے شئون اور مظاہر ہوتے ہیں اسی طرح اس سورت کی تمام آیتیں اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ کے شئون اور مظاہر ہیں۔ سورۂ بقرہ کے کل چالیس رکوع ہیں۔ کوئی ایسا نہیں کہ جس میں حیات اور قیومیت اور

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں لیھنک العلم یا ابا المنذر۔

ہمیشہ کی زندگی کا مضمون مذکور ہو گیا کہ یہ تمام سورت لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ہی کی شرح اور بسط اور حیات دو قومیت ہی کی توضیح اور تشریح ہے۔ ابتداء سورت میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ سے قرآن کریم کا آب حیات ہونا بیان فرمایا اور یہ بتلایا کہ ایمان اور تقویٰ سے حیات ابدی حاصل ہوتی ہے اور کفر و نفاق سے دائمی ہلاکت۔ پھر تیسرے رکوع میں فرمایا انسان کی فرداً فرداً حیات کا ذکر فرمایا وَ خَلَقَكُمْ ۔ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ اور زمین و آسمان کی پیدائش اور دنیا کی نعمتوں کی پیدائش کا ذکر فرمایا جو دنیوی حیات کا مدار ہیں اور پھر اپنی عبادت کا حکم دیا جو انسان کی حیات روحانی اور قیام بدنی کا ذریعہ ہے۔ بعد ازاں ابوالبشر کی حیات اور منصب خلافت اور ملائکہ پر ان کی فضیلت کا ذکر فرمایا وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِيْفَةً بعد ازاں پانچویں رکوع سے ایک خاص خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا یعنی بنی اسرائیل کی حیات اور ان پر اپنے ظاہری اور باطنی انعامات کا بیان شروع کیا جو تقریباً اخیر پارے تک چلا گیا جس میں ان کو جہانوں پر فضیلت دینا اور من و سلویٰ کا ان کے لیے نازل کرنا۔ اور ان کی ہدایت کے لیے توریت کا عطا کرنا اور اس خاندان میں بکثرت پیغمبروں کو ہدایت کے لیے مبعوث کرنا بیان فرمایا۔ پھر پندرھویں رکوع تک جب اس خاندان کی حیات کا قصہ تمام ہوا تو پندرھویں رکوع سے ایک دوسرے خاندان کی حیات کا ذکر شروع فرمایا یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام کا کہ ان کی آبادی اور وطن کہ یہ خانہ کعبہ کی تعمیر ہوئی یہ جگہ تھی، تا آنکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی جگہ اور یہ قبلہ آخری قبلہ ہے۔ دوسرے رکوع تک یہ سلسلہ کلام چلا گیا جب ان دونوں خاندانوں کی حیات اور تاریخ سے فارغ ہوئے تو پھر اس کے بعد چند احکام حیات کو ذکر فرمایا جو بظاہر حیات کے خلاف معلوم ہوتے ہیں من جملہ ان کے شہادت فی سبیل اللہ اور مصیبت پر صبر کرنا اور قصاص کو جاری کرنا اور وصیت کو بغیر تغیر و تبدل کے جاری کرنا اور روح کو زندہ رکھنے کے لیے روزہ رکھنا اور دین کی بقاء کے لیے جہاد کرنا اور شعائر ملت کو زندہ اور قائم رکھنے کے لیے حج اور عمرہ کرنا اور مال اور آبرو کی حیات قائم رکھنے کے لیے شراب اور جوئے سے پرہیز کرنا اور حقوق نکاح اور نسب کے محفوظ اور قائم رکھنے کے لیے نکاح اور طلاق اور عدت اور حالت حیض میں مباشرت اور رضاعت وغیرہ کی حدود کی پوری پوری رعایت رکھنا تاکہ خانگی اور معاشرتی حیات قائم رہے اور اس کا شیرازہ منتشر نہ ہو۔

پھر جب ان احکام حیات کے بیان سے فراغت ہوئی تو اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۔ سے چند عجیب و غریب قصے بیان فرمائے جن میں علاوہ حی و قیوم کی قدرت سے بلا اسباب ظاہری حیات غیبیہ کا عطا ہونا بیان فرمایا، تاکہ خوب واضح ہو جائے کہ اس کے سوا کوئی حی و قیوم نہیں، جو بھی زندہ اور قائم ہے وہ اسی کی دی ہوئی حیات سے قائم ہے حق تعالیٰ نے دو قصے اس آیت الکرسی (حی و قیوم) سے پہلے ذکر فرمائے اور تین قصے اسی مدعا کے اثبات کے لیے آیت الکرسی کے بعد ذکر فرمائے۔

پہلا قصہ حیات بنی اسرائیل کی اس جماعت کا ذکر فرمایا کہ جو وبا سے ڈر کر بھاگے وہ پھر ایک نبی کی دعا سے زندہ ہوگئے۔

دوسرا قصہ طالوت اور جالوت، اور تابوت سکینہ کا ذکر فرمایا جس سے ان خاندان کی گم شدہ حیات پھر واپس آئی۔

اس کے بعد آیت الکرسی کو ذکر فرمایا جس میں حق جل شانہ کی حیات اور قیومیت اور الوہیت اور عظمت اور ہیبت اور قدرت کا اور علم محیط کا ذکر فرمایا۔ اور یہ بتلا دیا کہ معبود اور مسجود ہمارا صرف ہے خدا کو وحدہٗ لاشریک لہٗ جانے۔ حق واضح ہے جس کا جی چاہے قبول کرے کسی پر زبردستی نہیں۔

اس کے بعد پھر ایسی حیات اور قیومیت کے اثبات کے لئے تین قصے ذکر فرمائے جن سے حیات اخروی کا ثبوت معلوم ہوا اور یہ واضح ہوگیا کہ وہ حی و قیوم مردوں کے زندہ کرنے پر قادر ہے تاکہ لوگ قیامت کے بارے میں شک نہ کریں۔ پھر اس کے بعد صدقات اور خیرات کے احکام بیان فرمائے جو انسان کی ترقی، اور دنیوی زندگی کے قیام کا سبب ہیں اور سود سے ممانعت فرمائی کہ وہ انسان کی ترقی اور دنیوی حیات کی تباہی اور بربادی کا سبب ہے۔ پھر اس سورت کو لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الٰی آخر الآیات سے ایمانیات اور اعتقادیات اور دعا اور استغفار کے مضمون پر ختم فرمایا۔ کیونکہ یہ ایمان اور توبہ اور استغفار ہی سے مردہ دلوں کو حیات جاودانی حاصل ہوتی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ تمام سورت حق تعالیٰ کے اسم حی و قیوم کی شرح اور تفصیل ہے اور آیت الکرسی اس سورت کے لئے بمنزلہ دل کے ہے اور یہ اسم حی و قیوم بمنزلہ جان کے ہے اور باقی آیتیں بمنزلہ اعضاء اور جوارح کے ہیں۔ واللہ اعلم۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ

زور نہیں دین کی بات میں کھل چکی ہے صلاحیت اور بے راہی

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ

اب جو کوئی منکر ہو مفسد سے اور یقین لاوے اللہ پر اس نے

اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَ

پکڑی حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا نہیں اور

اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ

اللہ سنتا ہے جانتا ہے ۔ اللہ کام بنانے والا ہے ایمان والوں کا نکالتا ہے ان کو

مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۣ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔهُمُ

اندھیروں سے اجالے میں اور جو منکر ہیں ان کے رفیق

الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ

ہیں شیطان نکالتے ہیں ان کو اجالے سے اندھیروں میں۔

اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

وہ ہیں دوزخ والے، وہ اسی میں رہ پڑے۔

حق اور باطل نور اور ظلمت کا فرق واضح ہے
کسی پر کوئی زبردستی نہیں جو چاہے اختیار کرے۔

قال تعالیٰ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

(ربط) گذشتہ آیت تِلْكَ الرُّسُلُ میں اثبات رسالت کا ذکر تھا اور آیت الکرسی میں اثبات توحید کا ذکر تھا اور یہی دو باتیں دین اسلام کا اصل الاصول ہیں جو دلائل واضحہ سے ثابت ہیں جس سے ان کو قبول کرنے کے لیے کوئی عذر و گنجائش باقی نہیں جس کا جی چاہے حق کو قبول کرے دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں۔ تحقیق ہدایت گمراہی سے بالکل جدا اور ممتاز ہو چکی ہے۔ حق کا حسن و جمال اور باطل کا قبح خوب ظاہر اور نمایاں ہو چکا ہے اور زبردستی اس امر پر ہوتی ہے جو ناپسندیدہ ہو اور کرنے والے کا دل اس سے خوش نہ ہو اور اسلام کا حسن و جمال ایسا بے مثال ہے کہ عقل سلیم اس پر عاشق اور فریفتہ ہے البتہ نفس پر اسلام کے احکام شاق اور گراں ہیں نفس تو نجاست خور اور شہوت پرست ہے اس کی گرانی اور تکدر کا اعتبار نہیں جیسے گندہ پانی ہی لذیذ معلوم ہوتا ہے مگر سلیم الطبع کو اس تصور سے بھی تکدر اور انقباض ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں اسلام میں اکراہ اور زبردستی ممکن ہی نہیں اس لیے کہ اسلام کے لیے تصدیق قلبی اور دلی اذعان کا اعتبار ہے اور دل پر کسی کی زبردستی چل نہیں سکتی۔

یا آیت کے یہ معنی ہیں کہ دین کے بارے میں تم کسی پر زبردستی نہ کرو کیونکہ یہ دنیا دار الابتلاء اور دار الامتحان ہے مقصود یہ ہے کہ لوگ اپنے اختیار سے ایمان لائیں۔ اس لیے کہ جزا و سزا کا مدار اختیاری افعال پر ہے۔

اس صورت میں یہ جملہ خبریہ بمعنی انشائیہ کے معنی میں ہوگا یعنی لَآ اِكْرَاهَ کی نفی معنی میں نہی کے ہوگی اور لَآ اِكْرَاهَ کے معنی میں لا تکرہوا کے ہوں گے۔ جیسا کہ آیت کے شان نزول سے معلوم ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ آیت حصین انصاریؓ کے بارے میں نازل ہوئی جن کے دو بیٹے عیسائی تھے، ایک روز حصین انصاریؓ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ پر ان کا نصرانی ہونا بہت گراں ہے اگر حضور اجازت دیں تو میں ان کو اسلام پر مجبور کروں اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی کسی پر اسلام کے لیے داخل ہونے کے لیے جبر درست نہیں کیونکہ ہم نے ہدایت اور ضلالت کا فرق واضح کر دیا ہے، اب لوگوں کو اختیار ہے جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس قسم کی آیات ان آیات کے معارض نہیں جن میں کفار سے جہاد و قتال کا حکم آیا ہے اس لیے کہ جہاد و قتال شر و فساد کے رفع اور دفع کرنے کے لیے ہے، کیونکہ جو لوگ خدا کی زمین میں فساد مچاتے ہیں اور خدا کی نازل فرمودہ ہدایت اور شریعت کے جاری اور نافذ ہونے میں حارج اور مزاحم ہوتے ہیں اور بندگان خدا کو عبادت سے روکتے ہیں اس لیے جہاد کا حکم نازل ہوا، جہاد سے مقصود اعلاء کلمۃ اللہ کے دین متین کی حکومت قائم کرنا ہے جبر سے کسی کو مسلمان بنانا مقصود نہیں۔ کافر اگر اپنے مذہب پر قائم رہنا چاہے تو جزیہ دے کر بھی اپنے مذہب پر رہ سکتا ہے اور چونکہ جہاد دفع فساد کے لیے ہے اس لیے بچوں اور عورتوں اور بوڑھوں اور اندھوں اپاہجوں کے قتل کرنے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اس لیے کہ ان لوگوں سے فتنہ اور فساد کی امید نہیں اور جس طرح موذی جانوروں سانپ اور بچھو کو ایذا رسانی کے بعد قتل کرنا جو نسبت اسی طرح سانپ اور بچھو کو ڈنک مارنے سے پہلے ہی ختم کر دینا عقل و انصاف کا تقاضا ہے اسی طرح اگر مسلمانوں کو کسی کافر حکومت سے کوئی خطرہ ہو تو پہلے ہی سے اس کا خاتمہ کر دینا عین تدبر و مقتضائے سیاست ہے اصطلاح شریعت میں اس کا نام جہاد اقدامی ہے۔

علاوہ ازیں جس طرح انسان ایمان و کفر کے قبول کرنے میں مختار ہے مجبور نہیں، اسی طرح تمام اعمال خیر و شر، بد یا خیر کے کرنے اور نہ کرنے میں بھی مختار ہے مجبور نہیں لیکن اچھے اور برے اعمال پر ان کے مناسب جزا اور سزا کا مرتب ہونا جبر یا اکراہ کو مستلزم نہیں، مثلاً چور کا ہاتھ کاٹا جانا اور زانی محصن کا سنگسار کیا جانا اور خون ناحق کا قصاص لیا جانا یہ تمام جرائم کے افعال اختیاریہ کی سزا ہے جبر اور اکراہ نہیں۔ اس شخص نے اپنے اختیار سے چوری اور زنا کا ارتکاب کیا، اس لیے یہ سزا بھگتنی پڑی ٹھیک اسی طرح جو مسلمان مرتد اور مرتکب ارتداد ہو اس کو قتل کیا گیا تو یہ جبر و اکراہ نہیں بلکہ اس کے فعل اختیاری اور مختارانہ کی

اللّٰهُ الْمُلْكَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ

تھا اس کو اللہ نے سلطنت، جب کہا ابراہیم نے میرا رب وہ ہے جو جلاتا ہے

وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ

اور مارتا ہے، وہ بولا میں بھی جلاتا ہوں اور مارتا ہوں، کہا ابراہیم نے کہ اللہ

اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ

تو لاتا ہے سورج کو مشرق سے پھر تو لے آ اس کو

الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي

مغرب سے، تب حیران رہ گیا وہ کافر، اور اللہ نہیں راہ دکھاتا

الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

بے انصاف لوگوں کو،

ذکر مبدأ و معاد

گذشتہ آیات میں حق تعالیٰ کی ذات و صفات کو بیان فرمایا اس کے بعد تین قصے اس کے مناسب ذکر فرمائے ہیں، اول قصہ توحید باری کے اثبات کے لیے ہے اور دوسرا اور تیسرا قصہ اثبات حشر و نشر یعنی اثبات قیامت کے لیے ہے تاکہ مبدأ اور معاد کی معرفت کامل ہو جائے اور خدائے ذوالجلال کی حیات و قیومیت خوب واضح ہو جائے اور نور ہدایت اور ظلمت ضلالت کا فرق نظر آجائے کہ حق تعالیٰ کس طرح ہدایت دیتے ہیں، اور کس طرح گمراہ کرتا ہے اور جہاد و قتال کی مشروعیت کی وجہ بھی معلوم ہو جائے کہ یہ کفار نا ہنجار خداوند کردگار کی صحیح معرفت کو مٹانا چاہتے تھے اور لوگوں کو خدا تعالیٰ سے باغی بنانا چاہتے ہیں اس لیے ان سے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا اور اگر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکیں تو مال امداد کریں۔

قصۂ اوّل

در بارۂ اثباتِ وجودِ باری عزّ اسمہٗ

قال تعالیٰ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۔

ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کا نمرود بن کنعان سے مناظرہ اور مکالمہ بیان کرتے ہیں۔ نمرود دھری تھا یعنی وجود باری تعالیٰ کا منکر تھا اور اپنے آپ کو ملک کا رب اور خدا اور مالک بتاتا تھا۔ (اے مخاطب) کیا تو نے اس کی حالت کو نہیں دیکھا جس نے خدا کے خلیل ابراہیم سے اپنے پروردگار کے وجود کے بارے میں مباحثہ اور مجادلہ کیا۔ یہ جھگڑنے والا شخص نمرود تھا جس نے سب سے پہلے سر پر تاج رکھا اور بادشاہت کے گھمنڈ میں خدائی کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے نمرود کا خدا کے بارے میں یہ مباحثہ اس وجہ سے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سلطنت اور بادشاہت عطا کی۔ اس نعمت عظمیٰ کے شکر کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ جس خدا نے یہ سلطنت بخشی تھی اس کے وجود کا تو اقرار کرتا مگر اس نے برعکس اس منعم کے وجود ہی کا انکار کر دیا۔ شکر تو درکنار جس وقت کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ خدائے پروردگار پر ایمان لا۔ نمرود نے کہا وہ کون سا خدا ہے جس کی طرف تم مجھ کو بلاتے ہو اس کا وصف بیان کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرا پروردگار جس کی طرف تم کو بلاتا ہوں اس کی شان یہ ہے کہ وہ موت اور حیات کا مالک ہے جس کو چاہتا ہے زندہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے مارتا ہے اور تو زندہ کرنے اور موت دینے سے عاجز ہے۔ لہٰذا تو مستحق ربوبیت کا نہیں ہو سکتا۔ نمرود نے اسی وقت دو آدمیوں کو بلایا اور ایک کو قتل کیا اور ایک کو چھوڑ دیا اور کہا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں یعنی مارنے اور زندہ کرنے سے عاجز نہیں۔ ابراہیم نے دیکھا کہ یہ تو احیاء اور اماتت کے معنی بھی نہیں سمجھتا احیاء اور اماتت کے معنی جسم میں جان ڈالنے اور جان نکالنے کے ہیں اور یہ سوائے خدا کے کسی کی قدرت میں نہیں۔ اس نادان نے لفظ کو دیکھا اور چھوڑ دینے اور حلق پر چھری چلانے اور نہ چلانے کا نام احیاء اور اماتت رکھا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تو احیاء اور اماتت یعنی جسم میں جان ڈالنے اور نکالنے پر قادر نہیں تو احیاء اور اماتت کا مفہوم بھی نہیں سمجھتا اچھا ایک بات اور سن اللہ تعالیٰ آفتاب کو لاتا ہے مشرق سے نکالتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اگر چاہے تو مغرب اور شمال اور جنوب سے بھی نکال سکتا ہے اور ہر فعل اس کی قدرت کے اعتبار سے یکساں ہے پس اگر تجھ کو دعوئ ربوبیت ہے تو آفتاب کو مغرب سے نکال کر دکھا اگر تجھ کو قوت اور قدرت کا اندازہ ہو تو احیاء اور اماتت اور مارنے اور جلانے پر تو کیا قادر ہوتا۔ تیرے عجز اور درماندگی کا یہ عالم ہے کہ تو ایک جسم کی حرکت کے تغیر پر بھی قادر نہیں۔ حرکت وضعیہ کا ایک نہایت معمولی سا فرق ہے پس جو شخص ایک جسم کی حرکت میں تغیر کرنے سے عاجز ہو گا وہ احیاء اور اماتت سے بدرجۂ اولیٰ

عاجز ہو گئی۔ یعنی خدا کا منکر اس روشن اور نورانی دلیل کو سن کر حیران اور مبہوت ہو کر رہ گیا اور کسی قسم کی کوئی تاویل اور تلبیس بھی نہ کر سکا اور ایسا مدہوش ہوا کہ یہ بھی نہ بول سکا۔ مطلب یہ کہ نمرود حضرت ابراہیمؑ کی اس روشن دلیل کو سن کر ہکا بکا رہ گیا اور یہ نہ کہہ سکا کہ اگر تیرا معبود ایسا زبردست ہے تو اس سے کہو کہ وہ آفتاب کو کسی دن بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دے۔ اس لیے کہ اس نے خوب سمجھ لیا کہ اگر ابراہیمؑ اپنے خدا سے یہ دعا مانگیں کہ اے خدا اس آفتاب کو بجائے مشرق کے مغرب سے نکال دیجیے تو یقیناً ایسا ہی ہو جائے گا۔ ابراہیمؑ کا خدا جس طرح آگ کو برد اور سلام بنا سکتا ہے اسی طرح ابراہیمؑ کا خدا سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے بھی نکال سکتا ہے لیکن نمرود بایں ہمہ اس نورانی اور روشن دلیل کے کفر کی ظلمت اور تاریکی سے نہ نکلا اس لیے کہ اپنے عناد پر قائم رہا اور ایمان نہ لایا اور اللہ تعالیٰ بے انصافوں کو گمراہی کی ظلمت سے نکال کر نور ہدایت کی طرف نہیں لے جاتا کہ معاند کتنے ہی معجزات اور نشانات دیکھے وہ ظلمت سے نور ہدایت کی طرف نہیں آتا چنانچہ نمرود کا جو انجام ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ [illegible]

فائدہ بعض علماء کہتے ہیں کہ یہ قصہ ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کے بعد کا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ بتوں کے توڑنے کے بعد کا ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا۔ وہ اپنے تئیں سجدہ کرواتا تھا سلطنت کے غرور سے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کو سجدہ نہ کیا اس نے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنے رب ہی کو سجدہ کرتا ہوں۔ اس نے کہا رب تو میں ہوں۔ انہوں نے کہا میں رب حاکم کو نہیں کہتا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ اس نے دو قیدی بلائے جس کو جرم نہ پہنچا تھا اس کو مار ڈالا اور جس کو مارنا پہنچا تھا اس کو چھوڑ دیا تب انہوں نے آفتاب کی دلیل سے اس کو لاجواب کیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی تقریر سن کر بے اختیار نمرود کے دل میں یہ بات آگئی کہ خدا موجود ہے اور آفتاب کا مشرق سے نکالنا اسی کا فعل ہے اور وہ اگر چاہے تو مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ شخص اس خدا کا پیغمبر ہے اور اس کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا —— اور اگر ایسا ہو گیا تو عالم میں انقلاب برپا ہو جائے گا اور ساری دنیا اس کی طرف پھر جائے گی اور میرے ہاتھ سے سلطنت جاتی رہے گی۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ

یا جیسے وہ شخص کہ گذرا ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی

لہ اس عبارت میں اس آیت کا گذشتہ آیت اللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے۔

عُرُوشِهَا ۚ قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ

چھتوں پر، بولا کیونکر جلاوے گا اس کو اللہ مر گئے

مَوْتِهَا ۖ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ ۖ

پیچھے؟ پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس، پھر اٹھایا۔

قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۖ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۖ

کہا تو کتنی دیر رہا؟ بولا میں رہا ایک دن یا دن سے کچھ کم۔

قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ

کہا نہیں بلکہ تو رہا سو برس اب دیکھ کھانا اپنے

وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۖ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ

اور پینا، سڑ نہیں گیا اور دیکھ اپنے گدھے کو

وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ

اور تجھ کو ہم نمونہ کیا چاہیں لوگوں کے واسطے، اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کس طرح

كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ

ان کو ابھارتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت۔ پھر جب اس پر ظاہر

لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

ہوا، بولا میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

قصۂ دوم

برائے اثبات معاد یعنی برائے اثبات حشر و نشر

قال تعالیٰ: أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

یہ مطلب ہے کہ تم نے اس شخص کی طرف نظر نہیں کی کہ جس کا ایک بستی پر گذر ہوا۔ محمد بن اسحاقؒ سے مروی ہے کہ وہ گذرنے والے حضرت ارمیا نبی تھے، اور حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ وہ عزیرؑ تھے، اور مجاہدؒ سے منقول ہے کہ نمرود کے ساتھ ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گذرنے والا شخص کافر تھا، جس کو بعث میں شک اور تردد تھا، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کافر اس عزت اور کرامت کا مستحق نہیں جس کا آیت میں ذکر ہے اور قریہ سے بیت المقدس مراد ہے جس کو بخت نصر نے ویران و برباد کیا اور بنی اسرائیل کو قتل کیا اور بہت سوں کو قید کرکے لے گیا ان میں حضرت عزیرؑ بھی تھے حضرت عزیرؑ جب قید سے چھوٹ آئے اور اس ویران بستی پر گذر ہوا جس کے تمام آدمی مر چکے تھے اور عمارات بھی سب گری ہوئی پڑی تھیں اور اس وقت وہ بستی ایسی حالت میں تھی کہ وہ اپنی چھتوں پر گری ہوئی پڑی تھی یعنی اس کی چھتیں گر کر پھر ان پر دیواریں گر گئی تھیں اس ویرانی کو دیکھ کر بطور حسرت و تعجب یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو مرے پیچھے کس طرح زندہ کرے گا۔ مقصود اس کہنے سے بستی کے دوبارہ زندہ اور آباد ہونے کی طلب اور تمنا تھی مگر چونکہ عادۃً ایسا ہونا بعید تھا اس لیے یہ خیال گذرا کہ کیا میری یہ دعا قبول ہوگی۔ معاذ اللہ خدا کی قدرت میں کوئی شبہ اور تردد نہ تھا بعث کا یقین کامل تھا، لیکن تمنا یہ تھی کہ کاش میں بھی اس کا نمونہ دیکھ لوں، حق تعالیٰ نے اسی جگہ ان کی روح قبض کرکے ان کو سو برس تک مردہ رکھا درمیان عرصہ میں بخت نصر بھی مر گیا اور بنی اسرائیل کو اس کے ظلم و ستم سے رہائی ہوئی اور شہر بیت المقدس از سر نو آباد ہو گیا۔ اس کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو زندہ کیا، چنانچہ فرماتے ہیں: اور پھر سو برس کے بعد ان کو دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا تاکہ واضح ہو جائے کہ جو خدا سو برس کے مردہ کو زندہ کر سکتا ہے وہ سو ہزار برس کے مردہ کو بھی زندہ کر سکتا ہے اس کی قدرت کے لیے کوئی خاص مدت شرط نہیں جس وقت اٹھے سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے خود یا بذریعہ فرشتہ کے پوچھا کہ کتنی دیر ٹھہرا؟ اور اس حالت میں کتنی مدت تک رہا بولے کہ میں اس حالت میں ایک دن رہا یا ایک دن سے کچھ کم اگر چاشت کا وقت آیا تھا تو ایک دن ہوا اور اگر ظہر ہی آیا تھا تو ایک دن سے بھی کم ہوا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا بلکہ تو اس حالت میں سو سال ٹھہرے رہے یعنی تو حقیقۃً سو برس مرے رہے۔ سو سال کی موت کے بعد ہم نے تم کو اپنی قدرت سے زندہ کیا ہے یہ طویل مدت خواب نہیں تھی کہ تم خواب سے بیدار نہیں ہوئے بلکہ موت سے دوبارہ زندہ ہوئے ہو پس اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ باوجود اتنی طویل مدت گذرنے کے میرے جسم میں کوئی تغیر نہیں ہوا تو اپنے کھانے پینے کی چیز کو دیکھ کہ باوجود اتنی طویل مدت گذرنے کے اس میں ذرہ برابر تغیر نہیں آیا حالانکہ کھانے پینے کی چیزیں بہت جلد تغیر پذیر ہوتی ہیں صبح کا پکا ہوا کھانا شام ہی تک خراب ہو جاتا ہے پس جو خدا کھانے پینے کی چیز کو اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے وہ یقیناً تمہارے جسم کو بھی اتنی مدت تغیر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور اس کے مقابل اپنی سواری کے گدھے کی طرف نظر کر کہ وہ کس طرح گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور اس کی ہڈیاں اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ ہاتھ لگانے کی بھی تاب

نہیں رکھتیں، مگر گدھے کی یہ حالت ایک دن میں نہیں ہو سکتی۔ ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے کے لیے ایک
مدت مدید چاہیئے اور اب ہم عنقریب تمہارے سامنے بلا اس مردہ گدھے کو زندہ کریں گے۔ اور دوبارہ
اس کو گوشت اور پوست عطا کریں گے تاکہ تم اپنی آنکھوں سے مردہ کو زندہ ہوتا ہوا دیکھ لو۔ اور ہم نے تم کو
سو برس کی موت کے بعد اس لیے زندہ کیا تاکہ ہم تم کو تمہارے طعام اور شراب میں اور تمہاری سواری پر علاوہ
تمہاری ذات کے اپنی قدرت کی نشانیاں دکھلائیں اور تمہارے تعجب اور استبعاد ظاہری کو زائل کر دیں فہذا ہو المقصد
منشا تھا) کو دور کریں اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لیے قیامت کی ایک نشانی بنائیں کہ قیامت کے دن بھی
اسی طرح اللہ کی قدرت سے مردے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے اور لوگ جب تم کو دیکھیں تو قیامت
کی ایک مجسم دلیل اور برہان سمجھیں اور یقین کریں کہ قیامت میں بھی مردے اسی طرح جسم کے ساتھ دوبارہ
زندہ کیے جائیں گے اور اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اپنی ذات کے علاوہ احیاء موتیٰ کی کیفیت کا مشاہدہ کرو تو
اس مردہ ہوئے گدھے کی ہڈیوں کی طرف نظر کرو کہ کس طرح ہم ان کو جوڑتے ہیں اور پھر کس طرح ان
پر گوشت چڑھاتے ہیں اور پھر کس طرح ان میں جان ڈالتے ہیں اسی طرح وہ گدھا زندہ ہو کر ان کے روبرو
کھڑا ہو گیا اور گدھوں کی طرح بولنے لگا۔ پس جب مردہ کا زندہ ہونا مشاہدہ سے ظاہر اور واضح ہو گیا تو بے اختیار
جوش مسرت میں یہ بولے کہ یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ مردہ
کے زندہ ہونے کا علم الیقین تو پہلے بھی تھا لیکن اس مشاہدہ اور معاینہ کے بعد عین الیقین کا درجہ حاصل ہو
گیا یعنی جو کچھ پہلے ہی سے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے پس جس چیز کو پہلے سے جانتا تھا اب
اس کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ اور جو چیز پہلے سے یقینی تھی اب وہ مشاہدہ ہو کر عین بن کر سامنے آ گئی حق تعالیٰ
کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنی قدرت کا کرشمہ مجھ کو میری آنکھوں سے دکھلا دیا۔

ف اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیرؑ کو چار نشانیاں دکھلائیں۔ دو ان کی ذات میں اور دو خارجی (۱) سو سال مردہ رکھ کر ان کو دوبارہ زندہ کیا (۲) سو سال تک ان کے جسم کو صحیح سالم محفوظ رکھا۔ حدیث میں ہے۔

ان اللہ حرم علی الارض اجساد الانبیاء ۔	اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء کے بدن کا کھانا حرام کر دیا ہے۔

اور خارجی دو نشانیاں یہ تھیں ایک طعام و شراب کہ سو سال میں تغیر نہ آیا جس طرح
حضرت عزیرؑ کے جسم مبارک میں کوئی تغیر نہ آیا اور دوسرا بالکل برعکس اسی کا مرکب ہڈیوں کا ڈھیر ہو گیا۔ جس کو
دوبارہ زندہ کر کے دکھایا تاکہ کیفیت احیاء موتیٰ کی معلوم ہو جائے۔ تاکہ شراب اور مرکوب دونوں سو
سال کے بعد زندہ ہوئے۔ حضرت عزیرؑ بیان ہے اٹھ کر اسی گدھے پر سوار ہو کر بیت المقدس واپس
ہوئے اور گھر کو آئے دنیا اور اپنے محلہ اور گھر پہنچے تو کسی نے نہ پہچانا اس لیے کہ بچے تو بڈھے ہو چکے
تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام جوان رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی حیات اور جوانی کو محفوظ رکھا۔ پھر

قیامت کے دن احیاء موتی اسی طرح سے ہوگا کہ اجسام کے متفرق اجزاء کو جمع کرکے ان میں ان کی روح ڈال دی جائے گی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ معاد جسمانی ہوگی نہ کہ فقط روحانی۔ اور جو لوگ معاد جسمانی کے منکر ہیں وہ صریح نصوص قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے منکر ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں جیسا کہ امام غزالیؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔

۳ - نیز ان دونوں قصوں سے یہ امر بخوبی ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کبھی کبھی بطور خرق عادت اور بطور معجزہ دنیا میں بھی مردوں کو زندہ فرما دیتے ہیں اور اس کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد آیات سے صراحۃً دنیا میں مردوں کا زندہ کرنا بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کا ایک مرتبہ ہلاک کرکے دوبارہ زندہ کرنا وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَى اللَّهَ جَهْرَةً فَأَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَأَنتُمْ تَنظُرُونَ ۔ ثُمَّ بَعَثْنَاكُم مِّن بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ میں ذکر فرمایا۔

اور حق جل شانہ نے بنی اسرائیل کے ان ہزاروں آدمیوں کا جو موت سے ڈر کر بھاگے تھے مار کر دوبارہ زندہ کرنا أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ میں صراحۃً مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ قرآن کریم میں متعدد جگہ صراحۃً مذکور ہے۔

مرزا قادیانی نے مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور دیکھا کہ مسیح بن مریمؑ کی طرح میں تو مردوں کو زندہ کرکے دکھانے سے عاجز ہوں اس لیے اس نے اپنی فرضی نبوت کے قائم رکھنے کے لیے حضرت عیسیٰؑ اور دیگر انبیاء کرام کے اس قسم کے تمام معجزات کا انکار کردیا اور یہ دعویٰ کیا کہ یہ ناممکن ہے کہ حق تعالیٰ کسی کو ایک دفعہ مار کر دوبارہ دنیا میں بھیجے۔ اگر یہ اصول عام عادت ہوتی تو لوگ قیامت کے منکر نہ ہوتے۔ بیشک اللہ کا یہ عام قانون ہے مگر ناممکن اور محال نہیں۔ حق تعالیٰ بطور اعجاز اور اکرام کبھی کبھی دنیا میں بھی کسی مردہ کو بعض برگزیدہ بندوں کی دعا سے دوبارہ زندہ فرما دیتے ہیں تاکہ خدا کی قدرت اور اس نبی کی نبوت اور قیامت کی حقانیت ثابت ہو جائے۔

ملحد اور بے دین لوگ جو حضرات انبیاءؑ کے معجزات اور خوارق عادات کے منکر ہیں وہ اس قسم کے واقعات میں طرح طرح کی تحریفات کیا کرتے ہیں خوب سمجھ لو۔

۴ - ان چار پرندوں کے نام اگرچہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں مگر ابن عباسؓ اور علماء تابعین سے منقول ہے کہ ان کے نام یہ تھے طاؤس اور کبوتر اور مرغ اور کوا اور بعض نے بجائے کوے کے غرنوق کو ذکر کیا ہے۔

انسان چونکہ عناصر اربعہ سے مرکب ہے اس لیے عجب نہیں کہ اس کے مناسب چار پرند مختلف الطبائع لینے کا حکم دیا گیا ہو تاکہ معلوم ہو جائے کہ قیامت کے دن بھی اسی طرح اجزاء منتشرہ متفرقہ اور متحاربہ کے بعد پھر آپس میں مل جائیں گے اور روح ڈال کر زندہ کر دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ کے قصہ کی جو تفسیر ہم نے ذکر کی ہے کہ چار پرندے لے کر ان کو ذبح کرو اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرو اور چار مختلف پہاڑوں پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو، پھر ان کو آواز دو وہ بحکم خداوندی سب زندہ ہو کر تمہاری آواز پر تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے یہی تفسیر علماء صحابہ اور تابعین سے منقول ہے۔ ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؒ اور عکرمہؒ اور ابو مالکؒ اور ابو الاسود دؤلی اور وہب بن منبہؒ اور حسن بصریؒ اور سدیؒ وغیرہم سے منقول ہے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۳۱۵ ج ۱) اور یہی معنی مجاہدؒ اور ابو عبیدہؒ اور ابن الانباریؒ اور زجاجؒ سے منقول ہے (تفسیر قرطبی ص ۳۰۱ ج ۳) امام فخرالدین رازیؒ اس تفسیر کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ اسی تفسیر پر تمام مفسرین کا اجماع ہے اور یہی ظاہر قرآن کا مدلول ہے۔ صرف ایک ابو مسلم اصفہانی سے منقول ہے کہ وہ اس قصہ کا منکر تھا اور یہ کہتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قصہ کوئی حقیقت اور واقعہ نہیں بلکہ محض تشبیہ اور تمثیل ہے اور مراد یہ ہے کہ جیسے چار پرندے لے کر پال لو اور ان کو اپنے سے مانوس کر لو اور ان کو اپنے سے ایسا ہلا لو کہ اگر وہ پہاڑ پر بھی بیٹھے ہوں اور تم ان کو آواز دو تو وہ فوراً تمہاری آواز پر دوڑتے چلے آئیں۔ اسی طرح اے ابراہیمؑ تم لوگوں کو اپنے سے اتنا مانوس بنا دو کہ جب تم ان کو حق کی طرف بلاؤ تو سب دوڑتے چلے آئیں۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول مفسرین کی اجماعی تفسیر کے خلاف ہے اس لئے کہ اس پر سب کا اجماع ہے کہ وہ پرندے ذبح کیے گئے اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے لہٰذا ذبح اور قطع کا انکار کرنا اجماع سے انکار کرنا ہے۔ علاوہ ازیں اگر آیت کا یہ مطلب ہو جو ابو مسلم نے بیان کیا ہے تو پھر احیاء موتیٰ کا کیا معجزہ ظاہر ہوا۔ پرندوں کو مانوس کر کے اپنے سے ہلا لینا یہ کام تو وہ لوگ بھی بآسانی کر سکتے ہیں جو مرغ اور کبوتر پالتے ہیں اس میں ابراہیم خلیل اللہ کی کیا خصوصیت ہوئی اور حضرت ابراہیمؑ کی کیا فضیلت ظاہر ہوئی جو پرندوں کو پال لینا اور ان کو بلا لینا اس کا نام احیاء موتیٰ کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی کی درخواست کی تھی کہ یہ امر دکھا دیا جائے کہ مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں ابو مسلم کے قول پر یہ درخواست منظور نہیں ہوئی حالانکہ ظاہر آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا اور درخواست قبول ہوئی اور ابو مسلم کے قول پر دعا کا اجابت کو پہنچنا نہیں پایا جاتا۔ نیز اس آیت میں ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا کا جو لفظ آیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان پرندوں کے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے۔ پرندوں کا پال لینا مراد نہیں۔ (تفسیر کبیر ص ۴۱ ج ۲، تفسیر بیضاوی ص ۳۰ ج ۲)

علامہ آلوسیؒ ابو مسلم کے اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ولا یخفی ان ھذا خلاف اجماع	اہل علم پر پوشیدہ نہیں کہ ابو مسلم کا یہ
المسلمین وضرب من الھذیان	قول اجماع مسلمین کے خلاف ہے اور
لا یرکن الیہ ارباب الدین	ایک قسم کا ہذیان اور بکواس ہے جس کی
وعدول عما یقتضیہ ظاھر الآیۃ	طرف اہل دین کبھی مائل نہ ہوں گے۔ نیز

المروية بالأسانيد الصحيحة والآثار المرجحة الى ما تقدم لا يسع ان يدعى اليه داع فالحق اتباع الجماعة زاد الله تعالى سعيهم
(روح المعانی صفحہ ۳۲ ج ۳)

اس معنی پر آیت کے ظاہری مدلول سے بے وجہ عدول اور انحراف کرنا ہے۔ روایات صحیحہ اور آثار کثیرہ اسی ظاہری معنی کے مؤید ہیں۔ لہٰذا ایسے ظاہر اور صریح کو چھوڑ کر ایسے معنی کی طرف مائل ہونا جس کے لفظ سے کوئی ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ہوتا ہے کوئی وجہ نہیں کہ کسی رہنما اور کسی داعی کے اس معنی کی طرف رجوع کیا جائے۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ جماعت مفسرین نے آیت کے جو معنی بیان کیے ہیں اسی کا اتباع کیا جائے اللہ تعالیٰ اس جماعت کی سعی کو مشکور فرمائے۔

حکایت بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس قصہ کو آیت وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ پر ختم فرمایا۔ اشارہ اس طرف تھا کہ اے ابراہیم تم نے ہم سے رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى کی درخواست کی ہم نے اس کو منظور کیا۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ ہم تم سے یہ کہیں گے کہ رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُمِيْتُ الْاَحْيَاءَ اے ابراہیم اپنے بیٹے کو ذبح کر کے دکھلاؤ کہ ابراہیم زندہ کو کس طرح موت دیتا ہے یعنی فرزند دلبند کو کس طرح میرے لیے قربان کرتا ہے۔
(روح المعانی صفحہ ۳۸ ج ۳)

رجوع باحکام صدقات

ابتداء پارہ میں اہل ایمان کو حکم ہوا تھا کہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور موت اور قیامت کے آنے سے پیشتر جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرسکیں اس سے دریغ نہ کریں[1] بعد ازاں اس کے مناسب مبدأ اور معاد کے اثبات کے لیے تین قصے ذکر فرمائے اب پھر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر فرماتے ہیں کیونکہ اہل ایمان جب قیامت کا حق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آخرت کے لیے کوئی توشہ بھی تیار کرو جو قیامت کے دن تمہارے کام آئے نیز نفس پر آخرت کے لیے خرچ کرنا بہت شاق اور گراں ہوتا ہے۔ اور جب قیامت اور آخرت کا یقین ہو جائے تو پھر خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے اس لیے اثبات قیامت اور آخرت کے بعد عالم آخرت کے لیے سازوسامان تیار کرنے کی ترغیب دلانے کا مضمون شروع کیا گیا ہے۔

لہ قال تعالیٰ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ۔ الآیۃ

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ

جیسے ایک دانہ اس سے اگیں سات بالیں ہر بال میں سو

مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ

سو دانے۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے اور اللہ

وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ

کشائش والا ہے سب جانتا جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ

اللہ کی راہ میں پھر پیچھے خرچ کر کر نہ احسان رکھتے ہیں نہ

اَذًى ۙ لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

ستاتے ہیں انہیں کو ہے ثواب ان کا اپنے رب کے ہاں اور نہ ڈر ہے ان پر

وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ

اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ بات کہنی معقول اور درگزر کرنا

خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِىٌّ

بہتر اس خیرات سے جس کے پیچھے ستانا ہو، اور اللہ بے پرواہ ہے

حَلِيْمٌ ﴿٢٦٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ

تحمل والا اے ایمان والو! مت ضائع کرو اپنی خیرات

بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ

احسان رکھ کر اور ستا کر، جیسے وہ جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں

چھپ ہوں گے، پھر اس پر ایک سخت بارش پڑی جس نے اس پتھر کو بالکل صاف کر دیا اور مٹی کا ریزہ و ذرہ کا نام و نشان نہ چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اب اس میں کیا اُگے گا۔ اسی طرح نفاق اور ریاء صدقہ اور خیرات کو جلا کر رکھ دیتا ہے، قیامت کے دن ریاء اور نفاق سے خرچ کرنے والے اور خرچ کر کے احسان جتلانے والے اور ستانے والے اپنی کمائی میں سے کسی چیز کا ثواب حاصل کرنے پر ذرہ برابر قادر نہ ہوں گے، کوئی چیز اُن کے ہاتھ نہ لگے گی۔ اس لیے کہ ثواب ملنے کی شرط یہ ہے کہ ایمان اور اخلاص کے ساتھ دیا ہو، پس جس نے ریاء اور نفاق سے کچھ خیرات کیا اس کی مثال تو ایسی ہے کہ جس نے پتھر پر دانہ ڈالا اور بارش اس کو بہا کر لے گئی اور جس نے اخلاص سے دیا اور بعد میں احسان جتلایا اور ایذاء پہنچائی اُس کی مثال ایسی ہے کہ بویا اُگایا اور پھر خود ہی اس کو اپنے ہاتھ سے کھا کر پھینک دیا اور اللہ تعالیٰ نے کافرین کو اپنی توفیق اور عنایت سے سرفراز نہیں فرماتے اشارہ اس طرف ہے کہ ریاء اور دکھلاوے کے لیے خرچ کرنا اور احسان جتانا اور ستانا یہ کافروں کی صفات ہیں۔ مومن کی شان نہیں کہ ایسا کرے۔

فائدہ جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرطیں ہیں۔ ایک شرائط صحت جیسے وضو اور طہارت اور دوسری شرائط بقاء جیسے نماز میں کسی سے باتیں نہ کرنا اور کھانے اور پینے سے پرہیز کرنا۔ پس اگر وضو ہی نہ کرے تو سرے ہی سے نماز صحیح نہ ہوگی اور اگر وضو اور طہارت کے بعد نماز شروع کی پھر ایک رکعت یا دو رکعت کے بعد نماز میں کھانا اور پینا اور بولنا شروع کر دیا تو اس کی نماز باقی نہ رہے گی۔

اسی طرح صدقات اور خیرات کے لیے بھی دو قسم کی شرطیں ہیں۔ ایک شرائط صحت اور دوسری شرائط بقاء۔ اخلاص شرط صحت ہے۔ بغیر اخلاص کے صدقہ صحیح ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا جو صدقہ ریاء اور نفاق کے ساتھ دیا جائے وہ شریعت میں معتبر نہیں اور منّ اور اذٰی سے پرہیز شرط بقاء ہے یعنی صدقہ اور خیرات اسی وقت تک محفوظ اور باقی رہیں گے جب تک صدقہ دینے کے بعد نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ سائل کو کسی قسم کی ایذاء پہنچائی جائے۔ اگر صدقہ دینے کے بعد احسان جتایا یا ستایا تو وہ صدقہ ضائع اور باطل ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں صدقہ اور خیرات کے مبطلات میں سے ہیں جیسے کھانے اور پینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اسی طرح منّ اور اذٰی سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ جو صدقہ نفاق اور ریاء سے دیا جائے اس کا باطل ہونا بالکل ہی ظاہر ہے اس لیے اس صدقہ کو جو منّ اور اذٰی کی وجہ سے باطل ہوا اس کو اس صدقہ کے ساتھ تشبیہ دی جو کہ ریاء اور نفاق کی وجہ سے باطل ہوا اس لیے کہ صدقہ ریاء و نفاق ابتداء ہی سے باطل ہے کیونکہ شرط صحت مفقود ہے اور صدقہ منّ اور اذٰی ابتداء میں صحیح تھا بعد میں منّ اور اذٰی کی وجہ سے باطل ہوا اس لیے کہ شرط بقاء کی مخالفت ہوئی۔ جب اس تقریر کے بعد معتزلہ کا یہ شبہ کافور ہو گیا کہ جس طرح مرتد ہو جانے سے تمام اعمال حبط ہو جاتے ہیں اسی طرح ہر گناہ کبیرہ سے گزشتہ تمام طاعات حبط ہو جاتی ہیں اس لیے کہ صدقہ منّ اور اذٰی سے اس لیے باطل ہوا کہ صدقہ چونکہ ایک طاعت تھا اس کی شرط بقاء

نہیں پائی گئی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مطلقاً ہر سیئہ کے ارتکاب سے گزشتہ حسنات بھی حبط ہو جائیں۔ اور جن آیات اور احادیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاصی اور سیئات سے گزشتہ طاعات اور حسنات حبط ہو جاتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں کہ معاصی اور سیئات کے ارتکاب سے گزشتہ طاعات باطل ہو جاتی ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے انوار و برکات جاتے رہتے ہیں جیسے حدیث میں ہے اذا زنی العبد خرج منه الایمان۔ یعنی جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان کا نور زائل ہو جاتا ہے اور یہ مطلب نہیں کہ زنا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں مال اپنے اللہ کی

مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ

خوشی چاہنے کو اور اپنا دل ثابت کر کر جیسے ایک باغ

جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا

ہے بلندی پر اس پر پڑا مینہ تو دیا اپنا پھل

ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ

دونا پھر اگر نہ پڑا اس پر مینہ تو اوس ہی پڑی اور اللہ

بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾

تمہارے کام دیکھتا ہے۔

مثال نفقات مقبولہ

قال تعالیٰ۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ

ربط: گزشتہ آیات میں صدقات غیر مقبولہ کی مثال بیان فرمائی اب ان آیات میں صدقات مقبولہ کی مثال بیان فرماتے ہیں۔ اور مثال ان لوگوں کی جو اپنے اموال کو خرچ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ

کی اس خیرات کی کوئی جزاء عطا فرمائے گا۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے۔ من صام رمضان ایمانا واحتسابا۔ یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور وہ اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ نے یہ روزے فرض کیے ہیں اور احتسابا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے ثواب کی توقع اور امید رکھے اسی معنی کو امام ابن جریر نے اختیار فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر ص۳۱۳ ج۱)

اس تفسیر پر من انفسہم کا من ابتدائیہ ہے۔ اور تثبیتا ناشئا من انفسہم یعنی ایسی تصدیق اور ایسا یقین کہ جو ان کے دلوں سے نکلا ہو۔ اسی بنا پر ہم نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی کہ دلی تصدیق اور یقین کی بنا پر۔ شاہ ولی اللہ تثبیتا من انفسہم کے ترجمہ میں لکھتے ہیں۔

"وبسبب اعتقاد ناشی از دل خویش"

(۲) ف مجاہد اور حسن بصری فرماتے ہیں کہ تثبیت سے احتیاط کے معنی مراد ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں کانوا یتثبتون این یضعون صدقاتھم۔ یعنی وہ احتیاط کرتے ہیں کہ اپنا صدقہ اور خیرات کس جگہ خرچ کریں۔ (تفسیر قرطبی ص۳۱۵ ج۳ و تفسیر ابن کثیر ص۳۱۴ ج۱)

(۳) ف اور بعض مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ تثبیتا کے معنی نفس کو مقام عبودیت اور منزل ایمان میں ایسا ثابت قدم بنا دینا کہ اس کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہ آئے اور حرص اور طمع اور مال کی محبت اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور یہ قول اس تفسیر پر تثبیتا مصدر ہے اور تثبیتا کا مفعول ہے یعنی تثبیتا بعض انفسہم اور معنی یہ ہیں کہ جس نے اپنا مال خدا کے لیے خرچ کیا اس نے اپنے بعض نفس کو ایمان پر جما لیا اور جس نے جان اور مال دونوں خدا کے لیے خرچ کیے اس نے اپنے سارے نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دیا اور اس آیت شریفہ یعنی تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم میں یہی مراد ہے یعنی کل نفس کو ایمان پر ثابت اور قائم کر دینا مراد ہے امام فخرالدین رازی اس وجہ کو ذکر کر کے فرماتے ہیں۔

هذا الوجه ذكره صاحب الكشاف وهو كلام حسن وتفسير لطيف (تفسیر کبیر ص۳۶۳ ج۲)	اس وجہ کو صاحب کشاف یعنی علامہ زمخشری نے ذکر کیا ہے اور یہ کلام بہت خوب ہے اور نہایت لطیف تفسیر ہے۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ

بھلا خوش لگتا ہے تم میں کسی کو ؟ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور

وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِن

اور انگور کا ، بہتی اس کے نیچے ہیں ندیاں ، اس کو وہاں حاصل

كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ

سب طرح کا میوہ، اور اس پر بڑھاپا پڑا اور اس کے اولاد ہیں ضعیف،

فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ

تب پڑا اس باغ پر بگولا، جس میں آگ تھی، تو وہ جل گیا۔ یوں سمجھاتا ہے

اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

اللہ تم کو آیتیں، شاید تم دھیان کرو۔

مثال نفقات و طاعات غیر مقبولہ

قال تعالیٰ۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ ۔ الیٰ ۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ

کیا تم میں سے کوئی یہ بات پسند کرتا ہے کہ اس کا ایک ایسا باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا کہ اس کے نیچے سے نہریں جاری ہوں اور اس باغ میں علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے اس کے لیے ہر قسم کے پھل اور میوے ہوں اور اس کو بڑھاپا آ پہنچا کہ جس وقت میں چل پھر کر کمانے پر قدرت نہیں رہی اور بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے ضرورت دوچند بڑھ گئی اور اس کی اولاد بھی ضعیف اور ناتواں، جو کمانے پر قادر نہیں اور بجائے اس کے کہ وہ بڑے ہو کر باپ کی خدمت کریں خود محتاج خدمت ہیں۔ یہ وقت باپ کے لیے بڑی پریشانی کا ہے کہ خود بھی عاجز اور مجبور اور بچے بھی کمزور اور ناتواں۔ پس اچانک ایسی حالت میں اس باغ کو ایک بگولا آ لگا۔ جس میں آگ تھی پس وہ باغ جل کر خاک ہو گیا۔ اسی طرح قیامت کے دن جو انتہائی ضرورت اور پریشانی کا وقت ہوگا صدقات اور خیرات کے وہ تمام باغات جن کو منّ اور اذیٰ کا بگولا پہنچا۔ جس میں غضب خداوندی کی آگ پنہاں تھی جل کر خاک ہو جائیں گے اور کف افسوس ملتا ہوا رہ جائے گا۔ اور تمام امیدوں پر پانی پھر جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیتوں کو واضح فرماتا ہے تاکہ تم فکر کرو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہ لکھتے ہیں۔

حاصل این مثل آنست کہ عمل نخالص	حاصل مثال کا یہ ہے کہ احسان جتانے
مرائی و منت نہندہ وقت احتیاج حبط شود۔	والے اور ریا سے صدقہ دینے والے کے اعمال
چنانچہ بوستان ایں شخص در وقت ...	شدید احتیاج کے وقت حبط ہو جائیں گے جیسے

احتیاج نہ ہو تھی۔ اس شخص کا باغ شدید احتیاج کے وقت جل کر خاک ہو گیا۔

یعنی یہ مثال ہے اُن لوگوں کی جو احسان رکھ کر اپنی خیرات کو ضائع کرتے ہیں۔ جیسے کسی نے جوانی کے وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی اور بڑھاپے میں کام آئے اور اس سے میوہ کھائے، پس جب بڑھاپا اور ضرورت کا وقت آیا تو عین ضرورت کے وقت وہ باغ جل گیا۔

اسی طرح صدقہ اور خیرات مثل میوہ دار باغ کے ہیں کہ ان کا میوہ آخرت میں کام آتا ہے جب کسی کی نیت بُری ہو یا احسان جتانے یا ستانے تو وہ باغ جل کر خاک ہو جاتا ہے، پھر اس کا میوہ جو کہ ثواب ہے وہ کیونکر نصیب ہو!

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَنفِقُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا

اے ایمان والو : خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی

كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا

کمائی میں سے۔ اور جو ہم نے نکال دیا تم کو زمین میں سے اور نیت

تَيَمَّمُوا۟ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ

نہ رکھو گندی چیز پر کہ خرچ کرو۔ اور تم آپ وہ نہ لوگے

إِلَّآ أَن تُغْمِضُوا۟ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ

مگر جو آنکھیں موند لو۔ اور جان رکھو کہ اللہ بے پروا ہے

حَمِيدٌ ﴿٢٦٧﴾ ٱلشَّيْطَٰنُ يَعِدُكُمُ ٱلْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم

خوبیوں والا۔ شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگدستی کا اور حکم کرتا ہے

بِٱلْفَحْشَآءِ ۖ وَٱللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ

بے حیائی کا اور اللہ وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا

وَٱللَّهُ وَٰسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٦٨﴾ يُؤْتِى ٱلْحِكْمَةَ مَن يَشَآءُ ۚ وَ

اور اللہ بہت بخشش والا ہے سب جانتا۔ دیتا ہے سمجھ جس کو چاہے اور

مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ

جس کو سمجھ ملی بہت خوبی ملی اور

مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ

وہی سمجھیں جن کو عقل ہے - اور جو خرچ کرو گے

نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ

کوئی خیرات یا قبول کرو گے کوئی منت، سو اللہ کو معلوم ہے اور

مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ

گنہگاروں کا کوئی نہیں مددگار۔ اگر کھلی دو خیرات تو

فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ

کیا اچھی بات ہے، اور اگر چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو تم کو

خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ

بہتر ہے، اور اتارے گا کچھ گناہ تمہارے اور اللہ

بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ

تمہارے کام سے واقف ہے۔ تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا لیکن

اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے اور جو مال خرچ کرو گے سو

فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ

اپنے واسطے جب تک خرچ کرو گے مگر اللہ کی خوشی چاہ کر

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا

اور جو خرچ کرو گے خیرات پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ

تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ

نہ کیے جاؤ گے دینا ہے ان مفلسوں کو جو اٹکے رہتے ہیں اللہ کی راہ

اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ

میں چل پھر نہیں سکتے ملک میں سمجھے ان کو

الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ

بے خبر محتاج ان کے نہ مانگنے سے تو پہچانتا ہے ان کو ان کے چہرے سے

لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ

نہیں مانگتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو خرچ کرو گے کام کی چیز وہ

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

اللہ کو معلوم ہے۔ جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال

بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

خدا کی راہ میں رات اور دن چھپے اور کھلے تو ان کے لیے ہے مزدوری

عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ان کی پاس رب کے ان کے اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

بیان بقیہ آداب صدقات وذکر مصارف خیر

قال تعالیٰ۔ یٰاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ ... الیٰ ... وَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ

(ربط) اب ان آیات میں ان امور کو بیان فرماتے ہیں کہ جن کی صدقہ و خیرات میں رعایت ضروری ہے اور بعد ازاں یہ بیان فرمائیں گے کہ کن لوگوں کو صدقہ دینا چاہیے اور صدقہ و خیرات کے اصل مستحق کون لوگ ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ جو چیز تم نے اپنی تجارت یا صنعت و حرفت سے کمائی ہے۔

اور تم تو خدا کے ایسے مخلص بندے ہو کہ کوئی چیز بھی خرچ نہیں کرتے مگر محض اللہ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے اور جو مال بھی تم خدا کی رضامندی کے لیے خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تم تک پہنچا دیا جائے گا۔ اور تمہارے اجر میں ذرہ برابر کمی نہ کی جائے گی۔ لہٰذا اس فکر میں نہ پڑو کہ تمہارا صدقہ اور خیرات مسلمان ہی کو ملے اور کافر کو نہ ملے۔ شیخ سعدیؒ کا ارشاد گویا اس آیت کی تفسیر ہے

گروئی بہ دشمن آتش بجود تو با ایشاں چرا کشتی دست جود

حکایت ایک عالم بڑی خیرات کیا کرتے تھے اور کوئی پوچھتا تو قسم کھاتے کہ خدا کی قسم میں نے کسی کے ساتھ کوئی خیر نہیں کی۔ کسی نے اس عالم سے دریافت کیا کہ آپ خیرات کرتے ہیں اور پھر یہ قسم کھاتے ہیں تو یہ فرمایا کہ خدا کی قسم میں کسی کے ساتھ خیر نہیں کرتا۔ جو خیر کرتا ہوں وہ اپنے ہی لیے کرتا ہوں اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ یعنی تم جو بھی خیر کرتے ہو وہ اپنے ہی نفس کے لیے کرتے ہو۔

فائدہ ان آیات میں صدقات نافلہ اور عام خیرات کا بیان ہے اور نفلی صدقہ اور خیرات دینا کافر کو بھی جائز ہے۔ البتہ زکوٰۃ سوائے مسلمان کے کسی اور کو دینا جائز نہیں۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو یہ فرمایا کہ وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا اور جب اسلام قبول کر لیں تو ان کو یہ بتلا دینا کہ اللہ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو انہی مسلمان امیروں سے لی جائے گی اور انہی کے غریبوں کو دی جائے گی۔ پس جس طرح زکوٰۃ مسلمانوں ہی کے امیروں پر فرض ہے اسی طرح ان سے لے کر مسلمان فقیروں ہی پر تقسیم کی جائے گی۔ کافر فقیروں پر اس کا تقسیم کرنا جائز نہ ہوگا۔

ربط) گزشتہ آیت میں یہ فرمایا کہ صدقہ اور خیرات مومن کے ساتھ مخصوص نہیں کافر کو بھی خیرات دینا جائز ہے اب آئندہ آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ صدقات اور خیرات کے کون لوگ سب سے زیادہ مستحق ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ صدقات کا اصل مستحق وہ اہل حاجت مند ہیں جو خدا کی راہ میں مقید اور پابند ہیں۔ یعنی دین کی خدمت اور علوم ظاہری اور باطنی کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ قرآن کریم حفظ کرتے ہیں اور علم دین سیکھتے ہیں اور ظاہری اور باطنی دشمنوں کے جہاد میں لگے ہوئے ہیں۔ ظاہری دشمن سے کفار مراد ہیں اور باطنی دشمن سے نفس امارہ مراد ہے جس طرح کافروں کی گردن کشی کے لیے جہاد و قتال بزرگ ترین عبادت ہے اسی طرح نفس کشی کے لیے مجاہدت اور ریاضت بھی عظیم ترین عبادت ہے۔ حدیث میں ہے المجاهد من جاهد نفسه اور ایک ضعیف روایت میں جہاد نفس کو جہاد اکبر فرمایا ہے جیسے اصحاب صفہ تجارت اور زراعت کو چھوڑ کر حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے قریب جو ایک صفہ (چبوترہ اور سائبان تھا) وہاں لیل و نہار بسر کرتے تھے تاکہ حضورؐ کی صحبت میں علم سیکھیں اور جب جہاد کا موقعہ آئے تو جہاد میں جائیں۔ غرض یہ کہ صدقات کے اصل

مستحق وہ فقراء اور حاجت مند لوگ ہیں کہ جو علوم دینیہ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور علم اور جہاد میں مشغول ہونے کی وجہ سے ملک میں تجارت اور مزدوری کے لیے چل پھر نہیں سکتے اس لیے کہ ایک آدمی سے دو کام نہیں ہو سکتے۔

ف مسلمانوں کو چاہیے کہ صدقات اور خیرات میں ان حاجت مند طالب علموں کا خاص طور پر خیال رکھیں جو علم دین کے حاصل کرنے میں مشغول ہیں اگر دنیا میں یہ گروہ نہ رہے تو دنیا سے علم دین اور دین سب رخصت ہو جائے اور لوگ بے دین اور گمراہ ہو جائیں اس لیے کہ کسی چیز کا باقی رہنا اس شئے کے علم کے باقی رہنے پر موقوف ہے۔ طب جسمانی کی اگر تعلیم نہ ہو اور نہ اس کی کوئی درسگاہ ہو تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا بیماروں سے پر ہو گی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ملے گا۔ اسی طرح اگر طب روحانی یعنی علم دین کی کوئی درسگاہ نہ ہو تو دنیا روحانی مریضوں یعنی کفر اور الحاد اور معصیت کے روحانی بیماروں سے بھری ہوگی اور کوئی طبیب اور معالج نہ ہوگا یعنی ایمان اور کفر اور طاعت اور معصیت کا فرق بتلانے والا کوئی نہ ملے گا۔ باقی جو شخص کفر اور معصیت کو بیماری ہی نہ سمجھتا ہو اس سے ہمارا خطاب نہیں

اور ناپہچان آدمی جو ان کے حال سے ناواقف اور بے خبر ہے وہ ان کو نہ مانگنے کی وجہ سے مالدار اور دولت مند سمجھتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے۔ اس لیے عام طور پر ان کی حاجت مندی کا علم نہیں ہوتا البتہ تم ان کی حاجت اور تنگی کو کسی وقت ان کے چہرے کی حالت اور قیافہ سے پہچان سکتے ہو اس لیے کہ بعض مرتبہ بھوک اور تنگی کے باعث چہرہ پر زردی اور بدن پر لباس شکستہ ہوتا ہے اس لیے ان کی تنگی کا علم ہو جاتا ہے۔ قناعت کی وجہ سے اول تو یہ لوگ کسی سے سوال نہیں کرتے اور اگر شاذ و نادر کبھی مجبور ہو کر سوال کرتے ہیں تو لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے یعنی کسی کے سر نہیں ہوتے اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے خواہ وہ لوگ سوالی ہوں یا بے سوال، ان کی حاجت اور تنگی کم ہو یا زیادہ، تو اللہ تعالیٰ تم کو بقدر استحقاق کے اس کی جزا دے گا اس لیے کہ اس کو تمہاری نیت خوب معلوم ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے کسی زمان اور مکان اور وقت اور حال کی قید نہیں۔ جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں جس میں مستحق کا پورا پتہ نہیں چل سکتا یا دن میں جس میں ریا کا اندیشہ ہے اور علیٰ ہذا کسی حال کی تخصیص ہے ظاہراً خرچ کریں یا پوشیدہ پس ان کے لیے ان کا ثواب ہے ان کے پروردگار کے یہاں۔ جس پروردگار نے ان کے صدقات کی تربیت کی ہے اور ان کو بڑھایا ہے اور نہ ان پر کوئی خوف و خطرہ ہے اور نہ یہ لوگ رنجیدہ ہوں گے بلکہ صدقات کے انعامات کو دیکھ کر یہ تمنا کریں گے کہ کاش خدا کی راہ میں سارا ہی گھر لٹا دیا ہوتا۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ

اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے	نہ	سود	جو لوگ کھاتے ہیں

الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

جس کے حواس کھو دیئے جن نے لپٹ کر یہ اس واسطے کہ

قَالُوْٓا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

انہوں نے کہا سودا کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا سود لینا اور اللہ نے حلال کیا

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ

سودا اور حرام کیا سود۔ پھر جس کو پہنچی نصیحت اپنے رب کی اور

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهٗٓ إِلَى اللّٰهِ وَمَنْ

باز آگیا تو اس کا ہے جو آگے ہو چکا اور اس کا حکم اللہ کے اختیار اور جو

عَادَ فَأُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

کوئی پھر کرے وہی ہیں دوزخ کے لوگ وہ اسی میں رہ پڑے۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ

مٹاتا ہے اللہ سود اور بڑھاتا ہے خیرات اور اللہ نہیں چاہتا

كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿۲۷۶﴾ إِنَّ الَّذِينَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

کسی ناشکر گنہگار کو جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کیے

وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ

اور قائم رکھی نماز اور دی زکوٰۃ ان کو ہے بدلہ ان کا

رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓأَيُّهَا

اپنے رب کے پاس اور نہ ان پر ڈر ہے نہ وہ غم کھائیں گے۔ اے

الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا

ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ رہ گیا سود

إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿۲۷۸﴾ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا

اگر تم کو یقین ہے ، پھر اگر نہیں کرتے تو خبردار ہو جاؤ

بِحَرْبٍ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ۖ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ

لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اگر توبہ کرتے ہو تو تم

رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿۲۷۹﴾ وَ

کو ملتے ہیں اصل مال تمہارے نہ تم کسی پر ظلم کرو ، اور نہ کوئی تم پر ۔ اور

إِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ

اگر ایک شخص ہے تنگی والا تو فرصت دینی چاہئے جب تک کہ اس کو کشائش ملے اور

تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوا

اگر خیرات کر دو تو تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم کو سمجھ ہو اور ڈرتے رہو

يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ ۖ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ

اس دن سے جس میں لوٹائے جاؤ گے اللہ کے پاس ، پھر پورا ملے گا ہر شخص کو

مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۲۸۱﴾

جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۔

احکام ربا (سود)

قال تعالیٰ : اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا ... الیٰ ... وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۔

ربط : گذشتہ آیات میں خیرات اور صدقات کا بیان تھا ، اب ان آیات میں سود کے احکام ذکر کئے جاتے ہیں جو کہ صدقات اور خیرات کی ضد اور نقیض ہے اس لئے کہ صدقہ اور خیرات سے اخلاق اور مروت اور حقوق اللہ کی تعظیم اور انسانی ہمدردی میں ترقی ہوتی ہے اور سود میں سراسر بے مروتی اور خودغرضی اور سنگدلی ہے ۔ صدقہ اور خیرات میں صلہ رحمی اور غریبوں کی امداد ہوتی ہے اور سود میں سخت دلی اور غریبوں

پر زیادتی ہوتی ہے۔ اس لیے صدقہ کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور حرمت کا بیان نہایت مناسب ہوا تاکہ سود کی مذمت اور حرمت سے صدقہ کی فضیلت اور مؤکد ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ جس درجہ سود میں برائی ہے اسی درجہ خیرات میں بھلائی ہے۔ ایک ضد کی قباحت سے دوسری ضد کا حسن و جمال واضح ہوتا ہے۔ نیز صدقہ سے مال ظاہر میں گھٹتا ہے اور حقیقت میں بڑھتا ہے۔ اور سود میں مال ظاہر میں تو بڑھتا ہے اور حقیقت میں گھٹتا ہے۔ نیز گزشتہ آیات میں صدقہ کرنے والوں کا حال بیان فرمایا کہ دنیا اور آخرت میں ان کو خیرات کا عوض اور ثواب ملے گا اور آخرت میں ان کو کسی قسم کا رنج و غم نہ ہوگا۔ اب آئندہ آیات میں سود خواروں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ قبروں سے مدہوش اور وحشت زدہ اٹھیں گے۔ اس لیے کہ ان لوگوں نے حلال اور حرام کو یکساں کر دیا اور سود اور خرید و فروخت کو برابر سمجھا اور ظاہر ہے کہ حلال اور حرام اور جائز اور ناجائز کو یکساں کر دینا مخبوط الحواس آدمی کا کام ہے اس لیے سود خواروں کی سزا یہ تجویز ہوئی کہ قیامت کے دن قبروں سے آسیب زدہ اور مجنوں کی طرح اٹھیں گے۔

چنانچہ فرماتے ہیں جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے وہ شخص جس کو جنات نے خبطی اور بدحواس بنا دیا ہو لپٹ کر سود خوار مال کے عشق اور خبط میں گرفتار رہا اور اسی خبط اور خیال میں مرا اور اسی خبط کی حالت میں اس کا حشر ہوگا یہ سزا اس لیے تجویز ہوئی کہ یہ سود خوار حلال اور حرام کو ایک کرنا چاہتے ہیں اور سود کے حلال کرنے کے لیے استدلال میں یہ کہتے ہیں کہ بیع یعنی خرید و فروخت اور سوداگری بھی تو مثل سود کے ہے جس طرح بیع میں زیادتی اور نفع ہوتا ہے اسی طرح سود میں بھی زیادتی اور نفع ہوتا ہے دونوں میں فرق نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ بیع تو جائز ہو اور سود حرام ہو۔

ف اصل کلام اس طرح تھا کہ انما الربا مثل البیع یعنی سود مثل سوداگری کے ہے لیکن کفار نے حرمت ربا کی نفی میں مبالغہ کرنے کے لیے اصل کلام کا عکس کر دیا۔

اور یہ کہا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا یعنی بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود اصل ہے اور بیع حلال ہونے میں مثل سود کے ہے گویا کہ حلت یعنی حلال ہونے میں سود کے مشابہ ہے۔ غرض یہ کہ ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال سمجھ لیا حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں۔ اور اگر بالفرض والتقدیر کوئی فرق بھی نہ ہوتا تو فرق کے لیے اتنا کافی تھا کہ اللہ تعالٰی جو کہ مالک مطلق اور حاکم مطلق ہے اس نے بیع اور تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے اور جب حق تعالٰی مالک مطلق ہیں تو ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس چیز کو چاہیں حرام کریں کسی کو دریافت کرنے کا بھی حق نہیں لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ۔ ؎ اوست سلطان آں چہ خواہد آں کند

بیع اور سود میں فرق[۱]

بیع میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ مال کے مقابلہ اور عوض میں ہوتی ہے۔ اور سود میں جو نفع اور زیادتی ہوتی ہے وہ بلا عوض کے ہوتی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم میں فروخت کیا تو یہ دونوں درہم کپڑے کے عوض اور مقابل سمجھے جائیں گے۔ اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو ایک درہم تو ایک درہم کے مقابلہ میں ہو جائے گا اور دوسرا درہم بلا عوض اور کسی مقابلہ کے ہوگا کیونکہ سب دراہم ایک جنس ہیں۔ اور کپڑا اور درہم علیحدہ علیحدہ قسم ہیں، ہر ایک کا نفع اور ہر ایک کی غرض بھی علیحدہ علیحدہ ہے۔ اس لیے کپڑے اور درہم میں باہمی نسبت موازنہ اور مقابلہ ناممکن اور محال ہے۔ خرید و فروخت میں مقابلہ حاجت اور ضرورت اور رغبت کا ہوتا ہے، کسی کی ضرورت اور رغبت کچھ ہے اور کسی کی کچھ۔ کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دوسرے روپیہ کا کپڑا اس کی نظر میں کچھ نہیں ہوتا، اور کسی کو ایک کپڑے کی جس کی قیمت بازار میں ایک درہم ہے اتنی حاجت ہوتی ہے کہ وہ دو درہم کی اس کو اتنی حاجت نہیں ہوتی۔ لہذا اگر ایسی صورت میں کوئی ایک درہم کے کپڑے کو اگر دو درہم میں بھی خریدے تو وہ سود نہ ہوگا یعنی یہ نفع خالی از عوض نہ ہوگا کیونکہ کپڑے اور روپیہ میں باہمی نسبت تو موازنہ اور مساوات ممکن نہیں اس لیے کہ جنس مختلف ہے لہذا معیار اس کا اپنی اپنی ضرورت اور رغبت ہوگی، اور ضرورتوں اور رغبتوں میں بے انتہا تفاوت ہے، پس اگر ایک روپیہ کی قیمت کا کپڑا دس روپیہ میں فروخت کیا تو مجموعہ قیمت کا مجموعہ مال سے مقابلہ کیا جائے گا اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ نہ ہوگا۔ اور اگر ایک درہم کو دو درہم کے مقابلہ میں فروخت کیا تو یہاں مقابلہ مجموعہ کا مجموعہ سے نہ ہوگا بلکہ اجزاء کا اجزاء سے مقابلہ ہوگا، ہم جنس ہونے کی وجہ سے اجزاء میں مساوات اور موازنہ ممکن ہے۔ لہذا ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں ہوگا اور دوسرا درہم خالی از عوض ہوکر سود ہو جائے گا جس کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ بیع میں، قابل معاوضہ چیزوں کا مبادلہ ہوتا ہے اور ربا اصل قرض پر کچھ زیادہ لینے کو کہتے ہیں جو مہلت اور تاخیر وقت کے عوض میں زیادتی کی جاتی ہے اور تاخیر وقت اور مہلت نہ عقلاً کوئی مال ہے اور نہ عرفاً کوئی ایسی چیز ہے کہ جس پر قبضہ کیا جا سکے اور عوض اور مقابل بن سکے اور جو چیز بلا عوض و بدل حاصل کی جائے وہ باطل اور ناحق ہے۔ پس جس شخص نے بیع اور سود کو برابر قرار دیا اور اس نے مقابلہ اور معاوضہ میں خبط اور بد حواسی سے کام لیا اس لیے اس کا انجام یہ ہوگا کہ سود خوار قبر سے دیوانہ اور مخبوط الحواس بنا کر اٹھایا جائے گا، ہر عمل کی جزاء اسی کے مناسب ہوتی ہے۔

۱؎ یہ تمام تر قفال مروزیؒ کے کلام کی تشریح ہے جس کو امام رازیؒ نے تفسیر کبیر جلد دوم میں ذکر کیا ہے۔

سود خوار کے استدلال کی ایک مثال سود خوار کا اپنے استدلال میں یہ کہنا کہ جس طرح بیع میں نفع اور زیادتی ہوتی ہے اسی طرح سود میں بھی نفع اور زیادتی ہوتی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں اس استدلال کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی یہ کہے کہ جیسے بیوی عورت ہے اسی طرح ماں بھی عورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بیوی تو حلال ہے اور ماں حرام ہے۔

یا یوں کہے کہ کتا بھی بکری کی طرح ایک جانور ہے کیا وجہ ہے کہ ایک حلال ہے اور ایک حرام ہے؟

ربا کی اقسام ربا کی دو قسمیں ہیں، ایک ربا النسیئہ اور ایک ربا الفضل۔ ربا النسیئہ تو وہ سود ہے جو قرض اور ادھار میں ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں اسی قسم کا ربا شائع تھا۔ وہ یہ تھا کہ کوئی شخص کسی کو معین میعاد پر قرض دیتا اور اس پر کچھ ماہوار مقرر کر لیتا، پھر جب میعاد معین پر وہ روپیہ ادا نہ ہوتا تو قرض خواہ اصل میں کچھ اور بڑھا کر اس کو مہلت دے دیتا اور کبھی سود کو اصل میں جمع کر کے اس پہ سود لگاتا یہاں تک کہ سود اصل قرض سے اضعافاً مضاعفہ دوچند اور سہ چند اور چہار چند ہو جاتا، اور ربا الفضل وہ سود ہے کہ جو ایک جنس کی چیزوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ مبادلہ کرنے میں ہو۔

مثلاً ایک سیر گیہوں کو ڈیڑھ سیر گیہوں کے معاوضہ میں فروخت کیا جائے، یہ ربا الفضل ہے۔

آیت قرآنی کا محل نزول باجماع مفسرین ربا کی قسم اول ہی ہوا۔ مگر آیت اپنے عموم کی وجہ سے ربا کی قسم ثانی کو بھی بلاشبہ شامل ہے، جس کی تفصیل احادیث متواترہ سے معلوم ہوئی۔ اور مزید تفصیل اقوال صحابہؓ و تابعین سے معلوم ہوئی۔ اور احادیث میں ربا کی جس قدر صورتیں ذکر ہوئی ہیں آیت قرآنی اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے۔

سود کے حرام ہونے کی وجہ تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ضرورت مند کی اعانت اور امداد عین مروت اور کمال انسانیت ہے اور غریب اور فقیر کی ضرورت اور حاجت کو تحصیل زر اور حصول منفعت کا ذریعہ بنانا کمال دناءت اور غایت خست ہے۔ سوائے بخیلوں اور خود غرضوں کے کسی کا اس مسئلہ میں خلاف نہیں۔

(۱) سود خوار بلا کسی عوض کے اپنے روپیہ سے نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب اصل روپیہ بجنسہ اور بتمامہ واپس آ گیا تو یہ زائد روپیہ کس چیز کا معاوضہ ہے؟

اگر یہ کہا جائے کہ یہ معاوضہ اس مہلت اور تاخیر کا ہے کہ جو قرض خواہ کی طرف سے مقروض کو ملی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ اور مدت کوئی مالی چیز نہیں کہ جس کے معاوضہ میں روپیہ لیا جا سکے۔

(۲) نیز سود آدمی کو بے رحم بنا دیتا ہے اور بد اخلاقی اور فریب دہی کے عجیب عجیب طریقے اس کے نفس میں القاء کرتا ہے حتی کہ آدمی کو آدمیت سے خارج کر دیتا ہے۔

(۳) نیز سود سے ملک کی ترقی پر اثر پڑتا ہے، اس لیے کہ جب مالدار سود کے ذریعہ سے پیسہ

مال بڑھائیں گے تو تجارت اور زراعت اور صنعت اور حرفت پر روپیہ نہیں لگائیں گے جس پر ملک کی ترقی کا مدار ہے۔ اس شخص کو بے مشقت اور بلا محنت اگرچہ فائدہ ہو جائے گا مگر یہ فائدہ انفرادی اور شخصی ہوگا اجتماعی نہ ہوگا۔

(۴) سود خوری سے صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی اور مروت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

(۵) سود خواری کی وجہ سے مال اور دنیا کی محبت قلب میں اس درجہ راسخ ہو جاتی ہے کہ طمع اور حرص اس کو ہر عیب اور معصیت سے اندھا بنا دیتی ہے

(۶) نیز تجارت کا دار و مدار باہمی رضامندی پر ہے کما قال تعالیٰ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اور اسی رضامندی کی تکمیل کے لیے شریعت نے خرید و فروخت میں خیار عیب اور خیار شرط اور خیار رؤیت کو مشروع کیا۔

تجارت میں جو شخص مثلاً غلہ خریدتا ہے تو وہ اپنے کھانے کے لیے یا کاشت کے لیے یا فروخت کرنے کے لیے خریدتا ہے اور یہ سب حقیقی منافع اور واقعی فوائد ہیں جن کے حصول کے لیے روپیہ خرچ کیا جاتا اور بائع اور مشتری کے اختیار اور ان کی رضا و رغبت سے یہ معاملہ ہوتا ہے اور سود کا جو بھی معاملہ ہوتا ہے وہ مجبوری اور ناگواری کے ساتھ ہوتا ہے جو شخص بھی سو روپیہ لے کر ایک سو دس دینے کا معاہدہ کرتا ہے وہ ہرگز خوشی سے نہیں کرتا بلکہ بحالت مجبوری اور لاچار ہو کر بصد تنگی و ناگواری کرتا ہے اور دل سے یقین رکھتا ہے کہ اس سودی معاملہ سے مجھ کو حقیقی اور واقعی فوائد حاصل نہیں ہوئے آئندہ کے موہوم منافع کی امید پر سودی قرض لیتا ہے (غرض یہ کہ سود خواری انسانی ہمدردی اور ترحم کے بھی خلاف ہے اور مصلحت عامہ کے بھی خلاف ہے اور اصول تجارت کے بھی خلاف ہے کہ معاملہ کی بنا مجبوری اور لاچاری اور تنگی اور ناگواری پر ہے اس معاملہ میں دل بجائے شاد ہونے کے پریشانی محسوس کرتا ہے اور اس سودی قرض کو اپنی گردن پر ایک بوجھ سمجھتا ہے دوسروں کے اظہار سے شرماتا ہے اور اخیر تک چھپاتا ہے اور اجتماع اور تمدن کے لیے بھی نقصان دہ ہے اور بد اخلاقی اور اخلاقی مفاسد کا ذریعہ ہے جو شریعت کی نگاہ میں نہایت سخت اور بالکل ہی ناقابل درگذر ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ربا کو حرام کیا جو کمال ترحم اور کمال عطوفت پر مبنی ہے۔

(۷) نیز سود کا دار و مدار حکمت کے خلاف ہے اور درہم و دینار کے اصل وضع کے منافی ہے اس بارہ میں ہم امام غزالی قدس اللہ سرہ کے کلام معرفت التیام کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں جو نہایت درجہ لطیف اور نفیس ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم کی کتاب الشکر ص ۹۰ ج ۴ میں فرماتے ہیں کہ ربا کی حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی روپیہ سے تجارت کر کے نفع اٹھایا جائے اور روپیہ کی روپیہ سے تجارت کرنا اس کی اصل وضع کے خلاف ہے اس لیے کہ درہم و دینار (سونا چاندی) مقصود بالذات نہیں بلکہ ضروریات زندگی کے حصول کا

توریت سفر خروج باب ۲۲ درس ۲۵ میں ہے۔

"اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو کچھ قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔" اھ

اور علی ھذا انجیل لوقا باب ششم درس ۳۵ میں بغیر سود کے قرض دینے کی ترغیب مذکور ہے۔

سود ترقی کا ذریعہ نہیں بلکہ تنزل کا ذریعہ ہے

لوگوں کی زبان پر ہے کہ مسلمان گھٹتے جاتے ہیں حالانکہ سود خوری مسلمانوں میں بڑھ رہی ہے اور دن بدن تنزل ہے۔ مسلمانوں کا جو ترقی کا زمانہ گذرا ہے اس میں سود کا نام ونشان نہ تھا، اور مغربی اقوام کی ترقی ان کی صنعت اور حرفت کی وجہ سے ہے نہ کہ سود کی وجہ سے بارہ سو سال تک مسلمانوں کی سلطنت عروج اور ترقی پر رہی اور کبھی سود کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی جب سے سلطان امیروں اور وزیروں نے دین سے منہ موڑا اور عیش ونشاط اور رقص وسرود میں مبتلا ہوئے تب سے زوال شروع ہوا اور جو ہونا تھا ہوا۔

رہا یہ سوال کہ اس زمانہ میں بغیر سود کے کام کیسے چلے؟ جواب یہ ہے کہ جیسے پہلے چلتا تھا اور قریب چلتا تھا۔ رشوت خور بھی رشوت کے جواز کے لیے یہی دلیل پیش کر دیتے ہیں کہ بغیر رشوت کے کام نہیں چلتا۔

پس جس کو پہنچ گئی نصیحت اس کے پروردگار کی جانب سے یعنی ربا کی حرمت اور اس کی ممانعت اس کو پہنچ گئی پس باز آگیا اس فعل حرام اور قول کفر سے یعنی سود لینا بھی چھوڑ دیا اور اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کہنا بھی چھوڑ دیا، تو اس کے لیے ہے جو کچھ اس حکم کے آنے سے پہلے لے چکا ہے۔ یعنی سود کا جو روپیہ پہلے جس قدر لے چکا ہے وہ اس سے واپس نہ لیا جائے گا وہ سب اسی کی ملک ہے اور نہ اس پر عنداللہ کوئی مواخذہ ہوگا۔ اور دل کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اگر صدق نیت سے باز آیا ہے تو اللہ اس کی جزاء دے گا۔ اور اگر کسی دنیاوی مصلحت اور ظاہرداری کی بنا پر توبہ کی ہے تو اس کے مطابق معاملہ ہوگا۔

اور جو شخص اس نصیحت کے بعد پھر اسی فعل حرام اور قول کفر کی طرف رجوع کرے یعنی حکم تحریم کے بعد بھی سود سے باز نہ آئے بلکہ سود لیتا رہے اور حسب سابق اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کہتا رہے یعنی سود کے حلال ثابت کرنے کے لیے تقریر کرتا رہے یا مضمون لکھتا رہے تو ایسے لوگ دوزخی ہیں وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ کیونکہ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے جو دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا باعث ہے۔

اور سود میں اگرچہ فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے لیکن مآل اور انجام اس کا تباہی اور بربادی ہے۔

اس لیے کہ اللہ سبحانہ کی عادت یہ ہے کہ سود کو مٹاتے ہیں اس میں برکت نہیں ہوتی۔ سود خوار یہ
کبھی تو دنیا ہی میں برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر دنیا میں اللہ نے ڈھیل دی تو آخرت میں تو تباہی اور
بربادی یقینی ہے۔

ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا کے معنی یہ ہیں کہ
سود کے مال میں سے نہ کوئی صدقہ اور خیرات مقبول ہے اور نہ حج اور جہاد اور کوئی صلہ رحمی مقبول ہے۔
یہ دنیا کی بربادی اور کہ سود کے روپیہ کا کوئی عمل مقبول نہ ہوا۔ اور اہل عقل کی نظر میں بھی حرام مال
کے ہدیہ کی کوئی وقعت اور قیمت نہیں۔ اور خدا رسیدہ کے یہاں اگر پاک اور حلال کی بھی
ہو جائے تو اس کا فضل اور احسان ہے۔

اور صدقہ اور خیرات میں اگرچہ مال گھٹتا ہے۔ لیکن حقیقت
میں مال بڑھتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ صدقات اور خیرات کو بڑھاتا ہے صدقہ اور خیرات سے جس
قدر نکلتا ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ اس میں برکت دے دیتا ہے۔ غافل مال کی ظاہری کثرت
کو دیکھتا ہے۔ اور عاقل اور دانا اس کی باطنی طہارت اور نظافت کو دیکھتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہ
کا ارشاد ہے۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ
وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ

آپ کہہ دیجیے کہ پاک اور ناپاک برابر
نہیں ہوتے۔ اگرچہ اے نادان تجھ کو
ناپاک کی کثرت اچھی معلوم ہو۔

ایک پرہیزگار ملازم اپنے سو روپیہ پر قناعت کرتا ہے۔ اور دوسرا سو روپیہ کا رشوت خوار
ملازم ایک مہینہ میں سو کے ایک ہزار کر لیتا ہے۔ اول کے سو عطر اور گلاب ہیں اور دوسرے
کے ایک ہزار پیشاب ہیں۔

صدقہ اور خیرات کی مثال مسہل کی سی ہے کہ مسہل سے بدن دبلا اور پتلا تو ہو جاتا ہے مگر طبیب
اور ڈاکٹر جانتا ہے کہ یہ تندرستی ہے۔ بدن سے فاسد مادہ نکل گیا اور سود اور رشوت کی مثال ورم
کی سی ہے اگر کسی کے منہ اور ہاتھ اور پیر پر ورم آجاتے تو نادان اس کو فربہ سمجھتا ہے اور طبیب
اور ڈاکٹر اس ورم کو دیکھ کر پیغام موت سمجھتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کسی ناشکرے اور گنہگار سے راضی نہیں ہوتا اور ظاہر ہے کہ اس سود خوار کی
اس سے بڑھ کر کیا ناشکری ہوگی کہ خدا نے اس کو مال دیا اور صاحب مال ہونے کے باوجود اس سے نہ تو [illegible]
اس نعمت کے شکر میں کسی محتاج کو کچھ صدقہ اور خیرات دے دیتا اور اگر صدقہ اور خیرات بھی اس کو
دو بھر ہوا تھا تو کم از کم بلا سود کے اس کو قرض ہی دے دیتا بھلا اس سے بڑھ کر خدا کی نعمت کی
کیا ناشکری ہوگی۔ ایسے ناسپاس اور ناشکروں کے مال میں اللہ برکت نہیں دیتا۔ اور صدقات اور

خیرات میں جو خیر و برکت ہوتی ہے وہ ایمان اور اعمال صالحہ کا ثمرہ ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق جو لوگ ایمان لاتے یعنی اللہ کے تمام احکام کو مانا اور جس چیز کو خدا نے حلال اور حرام کیا اسی کے مطابق اس کو حلال اور حرام سمجھا اور نیک عمل کیے اور نماز کو قائم کیا اور زکوٰۃ ادا کی ایسے لوگوں کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت دیتا ہے ان کو اپنے اعمال اور خیرات کا بدلہ اور ثواب ملے گا اپنے پروردگار کے پاس یعنی آخرت میں اور قیامت کے دن ان پر کسی قسم کا خوف نہ ہوگا اور نہ یہ لوگ غمگین ہوں گے۔ بخلاف ان لوگوں کے جنہوں نے حلال اور حرام میں فرق نہ کیا وہ طرح طرح کی مصیبتوں اور بلاؤں میں گرفتار ہوں گے۔

اے ایمان والو ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کرو اور جو سود تمہارا لوگوں کے ذمہ باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہو یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے وہ لے چکے اب ممانعت کے بعد جو سود باقی رہ گیا ہے اس کے لینے اور مانگنے کی اجازت نہیں۔ ایمان کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جس چیز کی ممانعت کر دی جائے اس کو چھوڑ دیا جائے۔ پس اگر تم اس حکم کے بعد ایسا نہ کرو یعنی باقیماندہ سود کو نہ چھوڑو تو خبردار ہو جاؤ تم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کے لیے یعنی اگر تم اس حکم پر عمل نہ کرو تو سمجھ لو کہ خدا اور اس کے رسول کے وفاداروں کی فہرست سے تمہارا نام کٹ گیا اور خدا اور اس کے رسول کی طرف سے تمہاری گرفتاری کے احکام جاری ہوں گے اور گرفتاری کے بعد تم کو حسب قواعد شریعت اور حسب احکام قتل کیا جائے گا یا قید میں رکھا جائے گا اور اسلامی حکومت ان احکام کو تم پر جاری کرے گی۔ اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہارے اصل مال اور راس المال تم کو مل جائے گا اس حکم کے بعد نہ تم کسی پر ظلم اور زیادتی کرو اور نہ تم پر کوئی ظلم اور زیادتی کی جائے۔ یعنی جو سود تم لے چکے ہو اگر اس کو تمہارے اصل مال میں محسوب کر لیا جائے تو وہ تم پر ظلم ہے۔ اور ممانعت کے بعد جو سود چڑھا ہے وہ اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے اور تمہارا قرضدار اگر مفلس اور تنگدست ہے تو اس کو فراخی کے زمانہ تک مہلت دینی چاہیے اور اگر تم اس کو بالکل معاف کر دو تو تمہارا یہ صدقہ کرنا تمہارے لیے بہت ہی بہتر ہوگا کہ سود تو کیا لیتے اصل ہی معاف کر دیا۔ اگر تم جانتے ہو کہ مہلت دینا صدقہ کرنے اور معاف کرنے کی کیا فضیلت ہے۔ جس فضیلت کو تم حاصل کر سکو اس میں دریغ نہ کرو اور اس دن کی پیشی سے ڈرتے رہو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور ہر شخص کو اس کے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی اور ان پر کسی قسم کا ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ لہٰذا جو شخص دنیا میں مقروض کے ساتھ چشم پوشی اور نرمی کا معاملہ کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے ساتھ اپنے حقوق میں چشم پوشی اور نرمی فرمائیں گے۔

فوائد و لطائف

(۱) جو شخص سود کو حلال سمجھے وہ باجماع امت کافر اور مرتد ہے اور اگر سود کو حلال تو نہیں سمجھتا

www.ahlehaq.org

مگر پھر بھی باز نہیں آتا تو بادشاہ اسلام کے ذمہ ایسے شخص کو قید کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ توبہ کرے اور اگر کوئی اس قسم کی جماعت اور طاقت ہے جن کا قید کرنا مشکل ہے تو بادشاہ اسلام کے ذمہ ایسی جماعت سے جہاد اور قتال واجب ہے۔ اور یہی حکم ہے ہر اس شخص کا جو فرائض کو چھوڑ دے، مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کو یا علی الاعلان گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا، وہ اس پر اڑا رہے۔ تفصیل کے لیے ابوبکر رازی جصاص کی احکام القرآن صفحہ ۴۷۳/۱ کی مراجعت کریں یا تفسیر مظہری دیکھیں۔

(۲) قال جعفر الصادق حرم الله الربا ليتقارض الناس۔

امام جعفر صادقؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے سود کو اس لیے حرام فرمایا تاکہ قرض سے ایک دوسرے کی مدد کریں۔

وعن ابن مسعود عن النبي صلى الله عليه وسلم قرض مرتين يعدل صدقة مرة اخرجه البزار تفسير قرطبي ص۳۶۳

عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی کو دو مرتبہ قرض دینا ایک مرتبہ صدقہ دینے کے برابر ہے۔

(۳) حرام مال سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ سود اور رشوت کا جو پیسہ اس کے پاس ہے وہ صاحب حق کو واپس کرے یا اس سے معاف کرائے۔ اور اگر اس شخص کو وہ تلاش کرنے کا امید نہیں جس کو پانا ممکن ہو تو اس کی طرف سے خیرات کرے اور ایسے مصرف میں اس کو خرچ کرے جس میں اسلام اور مسلمانوں کا نفع اور فائدہ ہو۔ اور اگر کسی کی کل آمدنی حرام ہو تو سب کا خیرات کرنا واجب اور فرض ہے۔ سوائے ستر عورت کے کپڑے کے کسی شے کا اپنی ملک میں رکھنا جائز نہیں۔ جو کیا ہے اس کو بھگتنا پڑے گا۔ تفصیل کے لیے تفسیر قرطبی صفحہ ۳۶۶ ج ۳ کی مراجعت کریں۔

(۴) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ حرام مال پر زکوٰۃ نہیں۔ لہٰذا جس شخص کے پاس سود یا رشوت کا کروڑ روپیہ بھی جمع ہو اس پر زکوٰۃ نہیں۔ زکوٰۃ حلال مال پر واجب ہوتی ہے۔ جو مال سود یا رشوت یا خیانت یا چوری سے حاصل کیا جائے وہ دوسروں کا حق ہے اس پر زکوٰۃ کیسے واجب ہو۔ جو شخص حرام مال کا صدقہ کرے اور اللہ سے ثواب کی امید رکھے تو اندیشہ کفر کا ہے۔ بارگاہ خداوندی میں ناپاک اور گندی چیز پیش کرنا اور پھر اس پر اس کی رضا اور خوشنودی کی امید رکھنا کمال بے ادبی اور گستاخی ہے۔

(۵) احکام پر زور کر کے وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ پر ختم فرمایا۔ تاکہ دنیا اور اہل دنیا کا فنا اور زوال اور آخرت کی طرف سب کا رجوع کرنا اور ذرہ ذرہ کا حساب ہونا نظروں میں گھوم جائے اور دنیا کے حریص اور دلدادہ ہوش میں آجائیں۔ دنیا کے بیماروں کا علاج سوائے آخرت کی یاد کے کچھ نہیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ

اے ایمان والو! جب تم معاملت کرو ادھار کا کسی

أَجَلٍ مُّسَمًّى فَٱكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ

وعدہ مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہئے کہ لکھ دے تمہارے

كَاتِبٌۢ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَن يَكْتُبَ

درمیان کوئی لکھنے والا انصاف سے، اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے

كَمَا عَلَّمَهُ ٱللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ ٱلَّذِى

جیسا سکھایا اس کو اللہ نے سو وہ لکھے اور بتلاتا جاوے جس پر

عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ وَلْيَتَّقِ ٱللَّهَ رَبَّهُۥ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ

حق دینا ہے اور ڈرے اللہ سے جو رب ہے اس کا اور نہ کم کرے

شَيْـًٔا ۚ فَإِن كَانَ ٱلَّذِى عَلَيْهِ ٱلْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ

اس میں سے کچھ، پھر اگر جس شخص پر دینا آیا بےعقل ہے یا

ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ

ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلا دے اس کا اختیار

وَلِيُّهُۥ بِٱلْعَدْلِ ۚ وَٱسْتَشْهِدُواْ شَهِيدَيْنِ مِن

والا انصاف سے اور شاہد کرو دو شاہد اپنے

رِّجَالِكُمْ ۖ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَٱمْرَأَتَانِ

مردوں میں سے پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں

مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ ٱلشُّهَدَآءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَىٰهُمَا

جن کو پسند رکھتے ہو شاہدوں میں، کہ اگر بھول جاوے ایک عورت

فَتُذَكِّرَ إِحْدٰىهُمَا الْأُخْرٰى ۚ وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ

تو یاد دلاوے ایک کو وہ دوسری، اور انکار نہ کریں گواہ

إِذَا مَا دُعُوْا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ

جس وقت بلائے جاویں اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو یا

كَبِيْرًا إِلٰٓى أَجَلِهٖ ۚ ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَأَقْوَمُ

بڑا، جس کے وعدہ تک اس میں خوب انصاف ہے اللہ کے ہاں اور درست

لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰٓى أَلَّا تَرْتَابُوْٓا إِلَّآ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً

رہتی ہے گواہی اور نزدیک ہے کہ تم کو شبہ نہ پڑے، مگر ایسا کہ سودا ہو دو بدو

حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ

لیتے دیتے ہو اس کو آپس میں تو گناہ نہیں تم پر کہ

أَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۗ وَأَشْهِدُوْٓا إِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ

نہ لکھو اس کو، اور گواہ کر لیا کرو جب سودا کرو اور نقصان نہ کیا

كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۬ وَإِنْ تَفْعَلُوْا فَإِنَّهٗ فُسُوْقٌ

جاوے لکھنے والا اور نہ گواہ، اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات

بِكُمْ ۗ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ

ہے تمہارے اندر، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ سب چیز سے

عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا

واقف ہے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ لکھنے والا تو گرو ہاتھ

فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ۖ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

میں رکھنی چاہئے، پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا تو چاہئے

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ

پورا کرے جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رب

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَن يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ

ہے اس کا اور مت چھپاؤ گواہی کو اور جو کوئی اس کو چھپاوے تو بیشک گنہگار ہے

قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿٢٨٣﴾

دل اس کا۔ اور اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

احکام قرض و رہن

قال تعالیٰ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ ۔ الخ ۔۔ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ

ربط: حق تعالیٰ نے صدقہ اور خیرات کے فضائل کے بعد سود کی مذمت بیان فرمائی اور چونکہ سود کی ضرورت اکثر قرض اور ادھار کی حالت میں پیش آتی ہے اس لیے سود کے بعد قرض اور ادھار کے احکام بیان فرماتے ہیں تاکہ سود سے بچیں جو نہیں اس طرح بھی محفوظ رہے۔ نیز صدقہ اور ربا اور دَین تینوں ان معاملات میں پہلا محض رحمت ہے اور مقتضائے شفقت ہے اور دوسرا محض ظلم ہے اور مقتضائے حرص و ہوا ہے اور تیسرا محض عدل اور انصاف ہے اور مقتضائے مروت ہے اس لیے آئندہ آیات میں دَین کے احکام بیان کیے تاکہ حاجتمند کی ضرورت پوری ہو جائے اور قرض دینے والے کا مال ضائع اور تلف ہو جانے سے محفوظ ہو جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں اے ایمان والو! جب تم کسی سے ایک معین مدت تک ادھار کا معاملہ کیا کرو خواہ قیمت ادھار ہو یا وہ چیز ادھار ہو جس کو خریدنا مقصود ہے۔ جیسے بیع سلم تو اس کو لکھ لیا کرو تاکہ آئندہ کسی قسم کا جھگڑا پیش نہ آئے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ امر استحباب کے لیے ہے۔ لہذا اگر نہ لکھے تو کوئی حرج نہیں۔ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ یہ امر وجوبی ہے۔

فائدہ: بیع کی چار قسمیں ہیں (۱) بیع الدین بالدین یعنی مبیع اور قیمت دونوں ادھار ہوں۔ یعنی ادھار کو ادھار کے بدلہ میں فروخت کرنا یہ بیع بالاجماع باطل ہے (۲) بیع العین بالدین یعنی مبیع نقد ہو اور قیمت ادھار ہو۔ یہ صورت بالاجماع جائز ہے (۳) بیع الدین بالعین یعنی قیمت نقد ہو اور مبیع ادھار ہو اسی کو بیع سلم کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ[1] فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور

[1] قال ابن عباسؓ ہذہ الآیۃ نزلت فی السلم خاصۃ کذا فی تفسیر القرطبی ص ۳۷۷ ج ۳۔

چونکہ بیع سلم کی اجازت کے لئے نازل ہوئی مگر بیع سلم کے لئے یہ شرط ہے کہ معاملہ کے وقت مدت اور مبیع کی نوع اور قسم نیز اس کی مقدار اور نرخ سب مقرر کرلیا جائے تاکہ بعد میں کوئی نزاع پیش نہ آئے

(۳) بیع العین بالعین یعنی مبیع اور قیمت دونوں نقد ہوں۔ حق جل شانہ نے بیع کی اس قسم کو آخر آیت میں تجارت حاضرہ سے تعبیر فرمایا ہے کہ قال تعالیٰ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا۔ جس کا حکم یہ فرمایا کہ تجارۃ حاضرہ میں بیع سلم کی طرح دستاویز لکھنے کی ضرورت نہیں، البتہ دو گواہوں کی گواہی کرالینی چاہئے کہ کل کلاں کبھی تمہارے درمیان یہ دستاویز نہایت انصاف سے لکھے کہ نہ اس میں کوئی کمی کرے اور نہ زیادتی اور نہ کسی کی رعایت کرے، اور جو شخص لکھنا جانتا ہو اس کو چاہئے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو لکھنا سکھایا۔ پس اس نعمت کے شکریہ میں چاہئے کہ دوسروں کو اس کتابت سے نفع پہنچائے۔ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ لہٰذا اور جو شخص اس معاملہ وثیقہ اور دستاویز لکھوا رہا ہے تو اس کاتب کو چاہئے کہ لکھ دے، اور اس دستاویز اور وثیقہ کا مضمون وہ شخص بتلائے کہ جس کے ذمہ حق واجب ہے، یعنی جس کے ذمہ دین اور قرض ہے وہ خود لکھوائے تاکہ اس کا اقرار متحقق ہو جائے اور یہ حجت ہو، بخلاف قرض خواہ کے کہ اس کے قول کا اعتبار نہیں، جب تک خود قرض دار یعنی مقروض مدیون اقرار نہ کرے ثبوت قرض کے بعد علم نہ کرے اور چاہئے کہ لکھوانے والا یا لکھنے والا، یعنی مدیون اللہ سے ڈرے اور لکھوانے اور لکھنے میں حق سے ذرہ برابر کمی نہ کرے یعنی ٹھیک ٹھیک لکھے۔ پس اگر وہ شخص جس پر حق واجب ہے یعنی جس کے ذمہ دینا آتا ہے وہ کم عقل ہو یعنی دیوانہ یا دن چڑھا ہو کہ اپنا بھلا برا فرق نہ کرتا ہو اور انجام نہ سوچتا ہو، جیسے مبذر، بے جا صرف کرنے والا، یا ضعیف البدن ہو یعنی کم عمر ہو یا بہت بوڑھا ہو کہ اس کی عقل میں فتور آگیا ہو یا کسی اور وجہ سے خود نہ لکھوا سکتا ہو مثلاً گونگا ہو یا زبان نہ جانتا ہو یا قید میں ہو یا بیمار زیادہ ہو یا کسی جگہ ہو کہ جہاں کاتب نہ ہو یا پردہ نشین عورت ہو کہ وہ کاتب کے سامنے نہیں آسکتی، تو ایسے حالات میں اس کا مختار اور کارگذار ٹھیک ٹھیک طور پر لکھوا دے۔ اور لکھوانے اور معاملہ کے قلمبند ہو جانے کے بعد احتیاطاً اپنے مردوں میں سے دو گواہ بھی بنا لو یعنی دو آزاد مسلمان با عقل کو گواہ بنا لو۔ غلام اور کافر اور بچے کو گواہ نہ بناؤ۔ کیونکہ جب کتابت کے ساتھ شہادت بھی مل جائے گی تو نزاع اور مخاصمت کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا اور اگر گواہی کے لئے دو مرد میسر نہ آئیں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں گواہی کے لئے کافی ہیں، بشرطیکہ یہ سب ان لوگوں میں سے ہوں جن کو تم گواہ بنانے کے لئے پسند کرتے ہو یعنی ثقہ اور امین ہوں۔ فسق و فجور یا کمینے پن سے متہم نہ ہوں اور نہ دونوں میں کوئی ایسی قرابت ہو کہ جو شبہ اور تہمت کا باعث ہو۔ اور ایک مرد کی بجائے دو عورتوں کا حکم اس لئے مقرر کیا گیا کہ عورت بہ نسبت مرد کے اپنی فطری غفلت اور ذاتی قصور عقل کی وجہ سے اگر شہادت کے کسی جزو کو بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔ اور اس طرح شہادت کا مضمون مکمل ہو جائے

اور اگر سفر کی حالت میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز لکھنے کے لیے کوئی لکھنے والا تم کو میسر نہ آئے، تو تم کو لازم ہے کہ جس کو تم نے قرض اور ادھار دیا ہے، قرض کے عوض میں کوئی شے اس کے پاس رہن رکھ دو کہ جو اس کے قبضہ میں دے دی جائے۔

ف (۱) سفر کی قید احترازی نہیں کہ قیام کی حالت میں رہن جائز نہ ہو بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بہ نسبت حضر کے سفر میں رہن کی زیادہ حاجت پیش آتی ہے اس لیے آیت میں سفر کا خاص طور پر ذکر فرمایا ورنہ رہن سفر اور حضر دونوں حالتوں میں بالاجماع جائز ہے اور یہ رہن رکھنے کا حکم اس وقت ہے کہ جب ایک کو دوسرے پر اطمینان نہ ہو اور اگر ایک کو دوسرے پر اطمینان ہو اور ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو اور رہن اور لکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھتا ہو۔ پس اس شخص کو چاہیے کہ جس کا اعتبار کیا گیا اور بلا رہن اور بلا لکھے اس کو قرض دے دیا وہ اپنی امانت یعنی اپنے قرضہ کو پورا پورا ادا کر دے۔ یعنی جس نے اس کا اعتبار کیا ہے اس کا حق پورا پورا ادا کر دے۔

ف (۲) امانت سے قرضہ مراد ہے۔ قرضہ کو امانت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ امین ہونے کی وجہ سے بغیر تحریر اور بغیر رہن کے اس کو قرض دے دیا۔ اور اس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرے کہ نہ خیانت کرے اور نہ حق کا انکار کرے اور اے گواہو! جس وقت تمہاری شہادت کی ضرورت ہو اور بغیر تمہاری شہادت دیئے کسی کے حق کے ضائع اور تلف ہونے کا اندیشہ ہو خصوصاً جس وقت بغیر کسی رہن اور بغیر کسی تحریر کے کسی کو کوئی قرض دیا گیا ہو تو اس وقت تم اپنی شہادت کو مت چھپانا اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شہادت کو دل میں چھپا کر رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت زبان سے اس کو ظاہر نہیں کرتا تو بلا شبہ اس کا قلب بالذات اور بلا واسطہ گنہگار ہوتا ہے۔ اس لیے کہ کتمان شہادت بلا واسطہ قلب کا فعل ہے جس میں کسی عضو اور جارحہ کو بالکل دخل نہیں، اور قلب چونکہ رئیس الاعضاء ہے اس لیے اس کی معصیت بھی ام المعاصی ہوگی۔

حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اولاد آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس وقت تک وہ درست رہتا ہے تو سارا بدن درست رہتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ اور یاد رکھو کہ وہ ٹکڑا دل ہے (بخاری و مسلم)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خوب واقف ہے۔ تمہارے گواہی دینے اور نہ دینے اور شہادت کے چھپانے اور ظاہر کرنے کو بھی خوب جانتا ہے۔ جو شہادت تم نے دل میں چھپائی ہے اگرچہ لوگوں کو اس کا علم نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے۔

مسئلہ ۱: وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ میں گواہ بنانے کا حکم استحبابی ہے۔

مسئلہ ۲: سوائے شہادت زنا کے ہر امر کی شہادت کے لیے دو ثقہ آدمیوں کی گواہی کافی

ہے۔ البتہ زنا کی شہادت کے لیے چار مردوں کی گواہی ضروری ہے کیونکہ زنا کا تعلق مرد اور عورت دونوں سے ہے، اس لیے چار آدمیوں کی گواہی ضروری ہوئی کہ گویا دو گواہ مرد کے زنا کے لیے اور دو گواہ عورت کے زنا کے لیے۔ نیز شریعت کا مقصود پردہ پوشی بھی مطلوب ہے۔

مسئلہ ۳ پھر سوائے زنا کے حدود اور قصاص میں دو مردوں کی گواہی کافی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی گواہ عورت نہ ہو۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں زہریؒ سے منقول ہے مضت السنة من لدن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والخلیفتین بعدہ ان لا شہادة للنساء فی الحدود۔ یعنی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کے زمانہ سے یہ سنت جاری ہے کہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی گواہی معتبر نہیں۔

مسئلہ ۴ باقی ان کے سوا اور تمام معاملات میں خواہ مالی ہوں یا غیر مالی دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی معتبر ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ

اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات یا چھپاؤ گے

يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ

حساب لے گا تم سے اس کا اللہ، پھر بخشے گا جس کو چاہے

وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ

اور عذاب کرے گا جس کو چاہے، اور اللہ ہر چیز پر

قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ

قادر ہے۔ مانا رسول نے جو کچھ اترا اس پر اس کے رب کی طرف

وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

سے اور مسلمانوں نے۔ سب نے مانا اللہ کو اور اس کے فرشتوں کو اور کتابوں کو

وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا

اور رسولوں کو، ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے رسولوں میں اور بول اٹھے

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

ہم نے سنا اور قبول کیا، تیری بخشش چاہتے ہیں اے رب ہمارے اور تجھی تک لوٹ کر جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی شخص کو مگر جو اس کی گنجائش ہے اسی کو ملتا ہے جو کمایا

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۗ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا

اور اسی پر پڑتا ہے جو کیا، اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو اگر ہم بھولیں

اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا

یا چوکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا

رکھا تھا تو نے اگلوں پر، اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے

لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۚ وَاغْفِرْ لَنَا ۚ وَارْحَمْنَا ۚ

جس کی طاقت نہیں ہم کو، اور درگزر کر ہم سے اور بخش ہم کو اور رحم کر ہم پر

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

تو ہمارا صاحب ہے، مدد کر ہماری قوم کافروں پر۔

خاتمۂ سورۃ

مشتمل بر تذکیر جلال خداوندی و عظمت و تحذیر از محاسبۂ آخرت و تلقین ایمان و سمع و طاعت و تعلیم دعا فلاح دارین در آخرت عفو و مغفرت و در دنیا فتح و نصرت

قال تعالیٰ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ... الیٰ ... فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۔

ربط: یہ رکوع سورۂ بقرہ کا آخری رکوع ہے جس پر سورۂ بقرہ ختم ہو رہی ہے۔ یہ عجیب خاتمہ ہے جس کو ابتدائے سورت سے بھی خاص ربط ہے اور آخر سورت سے بھی اور درمیان سورت سے بھی اور مجموعہ سورت سے بھی۔

ان آیات سے پہلے جو آیتیں گذریں ان میں کتمان شہادت کو دل کا گناہ بتلایا تھا۔ اب ان آیات میں اس امر کو بیان فرماتے ہیں کہ قلب کے کس خیال پر مؤاخذہ ہے اور کس پر نہیں۔ نیز گذشتہ آیات میں یہ حکم دیا تھا کہ امانت میں خیانت نہ کرو اور اللہ کا خوف دل میں رکھو اور اس کے عذاب اور مؤاخذہ سے ڈرتے رہو۔ اب ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی قدرت اور اس کے محاسبہ اور مؤاخذہ کو بیان فرماتے ہیں۔ اور ابتداء سورت سے یہ مناسبت ہے کہ ابتداء سورت میں متقین کی صفات کا ذکر تھا کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ سب کی بلا تفریق کے تصدیق کرتے ہیں اور آخرت کا خاص طور پر یقین رکھتے ہیں اور عبادت بدنیہ اور مالیہ دونوں سے بجا لاتے ہیں۔ اب اس سورت کے آخری رکوع میں پھر انہی متقین کی مدح ہے۔ اور ان کی سمع و طاعت اور بارگاہ خداوندی میں ان کی دعا و مناجات کا تذکرہ ہے۔ نیز ابتداء سورت میں ایمان بالغیب کا ذکر تھا کہ پرہیزگار لوگ محض خدا اور رسول کے اعتماد پر بے دیکھی چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں مگر اس غیب کی تفسیر مذکور نہ تھی کہ غیب سے کون کون سی چیزیں مراد ہیں۔ اب اس آخری رکوع میں اس غیب کی تفسیر کی طرف اشارہ فرمایا کہ غیب سے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور اس کے نازل فرمودہ صحیفے اور کتابیں اور تمام پیغمبر مراد ہیں۔ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ یہ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کی تفسیر ہے یعنی يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ میں لفظ غیب سے ان چیزوں پر ایمان لانا مراد ہے جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کے شروع میں اس کی توضیح گذر چکی ہے دوبارہ وہاں دیکھ لیا جائے اور نیز سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا یہ

لفظ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ کی تفسیر ہے اور غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ اور رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ تا آخر یعنی معافی اور مغفرت اور رحمت کی درخواست یہ سب وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کی تفسیر ہے۔ اور ایمان اور تقویٰ کے ساتھ قوم کافرین پر فتح اور نصرت یہ ہدایت بھی ہے اور دینی اور دنیوی فلاح اور کامیابی بھی ہے گویا کہ یہ مضمون اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کی تفسیر ہے۔ اور یہی مضمون درمیان سورت بیان کیا گیا تھا یعنی لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ الخ یہی مضمون تھا جس کا آخری رکوع میں ذکر رہا ہے۔ غرض یہ کہ سورت کی ابتدا بھی مسئلہ ایمان کی تحقیق اور متقین کی مدح سے ہوئی اور اس کی انتہا بھی اسی مضمون پر ہوئی اور وسط میں بھی ایک عجیب عنوان سے اسی مسئلہ کو بیان فرمایا اور یہ بلاغت کی انتہا ہے کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک کلام یکساں ہو۔ اول اور آخر اور وسط سب ایک دوسرے سے مربوط اور متناسب ہوں۔

اور اسی سورت کا دل آیت الکرسی ہے جس میں حق جل شانہ کی صفت حیات اور قیومیت کا بیان تھا اور مومن کی باطنی اور روحانی حیات اور قیومیت کا دار و مدار ایمان اور طاعت پر ہے جس کا اس رکوع میں تفصیل کے ساتھ بیان ہے۔

اور مجموعہ سورت کے ساتھ یہ ربط ہے کہ یہ سورت معاش اور معاد کے متعلق بیشتر ہر قسم کے احکام پر مشتمل ہے اس لیے مناسب ہوا کہ خاتمہ احکام پر حق جل شانہ کی مالکیت اور اس کے احاطہ علم و قدرت اور اس کے محاسبہ اور مواخذہ کو ذکر کیا جائے تاکہ احکام خداوندی کی تعمیل میں کوتاہی نہ کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الٰی آخر السورۃ۔ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے جس میں تمہارا دل اور اس کے خطرات بھی داخل ہیں۔ وہی ان سب کائنات کا مالک ہے کیونکہ اسی نے ان سب کو پیدا کیا ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو۔ کما قال تعالیٰ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ اور جب تم یہ سمجھ گئے تو جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خالقیت تمام کائنات کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم قدیم بھی تمام کائنات کو ہر اعتبار سے محیط ہے۔ تو اب یہ سمجھو کہ جو اخلاق اور اعمال تمہارے دل اور ضمیر میں مضمر اور پوشیدہ ہیں ان کو زبان یا اعضاء اور جوارح سے ظاہر کرو یا دل ہی میں چھپائے رکھو ان سب پر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تم سے حساب لے گا اور پھر محاسبہ کے بعد جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ جس ظاہر اور پوشیدہ کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس پر چاہے گا سزا دے گا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔ اگر چاہیں تو صغیرہ پر بھی عذاب دے سکتے ہیں اور چاہیں تو کبیرہ کو بھی بلا توبہ ہی معاف فرما دیں۔ تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے کہ اعمال قلبیہ اور قالبیہ

اپنی تقصیرات پر طلب مغفرت ہے اور بعد ازاں یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ طاقت اور مقدور سے زیادہ کسی کو اپنے احکام کا مکلف نہیں بناتے اور قیامت کے دن محاسبہ اور مواخذہ انہی افعال پر ہوگا جو اختیاری ہیں۔ غیر اختیاری امور پر محاسبہ اور مواخذہ نہ ہوگا۔

اب آئندہ آیت میں ایک ایسی دعا کی تعلیم فرماتے ہیں۔ جس میں خطا اور نسیان کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے اس لیے کہ خطا اور نسیان اگرچہ بظاہر غیر اختیاری ہیں اور داخل تکلیف نہیں لیکن من وجہ اختیاری بھی ہیں اس لیے کہ بسا اوقات خطا اور نسیان غفلت اور کوتاہی اور بے توجہی اور بے احتیاطی کی بنا پر پیش آتا ہے اور بے توجہی اور لاپرواہی انسان کا اختیاری فعل ہے اس لیے عقلاً اور شرعاً خطا اور نسیان پر بھی مواخذہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اگر خادم سے کسی غفلت اور بے توجہی کی بنا پر کوئی بھول چوک ہوجائے تو اس پر مواخذہ اور باز پرس ہوتی ہے کہ یہ غلطی کیوں ہوئی اور حضرت آدمؑ کے قصہ میں حق جل شانہ کا یہ ارشاد فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا بھی اسی کا مؤید ہے۔ اور اسی وجہ سے شریعت مطہرہ نے بعض مواقع خطاء میں دیت اور کفارہ کو واجب قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ خطاء انسان کے تساہل اور عدم احتیاط کی بنا پر پیش آئی ہے جو انسان کا فعل اختیاری ہے اور داخل تکلیف ہے اور قابل مواخذہ ہے۔ اس لیے حق جل شانہ نے ہم کو یہ دعا سکھلائی کہ اپنی تقصیرات کو پیش نظر رکھ کر اس طرح دعا مانگا کرو۔ اے ہمارے پروردگار تیرا حق عبودیت اور حق ربوبیت ہم سے کہاں ادا ہوسکتا ہے۔ بھول چوک ساتھ لگی ہوئی ہے اس لیے تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ اگر ہم تیرے کسی حکم یعنی امر و نہی کو بھول جائیں اور بھولنے سے اس کی تعمیل نہ کرسکیں یا کسی غفلت اور کوتاہی کی بنا پر چوک جائیں کہ امر کو نہی اور نہی کو امر سمجھ جائیں یا ٹھیک عمل کرنے میں غلطی کر جائیں تو ہم پر مواخذہ اور دارو گیر نہ فرما۔

فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خطاء اور نسیان پر مواخذہ عقلاً و شرعاً ممتنع نہیں۔ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے غیر اختیاری طور پر افعال کا صدور ہوتا ہے۔ مگر عقلاً و شرعاً شراب پینے والا مواخذہ سے بری نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ افعال اگرچہ غیر اختیاری ہیں مگر ان غیر اختیاری افعال کا سبب تو فعل اختیاری ہے یعنی نشہ آور چیز کا استعمال۔ اس شخص نے اپنے اختیار سے عقل و ہوش سے حفاظت نہیں کی اس لیے قابل مواخذہ ہے۔ نسیان اگرچہ بالذات غیر اختیاری ہے مگر اس کا سبب اکثر اختیاری ہوتا ہے اسی وجہ سے بسا اوقات بھولنے والے پر لاابالیت اور بے پروائی کا الزام عائد کرتے ہیں اور خطاکار پر غفلت اور بے احتیاطی اور بے توجہی کا الزام رکھتے ہیں۔

عارف رومی قدس سرہ اسی کو فرماتے ہیں۔

لا تؤاخذ ان نسینا شد گواہ — کہ بود نسیان بوجہے ہم گناہ

زانکہ استکمال تعظیم او نکرد — ورنہ نسیان در نیاوردے نبرد

عبادت کرسکیں اور بلا کسی دشمن کے خوف کے قانون کو جاری کرسکیں۔

(۴) حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں۔

ف تو نکردی خود ندی مارا بخود نطلبیہ   میل نفس خود ولطف ناگفتۂ ما

اگر ہماری بس درخواست کے منظور کرنے کا ارادہ نہ ہوتا تو ہم کو درخواست کرنا ہی نہ سکھاتے اور نہ درخواست کرنے کا حکم دیتے۔

این دعا از تو اجابت ہم ز تو   لطف تو بر ما از حشمت صد کرم

معاذ بن جبلؓ سے منقول ہے کہ جب سورۃ بقرہ ختم کرتے تو آمین کہتے۔

الحمد للہ آج ۱۰ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۱ھ یوم دوشنبہ بوقت چاشت مقام لاہور میں سورۃ بقرہ کی تفسیر ختم ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرماویں اور باقی تفسیر کی تکمیل کی توفیق عطا فرماویں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ، آمين يا رب العالمين برحمتك يا أرحم الراحمين۔ يا ذا الجلال والإكرام۔

الحمد للہ آج ۱۱ محرم الحرام یوم سہ شنبہ ۱۳۹۲ھ کو نظرثانی سے فراغت ہوئی۔

فللہ الحمد والمنۃ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تفسیر سورۂ آل عمران

آیاتها ۲۰۰ (۳) سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ ۸۹ رکوعاتها ۲۰

یہ سورت مدنیہ ہے جس میں دو سو آیتیں اور بیس رکوع ہیں، چونکہ اس سورت میں آل عمران کا ذکر ہے اس لئے اس سورت کا نام سورۂ آل عمران ہے اور اس سورت کا نام مجادلہ بھی ہے اس لئے کہ یہ سورت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے مجادلہ اور مباہلہ کے بارے میں نازل ہوئی جیسا کہ عنقریب شان نزول سے واضح ہوگا۔

(ربط) اس سورت کو سورۂ بقرہ کے ساتھ متعدد وجوہ سے ربط ہے۔

وجہ اول

سورۂ بقرہ کی ابتداء کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ بیان کیا گیا کہ کس نے کتاب الٰہی سے ہدایت حاصل کی اور کس نے اس سے اعراض کیا، اسی طرح اس سورت کا آغاز بھی کتاب الٰہی کے ذکر سے ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بیان کیا گیا کہ سلیم الطبع لوگوں نے اس کی ہدایت کو قبول کیا اور زائغین اور کج طبیعت والے بجائے محکمات کے متشابہات کی پیروی کی اور اپنے مطلب اور خواہش اور غرض کے مطابق آیات الٰہیہ کی تاویلیں کیں اور لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کیا ایسے لوگ اصطلاح شریعت میں ملحد اور زندیق کہلاتے ہیں اور ملحد اور زندیق شریعت میں منافق کے حکم میں ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع میں منافقین کا ذکر تھا اور اس سورت میں ملحدین اور زندیقین کا ذکر ہے جن کو حق جل شانہ نے زائغین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

زیغ کے معنی میلان اور انحراف کے ہیں اور ملحد وہ شخص ہے جو دین میں ٹیڑھی راہ چلتا ہو۔ صراط مستقیم یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی راہ سے ہٹا ہوا ہو اور صحابہ و تابعین کے خلاف آیات کے نئے نئے معنی بیان کرتا ہو، جو شخص آیات قرآنیہ کے ایسے معانی بیان کرے جو اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ یعنی صحابہ و تابعین کے سمجھے ہوئے کے خلاف ہوں اور اس زمانہ کے مَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ یعنی یہود اور نصاریٰ کی تہذیب اور تمدن کے مطابق ہوں تو یقین کر لو کہ یہ شخص بلاشبہ صراط مستقیم سے ہٹا ہوا ہے اور حسب ارشاد باری فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ میں داخل ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایسے لوگوں سے بچتے رہنا چاہئے۔ یعنی ان کی کتابوں کے دیکھنے سے پرہیز کرو۔

وجہ دوم

ربط کی دوسری وجہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر خطاب اور مباحثہ یہود سے تھا اور سورۂ آل عمران میں خطاب اور مباحثہ زیادہ تر نصاریٰ سے ہے اور یہود چونکہ نصاریٰ سے مقدم ہیں اس لیے سورۂ بقرہ کو سورۂ آل عمران سے پہلے لایا گیا۔

وجہ سوم

سورۂ بقرہ میں حضرت آدمؑ کی پیدائش کا ذکر تھا اور اس سورت میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا ذکر ہے۔ وقال تعالیٰ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ

وجہ چہارم

ہر سورۃ کا خاتمہ ایک خاص دعا پر ہے۔ سورۂ بقرہ کا خاتمہ کفار کے مقابلہ میں فتح و نصرت کی دعا پر ہوا جو دین کی ابتدائی حالت کے مناسب ہے اور سورۂ آل عمران کا خاتمہ دعاء حسن ثواب اور وعدۂ اعمال اور ایفاء مواعید کی درخواست پر ہوا جو مومنین متقین کے مناسب ہے جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں تھا۔

وجہ پنجم

سورۂ بقرہ کی ابتدا متقین اور مفلحین کے ذکر سے ہوئی اور اس سورت کا خاتمہ متقین اور مفلحین کے ذکر پر ہوا کما قال تعالیٰ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ اسی طرح سے اس سورت کی نہایت پہلی سورت کی بدایت میں مندرج ہو گئی اور سورۂ آل عمران کا اختتام سورۂ بقرہ کے افتتاح میں مندمج ہو گیا قرآن کریم جس طرح علوم و معارف اور فصاحت اور بلاغت کے اعتبار سے حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے اسی طرح باعتبار ربط کے بھی حد اعجاز کو پہنچا ہوا ہے۔

نکتہ

سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کا نام احادیث میں زہراوین آیا ہے جس کے معنی دو روشن سورتوں کے ہیں یوں تو ساری ہی سورتیں روشن ہیں لیکن وجہ یہ ہے کہ شاید سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے انوار و تجلیات باہم ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں اس لیے ان دونوں سورتوں کا نام زہراوین رکھا گیا ہو اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن سورۂ بقرہ اور آل عمران کے قرأت اور تلاوت پر مداومت کرنے والے قاری کو ایک تاج عطا کیا جائے گا نیز سنن ابی داود وغیرہ میں اسماء بنت یزید سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ان دو آیتوں میں ہے ایک سورۂ بقرہ کی یہ آیت وَاِلٰـھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اور سورۂ آل عمران کی یہ آیت الٓمّٓ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ اور یہ حدیث مسند ابن ماجہ میں بھی ہے، نیز اس سورت کا آغاز آیۃ الکرسی کے مضمون سے ملتا ہے جو قرآن کا دل ہے
پس کچھ عجیب نہیں کہ اس اشتراک کی وجہ سے بھی ان دونوں سورتوں کو زہراوین کہا گیا ہو۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے، جو بڑا مہربان ہے رحم والا

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ

اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں جیتا ہے۔ سب کا تھامنے والا۔ اتاری

عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ

تجھ پر کتاب تحقیق۔ ثابت کرتی اگلی کتاب کو

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى

اور اتاری تھی توریت اور انجیل۔ اس سے پہلے لوگوں کی

لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

ہدایت کو، اور اتارا انصاف جو لوگ منکر ہیں

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو

اللہ کی آیتوں سے ان کو سخت عذاب ہے۔ اور اللہ زبردست ہے

انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ

بدلہ لینے والا۔ اللہ اس پر چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں

وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ

اور نہ آسمان میں ۔ وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے ان کے پیٹ میں

كَيْفَ يَشَآءُ ۚ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

جس طرح چاہے۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا زبردست حکمت والا۔

اثبات توحید و بیان محکم در ابطال الوہیت عیسیٰ بن مریم و مناظرہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم با نصارائے نجران

قال اللہ تعالیٰ الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۔۔ الیٰ ۔۔ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

محمد بن اسحاق وغیرہ سے منقول ہے کہ سورۂ آل عمران کے شروع کی اسی آیتیں نصارائے نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ نجران علاقہ یمن میں ایک شہر کا نام ہے جو اس زمانہ میں عیسائیوں کا علمی مرکز تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی خبر جب اطراف اور اکناف میں پہنچی تو یہ خبر سن کر نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مناظرہ اور مباحثہ کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوا۔ اس وفد میں ساٹھ سوار تھے جن میں سے چودہ آدمی خاص طور پر بڑے شریف اور معزز تھے اور ان چودہ آدمیوں میں تین شخص ایسے تھے جو ان کا مرجع الامر تھے یعنی سب کا اُدنی اور ملجا تھے تمام کام انہیں تین کے مشورہ سے ہوتے تھے۔

ایک ان کا امیر اور سردار تھا جس کا نام عبدالمسیح تھا جو بڑا زیرک، وہ ہوشیار اور ذکی الطبع تھا۔ اور دوسرا اس کا وزیر و مشیر جس کا نام ایہم تھا۔ اور تیسرا ان میں کا سب سے بڑا عالم اور پادری تھا۔ جس کو وہ حبر اور سقف سمجھتے تھے اس کا نام ابو حارثہ بن علقمہ تھا۔ شاہان روم بھی پادری کی اس کے علم و فضل کی وجہ سے بڑی توقیر و تعظیم کرتے تھے۔ اور عیسائی بادشاہوں اور امیروں کی طرف سے اس کو بڑی بڑی جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ یہ لوگ حضرت مسیح کی الوہیت اور ابنیت کے قائل تھے ان کو خدا اور خدا کا بیٹا سمجھتے تھے جب مدینہ منورہ حضور پر نور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عیسیٰ کے بارے میں گفتگو شروع ہوئی گفتگو کرتے رہے

یہی تین آدمی تھے عبدالمسیح، ایہم، ابو حارثہ ان لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا استدلال یہ کیا کہ

۱۔ عیسیٰ علیہ السلام مُردوں کو زندہ کرتے تھے۔
۲۔ عیسیٰ علیہ السلام بیماروں کو اچھا کرتے تھے
۳۔ عیسیٰ علیہ السلام غیب کی باتیں بتاتے تھے۔
۴۔ عیسیٰ علیہ السلام مٹی کی صورتیں بناتے اور پھر ان میں پھونک مارتے اور زندہ ہو کر وہ پرندہ بن جاتے۔

اور ان تمام معجزوں کا قرآن کریم نے اقرار کیا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ خدا تھے۔
اور حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے پر اس طرح استدلال کیا کہ

۱۔ وہ بلا باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا کے بیٹے تھے۔
۲۔ نیز حضرت عیسیٰ نے گہوارہ میں کلام کیا ان سے پیشتر کسی نے گہوارہ میں کلام نہیں کیا۔ یہ بھی خدا کے بیٹا ہونے کی دلیل ہے۔

اور مسئلہ تثلیث یعنی حضرت عیسیٰ کے ثالث ثلاثہ ہونے پر یہ استدلال کیا کہ حق تعالیٰ جا بجا یہ فرماتے ہیں فَعَلْنَا کہ أَمَرْنَا وَخَلَقْنَا وَقَضَيْنَا ہم نے یہ کام کیا۔ ہم نے یہ حکم دیا ہم نے یہ پیدا کیا ہم نے یہ مقدر کیا یہ تمام صیغے جمع کے ہیں اور جمع کا اقل درجہ تین ہے پس اگر خدا تعالیٰ ایک ہوتا تو صیغہ جمع کا استعمال نہ ہوتا بلکہ بجائے صیغہ جمع کے مفرد کا صیغہ استعمال ہوتا اور یوں کہا جاتا فَعَلْتُ وَأَمَرْتُ وَخَلَقْتُ وَقَضَيْتُ میں نے کیا۔ میں نے حکم دیا، میں نے پیدا کیا۔ میں نے مقدر کیا یہ ان نازک دماغوں کے استدلالات تھے جن کو اپنے علم پر فخر اور ناز تھا جن کی حقیقت اہل عقل اور اہل فہم کی نظر میں اوہام اور خیالات سے زیادہ نہیں اب آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوابات اور ارشادات کو سنیئے۔

۱۔ فقال لهم النبي صلى الله عليه وسلم ألستم تعلمون أنه لا يكون ولد إلا وهو يشبه أباه قالوا بلى	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے وفد نے کہا کیوں نہیں۔ اور یہ سب کے نزدیک مسلم

ہے کہ خدا تعالیٰ بے مثل اور بے چون و بے چگون ہے کوئی شئے اس کے مشابہ نہیں۔

۲۔ قال ألستم تعلمون أن ربنا حي لا يموت وأن عيسى يأتي عليه الفناء قالوا بلى۔	بعد ازاں آپ نے وفد سے کہا کہ کیا تم کو معلوم ہے کہ خدا تعالیٰ زندہ ہے کبھی بھی اس کو موت نہیں آسکتی۔ اور

عیسیٰ علیہ السلام کو ضرور موت اور فنا آنے والی ہے۔ یعنی قیامت سے پہلے۔

وفد نے اقرار کیا کہ بے شک یہ صحیح ہے ایک نہ ایک وقت ان پر موت اور فنا ضرور آئے گی۔ اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر موت اور فنا کا طاری ہونا ناممکن اور محال ہے۔

تنبیہ

نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام مصلوب و مقتول ہو کر مر چکے تھے لیکن حضور پر نور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے الزام کے لیے یہ نہیں کہا کہ تمہارے عقیدہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام کو موت آچکی ہے اس لیے کہ یہ امر خلاف واقعہ ہے عیسیٰ علیہ السلام نہ مقتول ہوئے اور نہ مصلوب ہوئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے اور چند روز کے بعد وفات پائیں گے۔ جیسا کہ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے واضح ہے اس لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے وہی کلمہ نکلا جو واقع کے موافق تھا خلاف واقعہ چیز کا نبی برحق کی زبان سے نکلنا مناسب نہیں اگرچہ اس چیز کا ذکر محض بطور الزام ہو اور عجب نہیں کہ نصاریٰ نے اس کا اقرار اس لیے کیا ہو کہ وہ اتنی بات کو سمجھتے اور یہ خیال کیا ہو کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق ہم پر الزام اور حجت اور بھی پوری ہو جائے گی۔ نیز نصاریٰ میں مختلف فرقے تھے ایک فرقہ کا عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے۔ اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہونے کے بعد وفات پائیں گے۔ پس ممکن ہے کہ اس وفد کے لوگ اسی عقیدہ کے ہوں جو اسلام کے مطابق ہے۔

۳- قال ألستم تعلمون ان ربنا قيم على كل شيء يكلؤه و يحفظه و يرزقه فقالوا بلى قال فهل يملك عيسى من ذلك شيئا قالوا لا.

پھر آپ نے فرمایا کیا تم کو معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہی ہر چیز کے وجود کو تھامنے والے ہیں اور اس کے محافظ اور نگہبان اور سب کے روزی رساں ہیں انہوں نے کہا بے شک۔ آپ نے فرمایا کہ بتلاؤ کیا عیسیٰ علیہ السلام بھی ان میں سے کسی چیز کے مالک اور قادر ہیں یعنی کیا عیسیٰ علیہ السلام نے بھی مخلوقات کو وجود عطا کیا ہے اور اپنی قدرت سے ان کے لیے سامان بقا پیدا کیا ہے انہوں نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام تو ان چیزوں پر قادر نہیں۔

۴- قال ألستم تعلمون ان الله لا يخفى عليه شيء

پھر آپ نے فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز

الوہیت اور خدائی اسی کے لیے مخصوص ہے اس لیے کہ (۱) وہ بذاتہٖ زندہ ہے اور اس کی حیات ازلی اور ابدی ہے موت اور فنا کا اس کی ذات اور صفات میں امکان نہیں (۲) اور وہی تمام ممکنات کے وجود اور حیات کو تھامنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔

پناہ بلندی و پستی توئی ۔۔۔ ہمہ نیستند آنچہ ہستی توئی

قرار ہمہ ہست بر نیستی ۔۔۔ توئی آنکہ یک برقرار استی

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات نہ ذاتی ہے اور نہ ازلی اور ابدی۔ اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے سے وہ زندہ ہوئے ان کی حیات اور ان کی زندگی بلاشبہ حادث اور فانی ہے اور جس کا وجود اور جس کی حیات حادث اور زوال پذیر ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا اور نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے نہ تو مخلوقات کو کوئی وجود اور حیات عطا کی اور نہ ان کے لیے کوئی سامانِ حیات پیدا کیا اور نہ وہ کائنات کے وجود کے تھامنے اور قائم رکھنے پر قادر ہیں لہٰذا خدا کیسے ہو سکتے ہیں۔ (۳) نیز حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں۔ جس نے بندوں کی ہدایت کے لیے آپ پر ایک کتاب اتاری جو حق اور سچائی کو اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے۔ جو اس کی صفتِ کلام کا آئینہ ہے اور اس کے احکام اور قوانین کا ایک مجموعہ ہے۔ جس کی شان یہ ہے کہ وہ گزشتہ آسمانی کتابوں کی تصدیق و توثیق کرنے والی ہے اور اسی طرح حق تعالیٰ نے اس قرآن سے پہلے توریت اور انجیل کو لوگوں کی ہدایت کے لیے اتارا اور اللہ کی طرف سے پیغمبروں پر کتابوں کا اترنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اللہ رب العالمین احکم الحاکمین ہے اور انبیاء و مرسلین خدا نہیں بلکہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں جو احکام خداوندی کے پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اگر خدا ہوتے تو ان پر اللہ کی وحی اور اس کی کتاب نازل نہ ہوتی۔ وحی کا نزول بندہ پر ہوتا ہے خدا پر وحی نازل نہیں ہوتی۔

نیز کتبِ الٰہیہ اور صحفِ سماویہ سب کی سب توحید پر متفق ہیں کما قال تعالیٰ وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ لہٰذا تثلیث اور اقانیم کا عقیدہ تمام کتبِ الٰہیہ کے خلاف ہے۔ (۴) اور اتارے اللہ تعالیٰ نے معجزات تاکہ حق اور باطل کا خوب فرق ظاہر ہو اور دشمنانِ حق اس کے مقابلہ سے عاجز ہو کر حق تعالیٰ کی قدرت اور انبیاء کرام کی نبوت و رسالت کا یقین کر لیں معجزات اور خوارق عادات ایک طرف خداوند یکتا کی وحدانیت اور قدرت کی دلیل ہیں اور ایک طرف انبیاء کرام کی نبوت و رسالت کی برہان ہیں۔

لہٰذا تحقیق جن لوگوں نے خدا تعالیٰ کی نشانیوں کا انکار کیا اور خوارق عادات کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور انبیاء کرام کی نبوت کے قائل نہ ہوئے یعنی ان کو خدا کا برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ اور فرستادۂ خداوندی نہ مانا ان کے لیے نہایت سخت عذاب ہے۔ (۵) اور اللہ تعالیٰ

عزت والا اور زبردست اور صاحب انتقام ہے۔ جو شخص اس کے مقابلہ کے لیے سر اٹھاتا ہے اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اس عزیز مقتدر کے پنجہ قدرت سے نکل نہیں سکتا اور نہ اس عزیز منتقم کے انتقام سے بچ کر بھاگ سکتا ہے۔ اس جملہ میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ابطال الوہیت کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے وہ یہ کہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح صلیب پر لٹکائے گئے اور اپنی ایک جان بچا سکے اور نہ اپنے آپ کو دشمنوں کے پنجہ ظلم سے چھڑا سکے اور نہ ان سے کوئی انتقام لے سکے پس ایک عاجز اور مظلوم اور مغلوب کہ جس پر اس کے دشمن غالب آگئے ہوں خدا کہنا یا خداوند قادر مطلق کا بیٹا کہنا کیا کھلی ہوئی نادانی نہیں معبود عالم کے نزدیک خواری اور ذلت کا جمع ہونا ناممکن اور محال ہے۔ خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عزیز مقتدر ہو جیسا نصاریٰ کے نزدیک خدا کا دشمنوں کے ہاتھ سے ذلیل ہونا ممکن ہے۔ (۲) تحقیق اللہ تعالیٰ پر زمین اور آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ گزشتہ آیت میں حق تعالیٰ کے اقتدار کامل اور اختیار کامل کو بیان فرمایا اب اس آیت میں اس کے علم کامل کو بیان فرماتے ہیں یعنی جس طرح اس کی قدرت الٰہیہ تمام ممکنات کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی محیط ہے کوئی چھوٹی اور بڑی چیز اس کے علم سے غائب اور پوشیدہ نہیں اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسا علم محیط حاصل نہ تھا صرف اسی قدر جانتے تھے جتنا کہ حق تعالیٰ نے ان کو بتلا دیا تھا اور نصاریٰ نجران نے خود اس کا اقرار کیا اور موجودہ اناجیل سے بھی یہی ثابت ہے کہ مسیح علیہ السلام عالم الغیب نہ تھے بہت سی چیزیں ان پر مخفی رہتی تھیں جب تک وحی اور روح القدس کے بتلانے سے معلوم ہوتی تھیں۔ (۳) وہی خدا ہے جو ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں اور نقشے جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ کسی کو مرد اور کسی کو عورت کسی کو خوبصورت اور کسی کو بدصورت بنایا جس کی صورت اور نقشہ رحم مادر میں بنا ہو اور بطن مادر کی تاریکیوں سے نکل کر وہ اس دار فانی میں آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا اور پیتا اور پاخانہ اور پیشاب کرتا ہو معاذ اللہ وہ کس طرح خدائے قدوس اور خدا کا بیٹا ہو سکتا ہے خدا وہ ہے کہ جو اپنے ارادہ اور مشیت سے رحم مادر میں صورتیں اور نقشے بناتا ہے اور جو نقشہ اور صورت رحم مادر میں بنا ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا کیونکہ جو صورت بنتی ہے وہ مخلوق ہے اور خالق کی محتاج ہے اور خدا محتاج نہیں ہوتا اس لیے کہ ان صفات میں کوئی اس کا شریک اور سہیم نہیں لہٰذا وہی سزاوار ربوبیت اور شایان معبودیت ہے۔

خلاصۂ کلام

چونکہ خداوند قدوس ایک ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہی سب پر غالب ہے اور بڑی حکمت والا ہے جس کی قدرت اور حکمت کی کوئی انتہا نہیں اس نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مسیح کو بلا

باپ کے اور حضرت حواؑ کو بدون ماں کے اور حضرت آدمؑ کو بدون باپ اور ماں کے پیدا کیا۔ جس
مخلوق کو جس طرح چاہا پیدا فرمایا۔ اس کی حکمتوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے کہ
کس نگشود و نگشاید بحکمت این معما

فوائد و لطائف

۱۔ امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس سورت کا آغاز نہایت عجیب و غریب ہے جو اثبات توحید اور اثبات رسالت دونوں پر مشتمل ہے۔

اثبات توحید تو اس اعتبار سے ہے کہ صفات خداوندی کے بیان پر مشتمل ہے کہ خدا کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ حی اور قیوم اور عالم الغیب اور عزیز منتقم ہو۔ اور رحم مادر میں اولاد کی تصویر بنانے پر قادر ہو اور عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہ تھیں لہٰذا ثابت ہو گیا کہ وہ خدا نہ تھے۔ (جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے)

اور اثبات رسالت کی دلیل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا نبی اور رسول ہونا اور توریت اور انجیل کا ان پر نازل ہونا تم کو بھی تسلیم ہے اب بتلاؤ کہ توریت اور انجیل کے کتاب الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے جو دلیل ان کے لیے ہے۔ قرآن کے لیے اس سے بڑھ کر اور بدرجۂ اولیٰ دلائل موجود ہیں اور جس دلیل سے تم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو نبی مانتے ہو اسی طرح کی دلیل سے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ ناچیز کہتا ہے اثبات توحید اور اثبات رسالت کے علاوہ اثبات قیامت کی طرف بھی اشارہ ہے۔ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ اثبات قیامت کی دلیل ہے کہ جو خدا اپنی قدرت کاملہ سے پہلی مرتبہ زندہ کرنے پر قادر ہے وہ دوسری مرتبہ بھی زندہ کرنے پر قادر ہے اس طرح اس سورت کے مطلع میں اسلام کے اصول ثلاثہ توحید اور رسالت اور قیامت کے اثبات کے دلائل کی طرف اجمالی اشارہ ہو گیا۔

۲۔ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ میں اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی صورتوں اور شکلوں کا مختلف ہونا مادہ اور طبیعت کا اقتضاء نہیں اور نہ محض اتفاقی ہے بلکہ یہ اختلاف حق تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے بلکہ یہ تمام قادر علیم اور عزیز حکیم کی کارگیری ہے۔

۳۔ أَنْزَلَ الْفُرْقَانَ میں فرقان کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض نے فرقان سے معجزات مراد لیے اور بعض نے زبور مراد لی ہے اور بعض نے قرآن کریم مراد لیا ہے امام رازی کے نزدیک مختار یہ ہے کہ

اس آیت میں فرقان سے معجزات مراد لیے جاسکتے ہیں جیسا کہ ہم نے تفسیر میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعضی آیتیں پکی ہیں،

هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

سو جڑ ہیں کتاب کی، اور دوسری ہیں کئی طرف ملتی۔ سو جن کے دل

فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ

پھرے ہوئے ہیں، وہ لگتے ہیں ان کی ڈھب والیوں سے، تلاش

الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا

کرتے ہیں گمراہی اور تلاش کرتے ہیں ان کی کل بیٹھانی، اور ان کی کل کوئی نہیں جانتا سوا

اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ

اللہ کے، اور جو مضبوط علم والے ہیں، سو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے، سب

مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے، اور سمجھانے وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا

اے رب ہمارے دل نہ پھیر جب ہم کو ہدایت دے چکا، اور دے ہم کو اپنے پاس

مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَھَّابُ ۝ رَبَّنَآ

سے مہربانی، تو ہی ہے سب دینے والا۔ اے رب!

اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن، جس میں شبہ نہیں۔ بیشک اللہ

لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ⑨

خلاف نہیں کرتا وعدہ

تقسیم آیات بسوئے محکمات ومتشابہات
مع تقسیم سامعین بسوئے زائغین فہم وراسخین علم

قال اللہ تعالیٰ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ ... الی ... إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۔

جب دلائل واضحہ سے توحید کا اثبات اور تثلیث اور ابنیت کا رد ہو گیا تو نصاریٰ نے عاجز ہو کر بطور معارضہ یہ کہا کہ آخر آپ بھی حضرت مسیح کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ مانتے ہیں یہی الفاظ ہمارے مدعا کے اثبات کے لیے کافی ہیں۔

حق جل شانہ نے ان آیات میں ان کے اس شبہ کا جواب ایک عام ضابطہ اور قاعدہ کی شکل میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد صدہا اور ہزارہا شبہات اور اشکالات اور تزاحمات اور مناقشات کا خاتمہ ہو جاتا ہے وہ یہ کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں آیات خداوندی کی دو قسمیں ہیں ایک محکمات کہ جن کی مراد واضح اور متعین ہو اور جو بسبب ان کے مفہوم اور معانی میں الٹ پھیر کر کے اور ان آیات کے ظاہری الفاظ کو اپنی غرض پر نہ ڈھالا جا سکتا ہو یہی آیتیں اُمّ الکتاب اور اصل کتاب کہلاتی ہیں جو کتاب الٰہی اور شریعت اور تمام تعلیمات کی جڑ ہوتی ہیں۔ انہی پر دین اور شریعت کا دارومدار ہوتا ہے جیسے آیات توحید و تنزیہ وغیرہ۔

دوسری قسم کی آیات وہ ہیں جن میں ایک گونہ خفا اور ابہام ہوتا ہے وہ مراد لینے کی واضح اور متعین نہیں ہوتی اور بہت سے معنی کا ان میں احتمال ہوتا ہے۔ ان آیات کا حکم یہ ہے کہ ان کو بھی محکم کی طرف رجوع کر کے دیکھنا چاہیے جو معنی محکمات کے موافق ہوں ان کو لیا جائے اور جو معنی آیات محکمات کے خلاف ہوں ان کو رد کیا جائے۔

بعض آیات کو حق جل شانہ نے قصداً مجمل اور متشابہ نازل فرمایا ہے تاکہ بندوں کا امتحان کریں کہ کون صریح اور واضح امور یعنی آیات محکمات کا اتباع کرتا ہے اور کون ہے جو ان مجملات اور متشابہات کو اپنی غرض پر ڈھالتا ہے اور محکمات اور آیات واضحات سے پہلو تہی کرتا ہے اور ایک حکمت آیات متشابہات کے نازل کرنے میں یہ ہے کہ جب باوجود جد و جہد کے متکلم کی مراد متعین نہ کر سکیں تو اپنے قصور فہم کا اقرار کریں۔ اور یہ نادان عاقل جو ہمہ دانی کے دعوے دار بنے ہوئے تھے اس سے توبہ کریں اور

جن میں قصور علم اور قصور فہم کی وجہ سے اور دیگر بے شمار حقائق ہیں دسترس نہیں اسی طرح آیات متشابہات کو بھی ان کی فہرست میں شامل کرلیں مگر ایسی تاویلات سے پرہیز کریں کہ جو آیات بینات اور محکمات اور اسلام کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔

بعض کج رو آیات اور عبارات سے نصاریٰ نجران نے استدلال کیا ہے مثلاً روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے الفاظ سے، وہ سب کے سب اقسام متشابہات سے ہیں اور جن آیات میں حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بندہ اور پیغمبر ہونا صاف اور واضح طور پر بیان کیا ہے وہ آیات محکمات ہیں مثلاً قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تصریح کردی، اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ، اور مثلاً اِنَّ مَثَلَ عِيسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ، اور ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ، مثلاً جن بے شمار آیات میں حق تعالیٰ نے یہ امر واضح طور پر بیان فرمایا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور نہ اس کے کوئی بیٹا ہے مثلاً مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔

یہی آیات محکمات ہیں صاف طور پر غیر اللہ کی الوہیت اور ابنیت کا رد کیا گیا ہے ان سے روگردانی اختیار کرنا اور کلمۃ اللہ اور روح منہ جیسی آیات متشابہات کو لے دوڑنا اور ان کی ایسی تاویل کرنا جو صریح بینات اور آیات محکمات کے منافی ہو کج رو اور گمراہ لوگوں کا طریقہ ہے کہ جو لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے اور سیدھے راستہ سے ہٹانے کے لئے ایسا کیا کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا عزیز و حکیم وہی ذات ہے کہ جس نے اپنی حکمت سے تم پر ایک جامع اور کامل کتاب اتاری جس کی کچھ آیتیں محکم ہیں یعنی ظاہر المراد اور واضح المعنی ہیں جن کے معنی اور مطلب میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس نہیں جو شخص لغت کو جانتا اور زبان سے اور اصطلاحات شریعت سے واقف ہو اس پر ان کا مفہوم مشتبہ نہیں رہتا، یہی آیتیں کتاب الٰہی کی اصل اور جڑ ہیں یہی سماوی تعلیم کا دار و مدار ہے اور یہی آیتیں قرآن کا مغز ہیں۔

اور کچھ آیتیں اس کی متشابہ ہیں جن کی مراد میں کچھ خفا اور اشتباہ ہے جس کو باوجود زبان دان ہونے کے اور باوجود علوم عربیہ کے اور باوجود اصول شریعت سے واقف ہونے کے ان کی پوری پوری مراد واضح نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ عزیز اور حکیم ہے بندوں کو جتنا بتلانا چاہتے ہیں اتنی مقدار واضح فرما دیتے ہیں اور جس قدر نہیں بتلانا چاہتے اتنی مقدار اس میں خفا اور ابہام رکھ دیتے ہیں اور اس عزیز و حکیم کا حکم یہ ہے کہ جس چیز کو ہم نے ظاہر اور واضح کردیا اس کا اتباع کرو اور کتاب الٰہی کی جو چیز تم پر مخفی اور مشتبہ ہے اس پر بےچون و چرا ایمان لاؤ اور اس قسم کی آیات کی تفسیر میں اس کا پورا لحاظ رکھو کہ ان آیات کے کوئی معنی ایسے ہرگز ہرگز نہ بیان کئے جائیں جو آیات محکمات اور شریعت کے اصول مسلمہ کے خلاف ہوں۔ متشابہات کو محکمات کی طرف راجع کرو، امام ابومنصور ماتریدی

فرماتے ہیں کہ آیت محکم کی مراد عقل سے معلوم ہوتی ہے اور آیت متشابہ میں بدون نقل اور روایت کے عقل
کے دخل دینا ممکن نہیں۔ پس جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے۔ یعنی طور پر کسی کفر اور بدعت کی طرف مائل
ہیں تاہم کہ مسلمان بنیاد دل میں اپنے خیالات اور معتقدات چھپائے ہوئے ہیں سو یہ لوگ کتاب الٰہی میں سے
صرف آیات متشابہات کی پیروی کرتے ہیں تاکہ حق اور باطل کو مشتبہ بنا سکیں اتباع متشابہات
سے کبھی تو ان لوگوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ لوگوں کو الحاد اور بدعت کے فتنہ میں مبتلا کریں
اور لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے شکوک اور شبہات ڈالیں اور اس طرح مغالطہ دے کر
لوگوں کو گمراہی میں پھنسائیں اور کبھی غرض یہ ہوتی ہے کہ ان آیات متشابہات کی کوئی ایسی تاویل
تلاش کی جائے۔ جو ان کی خواہش اور غرض کے مطابق ہو اور کھینچ تان کر کے آیت کا ایسا مطلب
بیان کیا جائے جو ان کی رائے اور ہوائے نفسانی کے موافق ہو جیسے لوگ اپنی مطلب برآری کے
لیے آیات محکمات اور احادیث واضحات کی طرف نظر نہیں کرتے اور ہوائے نفسانی کی وجہ سے
آیات متشابہات کا پیچھا کرتے ہیں تاکہ ان کے خفاء اور ابہام کی وجہ سے ان میں کھینچ تان کر کے اپنا
مطلب نکال سکیں اور عوام کو دھوکہ دے سکیں۔ حالانکہ ان فتنہ پردازوں کی صحیح حقیقت اور یقینی مراد
سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ اس نے اپنے لطف و کرم سے جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہا کر دیا اور بقیہ
حصہ اپنی حکمت سے مخفی رکھنا چاہا وہ مخفی اور مشتبہ رکھا اور جو لوگ علم میں پختہ اور ثابت قدم ہیں جب
وہ آیات متشابہات کو دیکھتے ہیں کہ ان میں متعدد معانی کا احتمال ہے تو اپنی نفسانی خواہش اور طبعی میلان
کا ذرہ برابر بھی لحاظ نہیں کرتے بلکہ متشابہات کو محکمات کے ساتھ ملا کر معنی بیان کرتے ہیں جتنا کچھ ہیں
آگیا اس کو سمجھ گئے اور جو نہ سمجھ میں آیا اس کو اللہ پر چھوڑ دیا واللہ اعلم اللہ ہی بہتر جاننے والا ہے اور کہہ کر تو
ایمان سے مطلب ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ان متشابہات پر اللہ کی مراد کے مطابق ایمان لائے سب کچھ
یعنی محکم اور متشابہ اور ناسخ اور منسوخ جس کی مراد ہم کو معلوم ہے اور جس کی مراد ہم کو معلوم نہیں یہ سب ہمارے
پروردگار کی طرف سے ہیں محکم اور متشابہ سب سے ہماری تربیت مقصود ہے محکمات کو اس لیے نازل فرمایا کہ
اس کے مطابق اعتقاد رکھیں اور عمل کریں۔ اور متشابہات کو اس لیے اتارا کہ اپنی قصورِ استعداد اور قصورِ علم
کا اعتراف کریں اور ایسے مواقع پر آیات محکمات کا اتباع کریں۔ نفسانی خواہشوں کی پیروی نہ کریں۔
اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہی لوگ کہ جن کی عقل سلیم اور خالص ہے نفسانی خواہشوں کے زنگ
سے پاک اور صاف ہے جس بات کا مطلب ان کی سمجھ میں نہیں آتا اس کو متکلم علیم و حکیم کے حوالہ کرتے
ہیں اور ما ادری اور لا اعلم کہہ کر نصف علم حاصل کر لیتے ہیں اور باوجود اس کے وہ خائف رہتے ہیں
اور ڈرتے ہیں کہ مبادا کسی پوشیدہ نفسانی خواہش کے فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اس لیے یہ دعا کرتے
رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار بعد اس کے کہ تو نے کتاب نازل فرما کر ہم کو ہدایت دی اور اس
کتاب کے محکم اور متشابہ پر ایمان لانے کی توفیق عطا کی اب اس لطف و عنایت اور اس توفیق

قطعیہ اور اسلام کے مسلمہ اصول، تواتر اور اجماع امت سے یہ قطعاً متعین ہو چکا ہے کہ صلوٰۃ اور زکوٰۃ سے متکلم کی مراد مخصوص طریقہ پر بدنی اور مالی عبادت بجا لانا ہے، شریعت کے بیان سے ان آیات کی مراد اس قدر صاف اور واضح ہے کہ کوئی جاہل سے جاہل بھی ان کے مفہوم اور معنی میں اختلاف نہیں کر سکتا، ایسی آیات کو محکمات کہتے ہیں۔

اور متشابہات ان آیات کو کہتے ہیں جن کی مراد اور معنی کے معلوم اور متعین کرنے میں کسی قسم کا اشتباہ اور التباس واقع ہو جائے اور چونکہ اشتباہ و التباس ایک امر متفاوت ہے جس کے درجات اور مراتب ہیں، اس لئے متشابہ کی دو قسمیں ہیں، ایک متشابہ تو وہ ہے جس کی مراد معلوم ہونے کی توقع اور امید ہی نہ ہو، یعنی نہ کسی کی مراد معلوم ہونے کا کوئی ذریعہ اور امکان ہو جیسے مقطعات قرآنیہ الٓمٓ۔ حٰمٓ۔ طٰسٓمٓ وغیرہ کہ نہ لغت سے ان کے معنی معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ شریعت نے ان کے معنی بیان کئے ہیں اور دوسری قسم متشابہ کی یہ ہے کہ آیت میں اجمال اور ابہام یا اشتراک لفظی کی وجہ سے اس کی مراد میں اشتباہ پیش آگیا ہو۔ متشابہ کے یہ اصطلاحی معنی بھی دونوں کو شامل ہیں، پس اگر آیت میں متشابہات سے پہلے معنی مراد لئے جائیں تو اس معنی کر متشابہ کی مراد سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور اگر متشابہات سے دوسرے معنی مراد لئے جائیں تو اس معنی کر متشابہات کے معنی و تاویل راسخین فی العلم کو بھی بقدر اپنے علم اور فہم کے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ اصل کنہ اور حقیقت اور پوری کیفیت اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے۔ لیکن راسخین فی العلم جب محکمات کی طرف رجوع کرتے ہیں اور خداداد علم و فہم سے ان میں غور و فکر کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے صحیح معنی اور مراد ان پر واضح کر دیتے ہیں (یعنی) اول: وہ معنی جن کا ظاہر واضح (نہ ہو) اور متشابہ کی قسم اول کو اصطلاح میں متشابہ حقیقی کہتے ہیں اور متشابہ کی قسم ثانی کو متشابہ اضافی کہتے ہیں۔

اور سلف صالحین سے آیات متشابہات کی تاویل میں دو قول منقول ہیں، ایک قول تو یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں جیسا کہ ابی بن کعبؓ اور عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے، اور اکثر سلف سے یہی منقول ہے اور ابن عباسؓ سے بھی ایک روایت ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں جیسا کہ ابن عباسؓ اور مجاہد اور ربیع بن انسؓ وغیرہم سے منقول ہے۔

ان دونوں قولوں میں کوئی تعارض نہیں، جن حضرات کا یہ قول ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں، ان کی مراد متشابہ کی قسم اول ہے جیسے مقطعات قرآنیہ، اور جن سلف سے یہ منقول ہے کہ متشابہات کی تاویل راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں، ان کی مراد متشابہ کی قسم ثانی ہے۔

جو مجمل اور مؤول اور محتمل سب کو شامل ہے۔

۳۔ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ الخ میں قراء اور مفسرین کا اختلاف ہے۔

بعض کا قول یہ ہے کہ إِلَّا اللَّهُ پر وقف ضروری اور لازم ہے اور وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ جملہ مستانفہ یعنی کلام جدید ہے ماقبل پر معطوف نہیں اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ متشابہات کی تاویل سوائے اللہ کے کسی کو معلوم نہیں۔ اور راسخین فی العلم متشابہات کی تاویل اور حقیقت کو حق جل شانہ پر چھوڑتے ہیں اور جو کچھ خدا تعالیٰ کی مراد ہے اس پر ایمان لاتے ہیں ان کا مسلک محض تفویض و تسلیم ہے۔

اور بعض کا قول یہ ہے کہ إِلَّا اللَّهُ پر وقف جائز ہے ضروری اور لازم نہیں یعنی یہ بھی جائز ہے کہ إِلَّا اللَّهُ پر وقف کیا جائے اور وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ کو کلام جدید قرار دیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ إِلَّا اللَّهُ پر وقف نہ کیا جائے بلکہ وَالرَّاسِخُونَ کا لفظ اللہ پر عطف کیا جائے اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ کے بعد راسخین فی العلم بھی متشابہات کی تاویل اور معنی کو جانتے ہیں سلف صالحین کی ایک کثیر جماعت کا یہی مسلک ہے ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے

انا من الراسخين في العلم انا اعلم تاويله۔ میں راسخین فی العلم سے ہوں اور میں متشابہ کی تاویل کو جانتا ہوں۔

غرض یہ کہ وقف اور عطف کے بارہ میں سلف کے دو قول ہیں اور سلف کا یہ اختلاف اور تنازع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری ہے جن لوگوں نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے ان کے نزدیک إِلَّا اللَّهُ پر وقف ضروری اور لازم ہے اس لیے کہ مقطعات قرآنیہ جیسے متشابہات کی تاویل سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

اور جن لوگوں نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے جو مجمل اور محتمل اور مؤول کو بھی شامل ہیں ان کے نزدیک وَالرَّاسِخُونَ کا عطف لفظ اللہ پر جائز ہے اس لیے کہ ایسے متشابہات کی تاویل اور معنی غور و خوض کرنے اور محکمات کی طرف رجوع کرنے سے راسخین فی العلم کو بھی بقدر ان کے علم اور فہم ان پر منکشف ہو جاتے ہیں اگرچہ اصل حقیقت اور اصل کنہ اللہ ہی کو معلوم ہوتی ہے مگر بقدر علم راسخین فی العلم بھی اس کی تاویل کو جانتے اور سمجھتے ہیں اور متشابہ کے دوسرے معنی لے کر یہ بھی جائز ہے کہ إِلَّا اللَّهُ پر وقف کیا جائے اس صورت میں آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات کی اصل تاویل اور صحیح کنہ اور پوری حقیقت سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو معلوم نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ اگر متشابہات کے اول معنی مراد لیے جائیں تو إِلَّا اللَّهُ پر وقف ضروری اور لازم ہوگا اور اگر آیت میں متشابہات کے دوسرے معنی مراد لیے جائیں تو آیت میں وقف اور عطف دونوں

جائز ہیں جس نے وقف کو ضروری قرار دیا اس نے متشابہ کے پہلے معنی مراد لیے اور آیت میں وقف اور عطف کی جو قرأتیں آئی ہیں وہ دونوں حق اور صحیح ہیں جس قرأت میں الا اللہ پر متشابہ کی تاویل کی نفی کی گئی ہے وہاں متشابہ کے اول معنی مراد ہیں اور جس قرأت میں الا اللہ بعد الراسخین سے جو متشابہات کی تاویل کے علم کو ثابت کیا گیا ہے وہاں متشابہ کے دوسرے معنی مراد ہیں وقف جو نہ اور جس نے عطف جائز قرار دیا اس نے متشابہ کے دوسرے معنی مراد لیے اس لیے عرض کیا گیا کہ یہ اختلاف اور نزاع حقیقی نہیں بلکہ لفظی اور صوری سا ہے۔

۴۔ لفظ تاویل متقدمین کی اصطلاح میں تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے تفسیر ابن جریر میں جابجا تاویل کا لفظ تفسیر کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے۔ اور متأخرین کی اصطلاح میں کسی قرینہ و دلیل کی بنا پر ظاہر سے غیر ظاہر کی طرف پھیرنے کا نام تاویل ہے اور بلا کسی دلیل اور بلا کسی قرینہ کے ظاہر سے پھیرنے کا نام تحریف ہے لیکن تاویل کے یہ دونوں معنی اصطلاحی ہیں اور قرآن کریم میں جہاں کہیں یہ لفظ مستعمل ہوا ہے وہاں تاویل سے لغوی حقیقت اور مصداق اور مآل اور انجام اور نتیجہ اور حکمت اور کلام کی غرض اور غایت کے معنی مراد لیے گئے ہیں لفظ تاویل (معنی لغوی) اول سے مشتق ہے جس کے معنی اصل کی طرف رجوع کرنے کے ہیں مثلاً هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ سے یوم آخرت مراد ہے جس دن وعدہ اور وعید کا مصداق ظاہر ہوگا اور جزاء اور سزا کی حقیقت واضح ہوگی۔

اور بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ میں تاویل سے خبر اور وعدہ کے مصداق کا ظہور مراد ہے یا عاقبت اور انجام کے معنی مراد ہیں ہر خبر کا ایک لفظی مفہوم اور مدلول ہوتا ہے اور ایک اس کا خارجی اور واقعی مصداق ہوتا ہے جو وقوع کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔

جیسا قال تعالے بِئْسَ الْمَصِيرُ ۔ ۔ ۔ ۔ قرآن کریم نے خبر کے اس خارجی اور واقعی مصداق کو تاویل سے تعبیر کیا ہے یعنی وقت خبر کا لفظی مدلول اور مفہوم ظاہر ہوتا ہے اور اس کا خارجی مصداق مخفی اور پوشیدہ ہوتا ہے۔ راسخین فی العلم اس خبر کے لفظی اور ظاہری مفہوم کو جانتے ہیں اور اس کے خارجی مصداق کو خدا کے سپرد کرتے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی تاویل سے تعبیر مراد ہے جو خواب کا مآل اور انجام اور خارجی مصداق ہے جیسا وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا وَقَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ میں تاویل سے مآل اور انجام مراد ہونا بالکل ظاہر ہے۔

اور ذَٰلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا میں تاویل سے مصداق اور خارجی حقیقت اور حکمت کے معنی مراد ہیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ابن عباس کے حق میں یہ دعا فرمائی

اللھم فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل۔ — اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے اور تاویل کا علم عطا فرما

ظاہر ہے کہ یہاں تاویل سے لغوی حقیقت اور پوشیدہ حکمت کا منکشف کرنا اور مآل اور انجام کو ظاہر کرنا مراد ہے۔

مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ

سے پہلے تھے، جھٹلائیں ہماری آیتیں، پھر پکڑا ان کو اللہ نے

بِذُنُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ لِلَّذِينَ

ان کے گناہوں پر اور اللہ کا عذاب سخت ہے۔ کہہ دے منکروں

كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَتُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ

کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور ہانکے جاؤ گے دوزخ کو۔

وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ آيَةٌ فِي

اور کیا بری تیاری ہے۔ ابھی ہو چکا ہے تم کو ایک نمونہ دو

فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۖ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ

فوجوں میں جو بھڑی تھیں، ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور

أُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ مِثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ ۚ وَ

دوسری منکر ہے یہ ان کو دیکھتے ہیں اپنے سے دوچند، صریح آنکھوں سے اور

اللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً

اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہتا ہے۔ اسی میں خبردار ہو جاویں جن کو

لِأُولِي الْأَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

آنکھ ہے۔

مال و اولاد کے نشہ میں حق سے استغنا پر وعید اور تہدید

قال تعالیٰ: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَنْ تُغْنِیَ عَنْھُمْ ... الیٰ ... لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ۔

ربط: یہ آیتیں بھی نصاریٰ نجران کے بارہ میں نازل ہوئیں، دلائل اور براہین سے حق ان پر واضح ہو چکا تھا، مگر مال و دولت کے فوائد اور شہرت نے ان کو قبول حق اور قبول ہدایت سے باز رکھا، اس لیے ان ارباب جاہ کی وعید اور تہدید کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ آخرت میں مال اور اولاد کچھ کام نہ آئیں گے، اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ اب ان کافروں سے یہ کہہ دیں کہ یہ لوگ عنقریب دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے اور قیامت کے دن جہنم میں ڈال دیے جائیں گے، اور پھر واقعۂ بدر کو ان کی عبرت کے لیے ذکر فرمایا۔ محمد بن اسحاق کی سیرت میں ہے کہ نصاریٰ نجران کا وفد جب بغرض مناظرہ مدینہ منورہ روانہ ہوا تو راستہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ان کا بڑا عالم ابو حارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا، یکایک خچر کو ٹھوکر لگی اور وہ عالم سواری سے گرا تو اس کے بھائی کرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا تَعِسَ الْاَبْعَدُ یعنی ہلاک ہو وہ شخص جس کے پاس ہم جا رہے ہیں، اس نے الابعد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لیا۔ العیاذ باللہ۔

ابو حارثہ نے کہا:

بل تعست انت اتشتم رجلا من المرسلین انه الذی بشر به عیسیٰ وانه لفی التوراة و والله انه النبی الذی ننتظر	بلکہ تو ہلاک ہو گیا تو ایسے شخص کی شان میں نازیبا الفاظ کہتا ہے جو رسولوں میں سے ہے تحقیق بلاشبہ آپ وہی نبی ہیں جن کی عیسیٰ بن مریمؑ نے بشارت دی ہے اور جن کا تذکرہ توریت میں ہے اور خدا کی قسم یہ وہی نبی ہیں جن کے ظہور کا تھا جس کے ہم سب منتظر ہیں

اس پر ابو حارثہ کے بھائی کرز نے کہا۔

فما یمنعک منه وانت تعلم هذا۔	کہ جب تم کو ان کی نبوت و رسالت کا اس درجہ علم اور یقین ہے تو پھر ایمان لانے سے کیا چیز مانع ہے۔

ابو حارثہ نے جواب دیا:

ان هؤلاء الملوک اعطونا اموالا کثیرة واکرمونا فلو امنا به لاخذوا منا کل هذه الاشیاء۔	کہ ہم ایمان اس لیے نہیں لاتے کہ یہی عیسائی بادشاہ جنہوں نے بے شمار اموال ہم کو دے رکھے ہیں اور ہمارا اعزاز و اکرام کرتے ہیں اگر ہم آپ پر ایمان لے آئیں تو یہ سب ہم سے چھین لیں گے۔

اشارہ اس طرف ہے کہ بنو قریظہ اور بنو نضیر جلا وطن کیے جائیں گے اور خیبر اور مکہ فتح ہوگا، یہ ذلتیں تو ان منکرین کو دنیا میں پہنچیں گی اور آخرت کی بابت یہ فرما دیجئے کہ تم جہنم کی طرف جانوروں کی طرح ہانکے جاؤ گے، اور دوزخ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔ چونکہ کفار اپنے مال اور اولاد یعنی قوت اور کثرت اور ثروت پر نازاں تھے اور یہ کہتے تھے کہ نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ اور یہ خیال کرتے تھے کہ دنیا کی طرح آخرت میں بھی مال اور اولاد کام آئیں گے کما قال تعالیٰ حکایۃ عنہم اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے "لن تغنی" آیت میں متنبہ فرمایا کہ مال اور دولت صرف آخرت ہی میں بے سود نہ ہوگی بلکہ بسا اوقات وہ دنیا میں بھی سود مند اور کارآمد نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ جس کو شکست دینا چاہتے ہیں اس کے مقابلہ میں ساری قوت اور ثروت اور کثرت دھری رہ جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو پیشین گوئی فرمائی تھی چند روز کے بعد وہ حرف بحرف پوری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ سے بنو قریظہ اور بنو نضیر کو مقہور اور مغلوب کیا اور خیبر اور مکہ بھی انہی فقراء مسلمین کے ہاتھوں پر فتح ہوا جن کو یہ حقیر سمجھتے تھے۔

ذکر استشہاد برائے دفع استبعاد

حق جل شانہ نے جب گزشتہ آیت قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ الآیۃ میں مسلمانوں کے غلبہ کی خبر دی تو منافقین نے اس کو مستبعد سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے استبعاد کو دفع کرنے کے لیے بطور استشہاد واقعہ بدر کو ذکر فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق تمہارے لیے دو جماعتوں کے بارہ میں ایک عبرت اور عجیب نمونۂ قدرت ہے کہ جو باہم ایک دوسرے سے لڑیں، جس معرکہ و لڑائی میں ایک جماعت تو وہ تھی کہ جو خدا کی راہ میں لڑتی تھی یعنی مسلمانوں کی جماعت تھی جن کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور بے سروسامان تھی اور دوسری جماعت کافروں کی تھی جن کی تعداد نو سو پچاس تھی جو جنگی ساز و سامان سے لیس تھی اور جن کو اپنی قوت اور شوکت اور کثرت اور ثروت پر ناز تھا بدر کے میدان میں دونوں جماعتوں کا مقابلہ ہوا، عین مقابلہ اور مقاتلہ کے وقت یہ کافر کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کو دو چند لشکر یعنی تقریباً دو ہزار دکھائی دیتے تھے جس سے کافروں کے دل مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے اور یہ اس طرح کا دیکھنا صریح اور کھلی آنکھوں سے تھا کوئی خواب و خیال نہ تھا اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ قلیل کو کثیر اور کثیر کو قلیل کرکے دکھلائے حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھلایا۔ بھینگے کو ایک کے دو دکھلائی دیتا ہے یہ کوئی کذب نہیں، اور دوربین اور خوردبین اس کی قدرت کا کرشمہ ہے جس طرح خوردبین اور دوربین سے چھوٹی چیز بڑی نظر آنے لگتی ہے تو یہ جھوٹ نہیں بلکہ کاریگری اور صنعت کا کمال ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے انہوں نے یہ بیان کیا کہ مسلمان ہم کو تعداد میں بہت

نظر آنے لگے اسی طرح سمجھو کہ اگر حق تعالیٰ اپنی قدرت سے اپنے دشمنوں کو دگنی طور پر دو دو یا تین تین
بنا دے کہ ہر ایک ایک کے تین نظر آنے لگیں تو یہ کوئی کذب اور دروغ نہیں بلکہ اس کی قدرت کا ایک
کرشمہ ہے۔

فائدہ

لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسلمان کافروں کی نظر میں تھوڑے دکھائی دیتے تھے جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے وَيُقَلِّلُكُمْ فِي أَعْيُنِهِمْ یعنی اے مسلمانو اللہ تعالیٰ تم کو کافروں کی نظر میں تھوڑا کر کے دکھاتا تھا۔ لیکن جب اس کے بعد گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی تو کافر مسلمانوں کو اپنے سے بھی دو چند دیکھنے لگے پس اس آیت میں عین جنگ کے وقت کا ذکر ہے اور سورۂ انفال میں جنگ چھڑنے سے پہلے کا ذکر تھا۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض اور تناقض نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی مدد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دیتے ہیں اور فتح اور غلبہ کا اصل مدار تائید خداوندی پر ہے تائید خداوندی کے مقابلہ میں کوئی طاقت اور قوت غالب نہیں آ سکتی جیسا کہ تم نے بدر کے معرکہ میں اس کا مشاہدہ کر لیا تحقیق اس بدر کے واقعہ میں آنکھ والوں کے لیے بڑی عبرت اور نصیحت ہے کہ کس طرح ایک گروہ اور وہ بے سروسامان گروہ ایک پوری قوت اور شوکت رکھنے والے گروہ پر غالب آگیا وجہ اس کی یہ تھی کہ تائید خداوندی اور امداد غیبی مسلمانوں کے ساتھ تھی اور خدا کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اس لیے تم کو چاہیے کہ تم اپنے مال و دولت کے غرور سے تائب ہو کر اس جماعت میں داخل ہو جاؤ کہ جن کے ساتھ تائید خداوندی ہے۔

فائدہ

آیت يَرَوْنَهُم مِّثْلَيْهِمْ کی تفسیر میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں پہلا قول یہ ہے کہ يَرَوْنَ کے ضمیر فاعل فِئَةٌ کافرہ کی طرف راجع ہے جو قریب ہے اور هُمْ کی ضمیر مفعول مسلمانوں کی طرف راجع ہے اور مِثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور کافروں کی طرف راجع ہے یعنی کافروں کا گروہ مسلمانوں کو اپنے سے دو چند دیکھتا تھا۔ تفسیر میں ہم نے اسی قول کو اختیار کیا ہے دوسرا قول یہ ہے کہ يَرَوْنَ کی ضمیر تو حسب سابق فئہ کافرہ کی طرف راجع ہو اور هُمْ کی ضمیر مفعول بھی مسلمانوں کی طرف راجع ہو لیکن مِثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور بجائے کافروں کے مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور معنی یہ ہوں کہ کافر مسلمانوں کو مسلمانوں کے اعتبار سے دو چند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کافروں کی نظر میں بجائے تین سو تیرہ کے چھ سو چھبیس دکھائی دیتے تھے۔ مقصود یہ تھا کہ کافر جب مسلمانوں کی ایک عظیم تعداد دیکھنے لگے تو مرعوب ہو جائیں گے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ یَرَوْنَ کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور ھُم کی ضمیر مفعول کافروں کی طرف راجع ہو اور مِّثْلَيْهِمْ کی ضمیر مجرور مسلمانوں کی طرف راجع ہو اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ مسلمان کافروں کو اپنے سے دوچند دیکھتے تھے یعنی کافر مسلمانوں کی نظر میں چھ سو چھبیس دکھائی دیے۔ کفار اگرچہ فی الواقع مسلمانوں سے سہ چند تھے مگر مسلمان اُن کو صرف دوچند دیکھتے اور سمجھتے تھے کیونکہ مجاہد اور بری طبیعتیں اپنے سے دوچند سے مقابلہ کرنے کو معمولی بات سمجھتے ہیں لیکن دوچند سے زیادہ کا مشاہدہ باعث تشویش اور پریشانی ہوتا ہے۔ چوتھا قول اور یہ درحقیقت قول نہیں بلکہ محض احتمال ہے وہ یہ کہ یَرَوْنَ کی ضمیر فاعل مسلمانوں کی طرف راجع ہو اور ھُم اور مِثْلَيْهِمْ کی دونوں ضمیریں کافروں کی طرف راجع ہوں اور معنی یہ ہوں کہ مسلمان کافروں کو کافروں سے دوچند دیکھتے تھے یعنی کافر مسلمانوں کو تقریباً دو ہزار دکھائی دیتے تھے اس قول کا کوئی قائل نہیں محض احتمال عقلی ہے جو غیر معقول بھی ہے اس لیے کہ جب مسلمان کافروں کو دو ہزار کی تعداد میں دیکھیں گے تو لامحالہ مرعوب ہو جائیں گے۔ تفصیل کے لیے تفسیر کبیر کی مراجعت کریں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ

ریجھایا ہے لوگوں کو مزوں کی محبت پر، عورتیں اور

وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ

بیٹے، اور ڈھیر جوڑے ہوئے سونے کے،

وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ

اور روپے کے اور گھوڑے پلے ہوئے اور مواشی اور کھیتی۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ

یہ برتنا ہے دنیا کی زندگی میں، اور اللہ جو ہے اسی پاس

حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝

ہے اچھا ٹھکانا۔

بیانِ حقارتِ لذاتِ دنیویہ

قال تعالیٰ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ

ربط[1] گزشتہ آیات میں کافروں کا حال بیان فرمایا کہ وہ مال و دولت کے نشہ میں چور ہیں اس لیے حق کو قبول نہیں کرتے۔ اب ان آیات میں دنیوی لذات کا ہیچ اور فانی ہونا بیان کرتے ہیں کہ یہ تمام عیش و عشرت کے سامان محض چند روزہ ہیں اور عالم جاودانی کے مقابلہ میں بمنزلہ خواب کے ہیں پھر اس کے بعد آئندہ آیات میں حق تعالیٰ نے آخرت کی عظیم الشان اور جلیل القدر نعمتوں کو ذکر فرمایا جو آخرت میں اہل ایمان اور اہل تقویٰ کو عطا ہوں گی۔

ان تمام آیات میں وفد نجران کی طرف اشارہ ہے کہ مال و جاہ کی محبت نے حق کے اتباع سے باز رکھا اور نصاریٰ کا سب سے بڑا عالم، ابو حارثہ، باوجود اعتراف اور اقرار کے اسی مال و دولت کی بدولت۔ ایمان و ہدایت کی لازوال دولت سے محروم رہا۔

اور پھر لطف یہ ہے کہ ان آیات میں لذات کے اصول اور شہوات کے انواع اور اقسام کو بیان فرمایا کہ یہی چیزیں تمام دنیا کے فتنے اور فساد کا دارومدار ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ آراستہ اور خوشنما کر دی گئی ہے عام طور پر لوگوں کے لیے محبت۔ خواہشوں اور نفس کی آرزوؤں کی یعنی شہوات اور نفسانی خواہشات پر ایسے فریفتہ ہوئے کہ ان کا عیب اور نقصان ان کی نظروں سے پوشیدہ ہو گیا ان شہوات کی ظاہری زیب و زینت تو نظر آتی ہے اور باطنی قبح ان کو نظر نہیں آتا اسی وجہ سے کبھی ان سے کنارہ کشی کا خیال بھی دل میں نہیں آتا۔ بے شک شہوات کی محبت آدمی کو اندھا بنا دیتی ہے۔ البتہ جو اولی الابصار ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے دل کی بینائی عطا کی ہے۔ وہ شہوات اور خواہشات کے پیچھے اندھے نہیں بن جاتے۔ نفس کے مقابلہ میں عقل کا اتباع کرتے ہیں اور اپنی نگاہ کو نابینا ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں اور دنیا کے مادہ و سامان پر مفتون اور فریفتہ نہیں ہو جاتے بلکہ ان سے عبرت پکڑتے ہیں گزشتہ آیت یعنی اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر تھا اب اس کے بعد ان شہوات اور خواہشات کے انواع اور اقسام کو ذکر فرماتے ہیں جن کی محبت میں ساری دنیا سرگردان اور حیران ہے یعنی آٹھ شہوات اور خواہشات ہیں کہ جن میں آدمی پھنس کر خدا سے غافل ہو جاتا ہے ان میں سے سب سے اول عورتیں ہیں کہ دنیاوی لذتوں اور شہوتوں کا منتہیٰ ہیں متاعِ دنیا میں سے کسی چیز کی محبت عورتوں کی محبت کو نہیں

[1] اس عبارت سے زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ کا گزشتہ آیت اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ کے ساتھ ربط کی طرف اشارہ ہے ۱۲ منہ عفا اللہ عنہ۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿١٥﴾ الَّذِينَ

اور رضامندی اللہ کی ۔ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے ۔ وہ جو

يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا

کہتے ہیں اے رب ہمارے ! ہم یقین لائے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور

وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿١٦﴾ الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ

بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ۔ وہ محنت اٹھانے والے اور سچے ۔

وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ ﴿١٧﴾

اور بندگی میں لگے رہتے اور خرچ کرتے اور گناہ بخشواتے پچھلی رات کو ۔

بیانِ نفاستِ نعمائے اخرویہ و مستحقین آنہا

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّن ذٰلِكُمْ ..... الیٰ ..... وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ

ربط : گذشتہ آیات میں لذات دنیویہ کی حقارت اور خساست کو بیان فرمایا اب ان آیات میں اُخروی نعمتوں کی نفاست کو بیان فرماتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بیان فرماتے ہیں کہ ان نفیس اور لازوال نعمتوں کے اصل مستحق کون لوگ ہیں۔

نیز گذشتہ آیت میں یہ بتلایا تھا کہ دنیا کے سامان سے فقط دنیا کی چند روزہ زندگی میں نفع اٹھایا جا سکتا ہے اب آئندہ آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ مستقل اور پائیدار فائدہ اور دائمی فلاح کے حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے جو شہوات اور لذات کی محبت میں گرفتار ہیں یہ کہہ دیجئے کہ آؤ میں تم کو اس چیز کی خبر دوں جو اس متاع دنیا اور اس کی تمام شہوات اور لذات سے کہیں بہتر اور برتر ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ متقی اور پرہیزگار ہیں اور اپنے آپ کو شہوات اور لذات کی محبت اور پیروی سے بچا کر چلتے ہیں جیسے اہل صفہؓ اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے حضرات صوفیہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے پروردگار کے نزدیک عجیب عجیب قسم کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ یہ لوگ ان باغات میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے داخل ہونے کے بعد کبھی بھی ان سے نہیں نکلیں گے اور ان کے لیے ایسی بیبیاں ہوں گی جو ظاہر اور باطن اور صورت و سیرت ہر اعتبار سے صاف

اور ستھری ہوں گی اور ظاہری اور باطنی گندگی سے بالکل پاک ہوں گی اور ان سب نعمتوں سے بڑھ کر ان کو یہ نعمت ملے گی کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کو رضامندی اور خوشنودی کا پروانہ عطا ہوگا۔ اور جنت بھی فی الحقیقت اسی وجہ سے مطلوب ہے کہ وہ رضاء خداوندی کا محل ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے خاص بندوں پر خاص نظر عنایت ہے۔

نکتہ — اس آیت میں جنات (یعنی باغات) کا ذکر ان تمام شہوات اور خواہشات کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ جنت کے متعلق ارشاد خداوندی ہے وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ یعنی جنت میں نفس کی تمام خواہش پوری ہوں گی اس آیت میں حب النساء کے مقابلہ میں ازواج مطہرۃ کو ذکر فرمایا کہ جو حسن و جمال میں آفتاب و ماہتاب سے بھی بڑھ کر ہوں گی اور حیض و نفاس وغیرہ کی آلائشوں سے بالکل پاک و صاف ہوں گی۔ اور جنت میں بنین یعنی بیٹے اور سب رشتہ دار بھی جمع ہوں گے۔ کما قال تعالیٰ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَا أَلَتْنَاهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَيْءٍ رہے قناطیر مقنطرہ سو جنت کے مکانات سونے اور چاندی کی اینٹوں سے بنے ہوئے ہوں گے وہاں ایک اینٹ سونے کی ہوگی اور ایک چاندی کی اور گارا مشک کا ہوگا اور جنت کے برتن اور اس کا سامان بھی سونے اور چاندی کا ہوگا۔ اور موتیوں کے خیمے ہوں گے اور سواری کے لیے عمدہ برق رفتار گھوڑے ہوں گے اور لید اور پیشاب سے پاک ہوں گے اور جنت میں انعام اور مویشی بھی ہوں گے غرض یہ کہ اس آیت میں جنت کا ذکر ان تمام شہوات اور متاع حیوۃ الدنیا کے مقابلہ میں ہے جن کا ذکر پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔

خلاصۂ کلام — یہ کہ اہل ایمان کو آخرت میں یہ چیزیں ملیں گی۔ (۱) پہلے مالک خداوند کریم کا قرب نصیب ہوگا۔ (۲) رہنے کے لیے باغات ہوں گے۔ (۳) ہر دم ان کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (۴) ایسی بیویاں ملیں گی جو ظاہری اور باطنی آلائشوں سے پاک ہوں گی۔ زائد سب سے: (۵) یہ نعمت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ ان سے راضی ہو جائے گا۔ بھلا کہاں یہ نعمتیں اور لذتیں اور کہاں وہ دنیوی آلائشیں۔

صفات متقین

اور جن عباد متقین کے لیے حق تعالیٰ نے سابق الذکر نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ جو خاص طور پر یہ دعا ضرور مانگتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم دل و جان سے ایمان لا چکے ہیں۔ ہمارے پاس اگر ایمان کے سوا کوئی بھی عمل صالح نہ ہو تو تیری بارگاہ میں تنہا ایمان ہی مغفرت کا سبب بن سکتا ہے لیکن تو اپنی رحمت سے فقط ایمان ہی کو کافی قرار دے کر ہمارے تمام گناہوں کو بخش

الْحِسَابِ ﴿١٩﴾ فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ

لینے والا ہے حساب۔ پھر اگر تجھ سے جھگڑیں، تو کہہ، میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے

وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۗ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ

حکم پر اور جو کوئی میرے ساتھ ہے اور کہہ دے کتاب والوں کو اور

أَأَسْلَمْتُمْ ۚ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا

ان پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو، پھر اگر تابع ہوئے تو راہ پا گئے، اور اگر پھرے رہے تو

فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠﴾

تیرا ذمہ یہی ہے پہنچا دینا۔ اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے۔

بیانِ حقانیتِ اسلام و جوابِ مجادلۂ مخالفینِ اسلام

قال تعالیٰ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

ربط: گزشتہ آیت میں توحید کی شہادت کو ذکر فرمایا جو اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اب اس آیت میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ دین صرف دین اسلام ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق وہ دین جو اللہ کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے وہ صرف اسلام ہے، نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ اس لئے کہ اسلام کے معنی اپنے آپ کو ایک خدا کے حوالہ اور سپرد کر دینے کے ہیں اور مسلم اور مسلمان اس بندہ کو کہتے ہیں جس نے بحق اپنے آپ کو خداوند واحد کے سپرد کر دیا ہو اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دی ہو اور باعتبار لغت اسلام نام اطاعت اور فرمانبرداری کا ہے اور مسلم اس بندہ کا نام ہے کہ جو خدائے واحد کا فرمانبردار اور اطاعت شعار ہو۔ شروع سے لے کر اخیر تک تمام انبیاء کرام کا یہی دین رہا ہے کہ ایک خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کی جائے۔ پس جو لوگ حضرت مسیح کو خدا یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں یا اللہ اور مسیح اور مریم کی تصویروں کو پوجتے ہیں یا جو بے وقوف درختوں اور پتھروں اور چاند اور سورج اور ستاروں کو پوجتے ہیں ان کو اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ توحید اور اخلاص اور اطاعت کے لحاظ سے تمام انبیاء اور تمام ادیان سماویہ متفق رہے۔ کما قال تعالیٰ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا

غرض یہ کہ اسلام اور توحید ایک واضح اور مسلّم حقیقت تھی اس میں ذرہ برابر خلاف کی گنجائش نہ تھی مگر شہوات اور لذات کی محبت نے خود غرضی اور شہوت پرستی کو اختلاف پر آمادہ کیا کوئی حضرت مسیح کی الوہیت کا قائل ہوا اور کوئی ان کی ابنیت اور فرزندیت کا قائل ہوا اور کوئی حلول کا قائل ہوا کہ معاذ اللہ خداوند تعالیٰ حضرت مسیح میں حلول کر گیا ہے اور کوئی اتحاد کا قائل ہوا کہ خدا تعالیٰ اور مسیح ابن مریم ایک ہو گیا اور اہل کتاب نے اس بارہ میں لاعلمی کی بنا پر اختلاف نہیں کیا بلکہ صحیح علم آنے کے بعد جان بوجھ کر اختلاف کیا، اہل کتاب کو اس بات کا خوب علم تھا کہ اللہ کے نزدیک اسلام ہی پسندیدہ دین ہے کیونکہ توریت اور انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اس کو بیان فرمایا ہے اور یہ ان کا اختلاف اشتباہ اور غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ محض باہمی حسد اور آپس کی ضد سے تھا، ابن جریرؒ نے محمد بن جعفرؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت نجران کے عیسائیوں کے بارہ میں نازل ہوئی ان کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندہ اور رسول ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں جو اختلاف ہوا وہ یہودیوں کی عداوت کی بنا پر ہوا، یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کیا اور حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی اس کے نصاریٰ ضد میں حضرت عیسیٰؑ کی ابنیت کے قائل ہو گئے کہ معاذ اللہ یہ خدا کے بیٹے ہیں اور بعض علماء کا قول یہ ہے کہ اس آیت میں اختلاف سے اسلام اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت میں اختلاف کرنا مراد ہے اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار یا اللہ کے حکموں سے انحراف کرے گا اور اسلام اور توحید کو نہ مانے تو خوب سمجھ لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ان لوگوں سے اس مخالفت پر محاسبہ کرے گا اور سزا دے گا پس جب کہ دلائل اور براہین سے اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اس کے بعد بھی اگر اہل کتاب آپ سے کٹ حجتی اور مخاصمہ کریں اور اس صریح اور واضح امر میں آپ سے جھگڑیں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میں نے اور میرے متبعین نے تو اپنا چہرہ خالص اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور اسلام اور توحید کی راہ اختیار کر لی ہے یعنی میں نے اور میرے متبعین نے تو انبیاء کرام کا دین اختیار کر لیا ہے پس اگر تم تمام انبیاء کرام کی تعلیم کے برخلاف کسی کو خدا اور خدا کا بیٹا بناتے ہو تو ہم اور میرے متبعین اس سے بری ہیں اور آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ جن کو کتاب دی گئی یعنی یہود اور نصاریٰ سے اور ان پڑھوں سے یعنی مشرکین عرب سے بھی جن کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں ان سب سے یہ کہہ دیجئے کہ کیا تم بھی ہماری طرح اسلام میں داخل ہوتے ہو یا نہیں پس اگر یہ لوگ تمہاری طرح اسلام لے آئیں تو وہ تمہاری طرح ہدایت یافتہ ہو جائیں گے اور اگر تمہاری طرح اسلام لانے سے منہ موڑیں اور الوہیت اور ابنیت مسیح کے عقیدہ پر اڑے رہیں تو آپ کا کوئی نقصان نہیں، آپ کے ذمہ فقط حق کو پہنچا دینا اور دلائل اور براہین سے واضح کر دینا ہے سو وہ آپ کر چکے اور اللہ کی نگاہ میں ہیں تمام بندے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا دے گا۔

ف: جو شخص دلائل اور براہین کو نہ مانے اور صریح عناد پر اتر آئے تو ایسے شخص کے سامنے بحث کرنا فضول ہے، اور اپنے وقت کو ضائع کرنا ہے اس لیے اتمام حجت کے لیے یہ بات کہہ کر کلام ختم کر دینا مناسب ہے کہ ہم تو خالص اللہ کے فرمانبردار بندے بن چکے ہیں اب تم اپنی جانو۔ ہم کسی پر زبردستی نہیں کر سکتے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ

جو لوگ منکر ہیں اللہ کی آیتوں سے اور مار ڈالتے ہیں نبیوں

بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ

کو ناحق اور مار ڈالتے ہیں جو کوئی کہے انصاف کو

مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢١﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ

لوگوں میں سے، سو ان کو خوشخبری سنا دو دردناک عذاب کی۔ وہی ہیں جن کی

حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ

محنت ضائع ہوئی دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا

نَاصِرِينَ ﴿٢٢﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِنَ

مددگار۔ کیا تو نے نہ دیکھا وہ لوگ جن کو ملا ہے کچھ ایک حصہ

الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ

کتاب کا ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب پر کہ وہ ان میں حکم کرے پھر ہٹ

يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾ ذَٰلِكَ

جاتے ہیں بعض ان میں تغافل کر کر۔ یہ اس واسطے

بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ

کہ کہتے ہیں ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ، مگر کئی دن گنتی کے۔

وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾ فَكَيْفَ

اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر ۔ پھر کیسا ہوگا!

إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ

جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن جس میں شبہ نہیں ، اور پورا پاوے گا ہر

نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٥﴾

کوئی اپنا کیا ، اور ان کا حق نہ رہے گا ۔

ذکر بعض احوال شنیعۂ یہود

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ ...الیٰ... وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

شروع سورت میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اور گزشتہ آیات میں اہل کتاب کے عنوان سے یہود اور نصاریٰ دونوں کو خطاب تھا اب ان آیات میں خاص یہود کے بعض احوال شنیعہ کو بیان فرماتے ہیں کہ انبیاء اور ان کی امت کے علماء کو قتل کرنا یہود کا خاص شیوہ ہے قرآن کریم کی متعدد آیات میں یہود کا قاتل انبیاء ہونا بیان ہوا ہے اس لیے اس آیت سے خصوصیت کے ساتھ یہود کو خطاب شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں تحقیق جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور انبیاء کو دیدہ و دانستہ جان بوجھ کر ناحق قتل کرتے ہیں یعنی خود بھی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ فعل سراسر ناحق ہے محض حق کی عداوت اور دنیا کی محبت میں اتنے اندھے ہو گئے کہ جو بزرگوار صداقت حق اور ہدایت کو لے کر آتے تھے ان کو قتل کرتے تھے اور انبیاء کے بعد ان کی امت کے علماء اور صلحاء کو بھی قتل کرتے ہیں جو ان کو عدل اور انصاف اور حکمت کی باتوں کا حکم دیتے ہیں جیسا کہ آج کل یہود آپ کے قتل کے درپے ہیں اور آپ کے صحابہ کے قتل سے دریغ نہیں کرتے ان کے اسلاف کا طریقہ تھا جس پر یہ کاربند ہیں، سو ایسے قسی القلب لوگوں کو آپ دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے یہی وہ گروہ ہے جن کے اعمال حسنہ دنیا اور آخرت میں ضائع اور بے کار ہو گئے یعنی دونوں جہان کی کامیابی سے محروم ہوئے دنیا اور آخرت کی ذلتیں سر پڑیں اور کوئی ان کا مددگار نہیں کہ ان کے اعمال کو حبط ہونے سے بچا سکے اور دنیا اور آخرت کی کسی ذلت اور مصیبت کو ان سے دفع کر سکے۔

فوائد

۱- ابو عبیدۃ بن الجراح سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب کس کو ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے خدا کے کسی نبی کو قتل کیا یا اس شخص کو قتل کیا جس نے اچھی بات کا حکم کیا اور بری بات سے منع کیا اور اس کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ سے وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ تک اور پھر ارشاد فرمایا اے ابو عبیدہ - بنی اسرائیل نے شروع دن میں تینتالیس نبیوں کو ایک گھڑی میں قتل کیا اس پر بنی اسرائیل کے ایک سو ستر عابد و زاہد لوگ کھڑے ہوئے اور ان قاتلوں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا۔ بنی اسرائیل کے شریروں میں ان تمام نصیحت کرنے والوں کو بھی قتل کر دیا (اخرجہ ابن جریر)

۲- علماء چونکہ انبیاء کے وارث ہیں اور ان کا مرتبہ انبیاء کے بعد ہے اس لیے علماء کے قتل کا جرم انبیاء کے قتل کے بعد دوسرے درجہ کا ہے۔

۳- آیت میں انبیاء اور علماء کے قاتلین کی دو سزائیں ذکر کی گئیں ایک حبط اعمال دوسرے وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ انبیاء کرام چونکہ منبع ہدایت تھے اس لیے ان کے قتل پر حبط اعمال کی سزا ملی اور علماء چونکہ انبیاء کرام کے اعوان اور انصار اور معین و مددگار تھے اس لیے علماء کے قتل کی سزا میں وَمَا لَھُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ فرمایا یعنی ان کو خدا کی سزا سے کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا نہ ملے گا۔

استعجاب بر اعراض اہل کتاب

گزشتہ آیات میں اسلام کی حقانیت کو دلائل اور براہین سے واضح فرمایا اور اہل کتاب کو خاص طور پر اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دی لیکن ان لوگوں نے اعراض کیا اب آئندہ آیات میں یہ بیان فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کا اسلام سے اعراض کرنا نہایت عجیب ہے کہ توریت اور انجیل کے عالم ہیں اور نبی کریم کی بشارت اور صفت جو توریت اور انجیل میں مذکور ہے اس سے واقف ہیں مگر پھر بھی اعراض کرتے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک دن بیت المدارس (یہودیوں کے مدرسہ میں) تشریف لے گئے اور وہاں جا کر ان کو اسلام کے دین کی دعوت دی۔ نعیم بن عمرو اور

حارث بن زید نے کہا کہ آپ کا دین کیا ہے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو ابراہیم کا دین
تھا انہوں نے جواب دیا کہ حضرت ابراہیم تو خود یہودی تھے۔ آپ نے فرمایا اچھا اگر یہ بات ہے تو
تورات لے آؤ اور کتاب دیکھ لو کہ حضرت کس جگہ لکھا ہے کہ ابراہیم یہودی تھے ان دونوں
شخصوں نے تورات لانے سے انکار کردیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا
نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ الآیۃ یعنی اے نبی کریم کیا آپ نے ان لوگوں کی طرف
نظر نہیں کی کہ جن کو تورات کے علم کا ایک کافی حصہ دیا گیا جس سے حق اور باطل کا فرق ان پر واضح ہو
سکے مگر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو اسی اللہ کی کتاب (تورات) کی طرف بلایا جاتا ہے جس کے یہ عامل
اور عالم ہیں اور اس پر ایمان کے مدعی ہیں تاکہ یہ تورات اُن کے درمیان فیصلہ کردے کہ ابراہیم علیہ السلام
یہودی تھے یا نہیں اور عمران کا مقدمہ جو حضور پُرنور کے سامنے پیش ہوا ہے تورات اس کا بھی فیصلہ کردے
کہ تورات میں رجم کا حکم مذکور ہے یا نہیں یہ لوگ اقرار کرتے ہیں کہ تورات اللہ کی کتاب ہے اور
فصل خصومات کے لیے نازل ہوئی ہے مگر باوجود اس اقرار کے پھر بھی ان کا ایک فریق اس سے اعراض
اور روگردانی کرتا ہے اور یہ لوگ اس وقتی اور عارضی اعراض پر اکتفا نہیں کرتے کہ اس وقت سے پہلے
تورات کے احکام پر عمل کرتے رہے ہوں اور مستقلاً اسی ایک موقعہ پر اعراض اور روگردانی کر بیٹھے ہوں۔
بلکہ یہ لوگ ہر حال میں اعراض کرنے والے ہیں یعنی اعراض ان کی لازمی صفت اور دائمی عادت ہے۔

ف: يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ۔ میں تولی سے بالفعل اور وقتی طور پر اعراض کرنا مراد ہے
اور وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اعراض ان کا دائمی اور ازلی وصف تھا، اس لیے
کہ جملہ اسمیہ ثبات اور دوام کے بیان کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اس لیے يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
کے بعد وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ کا ذکر نہایت درجہ بلیغ اور لطیف ہوگا اور ان کے اس اعراض اور انحراف کی
وجہ یہ ہے کہ ان کا اعتقاد یہ ہے کہ ہم کو آگ ہرگز نہ لگے گی مگر چند گنتی کے روز یعنی چالیس دن کی مقدار
کہ جس میں ان کے بزرگوں نے گوسالہ کی پرستش کی تھی فقط اتنی مقدار عذاب ہوگا اور پھر مغفرت ہو جائے
گی اور عذاب سے نجات مل جائے گی۔ اسی فاسد اعتقاد کی بنا پر یہ لوگ ایمان اور عمل کا اہتمام نہیں کرتے
اگر خدا کے عذاب کو دائمی سمجھتے تو پھر اس کے مطابق اہتمام کرتے چند روزہ سمجھ کر پروا نہیں کرتے

عــلــه بعض علماء نے تفسیر میں اس جگہ کتاب اللہ سے قرآن کریم مراد لیا ہے کہ ان کو قرآن کریم کی طرف دعوت
دی جاتی ہو تورات اور انجیل کی بشارت کے موافق آیا ہے اور تمہارے اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے
لیکن ان میں علماء کا ایک فریق اعراض کرتا ہے حالانکہ قرآن کی طرف دعوت دینا درحقیقت تورات
اور انجیل کی طرف دعوت دینا ہے اور قرآن پر ایمان لانا تورات وانجیل پر ایمان لانا ہے مگر محققین نے اس جگہ
کتاب اللہ سے تورات مراد لی ہے اس لیے ہم نے تفسیر میں اسی قول کو اختیار کیا۔

حضرات انبیاء کے انتساب پر اعتماد کیے ہوئے ہیں اور اپنی نجات کا اعتقاد کیے ہوئے ہیں اس لیے آخرت کی عقوبت کو ہلکی اور خفیف سمجھتے ہیں اور ایمان اور عمل صالح کا اہتمام نہیں کرتے حالانکہ تمام انبیاء کرام اس بات کو بیان کرتے چلے آئے کہ نجات کا دارومدار ایمان اور عمل صالح اور تقویٰ پر ہے، بدون ایمان کے انتساب کچھ کام نہیں آسکتا اور یہ آنحضرت کی تعلیم ہے اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کو دین کے بارہ میں ان اعتقادات اور خیالات نے جو یہ اپنی طرف سے بناتے رہتے ہیں کبھی یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے چہیتے بیٹے ہیں اور اس کے نبیوں کی اولاد ہیں اور کبھی یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر لیا ہے کہ ان کی اولاد کو عذاب نہ دے گا مگر برائے نام اور نصاریٰ نے کفارہ کا مسئلہ نکال رکھا ہے کہ سارے عالم کے گناہوں کا حساب ایک اکلوتے بیٹے کے صلیب پر چڑھ جانے سے بیباق ہو گیا پس یہ لوگ اپنی ان افتراء پردازیوں پر آج دنیا میں اترا لیں خوش کر لیتے ہیں مگر یہ تو سوچیں کہ اس وقت ان کا کیا حال ہوگا کہ جب ہم سب کو حساب و کتاب کے لیے ایک دن جمع کریں گے جس کے بارہ میں ذرہ برابر کوئی شک و شبہ نہیں اور وہ دن ایسا ہوگا کہ ہر شخص کو اس چیز کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا جو اس نے دنیا میں کیا تھا اور ذرہ برابر ان پر کوئی ظلم نہ ہوگا کہ بلا جرم یا جرم سے زیادہ ان کو سزا دے دی جائے یا ان کی کوئی حق تلفی ہو جائے یعنی نیکیوں کا بدلہ نہ دیا جائے یا کم دیا جائے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ

تو کہہ، یا اللہ مالک سلطنت کے، تو سلطنت دیوے جس کو چاہے، اور

تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ

سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے، اور عزت دیوے جس کو چاہے اور ذلیل

مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ

کرے جس کو چاہے، تیرے ہاتھ ہے سب خوبی، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي

تو لے آوے رات کو دن میں اور تو لے آوے دن کو

اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ

رات میں اور تو نکالے جیتا مردے سے اور تو نکالے مردہ

مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

جیتے سے، اور تو رزق دیوے جس کو چاہے بے شمار۔

بشارتِ غلبۂ مؤمنین بر اعداء بعنوان مناجات و دعا

قال تعالیٰ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ... الیٰ ..... وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ

ربط، کفار دنیا اور مال و دولت پر مغرور تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے اصحاب اور احباب کو فقر و فاقہ کی وجہ سے بنظر حقارت دیکھتے تھے اس آیت میں اسی کے جواب کی طرف اشارہ ہے کہ سلطنت اور دولت کا عروج اور زوال اور عزت اور ذلت سب خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور مسلمانوں کو حکم ہوا کہ اس طرح دعا مانگو ہم تم کو بے مثال سلطنت عطا کریں گے جس کو یہ مذاق اڑانے والے بھی دیکھ کر حیران اور دنگ رہ جائیں گے گویا کہ یہ دعا ایک طرح کی پیشین گوئی تھی کہ عنقریب دنیا کی کایا پلٹ ہونے والی ہے اور یہ بے سر و سامان مسلمان تمام عرب اور سلطنتوں کے مالک بنیں گے اور جو بادشاہت کر رہے ہیں وہ اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ذلت کے گڑھے میں گرائے جائیں گے اور یہ مادی سلطنت کیا چیز ہے جس خداوند ذوالجلال نے نبوت و رسالت کے منصب جلیل کو بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی طرف منتقل کر دیا تو اسے روم و عجم کی ظاہری سلطنت کو عرب کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کر دینا کیا مستبعد ہے۔

شانِ نزول

غزوۂ احزاب میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے صحابہ کو خندق کھودنے کا حکم دیا ہر دس آدمیوں کو چالیس ہاتھ کھودنے کے لیے مقرر کیا صحابہ نے خندق کھودنا شروع کیا اس درمیان میں ایک بڑی چٹان نمودار ہوئی جس پر کدال کچھ کام نہ کرتا تھا جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ اس جگہ بنفس نفیس تشریف لائے اور سلمان رضی اللہ عنہ سے کدال لے کر اس چٹان پر ایک ضرب لگائی جس سے وہ چٹان شق ہو گئی اور اس سے ایک ایسی روشنی نمودار ہوئی جس سے تمام مدینہ روشن ہو گیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندھیرے میں چراغ روشن ہوگیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر فتح یعنی اللہ اکبر کہا اور صحابہ نے بھی آپ کے ساتھ اللہ اکبر کہا پھر حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں حیرہ کے محلات دکھلائے گئے پھر آپ نے دوسری ضرب لگائی اس سے بھی ایک روشنی نمودار ہوئی آپ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں روم کے سرخ محلات دکھلائے گئے یہاں تک کہ آپ نے پھر تیسری بار کدال ماری جس سے پھر ویسی ہی روشنی نمودار ہوئی آپ نے فرمایا کہ مجھے اس روشنی میں صنعاء یمن کے ملک اور سلطنت کے محلات دکھلائے گئے اور مجھے جبرئیل امین نے خبر دی ہے کہ عنقریب ان سب ممالک پر میری امت کا تسلط اور غلبہ ہوگا جب کہ منافقوں نے یہ سنا تو کہنے لگے کہ مسلمانو تمہارے نبی بھی خوب ہیں کہ عجیب عجیب باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں کہ مدائن اور حیرہ کے محلات یہیں نظر آگئے ہیں اور خوف کا حال یہ ہے کہ ایک معمولی دشمن کے ڈر سے تم سے خندق کھدوا رہے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی لے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان کفار و منافقین کے تمسخر اور استہزاء کی طرف ذرہ برابر التفات نہ کریں یوں کہو یعنی اس طرح ہم سے دعا مانگو ہم آپ کے غلاموں اور خادموں کو سلطنت عطا کریں گے۔ اس طرح دعا مانگو کہ اے اللہ مالک بادشاہی اور سلطنت کے ہم کو بادشاہی اور عزت عطا فرما تاکہ کوئی کافر تیرے دین اور تیرے نام لیواؤں کو ذلیل نہ کر سکے اور شان و شوکت کے ساتھ تیرے دین کے احکام جاری ہوں ہم اگرچہ قلیل اور بظاہر بے ذلیل ہیں مگر آپ کو سب کچھ قدرت ہے۔ کیونکہ آپ مالک مطلق اور قادر مطلق ہیں جس کو چاہیں بادشاہی اور سلطنت عطا فرمائیں اور جس سے چاہیں سلطنت چھین لیں تیرے ہاتھ میں ہے ہر بھلائی بلاشبہ آپ ہر چیز پر قادر ہیں اور عزت کو ذلت سے اور ذلت کو عزت سے بدلنا ایسا ہی آپ کی قدرت میں ہے جیسا کہ نور کو ظلمت سے اور ظلمت کو نور سے بدلنا آپ کی قدرت میں ہے اس لیے کہ آپ کو یہ قدرت ہے کہ رات کے ایک حصہ کو دن میں داخل کر دیتے ہیں جس سے دن بڑا ہو جاتا ہے اور کسی فصل میں دن کے کسی حصہ کو رات میں داخل کر دیتے ہیں جس سے رات بڑی ہو جاتی ہے مثلاً سردی کے موسم میں رات چودہ گھنٹے کی ہوتی ہے اور دن دس گھنٹے کا پھر چند مہینے کے بعد چار گھنٹے رات کے دن میں داخل کر دیتے ہیں یہاں تک کہ دن چودہ گھنٹے کا ہو جاتا ہے اور رات دس گھنٹے کی رہ جاتی ہے اور تو ہی نکالتا ہے جاندار کو بے جان سے اور تو ہی نکالتا ہے بے جان کو جاندار سے جیسے بیضہ سے چوزہ اور چوزہ سے بیضہ اور عالم سے جاہل اور جاہل سے عالم اور مومن سے کافر اور کافر سے مومن اور تو ہی رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے شمار یہ آپ کی قدرت کاملہ اور جود و کرم کے چند نمونے ہیں اس لیے ہم درخواست کرتے ہیں کہ جماعت غریب کو ایمان اور تقویٰ کے نور سے منور فرما اور ہم کو حکومت و سلطنت عطا فرما تاکہ تیرے اتارے ہوئے دستور اور قانون کو شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ دنیا میں جاری کر سکیں۔

فوائد

۱۔ طبرانی کی معجم صغیر میں ہے کہ ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نماز میں

نہ دیکھا تو خود اُن کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا اے معاذ کیا بات ہے آج میں نے تم کو نہیں دیکھا، عرض کیا یا رسول اللہ ایک یہودی کا میرے ذمہ ایک اوقیہ (چالیس درہم) قرض تھا، میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے گھر سے نکلا تو اس یہودی نے مجھ کو روک لیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے معاذ کیا میں تمہیں ایسی دعا نہ بتاؤں کہ اگر تمہارے ذمہ پہاڑ کے برابر بھی قرض ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ادا کردے، وہ دعا یہ ہے: اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَتُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَتُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاۗءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَرَحِیْمَھُمَا تُعْطِیْ مِنْھُمَا مَنْ تَشَاۗءُ وَتَمْنَعُ مِنْھُمَا مَنْ تَشَاۗءُ اِرْحَمْنِیْ رَحْمَۃً تُغْنِیْنِیْ بِھَا عَنْ رَحْمَۃِ مَنْ سِوَاکَ اَللّٰھُمَّ اَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ وَاقْضِ عَنِّی الدَّیْنَ وَتَوَفَّنِیْ فِیْ عِبَادَتِکَ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِکَ (تفسیر قرطبی ص ۵۲، ج ۴، و درمنثور، وشرح حصن حصین ص ۲۹)

۲۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ اس آیت کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس کی مداومت کرے اللہ تعالیٰ اس کو قرض سے سبکدوش فرماتا ہے۔

۳۔ بعض بزرگوں نے یہ تلقین بھی کی ہے کہ ہر نماز کے بعد سات سات بار پڑھے اور بزرگوں نے اس عمل کو مجرب لکھا ہے۔

۴۔ معجم طبرانی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسم اعظم جس کے ذریعہ سے دعا قبول ہوتی ہے وہ آل عمران کی اس آیت میں ہے: اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ بِیَدِکَ الْخَیْرُ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (تفسیر ابن کثیر ص ۳۵۵، ج ۱)

لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَاۗءَ مِنْ دُوْنِ

نہ پکڑیں مسلمان کافروں کو رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر

الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَلَیْسَ مِنَ اللّٰہِ

اور جو کوئی یہ کام کرے تو وہ اللہ کا کوئی نہیں۔

فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْھُمْ تُقٰىۃً ۭ وَیُحَذِّرُکُمُ

مگر یہ کہ تم کرنا چاہو ان سے بچاؤ ۔ اور اللہ

اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا

تم کو ڈراتا ہے آپ سے . اور اللہ ہی تک پہنچنا ہے ۔ تو کہہ اگر تم چھپاؤ

مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ

اپنے جی کی بات ، یا ظاہر کرو گے ، وہ اللہ کو معلوم ہے اور اس کو معلوم ہے

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ

جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں ۔ اور اللہ ہر چیز

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ

پر قادر ہے ۔ جس دن پاوے گا ہر شخص جو کی ہے نیکی

مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ

روبرو ۔ اور جو کی ہے برائی ۔ آرزو کرے گا

اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ

کہ مجھ میں اور اس میں فرق پڑ جائے دور کا ۔ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو

نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ؑ

آپ سے ۔ اور اللہ شفقت رکھتا ہے بندوں پر ۔

ممانعت دوستاں از دوستیِ دشمنان

قال تعالیٰ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ ... الیٰ ... وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۔

ربط: گزشتہ آیت میں یہ بتلایا گیا کہ عزت اور ذلت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں یعنی اہل اسلام کو حکم دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمنان خدا کی موالات اور دوستی کی طرف کبھی قدم نہ اٹھانا اور کافروں کی ظاہری اور وقتی شان و شوکت کو دیکھ کر

یہ گمان نہ کرنا کہ شاید ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے سے کوئی دنیوی عزت و وجاہت مل جائے گی۔ حاشا وکلا۔ أَيَبْتَغُونَ عِندَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔ کافروں کے پاس جو عزت نظر آتی ہے وہ حقیقی عزت نہیں بلکہ محض صورت ہے حقیقی عزت اللہ کے پاس سے ملتی ہے البتہ اگر کسی وقت بحالت مجبوری دشمنوں کے شر اور فساد سے بچنے کے لیے ظاہری طور پر ان کی موافقت کر لو تو اس کی ممانعت نہیں، تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے اس قسم کی ظاہری بشرط ضرورت اور بقدر حاجت موالات کے حکم سے مستثنیٰ ہے اس لیے کہ یہ موالات کی حقیقت نہیں بلکہ محض صورت ہے۔

شان نزول

حضرت ابن عباس ؓ سے مروی ہے کہ حجاج بن عمرو اور ابن ابی الحقیق اور قیس بن زید اس قسم کے چند یہودی چند انصار سے کچھ خفیہ ملا رکھتے تھے تاکہ موقعہ پا کر ان کو دین اسلام سے برگشتہ کر دیں اکثر مسلمانوں کو ان کی اس باطنی حال معلوم نہ تھا مگر جو صاحب نظر تھے وہ تاڑ گئے کہ یہود کا کیا مقصد ہے، چنانچہ رفاعہ بن منذر ؓ اور عبداللہ بن جبیر ؓ اور سعد بن خیثمہ ؓ نے ان مسلمانوں سے کہا کہ تم یہود کی اس جماعت سے بچتے رہنا کہیں تم کو دین سے برگشتہ نہ کر دیں ان انصاریوں نے ان کی اس بات کو نہ مانا اس پر یہ آیت نازل ہوئی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کافروں کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں کو چھوڑ کر یعنی سوائے مسلمانوں کے کسی کو ظاہراً اور باطناً دوست نہ بنائیں اس لیے کہ ایمان نور ہدایت ہے اور کفر ظلمت و ضلالت ہے اور نور اور ظلمت اور ہدایت اور ضلالت اور حق اور باطل یکجا نہیں ہو سکتے اجتماع ضدین عقلاً و نقلاً محال ہے اور جو کوئی یہ کام کرے یعنی کافروں کو دوست بنائے تو ایسے شخص کو اللہ سے کوئی سروکار نہیں کیونکہ کافر اللہ کے دشمن ہیں اور دشمن کا دوست بھی دشمن ہی ہوتا ہے اور مومن اللہ کے دوست ہیں، پس مومن رہتے ہوئے کافر کے ساتھ دوستی رکھنا ممکن نہیں۔ مگر ایک صورت میں محض تدبیر اور انتظام کے درجہ میں کافروں سے ظاہری دوستی کی اجازت ہے، وہ یہ کہ تم کو کافروں کے شر سے بچنا ہو کسی خاص بچاؤ کے ذریعہ سے یعنی محض ان کے شر اور ضرر سے بچنے کے لیے مناسب تدبیر کے درجہ میں ان سے فقط بقدر ضرورت محض ظاہری تعلق پیدا کرنا جائز ہے۔ باقی دلی تعلق اور قلبی محبت کسی حال میں بھی جائز نہیں اور یہ بھی جائز نہیں کہ اس مصلحت میں کسی معصیت کا مرتکب ہو یا مسلمانوں کی جاسوسی کرنے لگے اور مسلمانوں کے راز اور خبریں کافروں کو دینے لگے فقط دفع شر اور دفع ضرر کے لیے بقدر ضرورت قواعد شریعت کے ماتحت کافروں سے محض اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے تعلق رکھنے کی اجازت ہے باقی کافروں سے ایسا تعلق جو مسلمانوں کے لیے یا مسلمانوں کی حکومت کے لیے مضر ہو یا کسی

طرح اور کسی حالت میں جائز نہیں اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے یعنی اپنے ذاتی جلال اور قہر سے ڈراتا ہے جو کہ کافروں سے دوستی کرنے پر مرتب ہوگا اشارہ اس طرف ہے کہ کافروں کی دوستی پر خدا نے تمہارا جو قہر مرتب ہوتا ہے وہ قہر ذاتی ہے قہر فعلی نہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے جس سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے آپ صلے اللہ علیہ وسلم آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ تم کافروں کی محبت خواہ اپنے سینوں میں چھپاؤ یا اسے کسی قول یا فعل سے ظاہر کرو تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے اس لئے کہ اس کے سامنے ظاہر اور باطن سینہ اور زبان سب برابر ہیں اور اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے یعنی اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے علم کی طرح اس کی قدرت بھی محیط ہے لہذا تم کو چاہئے کہ اس علیم و قدیر کے دوستوں سے دوستی کرو اور اس کے دشمنوں کی دوستی سے ظاہر و باطن میں احتیاط رکھو اور اس دن کے حساب و کتاب سے ڈرو کہ جس دن ہر نفس اپنے اعمال نیک و بد کو اپنی اصلی شکلوں میں حاضر کیا ہوا پائے گا اس وقت جب کہ اعمال اپنی اصلی شکلوں میں نمودار ہوں گے اس وقت ان اعمال کا حسن و قبح نظروں کے سامنے آجائے گا اور اس وقت یہ تمنا کرے گا کہ کاش میرے اور میرے برے اعمال کے درمیان ایک طویل اور دور دراز مسافت حائل ہوتی اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنے قہر اور جلال سے ڈراتا ہے اور اللہ تعالیٰ بندوں پر بڑا مہربان ہے کہ ان کو پہلے ہی بتلا دیا کہ دنیا میں کن سے دوستی جائز ہے اور کن سے دوستی ناجائز ہے۔

فوائد

۱۔ کافروں سے موالاۃ یعنی محبت کی تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ان کو دینی حیثیت سے محبوب رکھا جائے یہ قطعاً کفر ہے دوسری صورت یہ ہے کہ دل سے ان کے مذہب اور دین کو برا سمجھے مگر معاملات دنیویہ میں ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آئے یہ بالاجماع جائز بلکہ ایک درجہ میں مستحسن ہے، تیسری صورت ان دونوں صورتوں کے بیچ بیچ ہے وہ یہ کہ دل سے تو ان کے مذہب کو برا سمجھے مگر کسی قرابت یا دوستی یا دنیوی غرض کی وجہ سے ان سے دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کی اعانت اور امداد کرے یا کسی وقت مسلمانوں کی جاسوسی کرے۔ یہ صورت کفر تو نہیں مگر سخت گناہ ہے حاطب ابن ابی بلتعہ کے قصہ میں یہی صورت پیش آئی کہ انہوں نے اپنی قرابت کی وجہ سے کافروں کی اور ان کے ساتھ ایک قسم کا سلوک اور احسان کیا سورۂ ممتحنہ کا نزول اسی قسم کی موالات کی ممانعت کے لیے ہوا ہے (تفسیر کبیر)

۲۔ کافروں کی سی وضع قطع اختیار کرنا یہ علامت ہے کہ اس شخص کو کافروں کی وضع پسند ہے اور اسلام کی وضع اس کو ناپسند ہے اس لیے کہ تمام عقلاء کے نزدیک ظاہری حرکات و سکنات قلبی

کیفیات کی ترجمان ہوتی ہیں۔

۷۔ تُقٰىةً سے آیت میں کافروں اور دشمنوں کے شر سے بچنے کی تدبیر مراد ہے جیسا کہ بیان ہو چکا۔ رہا رافضیوں کا تقیہ سو آیت قرآنیہ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو کہ اللہ تم

اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کو چاہے اور بخشے گناہ تمہارے۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ

تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ

لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

نہیں چاہتا منکروں کو

آغاز مضمون رسالت

در بیان آنکہ معیار محبت خداوندی اتباع رسول است

قال تعالیٰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ ۔۔۔ الیٰ ۔۔۔ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۔

ربط: گذشتہ آیات میں یہود اور نصاریٰ سے موالات کا حکم مذکور تھا اب ان آیات میں یہود اور نصاریٰ کے اس قول کی طرف تعریض ہے کہ جو یہ کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہیں۔ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ان آیات میں حق جل شانہ نے ان کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا کہ تم اللہ کی محبت اور دوستی کے دعوے دار ہو تو ہمارے نبی کا اتباع کرو اللہ تعالیٰ تم کو دوست رکھے گا یعنی اگر تم ہمارے نبی کا اتباع کروگے تو اس کا صلہ یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ تم کو محبت کے درجہ سے محبوبیت

کے درجہ تک پہنچ سکتے ہو، اس طریقہ سے تم رب کے محبوب بن جاؤ گے اور طالب سے مطلوب ہو جاؤ گے۔

۲۔ یا یوں کہو کہ گذشتہ آیت میں دشمنانِ خدا سے موالات اور محبت کی ممانعت کا ذکر تھا اب اس آیت میں انبیاء و رسل کی محبت اور متابعت کا ذکر ہے اور بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا معیار یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دوستوں سے دوستی رکھے اور اس کے دشمنوں سے دشمنی، طریقت حضرات انبیاء کرام کی اتباع میں ہے۔

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

۳۔ یا یوں کہو کہ شروع سورت سے اب تک توحید کا بیان تھا اب یہاں سے نبوت و رسالت کا بیان شروع ہوتا ہے سب سے پہلے پیغمبر آخر الزمان کی اطاعت کا ذکر فرمایا اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں یعنی إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ میں ان مقبول اور محبوب اور پسندیدہ اور برگزیدہ ہستیوں کا ذکر فرمایا کہ جن کی اطاعت اور متابعت اپنے اپنے زمانہ میں خدا تعالیٰ کی محبت کا معیار رہی اور اب نبی آخر الزمان کی نبوت و رسالت کا دور دورہ ہے جو بلاشبہ خداوند ذوالجلال کے حبیب اور خلیل ہیں لہٰذا اب جو شخص اللہ کی محبت اور دوستی کا دعویٰ کرے تو اس کا معیار یہ ہے کہ وہ حبیب خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے چون و چرا اتباع کرے، ایسے شخص سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا محبوب بنا لے گا اور تمام پچھلے گناہوں کو معاف کر دے گا جس درجہ ہمارے نبی کا اتباع کرو گے اسی درجہ خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔

۴۔ یا یوں کہو کہ گذشتہ آیت میں خدا کے دشمنوں سے محبت کی ممانعت تھی اب اس آیت میں خدا تعالیٰ کے بزرگ ترین حبیب اور خلیل کی محبت اور متابعت کا حکم ہے۔

۵۔ یا یوں کہو کہ گذشتہ آیت میں تخویف اور تہدید تھی تاکہ معصیت پر جری اور دلیر نہ ہو جائیں اور اس آیت میں تبشیر اور تسلی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائیں جیسا کہ خیال کرتے ہیں۔

اے ہمارے نبی آپ لوگوں سے یہ کہہ دیجئے کہ اگر تم اپنے زعم میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو یعنی میری راہ پر چلو کیونکہ محبت کا اقتضاء یہ ہے کہ محبوب کی مرضی اور خوشی کی تلاش ہو اور جن چیزوں سے محبوب کو نفرت ہے ان سے محب بھی نفرت کرے اور یہ بات آپ کے اتباع اور پیروی ہی سے ممکن ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا پتہ عقل سے نہیں چلتا بلکہ انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام ہی کے ذریعہ سے ان کا علم حاصل ہوتا ہے اور حضرات انبیاء و مرسلین ہی کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور اس کے اوامر اور نواہی کا صحیح علم حاصل ہوتا ہے اور محب اپنے محبوب کی معرفت اور طریقۂ اطاعت کے علم کا حریص اور مشتاق ہوتا ہے تاکہ اس کی محبت کا اہل اور اس کے تقرب کا مستحق ہو سکے یعنی اگر تم

اللہ کی محبت کے مدعی ہو تو میری راہ پر میرے پیچھے میرے نقش قدم پر چلے آؤ اللہ تعالیٰ تم کو اپنا محبوب اور مقرب بنا لے گا، اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے اور ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ محض محبت پر مغرور نہ ہو جاؤ بلکہ اس اللہ کی اطاعت کرو جس کی محبت کے تم مدعی ہو اور اس کے رسول کی بھی اطاعت کرو جو اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے محبوب کا محبوب بھی محبوب اور واجب الاطاعت ہوتا ہے، پس اگر یہ لوگ آپ کی اطاعت اور اتباع سے منہ موڑیں اور یہ گمان کریں کہ ہمیں رسول کی اتباع کی ضرورت نہیں تو خوب سمجھ لیں کہ خدا کے فرستادہ اور محبوب کی اطاعت اور اتباع سے اعراض اور گریز کرنا کفر ہے اور تحقیق اللہ کافروں کو محبوب نہیں رکھتا، یہود اور نصاریٰ یہ کہتے تھے کہ نحن ابناء اللہ واحباؤہ کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ کافر خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا، خدا کا محبوب وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا کے نبی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے چون و چرا اطاعت کرے۔

نکتہ: ظاہر کلام کا مقتضیٰ یہ تھا کہ فان اللہ لا یحبہم فرماتے لیکن بجائے ضمیر کے اسم ظاہر لائے اور یہ فرمایا فان اللہ لا یحب الکافرین تاکہ معلوم ہو جائے کہ نبی کی اتباع اور اطاعت سے اعراض کفر ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ

اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور

عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ

عمران کے گھر کو سارے جہان سے، کہ اولاد تھے ایک دوسرے کی

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

اور اللہ سننے والا جانتا ہے۔

ذکر اصطفاء بعض برگزیدگان خداوندی علیہم الصلوٰۃ والسلام

قال تعالیٰ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىٓ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ ..... الیٰ ..... وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ

ربط: گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے معیار کا بیان تھا اب ان آیات میں

اللہ تعالیٰ نے اپنے چند برگزیدہ بندوں کا ذکر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کے حقیقی محب اور محبوب تھے تاکہ ان کے حالات اور کمالات معلوم کر کے ان کے اتباع اور محبت کا شوق دل میں پیدا ہو۔ وہ یہ سمجھ لیں کہ حق تعالیٰ سے تعلق اور محبت بدون ان حضرات کی اتباع اور پیروی کے ناممکن ہے اور ان چند محبین اور محبوبین خدا کا ذکر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی تمہید ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ بہرحال مقصود اس تذکرہ سے یہ ہے کہ بارگاہ خداوندی میں رسائی بدون حضرات انبیاء کرام کے ناممکن اور محال ہے انہی حضرات کے اتباع سے حق تعالیٰ کی محبت اور خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے۔

سب سے پہلے جس نے دنیا کو خدا تعالیٰ کی محبت کی تعلیم و تلقین اور اس کا طریقہ بتلایا وہ ہمارے محترم روحانی باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں جو خداوند ذوالجلال کے خلیفہ ہیں اور علم اور معرفت میں فرشتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اور سب سے پہلے خدا کے نبی اور رسول مکرم ہیں۔

اور پھر حضرت نوح علیہ السلام اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور پھر آل عمران اور پھر سب سے آخر میں ہمارے نبی اکرم سرور عالم سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ جن کی بے چون و چرا متابعت اور اطاعت محبت خداوندی کا معیار ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ تحقیق اللہ تعالیٰ نے آدم کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا کہ دینی خلافت کا تاج اُن کے سر پر رکھا اور مسجود ملائکہ بنایا اور جس نے ان کو سجدہ کرنے سے انکار کیا اور ان کی برتری کا منکر ہوا اس کو ملعون اور مغضوب بنا کر اپنی بارگاہ سے نکال باہر کیا اور اُن کے ایک عرصہ دراز کے بعد خاص طور پر نوح کو برگزیدہ بنایا کہ اُن کی اتباع کرنے والوں کو نجات دی اور ان کی اطاعت اور اتباع سے منحرف ہونے والوں کو غرق کیا اور ابراہیم کی اولاد میں سے بعض کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا جیسے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کو دونوں کے لیے برکت کا وعدہ فرمایا در حقیقت خاندان عمران میں سے بھی بعض کو برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا۔ مفسرین کا اس میں اختلاف ہے کہ وآل عمران علی العالمین میں عمران سے کون سے عمران مراد ہیں آیا عمران بن ماثان مراد ہیں جو حضرت مریم کے والد ہیں اور حضرت مسیح کے جد ہیں یا عمران بن یصہر بن قاہث بن لاوی مراد ہیں جو حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے والد ہیں اور آیت کے سیاق اور سباق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں عمران بن ماثان حضرت مریم کے والد مراد ہیں اس لیے کہ ان آیات کا نزول نصاریٰ نجران کے بارہ میں ہوا جو حضرت عیسیٰ بن مریم کے الوہیت کے قائل تھے بہرحال اگر عمران سے حضرت موسیٰ کے والد مراد ہیں تو اولاد عمران سے حضرت موسیٰ اور ہارون مراد ہوں گے اور اگر عمران سے حضرت مریم کے والد مراد ہیں تو آل عمران سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں گے غرض یہ کہ ان سب حضرات کو اللہ تعالیٰ نے برگزیدہ اور پسندیدہ بنایا اور تمام جہان والوں میں سے ان کو اپنی نبوت و رسالت کے لیے منتخب فرمایا اور آپس میں یہ جماعت ایک نسل ہیں جو ایک دوسرے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایک طینت اور ایک خمیر ہے جو

اصطفاء اور اجتباء کے یکے بعد دیگرے وارث ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سب اقوال کے خوب سننے والے اور سب ظاہری اور باطنی احوال کے خوب جاننے والے ہیں کہ کون شخص اصطفاء اور برگزیدگی کے لائق ہے اللہ کا اصطفاء علم و حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

فائدہ

اس آیت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر نہیں وجہ یہ ہے کہ ان آیتوں کا نزول اہل کتاب کے مقابلہ میں ہوا ہے جو حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آل عمران کی نبوت اور برگزیدگی کو مانتے تھے ان پر حجت پوری کرنے کے لیے ان حضرات کا ذکر کیا گیا جن کی نبوت کے وہ خود بھی قائل تھے اس لیے اس مقام اور ترتیب میں ان افراد کا ذکر نہیں کیا گیا جن کی نبوت و بعثت کے وہ قائل نہ تھے نیز آیت میں کوئی کلمہ حصر کا نہیں کہ اصطفاء انہی حضرات میں منحصر ہے لہٰذا اگر حضرت اسمٰعیل کے اصطفاء کا اس آیت میں ذکر نہیں تو کوئی مضائقہ نہیں دوسری آیتوں میں ان کا اور دوسرے حضرات انبیاء کا ذکر مفصل آیا ہے جن کا اس آیت میں ذکر نہیں فرمایا۔

نکتہ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آل ابراہیم اور آل عمران سے جیسے عیسیٰ علیہ السلام سے جو خوارق اور معجزات ظہور میں آئے وہ ان کی برگزیدگی اور نبوت کی دلیل تھے نادانی سے ان کو الوہیت کی دلیل نہ سمجھا جائے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ

جب بولی عورت عمران کی، کہ اے رب! میں نے نذر کیا

لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ

تیرا، جو کچھ میرے پیٹ میں ہے آزاد ہو تو مجھ سے قبول

مِنِّي ۚ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا

کر۔ تو ہی اصل سنتا جانتا۔ پھر جب اس کو جنی

قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ ۖ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا

بولی اے رب میں نے یہ لڑکی جنی۔ اور اللہ کو بہتر معلوم

وَضَعَتْ ۗ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا

سے جو کچھ جنی اور بیٹا نہ ہو جیسے وہ بیٹی اور میں نے اس کا نام

مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ

رکھا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود

الرَّجِيمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا

سے پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا قبول کرنا اور بڑھایا

نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا

اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سپرد کی زکریا کو جس وقت آتا اس کے پاس

زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ

زکریا حجرے میں پاتا اس کے پاس کچھ کھانا کہا اے مریم

أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ

کہاں سے آیا تجھ کو یہ کہنے لگی یہ اللہ کے پاس سے ہے اللہ

يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس

قصۂ حضرت مریم و حضرت عیسیٰ علیہما السلام

قال تعالیٰ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ ..... الیٰ ..... بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

(ربط) گذشتہ آیات میں حق تعالیٰ کے چند محبوب اور مقبول بندوں کا اجمالاً ذکر تھا اب اس کی تفصیل شروع ہوتی ہے، اس سلسلہ میں سب سے پہلے آل عمران کا قصہ ذکر فرمایا جس سے مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب کے دو بڑے گروہ یہود اور نصاریٰ دونوں کے خیالات اور معتقدات فاسدہ کا

اور ان کی افترا پردازیوں کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یہود بے بہبود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں غایت درجہ تفریط کی اُن کو اُن کی شان عالی سے گھٹایا۔ اور اُن کو کاہن اور جادوگر بتلایا۔ اور نصاریٰ نے افراط کی یعنی ان کی تعظیم میں غلو اور مبالغہ کیا کہ ان کی ابنیت اور الوہیت کے قائل ہوگئے اس لیے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیت اور ان کی کہولت اور ان کے بشری احوال کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا تاکہ یہ امر خوب واضح ہو جائے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنس بشر سے ہیں اور حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت سے ہیں۔ معاذ اللہ خدا اور خدا کے بیٹے نہیں اس لیے کہ احوال بشریت اور اوصاف انسانیت سے گزرنا الوہیت اور ابنیت کے قطعاً منافی ہے حق تعالیٰ احوال اور تغیرات سے پاک اور منزہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اگر خدا ہوتے تو ماں کے پیٹ سے پیدا نہ ہوتے اور نہ ماں کی گود میں پرورش پاتے۔ غرض یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور طفولیت اور کہولیت کو نصاریٰ نجران کے عقیدۂ الوہیت اور ابنیت کے ابطال کے لیے ذکر فرمایا۔

بعد ازاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور رسالت اور ان کے فضائل اور معجزات اور رفع الی السماء کو یہود کے رد کے لیے بیان فرمایا تاکہ یہود بے بہبود یہ سمجھ جائیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو عزت دیتا ہے اور ان کے دشمنوں کو ذلیل اور خوار کرتا ہے اور مال اور اولاد کی کثرت ان کے کچھ کام نہیں آتی۔ حق تعالیٰ کو یہ بھی قدرت ہے کہ اپنے کسی دوست کو دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر آسمان پر لے جائے اور دشمنوں ہی میں سے کسی کو اپنے دوست کے ہم شکل بنا کر پھانسی پر لٹکوا دے اور تاکہ ان باتوں سے یہود یہ سمجھ جائیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقبول اور برگزیدہ بندے اور رسول برحق تھے کاہن اور ساحر نہ تھے غرض یہ کہ اس طریق سے یہود اور نصاریٰ دونوں کا خوب رد ہو گیا اور دونوں گروہ کے عقیدہ کا فاسد اور باطل ہونا خوب واضح ہو گیا۔

یا یوں کہو کہ ان حضرات انبیاء و مرسلین کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اور رضا اور خوشنودی کا ذریعہ ان حضرات کا اتباع اور اطاعت ہے اور خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ نبی کی اطاعت ہے۔ [illegible] هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ اور یہی دین بھی دین ہے جو ان حضرات کا تھا اور یہی دین اسلام ہے اور جو دین تم نے اختیار کیا ہوا ہے وہ انبیاء و مرسلین کا دین نہیں۔ انبیاء و مرسلین کا دین بھی وہی اسلام ہے جس کی طرف تم کو نبی آخرالزمان بلا رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ عمران کی بیوی نے جن کا نام حنہ بنت فاقوذا تھا اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق حالت حمل میں یہ منت مانی کہ اے میرے پروردگار میں نے آپ کے لیے نذر مانا ہے جو میرے شکم میں ہے تیری عبادت کے لیے اور تیرے گھر کی خدمت کے لیے آزاد ہوگا۔ ماں باپ اس سے اپنا کوئی خدمت نہ لیں گے۔ باقی تمام دنیوی مشاغل سے آزاد ہو کر فقط تیری عبادت اور تیرے گھر کی خدمت میں لگا رہے گا پس تو اپنی رحمت سے میری اس نذر کو قبول فرمالے۔

تحقیق تو میری عرض و معروض کو سننے والا ہے اور میری نیت اور اخلاص کو جاننے والا ہے اس لطیف اور پاکیزہ عنوان سے دعا مانگتے ہیں اشارہ اس طرف تھا کہ مجھ کو فرزند عطا فرما کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کیلئے قبول نہیں کی جاتی تھیں۔ پس جب خلاف توقع لڑکی جنی تو نہایت حسرت سے کہا اے میرے پروردگار میں نے تو اس حمل کو لڑکی جنا میری نذر تو اب کیا پوری ہوگی اس لیے کہ لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا۔ امراۃ عمران تو حسرت کر رہی تھیں اور اللہ کو بہتر معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا۔ اور وہ فرزند جس کی وہ خواہش کر رہی تھیں اس دختر کے برابر نہیں جو عطا ہوئی عمران کی بی بی کو۔

ف یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ قول خداوندی ہے اور مطلب یہ ہے کہ عمران کی بیوی کی حسرت اس بنا پر ہے کہ ان کو یہ معلوم نہیں کہ یہ لڑکی کس شان اور مرتبہ کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ لڑکی کیسی مبارک اور مسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک ایسے عظیم الشان فرزند ارجمند کا وجود مخفی اور مضمر ہے جو خیر و برکت میں اس کے وہم و گمان سے کہیں بالا اور برتر ہے یہاں تک بطور جملہ معترضہ کلام خداوندی تھا اب آگے پھر عمران کی بی بی کا قول ہے اور تحقیق میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا۔ مریم کے معنی ان کی زبان میں عابدہ یعنی عبادت کرنے والی کے ہیں حضرت حنہ کا مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مریم کو اسم بامسمیٰ بنادے اور بے شک میں پناہ میں دیتی ہوں مریم کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود کے شر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو لڑکے کے عوض قبول فرما لیا نہایت عمدہ قبول کے ساتھ یعنی لڑکوں سے بڑھ کر اس لڑکی کو قبول فرما لیا اور ہیکل اور بیت المقدس کے لیے باوجود خلاف دستور ہونے کے اس لڑکی کو قبول کر لیا اور مریم علیہا السلام کا لڑکی ہونا قبولیت کے لیے مانع نہ ہوا اور بڑھایا اللہ تعالیٰ نے اس لڑکی کو اچھی طرح بڑھانا یعنی ان کی ظاہری اور باطنی تربیت فرمائی اور ان کی پاکیزگی کو ایسا مکمل کیا کہ کوئی چیز ان کو بگاڑ نہ سکے۔ اور ان کی تربیت اور نباتات حسن یعنی ان کی تربیت کی ایک صورت یہ پیدا فرمائی کہ ایک مقبول اور برگزیدہ بندہ یعنی حضرت زکریا کو ان کا کفیل اور خبر گیر بنا دیا اور جب حضرت مریم سیانی ہو گئیں تو حضرت زکریا نے ان کے لیے مسجد کے قریب ایک حجرہ مخصوص کر دیا جو محراب سے قریب تھا جس میں وہ دن بھر اللہ کی عبادت کرتیں جب کبھی حضرت زکریا مریم کے پاس محراب یعنی حجرہ میں آتے تو ان کے نزدیک کچھ کھانا رکھا ہوا پاتے۔ جس کا ظاہر میں کوئی سبب نہ تھا کیونکہ وہ کھانا نہ تو ان کے گھر کا تھا اور نہ باہر کا اس لیے کہ حضرت زکریا جب چلے جاتے تھے تو حجرہ کا دروازہ بند کر دیتے تھے اور پھر تعجب یہ تھا کہ ان کے سامنے غیر موسم کا پھل رکھا ہوا دیکھتے سردیوں کا میوہ گرمیوں میں اور گرمیوں کا سردی میں اس لیے حضرت زکریا نے تعجب سے کہا کہ اے مریم یہ تیرے لیے کہاں سے آیا مریم بولی یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے اللہ جس کو چاہے بغیر قیاس اور بغیر گمان اور بغیر وہم و گمان کے روزی دے اس کے رزق دینے کے لیے کسی ظاہری سبب کی ضرورت نہیں۔

فوائد

۱- صحیحین میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بچہ پیدا ہوتا ہے پیدا ہوتے وقت شیطان اس کو مس کرتا ہے بچہ چیختا ہے جس سے وہ روتا ہے۔ مگر حضرت مریمؑ اور ان کے بیٹے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف یہ دونوں اس سے مستثنیٰ ہیں اور چونکہ امرأۃ عمران کی یہ دعا استعاذہ عین ولادت کے ساتھ تھی اس لیے اس وقت تک شیطان کا مس واقع نہ ہوا تھا اگرچہ قرآن کریم میں امرأۃ عمران کی اس دعاء استعاذہ کا ذکر بعد ولادت کے واقع ہوا لیکن واو ترتیب وقوعی پر دلالت نہیں کرتا۔ لہٰذا اب یہ اشکال نہیں رہا کہ امرأۃ عمران کی یہ دعا تو ولادت کے بعد ہوئی اور مس شیطان اس سے پہلے یعنی وضع حمل اور ولادت کے وقت ہوتا ہے۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ دعا تو عین ولادت کے وقت تھی مگر قرآن کریم میں ذکر اس دعا کا بعد میں ہے یہ دعا ذکر میں مؤخر ہے اور وقوع میں مقدم ہے۔

۲- ولادت کے وقت شیطان ہر بچہ کو مس کرتا ہے سوائے مریمؑ اور ان کے بیٹے کے، لیکن عباد مخلصین کو یہ مس شیطانی کوئی ضرر نہیں پہنچاتا اور اس مس سے ان کی عصمت اور نزاہت میں کوئی فرق نہیں آتا ہے اور اس ایک خاص خصوصیت کی بنا پر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی انبیاء کرام پر افضلیت ثابت ہوتی ہے۔

یہ امر بھی اہل اسلام میں مسلّم ہے کہ حضرت مریمؑ شان اور رتبہ میں ابراہیم خلیل اللہ اور موسیٰ کلیم اللہ سے اعلیٰ اور افضل نہیں ہیں اس لیے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے بارہ میں یہ نہیں آیا کہ شیطان نے ان کو مس نہیں کیا لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو رسالت اور تکلیم سے سرفراز فرمایا اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت سے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو مس شیطانی سے مستثنیٰ فرمایا اور دوسرے حضرات انبیاء جو خدا کے مقرب اور معصوم بندے ہیں اگرچہ وہ اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں اس لیے کہ ان عباد مخلصین پر شیطان کی کوئی حرکت کارگر نہیں۔

حدیث میں ہے کہ جس راستہ پر عمرؓ چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے کیا کوئی فہیم اس سے یہ سمجھ سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل تھے اور معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عمرؓ مجھ سے بھی افضل ہیں۔ بلکہ اس سے مقصود حضرت عمرؓ کی ایک خاص فضیلت اور خاص خصوصیت بیان کرنی تھی الغرض اس قسم کے خصوصی امتیازات سے فضیلت تو ثابت ہوتی ہے لیکن افضلیت ثابت نہیں ہوتی اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو کوئی خاص خصوصیت دی ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ

وہاں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے کہا اے رب میرے عطا کر

لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ

مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ بے شک تو

سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ

سننے والا ہے دعا کو۔ پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑا تھا

يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا

نماز میں حجرے کے اندر کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی جو گواہی

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ

دے گا اللہ کے حکم کی اور سردار ہوگا اور عورت پاس نہ جاوے گا اور نبی ہوگا

الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ

نیکوں میں سے۔ بولا اے رب کہاں سے ہوگا مجھ کو لڑکا! اور مجھ پر

بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ

آیا بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے فرمایا اسی طرح

اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ

اللہ کرتا ہے جو چاہے۔ بولا اے رب مجھ کو دے کوئی نشانی۔

قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ

کہا نشانی تیری یہ کہ نہ بات کرے تو لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے۔

گمان یہ ہے کہ چونکہ حضرت زکریاؑ نے فرزند کی یہ دعا حضرت مریمؑ کے زمانہ تربیت میں مانگی اس لیے انہیں بھی ایک فرزند خصوصی عطا کیا گیا کہ جس کو مرد و زن کی ضرورت نہ ہو واللہ اعلم۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ

اور جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا

وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِينَ ﴿٤٢﴾

اور ستھرا بنایا اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں سے

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِى لِرَبِّكِ وَاسْجُدِى وَارْكَعِى مَعَ

اے مریم بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ

الرّٰكِعِينَ ﴿٤٣﴾ ذٰلِكَ مِنْ أَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ

رکوع کرنے والوں کے یہ خبریں غیب کی ہیں ہم بھیجتے ہیں تجھ کو

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلٰمَهُمْ أَيُّهُمْ

اور تو نہ تھا ان کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون پالے

يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿٤٤﴾

مریم کو اور تو نہ تھا ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ

جب کہا فرشتوں نے اے مریم! اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک

مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِى

اپنے حکم کی جس کا نام مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا مرتبے والا

الدُّنْيَا وَالْأٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ

دنیا میں اور آخرت میں اور نزدیک والوں میں اور باتیں کرے گا لوگوں

فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ

سے جب ماں کی گود میں ہوگا اور جب پوری عمر کا ہوگا اور نیک بختوں میں ہے۔ بولی اے رب!

اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ

کہاں سے ہوگا مجھ کو لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے کہا

كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا

اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے، جب حکم کرتا ہے ایک کام کو

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ

تو یہی کہتا ہے اس کو کہ ہو وہ ہو جاتا ہے۔ اور سکھا دے گا اس کو کتاب

وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى

اور کام کی باتیں اور توریت اور انجیل۔ اور رسول ہوگا

بَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ

بنی اسرائیل کی طرف، کہ میں آیا ہوں تمہارے پاس نشان لے کر تمہارے رب کا

اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔــةِ الطَّيْرِ

کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو گارے سے صورت جانور کی پھر اس میں

فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ

پھونک مارتا ہوں تو وہ ہو جاتا ہے اڑتا جانور اللہ کے حکم سے اور اچھا کرتا ہوں

الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ

مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے،

وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي

اور بتا دیتا ہوں تم کو جو کھا کر آؤ اور رکھ آؤ اپنے گھر

بُيُوتِكُمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم

میں، اس میں نشانی پوری ہے تم کو اگر تم یقین

مُّؤْمِنِينَ ﴿٤٩﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ

رکھتے ہو ۔ اور سچ بتاتا ہوں توراۃ کو جو مجھ سے پہلے

التَّوْرَاةِ وَلِأُحِلَّ لَكُم بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ

کی ہے اور اس واسطے کہ حلال کر دوں تم کو بعض چیزیں جو حرام

عَلَيْكُمْ ۚ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ

تھیں تم پر، اور آیا ہوں تم پاس نشانی لے کر تمہارے رب کی سو ڈرو اللہ سے

وَأَطِيعُونِ ﴿٥٠﴾ إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۗ

اور میرا کہا مانو ۔ بے شک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو،

هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٥١﴾

یہ سیدھی راہ ہے ۔

تتمۂ قصۂ حضرت مریم علیہا السلام

قال اللہ تعالیٰ: وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاكِ ... الخ ... هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ

یہاں تک حق جل شانہٗ نے آلِ عمران اور آلِ ابراہیم کے اصطفاء اور ان پر اپنی توجہات و عنایات کے واقعات ذکر فرمائے اب آگے ایک اور قصہ اسی سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں جو درحقیقت حضرت مریمؑ کے قصہ کا بقیہ تتمہ ہے اس لیے کہ سلسلۂ کلام کا آغاز حضرت مریمؑ کے

قصہ سے ہوا تھا، درمیان میں مناسبت کی وجہ سے ضمناً حضرت زکریاؑ کا قصہ ذکر فرمایا، اب آگے پھر حضرت مریمؑ کے قصہ کا بقیہ ذکر فرماتے ہیں اور وہ دوسرا قصہ یہ ہے کہ جب فرشتوں نے ایک گروہ سے ہانپنا تو حضرت مریمؑ سے کہا کہ اے مریمؑ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے تجھ کو برگزیدہ کیا کہ اپنی کرامات و عنایات کا مورد بنایا، وہ یہ کہ لڑکی ہونے کے باوجود تجھ کو اپنی نیاز میں قبول فرمایا اور سب اخیر میں تجھ کو فرشتوں کے کلام اور خطاب سے عزت بخشی اور تجھ کو ظاہری اور باطنی عیوب سے پاک اور منزہ کیا اور اپنے پاک گھر یعنی مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لائق بنایا، ظاہری تو یوں کہ بعض زنانہ عوارض سے پاک کیا اور باطنی طہارت و نزاہت یوں کہ کسی شیطانی سے تجھ کو محفوظ رکھا اور تمام جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں تجھ کو بعض خصوصی فضائل اور امتیازات عطا کیے بلا مس بشر کے حضرت مسیحؑ جیسا مبارک اور اولوالعزم پیغمبر فرزند تم کو عطا کیا جو تمہارے سوا اور کسی عورت کو نہیں عطا ہوا، لہٰذا اے مریم ان نعمتوں کے شکریہ میں اپنے پروردگار کی بندگی میں لگی رہو اور یعنی نماز میں قیام کو طویل کیا کرو اور سجدہ کیا کرو اور رکوع کیا کرو تا کہ تم کو اللہ کا قرب حاصل ہو کما قال تعالیٰ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ اور رکوع کیا کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو اس لیے کہ رکوع اگرچہ رتبہ میں سجدہ سے کم ہے لیکن راکعین کی معیت کی وجہ سے جب راکعین کے انوار و برکات بھی اس کے ساتھ مل جائیں گے تو یہ رکوع قریب قریب سجود ہی کے قرب خداوندی میں معین اور مددگار ہوگا اور حضرت مریمؑ کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا حکم یا تو اس بناء پر تھا کہ اس زمانہ کی شریعت میں عورتوں کو نماز باجماعت میں شریک ہونے کی اجازت تھی یا حضرت مریمؑ کی خصوصیت تھی۔

نکتہ: جماعت میں شریک ہونے کے لیے غالباً رکوع کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت کو پالیا جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے اور اسی پر فقہاء امت کا اجماع ہے اور بعض علماء نے وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ اے مریم جس طرح رکوع کرنے والے رکوع کرتے ہیں اسی طرح تم بھی رکوع کیا کرو یعنی رکوع میں سب مسلمانوں کی موافقت کرو اور جس طرح وہ نماز پڑھتے ہیں اسی طرح تم بھی پڑھا کرو۔

اب حق جل شانہٗ ان مضامین کے ضمن میں آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل ذکر فرماتے ہیں جو ان واقعات کے بیان سے مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ قصے جو حضرت حنہ اور مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کے ہم نے ذکر کیے منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں جن کی وحی ہم آپ تک بھیجتے ہیں یہ دلیل ہے آپ کے نبی برحق ہونے کی اس لیے کہ کسی شے کے جاننے کی صرف تین صورتیں ہیں۔ عقل یا خبر یا مشاہدہ سو قصص اور واقعات میں عقل کو دخل نہ ہونا بالکل ظاہر ہے، گذشتہ واقعات کو عقل سے معلوم کر لینا باجماع عقلاء محال ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کو کسی سے سنا بھی نہیں اور اگر کسی کو یہ گمان ہو کہ توریت اور انجیل کے علماء سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا ہے تو اس کو چاہیے کہ اس عالم کو سامنے لائے یا خود اس سے پوچھ آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم

اُمّی تھے اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ آپ نے کسی کتاب میں دیکھ کر یہ واقعات بیان فرمائے ہوں کیونکہ کسی کتاب سے علم حاصل کرنا دفتر ہے جس میں یہ تمام واقعات تفصیل کے ساتھ لکھے ہوئے ہوں اور وہ کتاب اور دفتر کہاں ہے اور کس کتب خانہ میں ہے جسے حضور پُرنور دیکھ کر یہ واقعات بیان کرتے ہیں۔ منکرین خود جاکر اس کتاب اور دفتر کو دیکھ لیں اور دیکھ کر وہ بھی اسی طرح ان واقعات کو بیان کر دیں۔ اب صرف تیسری صورت مشاہدہ کی رہ گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان واقعات کو بچشم خود دیکھا ہو تو کسی ذی عقل اور ذی ہوش کو اس کا وسوسہ بھی نہیں آسکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قبل کے ان واقعات کے وقت موجود تھے، پس جب کہ آپ نے ان واقعات کو نہ بچشم خود مشاہدہ کیا اور نہ کسی خارجی طریقہ و ذریعہ سے آپ کو ان کا علم حاصل ہوا پس متعین ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان واقعات کا علم بذریعہ وحی کے معلوم ہوا اور آپ اللہ کے برحق نبی ہیں جن پر اللہ کی وحی نازل ہوتی تھی اور بذریعہ وحی کے آپ کو انباء الغیب سے مطلع کیا جاتا ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں اور آپ ان کے نزدیک نہ تھے جب وہ قرعہ کے لیے اپنے اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون شخص مریم کی پرورش کا کفیل اور متکفل ہو جائے اور آپ ان کے پاس نہ تھے جب وہ مریم کی پرورش کے بارہ میں جھگڑ رہے تھے۔ حق جل شانہ نے جب حضرت مریم کو نذر میں قبول فرمایا تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ مریم کس کی پرورش میں رکھا جائے حضرت مریم چونکہ سردار کی لڑکی تھیں اس لیے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میری پرورش میں رہے حضرت زکریا نے فرمایا میں زیادہ مستحق ہوں میری اہلیہ اس لڑکی کی خالہ ہے وہ نہایت محبت سے اس کی پرورش کرے گی فیصلہ اس پر ہوا کہ ہر ایک اپنا قلم جس سے توریت لکھتے تھے بہتے ہوئے پانی میں ڈالے جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہے وہ حضرت مریم کا حقدار سمجھا جائے۔ اس بار قرعہ حضرت زکریا کے نام کا نکلا۔ اور حق بحقدار رسید کو پہنچ گیا۔

پس جب آپ ان واقعات اور حالات کے وقت موجود نہ تھے تو معلوم ہوا کہ ان امور کا علم آپ کو بذریعہ وحی کے ہوا ہے۔ اور جس پر اللہ کی وحی کا نزول ہو وہ ضرور نبی ہے۔

آغاز قصۂ عیسیٰ علیہ السلام

اس وقت کو یاد کرو جب کہ فرشتوں نے حضرت مریم سے یہ بھی کہا اے مریم تحقیق اللہ تم کو بشارت دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کی جو منجانب اللہ ہوگا یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی خوشخبری دیتا ہے جو بلا باپ کے تم سے پیدا ہوگا اور بلا باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ کہلائے گا اور اللہ کی طرف اس نسبت اور اضافت سے اس کو ایک خاص شرف اور عزت حاصل ہوگی اس کا نام اور لقب مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ مسیح اصل میں مشیحا تھا عبرانی زبان میں اس کے معنی مبارک کے ہیں۔ معرب ہوکر مسیح ہو گیا جیسے موسیٰ

موشحا کا معرب ہے۔ باقی دجال کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ بالاجماع عربی لفظ ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ مسیح
کے معنی پونچھ دینے اور زائل کر دینے کے ہیں چونکہ دجال سے تمام عمدہ خصلتیں پونچھ دی گئی ہیں اس
لیے اس کو مسیح دجال کہتے ہیں۔ اور عیسیٰ اصل میں ایشوع تھا یہ بھی عبرانی زبان کا لفظ ہے عبرانی میں ایشوع کے
معنی مبارک کے ہیں، عیسیٰ، ایشوع کا معرب ہے۔

نکتہ: حضرت عیسیٰ کو ابن مریم (یعنی مریم کا بیٹا) اس لیے فرمایا حالانکہ خطاب خود حضرت مریم کو
ہے تاکہ اس پر تنبیہ ہو جائے کہ بغیر باپ کے پیدا ہوں گے کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ اولاد
باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے ماں کی طرف منسوب نہیں ہوتی۔ اب آگے اس مولود مسعود کے کچھ
اوصاف بیان کرتے ہیں کہ وہ مولود مسعود دنیا اور آخرت میں باعزت اور آبرو والا ہوگا اہل دنیا اور اہل
آخرت دونوں ہی کی نظروں میں معظم اور محترم اور مرتبہ والے ہوں گے۔ اس صفت کے ذکر سے حضرت
مریم کی تسلی مقصود ہے اس لیے کہ جب حضرت مریم کو بغیر باپ کے فرزند پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تو
ممکن ہے کہ حضرت مریم بمقتضائے بشریت تشویش میں پڑ جائیں کہ دنیا میں کون اس کو باور
کرے گا کہ لڑکا بغیر باپ کے پیدا ہوا۔ ناچار لوگ مجھ پر تہمت رکھیں گے اور بچہ کو ہمیشہ برے نام سے
مشہور کریں گے میں کس طرح اپنی برأت ظاہر کروں گی حق تعالیٰ نے فرمادیا کہ تم گھبراؤ نہیں ہم نے برأت
اور نزاہت کا انتظام کر دیا ہے حق تعالیٰ نے خصوصی طور پر تم کو تمام برے الزام اور تہمتوں سے بری
کرے گا چنانچہ پہلی مرتبہ وجاہت کا ظہور اس طرح سے ہوا کہ پیدا ہونے کے بعد شیر خوارگی کی حالت میں
کلام کیا اور یہ کہا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا الیٰ آخرہ۔ اس کلام کے سنتے ہی والدہ
سے تمام بدگمانیاں دور ہوگئیں اور سمجھ گئے کہ یہ مولود مسعود نہایت مبارک ہے محض قدرت کے حکم سے بلا باپ
کے پیدا ہوا ہے۔ حق تعالیٰ نے حضرت مریم کو بتلا دیا کہ جب کوئی اس بارہ میں تم سے کچھ سوال کرے تو تم
اس بچہ کی طرف اشارہ کر دینا وہ خود اپنی طہارت و نزاہت کو بیان کر دے گا جس کی تفصیل سورۂ مریم میں آئے گی
دوسری بار وجاہت اس وقت ظاہر ہوئی جب دشمنوں نے پکڑنے اور قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ
نے زندہ اور صحیح و سالم آسمان پر اٹھا لیا اور دشمن دیکھتے ہی رہ گئے۔ اور دنیاوی وجاہت کی پوری پوری
تکمیل، نزول من السماء کے بعد ہوگی جیسا کہ تمام اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے اور وہ مولود مسعود فقط
باعزت اور باآبرو ہی نہ ہوگا بلکہ حق جل شانہ کے خاص الخاص مقربین میں سے ہوگا۔ یعنی بارگاہ ایزدی کے
ان مقربین میں سے ہوگا جو قرب ذاتی اور صفاتی سے متصف ہوں گے اور تجلیات ربانیہ کے مورد اور
مظہر ہوں گے اور ان کے مقرب ہونے پر وہ ارہاصات اور خوارق عادات دلالت کریں گے جو ان سے
قبل از بعثت ظہور میں آئیں گے، مثلاً وہ گہوارہ (جھولے) میں ہی ایسا حکیمانہ کلام کرے گا جیسا کہ انبیاء کا کلام ہوتا
ہے حالانکہ وہ بچہ اس وقت ماں کی گود میں ہوگا اور اس کی یہ حالت مستمر اور دائم رہے گی یہاں تک کہ وہ
ادھیڑ عمر کا ہوگا اور اس حالت میں بھی ایسا ہی کلام کرے گا۔ عہد طفولیت اور عہد کہولت کے کلام میں

میں کوئی تفاوت نہ ہوگا ان احوال کے مشاہدہ کے بعد کسی کو وہم بھی نہ ہوگا کہ گہوارہ اور نا سمجھی کی عمر میں جو کلام صادر ہوا تھا وہ کسی شیطان یا جن کا اثر تھا اور ان پر شیطان کا اثر کہاں ہو سکتا ہے وہ تو نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک بختوں میں سے ہوں گے اور شیطان کا اثر فاسق اور فاجر اور بدکار لوگوں پر ہوتا ہے اور کسی نقصان اور دینی خلل اور فساد کا گمان علماء صالحین میں نہیں ہو سکتا۔

حضرت مریم کا تعجب اور اس کا جواب

یہ بشارت سن کر حضرت مریم کو یقین کہ وہ لڑکا بے باپ کے پیدا ہوگا اور اسی وجہ سے وہ کلمۃ اللہ اور ابن مریم کہلائے گا یعنی میری طرف منسوب ہوگا اس لیے حضرت مریمؑ نے اس بشارت کو سن کر بطور تعجب یہ کہا کہ اے میرے رب میرے لڑکا کیسے ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور بچہ عادۃً بغیر مرد کے تعلق کے پیدا نہیں ہوتا پس معلوم نہیں میرے بچہ ہوگا وہ کس طرح ہوگا آیا محض قدرت خداوندی سے بغیر باپ کے بچہ پیدا ہوگا یا مجھ کو نکاح کرنے کا حکم ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کے واسطہ سے جواب میں فرمایا کہ ویسے ہی بلا باپ کے پیدا ہوگا کیونکہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں یعنی وہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کسی سبب کا محتاج نہیں حق جل شانہٗ اس پر قادر ہے کہ وہ اشیاء کو بتدریج قانون عادت کے موافق مادہ اور سبب سے پیدا کرے اسی طرح وہ اس پر بھی قادر ہے کہ دفعۃً بغیر مادہ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کو پیدا کر دے تو اسی نے تو اپنی قدرت کاملہ سے اسباب کو بلا سبب کے اور مادہ کو بغیر مادہ کے پیدا کیا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کو انجام دینا چاہتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ تو ہو جا پس وہ چیز فوراً ہو جاتی ہے لہٰذا تم اس بچہ کے بدون مس بشر کے پیدا ہونے پر تعجب نہ کرو وہ لڑکا اسی طرح ہوگا خدا کی غیر محدود قدرت کسی سبب اور مادہ کی محتاج اور پابند نہیں۔

خوارق عادات کے متعلق فلاسفہ اور ملاحدہ کے

شبہات کے جوابات

جو لوگ بجز اسباب ظاہرہ اور اپنی محدود معلومات اور مخصوص تجربات کے موافق دنیا کی ہر چیز کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی آیات قدرت کا اکثر و بیشتر انکار کر بیٹھتے ہیں انہی آیات قدرت میں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی ہے یہ لوگ اس کے بھی منکر ہیں حالانکہ ان کے پاس

کوئی ایسی عقلی دلیل نہیں کہ جس سے وہ اس کو محال ثابت کرسکیں سوائے اس کے کہ یہ کہیں کہ بغیر باپ کے پیدا ہونا عادت کے خلاف ہے سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ خلاف عادت ہونے سے کسی چیز کا محال ہونا ثابت نہیں ہوسکتا۔

روز مرہ کائنات میں ایسے عجائب و غرائب کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے جو پہلے سے ہرگز دیکھی اور معلوم نہ تھے بلکہ وہم و گمان میں بھی نہ تھے، ان عجائب و غرائب کے اسباب و علل معلوم ہوجاتے ہیں جن کو آج کل کی اصطلاح میں انکشافات اور مخترعات کہتے ہیں اور جن کے اسباب و علل تک عقل کی رسائی نہیں ہوتی ان کو عجائبات طبعیہ سے تعبیر کرکے خاموش ہوجاتے ہیں یعنی جو چیزیں طبعی اور فطری طور پر قانون الٰہی کے طریقہ سے بلا کسی سبب اور علت کے ظہور میں آگئی ہیں ان کو عجائبات طبعیہ کہتے ہیں جن کا تعلق تو یہ ہے اجرام سماوات کے اتفاقی کرشمے، جب اس قسم کی چیزیں ظہور میں آجاتی ہیں تو ان کے غیر عادی اور خارق عادت وجود سے تو انکار نہیں ہوسکتا تو ان کو عجائبات طبعیہ کے نام سے موسوم کرکے خاموش بیٹھ جاتے ہیں مگر عقل اور تجربہ نے ان کے اسباب و علل بتلانے سے جواب دے دیا ہے اب ہم ان منکرین معجزات سے انہی عجائبات طبعیہ کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ جب ان عجائبات طبعیہ کے ظاہری اور معلوم اسباب تو ہوتے نہیں تو وہ عقلاً محال نہیں یا تو یہ کہئے کہ ظاہری اسباب اگرچہ نہیں مگر ان کا ظہور اسباب خفیہ کے ماتحت ہوا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہوسکے، یا یہ کہو کہ ان عجائبات طبعیہ کے لئے اسباب کا ہونا اور اسباب ظاہرہ کی طرح اسباب خفیہ بھی نہیں مطلقاً بلاکسی ظاہری اور خفی سبب کے ظہور پذیر ہوگئے ہیں۔

اگر منکرین معجزات شق اول کو اختیار کرتے ہیں تو ہم یہ کہیں گے کہ جس طرح عجائبات طبعیہ بلاکسی ظاہری و معلوم سبب کے ظہور پذیر ہوسکتے ہیں اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا اگرچہ ظاہراً کوئی سبب معلوم نہیں ہوتا لیکن ممکن ہے کہ ان کا کوئی خفی سبب ہو جو اب تک ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بے باپ کے پیدا ہوئے ہیں اور اس طرح کی ولادت کا کوئی خفی سبب ہو جو ہماری تحقیق میں نہ آیا ہو پس کیا وجہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کو تو آپ محال اور ناممکن سمجھیں اور عجائبات طبعیہ کو ممکن بلکہ ان کے واقع ہونے کے قائل ہوں۔

اور اگر شق ثانی کو اختیار کرتے ہیں یعنی یہ کہیں کہ عجائبات طبعیہ مطلقاً بلاکسی سبب کے ظہور میں آتے ہیں جس طرح ظاہر میں ان کے وجود کا کوئی سبب نہیں اسی طرح باطن میں بھی کوئی خفی سبب ان کے وجود کا نہیں تو اس صورت میں قرآن کریم کے خوارق عادت کو بھی تسلیم کرلینا چاہئے کہ اسباب عادیہ لازم و ملزوم نہیں ان اسباب عادیہ کے بغیر بھی کائنات ظہور پذیر ہوسکتی ہیں لہٰذا اس اقرار و اعتراف کے بعد آیات قدرت اور خوارق عادات کا محض اس بنا پر انکار کرنا کہ یہ اسباب عادیہ کے خلاف ہیں انتہائی نادانی اور کمال ابلہی سمجھا جائے گا۔

اگلے لوگوں نے اگر اس قسم کی چیزوں کا انکار کیا تو ان کو کچھ معذور کہا جاسکتا ہے کہ وہ چیزیں اس

اور پرندوں کے پھڑکنے میں کیا تناسب اور ربط ہے اور اس کی کیا حقیقت اور کیا علت ہے اس کی ان کو کچھ خبر نہیں غرض یہ کہ نادانی کا تو یہ عالم کہ کائنات کے ایک ذرہ کے حقیقت اور علت سمجھنے سے قاصر اور خالق کائنات کی خبر لانے پر جرأت کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ع بریں عقل و دانش بباید گریست۔

فضائل وکمالات عیسیٰ علیہ السلام

اور اے مریم تم اس بچہ کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے یہ خیال مت کرو کہ ولادت کے بعد لوگ طعن و تشنیع کا نشانہ بنائیں گے بلکہ وہ مولود تمہاری عزت و وجاہت کا سبب بنے گا اس لیے کہ وہ مولود مسعود عجیب و غریب فضائل و کمالات کا معدن اور مخزن ہوگا جن کو دیکھتے ہی اہل فہم سمجھ جائیں گے کہ یہ پیکر فضائل و شمائل معاذ اللہ ولد الزنا نہیں ہو سکتا بلکہ خود روح القدس ہے کہ جس کے پھونک مارنے سے مریم سے زندہ ہوا ہے اپنی والدہ کی گود ہی میں سے کلام کرنے لگے گا اور آگے اس مولود مسعود کی صفات یہ ہوں گی کہ اللہ تعالیٰ اس کو بلا کسی معلم اور بغیر استاد کے آسمانی کتابوں کے علوم اور دانائی اور حکمت کی باتیں سکھلائے گا۔ اور بالخصوص اس کو توریت اور انجیل کا علم عطا کرے گا اور بنی اسرائیل کی طرف ایک عظیم الشان رسول بنا کر بھیجے گا جو صاحب معجزات ہوگا اور تحدی کے ساتھ ان سے یہ کہے گا کہ میں تمہارے پاس خدا تعالیٰ کی طرف سے اپنی نبوت و رسالت کی ایک روشن نشانی لے کر آیا ہوں یعنی ایسے معجزات ظاہر کرنے آیا ہوں جو میری رسالت کی روشن دلیلیں ہیں جن کو دیکھ کر تم بداہتہ یہ جان لو گے کہ یہ معجزات بلاشبہ من جانب اللہ یعنی تمہارے رب کی جانب سے ہیں اس لیے کہ اس زمانہ کے تمام حکماء اور اطباء ان کے مثل لانے سے عاجز اور درماندہ ہوں گے اور وہ معجزات یہ ہیں کہ میں تمہارے لیے اور تمہارے اطمینان کے لیے گارے سے پرندہ جیسی ایک صورت اور شکل بناؤں گا اور پھر اس مصنوعی صورت اور شکل میں پھونک ماروں گا پس وہ ظاہری صورت و شکل اللہ تعالیٰ کے حکم سے حقیقۃ زندہ پرندہ بن جائے گی اور اس کے علاوہ دوسرا معجزہ میرا یہ ہوگا کہ میں مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو ہاتھ پھیر کر اچھا اور چنگا کر دوں گا اور مردوں کو زندہ کر دوں گا۔ اور یہ سب اللہ کے حکم سے ہوگا۔ یعنی اگرچہ میرا ہاتھ ہوگا مگر ارادہ اللہ کا حکم ہوگا اور مادر زاد اندھا ہونا اور کوڑھی ہونا یہ وہ بیماریاں ہیں جن سے تمام اطباء اور حکماء عاجز ہیں بالخصوص مردہ کو زندہ کرنا یہ سب ہی سے بڑھ کر ہے چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ طب کا چرچا تھا اس لیے حضرت عیسیٰؑ کو اسی قسم کے معجزات دیئے گئے تاکہ اطباء اور حکماء کا عجز ظاہر ہو۔

نکتہ لفظ باذن اللہ کا تکرار الوہیت کا شبہ رفع کرنے کے لیے ہے کہ مردہ کو زندہ کرنا بندہ کا کام نہیں بلکہ خدا کا کام اور اس کا حکم ہے۔ اب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار معجزات

بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا

کہ ہم نے حکم قبول کیا۔ اے رب! ہم نے یقین کیا جو تو نے اتارا اور ہم تابع

الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَكَرُوْا وَ

ہوئے رسول کے، سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں۔ اور مکر کیا ان کافروں

مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ

نے، اور مکر کیا اللہ نے اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے۔ جس وقت کہا اللہ نے

يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ

اے عیسیٰ! میں تجھ کو پھر لوں گا اور اٹھا لوں گا اپنی طرف، اور پاک کر دوں گا

مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ

کافروں سے، اور رکھوں گا تیرے تابعوں کو

فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ

اوپر منکروں سے قیامت کے دن تک، پھر میری طرف

مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

ہے تم کو پھر آنا، پھر فیصلہ کر دوں گا تم میں جس بات میں تم جھگڑتے تھے۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا

سو وہ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب

فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَ

دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔ اور

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ

اور جو لوگ یقین لائے اور عمل نیک کیے سو ان کو پورا دے گا

اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ

ان کا حق، اور اللہ کو خوش نہیں آتے بے انصاف، یہ پڑھ سناتے ہیں

عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى

ہم تجھ کو آیتیں اور مذکور تحقیقی، بے شک عیسیٰ کی مثال

عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ

اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے مثال آدم، بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو

لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ

کہ ہو جا وہ ہو گیا، حق بات ہے تیرے رب کی طرف سے پھر تو مت رہ

الْمُمْتَرِيْنَ ۝

شک لانے والوں میں۔

ذکر عداوتِ یہود با عیسیٰ علیہ السلام و حفاظتِ خداوند انام

و بشارتِ رفع الی السماء و محفوظیت از مکر اعداء

قال تعالیٰ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ ... الٰی ... فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

حسبِ بشارت جب عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہو گئے اور بڑے ہوئے اور لوگوں کو توحید اور تقویٰ اور اللہ کی اطاعت کی دعوت دی اور سیدھی راہ کی طرف بلایا اور معجزات اور نشانات ان کو دکھلائے تو یہودِ بے بہبود نے آپ کی تکذیب کی اور آپ کے ایذا اور قتل کے درپے ہو گئے۔

حق جل شانہ نے ان آیات میں یہود کی عداوت کا ذکر کیا کہ وہ حضرت عیسیٰ کے قتل کے درپے ہوئے

تدبیریں کر رہے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی تدبیر یعنی حفاظت کا ذکر فرمایا کہ ہم نے اُن کی حفاظت کی کیا تدبیر کی وہ یہ کہ ہم نے اُن کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور دشمنوں کی ساری تدبیریں اور امیدیں خاک میں ملا دیں اصل مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشارت دینا ہے کہ آپ دشمنوں سے بالکل مامون اور محفوظ رہیں گے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جائیں گے چنانچہ فرماتے ہیں پس جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی جانب سے کفر اور انکار کو محسوس کر لیا اور دیکھ لیا کہ یہ لوگ میرے قتل کے درپے ہیں تو اپنے مخصوص اصحاب سے جو حواریین کہلاتے تھے یہ کہا کہ کون ہے جو دشمنوں کے مقابلہ میں میری مدد کرے اللہ کی طرف ہو کر حواریین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے دین کے ہم آپ کی دعوت اور تبلیغ سے اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیے کہ ہم اللہ کے اور آپ کے مطیع و فرمانبردار ہیں اور پھر حواریین عیسیٰ علیہ السلام کے جواب کے بعد حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے ایمان کی پختگی اور استقامت کے لیے یہ دعا کی کہ اے پروردگار ہم ایمان لائے ان تمام چیزوں پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور دل وجان سے رسول کے تابع ہو گئے پس ہم کو اپنے دین کے شاہدوں کے زمرہ میں لکھ دیجئے یعنی یقین کے زمرہ میں ہمارا نام لکھ دیجئے مقصود یہ تھا کہ جب ہمارا نام ان کے دفتروں کی فہرست میں لکھا جائے گا تو گویا کہ ہمارا ایمان رجسٹرڈ ہو جائے گا کہ پھر پلٹ نہ سکے گا۔ مقابل یہ ہے کہ اور یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے پکڑنے اور قتل کرنے کی خفیہ تدبیریں کیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت اور بچاؤ کی ایسی پوشیدہ تدبیر فرمائی جو وہم و گمان سے بھی بالا تر ہو۔ وہ یہ تھی کہ انہی میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کا ہمشکل بنا دیا اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا یہودیوں نے اسی ہمشکل کو عیسیٰ سمجھ کر پکڑ لیے گئے اور عیسیٰ سمجھ کر اس کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا اور خوش ہو گئے۔ اور ادھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت جبرئیل تشریف لائے روشن دان سے عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لے گئے اور اللہ تعالیٰ سب سے بہتر تدبیر کرنے والے ہیں کوئی تدبیر اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس وقت جبکہ دشمن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نرغہ میں لیے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پریشانی دور کرنے کے لیے پانچ بشارتیں دیں۔

بشارت اوّل

فرمایا اے عیسیٰ تم گھبراؤ نہیں تحقیق میں تم کو ان دشمنوں کے نرغہ سے نکال کر اس جہان میں سے تم کو پورا پورا لے لوں گا اور تمہارا کوئی جزو ان کے ہاتھ میں باقی نہ چھوڑوں گا جس کو یہ ہاتھ بھی لگا سکیں بلکہ اور صلیب پر چڑھانا تو کیا تمہارا سایہ بھی ان کو نہ ملے گا۔

بشارت دوم

اور ان کافروں سے پورا لے لینے کے بعد تجھ کو اپنی طرف اٹھانے کا یعنی آسمان پر جو ملائکہ کی قرارگاہ ہے۔ حق تعالیٰ نے اول توفی کی بشارت دی کہ دشمنوں کے نرغہ سے پورے پورے اور صحیح سالم نکال لیے جاؤ گے اور پھر دشمنوں سے نجات پانے کے بعد رفع الی السماء کی بشارت دی کہ فقط دشمنوں سے نجات اور رہائی نہ ہوگی بلکہ رفع آسمانی اور معراج جسمانی سے سرفراز کیے جاؤ گے۔

اس وقت میں تمہارے اختلافات کا فیصلہ کردوں گا۔ وہ فیصلہ یہ ہوگا کہ عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے یہود کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کر دیا۔ کما قال تعالیٰ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ۔ اور نصاریٰ کا یہ زعم باطل ہو جائے گا کہ وہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں اور حیات مسیح کے مسئلہ کا بھی فیصلہ ہو جائے گا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے اترتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو روز روشن کی طرح یہ امر واضح ہو جائے گا کہ عیسیٰ علیہ السلام نہ قتل کیے گئے اور نہ سولی دیئے گئے بلکہ زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور اب عرصہ دراز کے بعد اسی جسم کے ساتھ آسمان سے نزول ہوا ہے۔

اب آئندہ آیت میں اس حکم کی قدرے تفصیل فرماتے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے پس جو لوگ کافر ہوئے ان کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اور آخرت میں۔ دنیا میں قتل ہوں گے اور اسیر ہوں گے اور ان پر جزیہ مقرر ہوگا اور طرح طرح سے ذلیل و خوار ہوں گے اور آخرت میں دوزخ کا دائمی عذاب ہوگا۔ اور نہ ہوں گے ان کا مددگار جو ان کو ہمارے عذاب سے بچا سکے اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے سو اللہ تعالیٰ ان کو پورا حق دے گا اور اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا بے انصافی کرنے والوں کو یعنی جو اللہ اور اس کے رسول کا حق ادا نہ کریں۔ اور اللہ اعمال کے عوضوں کا حق پورا کرنے والا ہے۔

استدلال بر نبوت محمدیہ بقصہ مذکورہ

چونکہ یہ قصہ بھی منجملہ انباء الغیب کے ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا اس لیے اس سے آپ کی نبوت کی دلیل کی طرف اشارہ فرماتے ہیں یہ قصہ ہم آپ کو پڑھ کر سناتے ہیں جو منجملہ آپ کی دلائل نبوت کے ہے اور نصیحت اور حکمت کی باتوں میں سے ہے جو ہر طرح سے موجب بصیرت ہے۔

نصاریٰ کے ایک استدلال یا شبہ کا جواب

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ۝

اس آیت میں حق جل شانہ نے نصاریٰ نجران کے ایک شبہ کا جواب دیا ہے جس کو وہ حضرت عیسیٰ کی ابنیت کے لیے بطور استدلال ذکر کرتے تھے وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے معلوم ہوا کہ وہ خدا اور خدا کے بیٹے تھے حق تعالیٰ نے ان کے جواب کے لیے یہ آیت نازل فرمائی کہ عیسیٰ کا بغیر باپ کے پیدا ہونا کچھ تعجب انگیز نہیں ہم نے آدم کو اپنی قدرت سے بغیر ماں اور باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ حضرت عیسیٰ کو جو

بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اپنی جنس کے ایک فرد سے تو پیدا ہوئے مگر آدم علیہ السلام تو بالکل ہی بغیر جنس سے پیدا ہوئے تھے۔ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا دلیل الوہیت ہے تو آدم علیہ السلام اس کے زیادہ سزاوار ہیں چنانچہ فرماتے ہیں۔ تحقیق عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم جیسی مثال ہے آدم کی تصویر کو مٹی سے بنایا پھر اس میں روح پھونکی اور کن کا خطاب کر کے حکم دیا کہ زندہ آدمی ہو جا تو فوراً اسی طرح ہوگیا۔ جس طرح حکم ہوا تھا یہ بات حق ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے حضرت عیسیٰ کے بارہ میں بتلا دی گئی ہیں سو مخاطب تو ان لوگوں میں سے مت ہو جو حضرت عیسیٰ کے بارہ میں شک اور تردد میں پڑے ہوئے ہیں یہود کی طرح نہ ان کی ولادہ پر تہمت لگا اور نہ نصاریٰ کی طرح ان کو ابن اللہ سمجھ بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ نے بتلا دیا ہے۔ اس کے مطابق ایمان لا وہ یہ کہ حضرت عیسیٰ خدا کے برگزیدہ بندے تھے بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور جب دشمنوں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا۔

نکتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ روح الامین یعنی جبرئیل امین کے نفخ سے پیدا ہوئے اور روح الامین کی طرح ان کا لقب بھی روح اللہ ہوا تو معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اگرچہ صورۃً انسان اور بشر تھے مگر حقیقۃً جنس ملائکہ سے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آسمان پر اٹھایا تاکہ اپنے ہم جنس فرشتوں میں زندگی بسر کریں اور حضرت عیسیٰ کو جو معجزات دیئے گئے ان کو بھی روح الامین سے خاص مناسبت تھی وہ یہ کہ مٹی کا پتلا پھونک مارنے سے باذن اللہ پرندہ بن کر اڑنے لگتا تھا اشارہ اس طرف تھا کہ ایک دن عیسیٰ علیہ السلام بھی اسی طرح اڑ کر آسمان پر پہنچ جائیں گے اور چونکہ عیسیٰ علیہ السلام بے باپ آدم علیہ السلام کے مشابہ ہیں۔ اس لیے حضرت عیسیٰ قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے جیسے آدم علیہ السلام آسمان سے زمین پر اترے تھے ایسے ہی حضرت عیسیٰ کا نزول حضرت آدم کے ہبوط کے مشابہ ہوگا اور جس طرح آدم علیہ السلام کا ہبوط من السماء جسمانی تھا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول من السماء بھی جسمانی ہوگا۔

لطائف و معارف

۱۔ حواری۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ یار کا لقب تھا حواری اصل میں دھوبی کو کہتے ہیں۔ پہلے وہ شخص جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تابع ہوئے وہ دھوبی تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو میں تم کو دل دھونے سکھا دوں وہ ان کے ساتھ ہو گئے پھر اسی طرح سب ساتھیوں کا یہی لقب پڑ گیا (کذا فی موضح القرآن) الغرض کہ حواریین سے حضرت مسیح کے خاص اصحاب مراد ہیں۔ قاموس میں ہے کہ حواری کے معنی دھوبی یا خالص دوست یا نبی کے مددگار کے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص اصحاب۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاون ہونے کی وجہ سے حواریین کے نام سے موسوم ہوگئے جیسے

لکھا ہے کہ حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوم خندق میں تین مرتبہ آواز دی، تینوں مرتبہ حضرت زبیر بن العوام نے جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ ہر نبی کے لیے ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔

۲۔ مکر کی تفسیر میں مفسرین کا اختلاف ہے، مفسرین کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں اس حیلہ کو کہتے ہیں جو دوسرے کے نقصان کا سبب ہو اور یہ بظاہر قبیح اور مذموم ہے۔ اس لیے یہ لفظ کر مکرین عیسیٰ کے حق میں تو بطور حقیقت استعمال ہوا ہے اور مکر اللہ میں جو مکر کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے، وہ بطریق مجاز ہے یعنی مقابلہ اور ازدواج کے طور پر استعمال ہوا ہے اس لیے کہ مکر ایک برا فعل ہے جس سے ذات باری تعالیٰ کو منزہ ہونا چاہیے اس لیے زجاج کا قول ہے کہ مکر اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے اُن کے مکر کا بدلہ دیا جیسے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا میں برائی کے بدلہ اور سزا کو بطور مقابلہ برائی سے تعبیر کیا گیا ہے اور جیسے قرآن کریم میں جزاء خداع اور جزاء استہزاء کو خداع اور استہزاء سے تعبیر کیا گیا ہے۔

محققین کی رائے یہ ہے کہ مکر اصل لغت میں کسی بُرے معنی پر دلالت نہیں کرتا تاکہ بغرض تنزیہ مکر اللہ میں معنی مجازی مراد لیے جائیں کیونکہ اصل میں مکر کے معنی تدبیر لطیف کے ہیں جو ایسے نامعلوم طریقہ سے کی جائے کہ دوسرے کو اس کا خیال بھی نہ ہو، پس اگر یہ تدبیر کسی محمود اور مستحسن غرض کے لیے کی جائے تو یہ تدبیر بھی محمود اور مستحسن ہوگی اور اگر کسی غرض فاسد کے لیے کی جائے تو قبیح اور مذموم ہوگی۔ عرف میں اگرچہ لفظ مکر بری تدبیر ہی کے لیے بولا جاتا ہے مگر حقیقت اور اصل لغت میں اچھی اور بری دونوں ہی قسم کی تدبیریں مکر کے مفہوم میں داخل ہیں یعنی اگر کسی حکمت اور مصلحت سے کسی کے حق میں بھلائی کی تدبیر چپکے کی جائے تو وہ مکر محمود ہوگا اور اگر کسی غرض فاسد سے کسی کی برائی کے لیے خفیہ تدبیر کی جائے تو وہ مکر مذموم ہوگا اور وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ میں مکر کے ساتھ سیئ کی قید لگانا بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ مکر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ اب اس تحقیق کی بناء پر لفظ مکر، مکر اللہ میں اپنے حقیقی اور لغوی معنی میں مستعمل ہوا ہے مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں اگرچہ آیت میں معنی مجازی بھی صحیح اور درست ہو سکتے ہیں تاہم بہتر یہی ہے کہ معنی حقیقی مراد لیے جائیں، اصل لغت کے اعتبار سے مکر کے معنی میں کوئی برائی نہیں تاکہ بغرض تنزیہ اس کو مجاز پر محمول کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ اور ذوق اور وجدان بھی یہی کہتا ہے کہ اللہ کا مکر محمود تھا اور بنی اسرائیل کا مکر مذموم تھا اس لیے کہ وَمَكَرَ اللّٰهُ کو قبیح پر بطور عطف ذکر فرمایا ہے اور عطف تغایر کو چاہتا ہے۔

حکایت وَقَدْ سُئِلَ بَعْضُهُمْ كَيْفَ يَمْكُرُ اللّٰهُ تَعَالٰى وَقَالَ لَا عِلَّةَ لِصُنْعِهِ وَانْشَأَ يَقُولُ۔

بعض اولیاء اللہ سے سوال کیا گیا کہ حق تعالیٰ کیسے مکر کرتا ہے تو ایک چیخ ماری اور یہ کہا کہ اللہ کے فعل کے لیے کسی علت اور سبب کی ضرورت نہیں، اور اس کے بعد

استعمال العامة اى الاستيفاء و اخذ الحق وعليه استعمال البلغاء اھ . یعنی توفی کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور روح قبض کرنے کے لیے مستعمل ہوتا ہے لیکن بلغاء کے نزدیک استیفاء یعنی کسی چیز کے پورا پورا لے لینے کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ توفی کے اصل معنی تو استیفاء کے ہیں اور موت پر جو لفظ توفی کا اطلاق آتا ہے وہ بھی اسی وجہ سے آتا ہے کہ اس میں جان پوری پوری لے لی جاتی ہے یا عمر پوری کر دی جاتی ہے پس اگر فقط جان پوری پوری لے لی جائے تو بھی توفی ہے اور اگر جان اور جسم دونوں کو پورا پورا لے لیا جائے تو بدرجہ اولیٰ توفی ہوگی بلکہ اعلیٰ درجہ کی توفی ہوگی کیونکہ جن اہل لغت نے توفی کے معنی قبض روح کے سمجھے ہیں انہوں نے یہ کہیں نہیں لکھا کہ فقط قبض روح کو توفی کہتے ہیں اور اگر قبض روح مع البدن ہو تو اس کو توفی نہیں کہتے بلکہ ظاہر ہے کہ اگر قبض روح کے ساتھ قبض بدن بھی ہو تو بدرجہ اولیٰ توفی ہوگی۔

غرض یہ کہ اصل لغت کے اعتبار سے توفی کے معنی استیفاء اور قبض کے ہیں جو اپنے معنی اصلی اور جنسی کے لحاظ سے نوم (نیند) اور موت اور رفع جسمانی سب پر صادق آتا ہے۔

دیکھئے حق جل شانہ نے اپنے اس ارشاد اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا میں توفی نفس کی دو صورتیں بتلائی ہیں ایک موت اور دوسری نوم یعنی نیند۔ اور حین موتہا کی قید لگا کر یہ بتلا دیا کہ یہ توفی موت کے وقت حاصل ہوتی ہے عین موت نہیں ورنہ شیٔ کا خود اپنے لیے ظرف ہونا لازم آئے گا۔ اور وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ میں بھی توفی کا استعمال نیند کے موقع پر کیا گیا ہے۔

نکتہ توفی کے اصل معنی تو پورا پورا وصول کر لینے کے ہیں محاورہ عرب میں لفظ توفی نوم اور موت کے لیے مستعمل نہیں ہوتا تھا لیکن قرآن کریم نے لفظ توفی کو نوم اور موت کے معنی میں اس لیے استعمال کرنا شروع کیا تاکہ اہل عرب پر موت اور نوم کی حقیقت واضح ہو جائے کہ انسان کے بدن کا کوئی چیز پاسپید ہے جس کو حق تعالیٰ نوم اور موت کی حالت میں بندہ سے لے لیتے ہیں عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان مرکر بالکل نابود ہو جاتا ہے، موت کو فنا اور عدم کے مرادف سمجھتے تھے اسی لیے وہ بعث یعنی قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کے منکر تھے اور یہ کہتے تھے۔ ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ حق تعالیٰ نے ان کے رد کے لیے یہ ارشاد فرمایا قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ یعنی آپ ان منکرین بعث سے کہہ دیجئے کہ تم مرکر فنا نہیں ہو جاتے بلکہ موت کا فرشتہ تم سے اللہ کا پورا پورا حق وصول کر لیتا ہے یعنی وہ ارواح جو اللہ کی امانت ہیں وہ قبضہ جسموں سے لے لی جاتی ہیں اور اللہ کے یہاں محفوظ رہتی ہیں قیامت کے دن پھر انہی ارواح کو تمہارے اجسام کے ساتھ متعلق کرکے حساب و کتاب لیا جائے گا چنانچہ شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں، تم اپنے آپ کو دھڑ سمجھے ہو کر خاک میں مل گئے تم جان ہو اور وہ فرشتہ لے جاتا ہے فنا نہیں ہوتے ہو۔

۵۔ تمام امت محمدیہ کا اس پر اجماع اور اتفاق ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے

اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے، سلف اور خلف میں سے کوئی حضرت عیسیٰ کے رفع الی السماء کا منکر نہیں اور نزول من السماء کا جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تلخیص الحبیر صفحہ ۳۱۹ میں اس پر اجماع نقل کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے، تفصیل کے لیے ... فی حیاۃ روح اللہ کو دیکھئے۔

اختلاف صرف اس میں ہے کہ رفع الی السماء سے پہلے کچھ دیر کے لیے موت طاری ہوئی یا نہیں، بلکہ زندہ ہی آسمان پر اٹھا لیے گئے۔

جمہور صحابہ و تابعین اور عامۂ سلف صالحین یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں توفی سے موت کے معنی مراد نہیں بلکہ توفی کے اصلی اور حقیقی معنی مراد ہیں یعنی کسی شئے کو پورا پورا لے لینا کیونکہ دشمنوں کے ہجوم اور نرغے کے وقت توفی کی بشارت حضرت عیسیٰ کی تسلی اور تسکین کے لیے ہے کہ اے عیسیٰ تم دشمنوں کے ہجوم اور نرغے سے گھبراؤ نہیں، میں تم کو پورا پورا روح اور جسم سمیت ان نابکاروں سے چھین لوں گا نیز وجود ان کے لیے بڑی ایک عظیم نعمت تھا ان کے کردار سے یہ ثابت ہو چکا کہ یہ نابکار اور ناشکرے اس قابل نہیں کہ تیرے وجود کی نعمت کو ان کے لیے باقی رکھا جائے ان کی ناقدری اور ناسپاسی کی سزا یہ ہے کہ ان سے یہ نعمت پوری کی پوری واپس لے لی جائے، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی قدس سرہ اس بارہ میں فرماتے ہیں:

وَلَمَّا لَمْ تَكُنْ أُمَّةٌ بِخَيْرٍ ... تَأَخَّذَ مِنْهُمْ عِيسَى إِلَيْهِ

جب کسی چیز کے قابل نہ تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچ لیا

وَلَمْ يَتْرُكْهُ وَلَا يُبْقِيهِ بَيْنَهُمْ ... كَأَخْذِ الشَّيْءِ لَمْ يَشْكُرُوا عَلَيْهِ

اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھا لیا اور ان میں باقی نہ چھوڑا، اور اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ کو ان سے ایسا لے لیا جیسا کوئی شئے کسی سے لے لیا جاتا ہے جس کی ناقدری کی جائے۔

وَخَبَّأَهُ كَمَا يُخْبَأُ الشَّيْءُ بِحِفْظٍ ... وَآوَاهُ إِلَيْهِ مَآوِي قُدْسِهِ

اور ان سے چھین کر اپنے پاس ان کو خاص طور سے محفوظ رکھا اور اپنے قریب میں ان کو ٹھکانہ دیا۔

غرض یہ کہ آیت میں توفی سے پورا پورا لے لینے کے معنی مراد ہیں، موت کے معنی مراد نہیں اور نہ اس مقام کے مناسب ہیں اس لیے کہ جب ہر طرف سے دشمن گھیرے ہوئے ہوں اور جان کے لیوا کھڑے ہوئے ہوں تو اس وقت تسلی اور تسکین خاطر کے لیے موت کی خبر دینا کہ میں تجھ کو موت دوں گا مناسب نہیں، دشمنوں کا تو مقصود ہی جان لینا ہے اس وقت تو مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ تم گھبراؤ نہیں ہم تم کو تمہارے دشمنوں کے نرغے سے پورا پورا اور صحیح و سالم نکال لے جائیں گے اور دشمن تمہارا سایہ بھی نہ پا سکے گا، ہاں اگر آیت میں توفی سے موت کے معنی مراد ہوں تو عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی تو درکنار البتہ یہود کی تسلی ہو جائے گی اور مطلب یہ ہوگا کہ اے یہود تم بالکل نہ گھبراؤ اور مسیح کے قتل کی فکر نہ کرو میں خود ہی ان کو موت دے دوں گا۔

اور میں خود ہی تمہارا نگہبان تھا اور گزند پہنچانے والوں کی تمہیں کوئی مخالفت : اور گو یہ تو حضرت عیسیٰ کی تسلی دہی تھی بلکہ حواریوں کی تسلی ہوئی۔

۲۔ نیز یہ کہ توفی بمعنی الموت تو ایک عام شئی ہے جس میں تمام مومن و کافر انسان و حیوان سب ہی شریک ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے جو خاص طور پر اُن سے توفی کا وعدہ کیا گیا۔

۳۔ نیز وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ سے بھی یہی معلوم اور مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کا مکر اور اس کی تدبیر یہود کی تدبیر اور مکر کے خلاف اور متضاد تھی جیسا کہ۔ يَكِيدُونَ كَيْدًا وَّأَكِيدُ كَيْدًا ۔ وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا ۔ اور وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ان تمام واقعات میں اللہ کی تدبیر کافروں کی تدبیر کے برعکس تھی۔

قوم صالح نے صالح علیہ السلام کے قتل کی تدبیریں کیں اور مشرکین مکہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تدبیر کی گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کی حفاظت کی تدبیر کی اسی طرح آیت زیر بحث میں مراد یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کے قتل کی تدبیر کی اور اللہ تعالیٰ نے اُن کی حفاظت کی تدبیر کی کہ دشمنوں کے ہاتھ سے صحیح و سالم نکال کر آسمان کی طرف ہجرت کرادی۔ سب اس ہجرت کے بعد زمین پر جو نزول ہوگا وہ کافروں سے جنگ کرنے کیلئے ہوگا جیسا کہ آنحضرت ہجرت کے کچھ عرصہ بعد مکہ فتح کرنے کے لیے تشریف لائے تو اہل مکہ مشرف باسلام ہوئے اسی طرح جب عیسیٰ زمین کے فتح کرنے کے لیے نازل ہوں گے تو تمام اہل کتاب ایمان لے آئیں گے جیسا کہ اہل مکہ ایمان لے آئے تھے۔ امام رازی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ توفی کے معنی کسی چیز کو پورا لینے کے ہیں چونکہ حق تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ شاید کسی کے دل میں یہ خطرہ گذرے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی فقط روح اٹھائی گئی روح اور جسم دونوں نہیں اٹھائے گئے (جیسا کہ نصاریٰ کا خیال ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے لاہوت کے ساتھ آسمان پر اٹھائے گئے اور ناسوت زمین پر ہی رہا) اس لیے اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيكَ [illegible] فرما کر آگاہ کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح اور جسم دونوں پورے پورے اٹھائے گئے اور یہ آیت حضرت عیسیٰ کی تسلی کے لیے ایسی ہوگی جیسے وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ (تفسیر کبیر ص ۔ ج ۲)

۴۔ ربیع بن انس سے منقول ہے کہ اس آیت میں توفی سے نوم (نیند) مراد ہے جیسا کہ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ بِاللَّيْلِ میں توفی سے نوم (نیند) کے معنی مراد ہیں جو کہ توفی اور وفات کی ایک قسم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پہلے سُلا دیا اور پھر بحالت خواب اُن کو آسمان پر اٹھا لیا۔ پس آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اے عیسیٰ تم گھبراؤ نہیں میں تم کو سلا دوں گا اور پھر اسی حالت میں تم کو اٹھا لوں گا۔

۵۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ توفی سے موت مراد ہے مگر ساتھ ہی ساتھ ابن عباس یہ بھی فرماتے ہیں کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے مراد یہ ہے کہ جو چیز پہلے ذکر ہے اس کا وقوع بعد میں ہوگا اور جو بعد میں مذکور ہے اس کا وقوع مقدم ہے یعنی رفع آسمانی پہلے ہوا اور یہ توفی بمعنی الموت قیامت کے قریب نزول من السماء کے بعد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اے عیسیٰ میں اس وقت تم کو آسمان پر اٹھا لوں

گا اور پھر آخری زمانہ میں تمہارے نازل ہونے کے بعد تم کو موت دوں گا۔

اس تفسیر کی رو سے رفع و نزول پر مقدم ٹھہرتا ہے اور آیت میں تقدیم و تاخیر کا قائل ہونا لازم آتا ہے لیکن یہ اعتراض قابل التفات نہیں اس لیے کہ واؤ ترتیب کے لیے وضع نہیں ہوا، اور تقدیم و تاخیر قواعد عربیت کے خلاف ہے اور نہ فصاحت و بلاغت میں مخل ہے، امام رازی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں۔

ومثله من التقديم والتأخير كثير في القرآن (تفسير كبير ص ۴۸۱ ج ۲)	ابن عباس کی تفسیر میں جو تقدیم و تاخیر مانی ہے سو اس قسم کی تقدیم و تاخیر قرآن کریم میں بہت کثرت کے ساتھ موجود ہے۔

اور قرآن کریم میں تقدیم و تاخیر کے نظائر اور شواہد ہم نے اپنے رسالہ "کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ" میں لکھ دیئے ہیں وہاں دیکھ لیے جائیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے باسانید صحیحہ منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اور آیت اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ میں توفی سے توفی موت مراد ہے لیکن یہ اخیر زمانہ میں ہوگی۔

اخرج اسحاق بن بشر وابن عساكر من طريق جوهر عن الضحاك عن ابن عباس في قوله تعالى اني متوفيك ورافعك الي يعني رافعك ثم متوفيك في آخر الزمان (تفسير درمنثور ص ۳۶ ج ۲)	اسحاق بن بشر اور ابن عساکر ضحاک سے راوی ہیں کہ ابن عباس مُتَوَفِّیْكَ کی تفسیر میں یہ فرماتے تھے کہ حضرت مسیح کا رفع مقدم ہے اور ان کی وفات اخیر زمانہ میں ہوگی۔ (تفسیر درمنثور)

پس اگر ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متوفیک کی تفسیر ممیتک کے ساتھ منقول ہے تو انہی ابن عباس سے باسانید صحیحہ یہ بھی منقول ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے اور قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور انہی سے یہ بھی منقول ہے کہ آیت میں تقدیم و تاخیر ہے تو پھر ان کے نصف قول کو ماننا اور نصف کا انکار کر دینا کونسی عقل اور کونسی دیانت ہے، تاویل کے دہقان ابن عباس کے اس نصف قول کو قبول کرتے ہیں جو ان کی خواہش نفسانی اور غرض کے موافق ہے۔ اور دوسرا نصف جو ان کی غرض کے خلاف ہے اس سے گریز کرتے ہیں یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ سے حجت پکڑتے ہیں اور وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

نکتہ: رہا یہ امر کہ اس تقدیم و تاخیر میں نکتہ کیا ہے سو نکتہ یہ ہے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ سے مقصود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تسلی ہے کہ یہ دشمن جو آپ کے قتل اور صلب کے درپے ہیں اور آپ کی جان لینا چاہتے ہیں یہ ہرگز آپ کے قتل کرنے اور سولی دینے پر قادر نہ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو وقت مقرر پر طبعی موت سے وفات دے گا اور فی الحال آپ کو اپنی طرف

اٹھا لیں گے آپ بالکل مطمئن رہیں کہ دشمن آپ کی جان نہیں لے سکیں گے۔ غرض یہ کہ دشمن جب ان لینے پر تلے ہوئے تھے اس لیے توفی کا ذکر مقدم فرمایا جس سے مقصود دشمنوں سے محفوظ رہنے کی بشارت دینا ہے کہ موت ان کے قبضہ میں نہیں وہ ہمارے ہاتھ میں ہے جو ہمارے حکم سے اپنے وقت پر ہوگی۔

نیز توفی کی تقدیم میں ایک نکتہ یہ ہے کہ بیک وقت اور بیک لفظ یہود اور نصاریٰ دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔ یہود کی تردید اس طرح ہوئی کہ یہود اُن کے مارنے میں کامیاب نہ ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ خود ان کو وقت مقرر پر وفات دے گا۔

اور نصاریٰ کی تردید اس طرح ہوئی کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا نہیں کیونکہ ان پر ایک وقت آنے والا ہے کہ اس وقت ان پر موت اور فنا آئے گی۔ اور فانی خدا نہیں ہوسکتا۔

۲۔ حق جل شانہ نے اس آیت میں عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدوں کا ذکر فرمایا ہے۔

ایک وعدہ توفی کا جس کی تفصیل گذر گئی۔

دوسرا وعدہ رفع الی السماء کما قال تعالیٰ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ۔ یعنی اے عیسیٰ میں تم کو اپنی طرف اٹھانے والا ہوں جہاں میرے فرشتے رہتے ہیں وہاں تم کو رکھوں گا۔ اس آیت میں رفع سے جسمانی رفع مراد ہے اس لیے کہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ میں خطاب عیسیٰ علیہ السلام کو ہے جو مجموعہ ہے جسم اور روح کا اور رفع درجات اس لیے مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو پہلے ہی سے حاصل تھا اور رفع جسمانی میں تو اور بھی رفع درجات حاصل ہو جاتا ہے۔ رفع جسمانی رفع درجات کے منافی نہیں اور فقط رفع روحانی اس لیے مراد نہیں ہوسکتا کہ رفع روحانی ہر مرد صالح کو بوقت موت حاصل ہوتا ہے۔ اس کو خاص طور پر بطور وعدہ ذکر کرنا بے معنی ہے۔

نیز باتفاق محدثین و مفسرین و مورخین یہ آیتیں نصاریٰ نجران کے حق میں اُن سے مناظرہ اور ان کے عقائد کی اصلاح کے بارہ میں نازل ہوئیں اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور دشمنوں کے ہاتھ سے مقتول اور مصلوب ہوئے اور پھر دوبارہ زندہ ہو کر آسمان پر اٹھائے گئے حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں عقیدہ ابنیت اور عقیدہ قتل و صلب کی صراحتہً تردید اور نفی فرمائی کہ وہ خدا کے بیٹے نہ تھے بلکہ خدا کے بندہ اور رسول تھے اور یہود کا یہ زعم کہ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِیْحَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ کہ ہم نے عیسیٰ بن مریم کو قتل کر دیا یہ بالکل غلط ہے۔ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ اور نصاریٰ کے تیسرے عقیدہ یعنی رفع الی السماء کی تصویب اور تصدیق فرمائی اور وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ (یعنی دشمنوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ صلیب دی) میں قتل اور صلب کی نفی کرنے کے بعد متصلاً یہ فرمایا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰہُ اِلَیْهِ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا اگر عقیدہ قتل و صلب کی طرح عقیدہ رفع الی السماء بھی غلط تھا تو جس طرح وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ فرما کر عقیدہ قتل و صلب کی صراحتہً تردید فرمائی اسی طرح بجائے بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰہُ اِلَیْهِ کے مَا رَفَعَهُ اللّٰہُ

فرما کر عقیدۂ رفع الی السماء کی تردید فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو نہیں اٹھایا۔

تیسرا وعدہ۔ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا کا ہے تعبیر سے مراد یہ ہے کہ اہل کفر کے نجس اور ناپاک قرب و جوار سے الگ کر کے تم کو آسمان پر بلا لوں گا۔

چوتھا وعدہ۔ یہ ہے کہ تیرے متبعین کو تیرے منکروں پر غالب رکھوں گا، اور تیرے دشمنوں کو کبھی حاکمانہ اقتدار نصیب نہ ہوگا۔ جیسا قال تعالیٰ وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ جاننا چاہیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے حضرت عیسیٰ کے تابع اور پیرو نصاریٰ تھے جو حضرت عیسیٰ کے دین پر تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سچے پیرو مسلمان ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بندہ اور رسول مانتے ہیں اور حضرت عیسیٰ کی وصیت مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ پر عمل کرنے والے ہیں۔ پس حاصل یہ نکلا کہ امت محمدیہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر غالب اور حاکم رہیں گے چنانچہ یہ وعدہ جلد ایسا پورا ہوا کہ یہود ذلیل اور خوار ہوئے اور سلطنت ان کی ختم ہوئی اور پھر آج تک یہود جہاں کہیں بھی ہیں یا تو نصاریٰ کی رعایا ہیں یا اہل اسلام کی اور اس وقت فلسطین میں جو یہودیوں کی برائے نام حکومت قائم ہوئی ہے وہ درحقیقت نصاریٰ امریکہ و برطانیہ کی ہے تمام یہود کا یہ اسی برائے نام سلطنت کا وجود تمام تر نصاریٰ کے رحم و کرم اور اعانت اور امداد کا مرہون منت ہے، اور قیامت تک ایسا ہی رہے گا صرف چالیس دن کے لیے دجال کا خروج ہوگا اور یہودی اس کے ساتھ ہوں گے سو اس چند روزہ شور و شغب کو سلطنت نہیں کہا جا سکتا اور عجب نہیں کہ فلسطین میں یہ برائے نام حکومت اس لیے قائم ہوئی ہو کہ یہودی سب ایک جگہ جمع ہو جائیں اور عیسیٰ علیہ السلام اور امام مہدی کو نزول اور ظہور کے بعد قتل یہود میں سہولت ہو کہ سب ایک جگہ جمع ہیں قتل کے لیے تلاش نہ کرنا پڑے۔

پانچواں وعدہ۔ فیصلہ اختلاف ہے ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ۔ یہ پانچواں وعدہ ہے کہ جو اختلافات کے فیصلہ سے متعلق ہے تمام اختلافات کا آخری فیصلہ تو آخرت اور قیامت کے دن ہوگا لیکن یہود اور نصاریٰ اور اہل اسلام کے اختلافات کا ایک فیصلہ قیامت قائم ہونے سے کچھ روز پہلے ہی ہو جائے گا اور وہ مبارک وقت ہوگا کہ جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے اور دجال کو قتل کریں گے اور یہود کو چن چن کر مار ڈالیں گے کوئی یہودی اس وقت اپنی جان نہ بچا سکے گا۔ حدیث میں ہے کہ اس وقت اگر کوئی یہودی جان بچانے کے لیے کسی پتھر یا شجر کے پیچھے چھپ جائے گا تو شجر اور حجر یہ آواز دے گا هٰذَا يَهُودِيٌّ وَرَائِي فَاقْتُلْهُ یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے اس کو قتل کیجئے غرض یہ کہ اس طرح کی تیغ بے دریغ سے تو یہودیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا اور حضرت عیسیٰ نزول کے بعد صلیب کو توڑ کر جو نصرانیت کا نشان ہے اور توڑیں گے جس سے نصرانیت کا فیصلہ اور خاتمہ ہو جائے گا۔ اور یہود اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے اور یہود

عقیدۂ قتل و صلب سے تائب اور مومن بن جائیں گے اور نصاریٰ عقیدۂ ابنیت سے تائب ہو جائیں گے۔ اور مسلمان تو پہلے ہی سے حضرت عیسیٰ کے بارہ میں صحیح عقیدہ رکھتے تھے اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے تھے مسلمان نزول کے بعد جب ان تمام چیزوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے تو مسلمانوں کا ایمان بالغیب، ایمان شہودی بن جائے گا جس کے بعد ارتداد کا اندیشہ نہیں رہتا اور چونکہ مسلمانوں کا ایمان اور عقیدہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں بالکل صحیح ہوگا اس لیے حضرت عیسیٰ کا نزول مسلمانوں ہی کی کسی مسجد کے منارہ پر ہوگا اور مسلمان ہی آپ کے گرد جمع ہوں گے اور آپ کے معین و مددگار ہوں گے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول دین اسلام ہی کی تجدید کے لیے ہوگا۔

غرض یہ کہ اس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول سے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا اور خدا تعالیٰ کا یہ قوی وعدہ دنیا کے اخیر میں پورا ہوگا۔

لہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال کی عمر میں نبی بنائے گئے اور ساٹھ سال کی عمر میں آسمان پر اٹھائے گئے اور آسمان سے نازل ہونے کے بعد چالیس سال زمین پر زندہ رہیں گے اور اس کے بعد وفات پائیں گے اور حجرۂ نبویہ میں مدفون ہوں گے اس طرح وفات کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر ایک سو بیس سال کی ہوگی۔ (کذا فی عقیدۃ الاسلام ص ۲)

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ

پھر جو جھگڑا کرے تجھ سے اس بات میں بعد اس کے کہ آچکی تجھ کو

الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ

سچی خبر تو تو کہہ دے آؤ ! بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے

وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ

اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان ، پھر التجا

نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝ إِنَّ

کریں ، اور لعنت ڈالیں اللہ کی جھوٹوں پر ، بے شک یہ جو

هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللَّهُ

ہے سو یہی ہے بیان تحقیق ، اور کسی کی بندگی نہیں سوائے اللہ کے۔

وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ

اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا ۔ پھر اگر قبول نہ کریں تو

اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے ۔

دعوتِ مباہلہ برائے اتمامِ حجت بر اہلِ مجادلہ

قَالَ تَعَالَىٰ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ... إلى ... فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ ۔

(ربط) جب ایک حق کو دلائل اور براہین سے ایسا واضح کر دیا گیا کہ جس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی لیکن جو شخص یا جو گروہ معاندانہ روش پر قائم ہو اور باطل پر مصر ہو اس سے کیا معاملہ کیا جائے ۔ آئندہ آیات میں اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کو مباہلہ کی دعوت دی جائے اور معاملہ اللہ کے سپرد کیا جائے ایسے لوگوں پر اتمام حجت کا یہ طریقہ ہے اور جیسا کہ ہم شروع سورت ہی میں لکھ آئے ہیں کہ سورۂ آل عمران کی ابتدائی اسی آیتیں نجران کے نصرانیوں کے حق میں نازل ہوئی تھیں اب اس آیت میں بھی انہی کو خطاب ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں حق واضح ہو چکا ہے ان واضح اور روشن دلائل کے بعد بھی اگر یہ جھگڑا کریں تو اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنی عورتوں اور لڑکوں سمیت حاضر ہو جاؤ اور ہم بھی اسی طرح اپنی عورتوں اور لڑکوں کو لے آتے ہیں اور سب مل کر خدا تعالیٰ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو جب جھوٹے پر حق تعالیٰ کا قہر آئے گا تو اسی وقت معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا چنانچہ فرماتے ہیں پس جب کہ یہ بتلا دیا گیا کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور وہ خدا اور خدا کے بیٹے نہ تھے اور نہ معاذ اللہ وہ جھوٹے تھے بلکہ وہ اللہ کے ایک برگزیدہ بندہ اور رسول برحق تھے اس پر بھی اگر آپ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں کوئی جھگڑا کرے اور کسی طرح حق کو نہ مانے بعد اس کے کہ پہنچ چکا ہے آپ کے پاس اس امر میں علم قطعی اور یقینی تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے کہ اب مناظرہ اور مباحثہ تو ختم ہوا تمہاری ضد اور عناد کے ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آؤ باہم کر اس طرح سے کر لیں ہم سب مل کر بلائیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور اپنی ذاتوں کو اور تمہاری ذاتوں کو پھر ہم سب ایک جگہ جمع ہو کر اور مل کر عجز و زاری کے ساتھ حق تعالیٰ سے دعا کریں یعنی یہ دعا کریں کہ اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہو جھوٹوں پر پس جو جھوٹا ہوگا اس پر اللہ کا قہر آئے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ کون سچا ہے اور

کرنی چھوٹا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں افراط اور تفریط کرتے ہیں اور کسی طرح امر حق کو ماننے پر آمادہ نہیں اور کسی دلیل و برہان پر کان دھرتے ہی نہیں تو ایسے معاندین سے احقاق حق کی تدبیر اور فیصلہ کی آخری صورت یہ ہے کہ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ تم اپنے آدمیوں کی ایک جماعت لے آؤ اور ہم مؤمنین کی ایک جماعت اپنے ساتھ لاتے ہیں اور پھر دونوں فریق مل کر دعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو اس پر خدائے تعالیٰ کی لعنت اور عذاب ہو۔ اللہ تعالیٰ خود جانتا ہے جھوٹے پر کوئی قہر نازل فرمائے گا جس سے راست باز کی راستی اور صداقت ظاہر ہو جائے گی اور جب اس بددعا کا اثر ظاہر ہوگا تو عام لوگ خود ہی صادق اور کاذب کی تعیین کر لیں گے۔

چنانچہ جب آیت مذکورہ نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے وفد کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر اُن کو سنائی اور مباہلہ کی اُن کو دعوت دی انہوں نے یہ کہا کہ ذرا صبر کیجئے ہم ذرا غور کر لیں اور باہم مشورہ کر لیں۔ کل آپ کے پاس آئیں گے اور بعض روایات میں ہے کہ یہ کہا کہ آپ ہم کو تین دن کی مہلت دیجئے اور یہ کہہ کر چلے گئے اور باہم مشورہ کیا۔

قال السيد للعاقب قد	مشورہ میں اُن کے سردار نے عاقب
والله علمتم ان الرجل	سے کہا کہ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ
نبي مرسل ولئن لاعنتموه	یہ مرد نبی مرسل ہے اور اگر تم نے اس سے
انه ليستأصلكم وما لاعن	مباہلہ کیا تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور واللہ کسی
قوم نبيا قط فبقي كبيرهم	قوم نے کسی نبی سے مباہلہ نہیں کیا اور پھر
ولا نبت صغيرهم فان ابيتم	اُن کے بڑے زندہ رہے ہوں اور چھوٹے
ان تتبعوه وابيتم الا الفكم	جوان ہوئے ہوں یعنی سب ہلاک ہو گئے
فوادعوه وارجعوا الى بلادكم	پس اگر تم ان کا اتباع اور پیروی کو نہ مانو
(در منثور ص۳۸ ج۲)	اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے ہو تو اس
	شخص (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) سے
	صلح کر لو اور اپنے شہروں کو واپس چلے جاؤ۔

یہ تجویز ہے کر جو حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے اور دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امام حسینؓ کو گود میں لیے ہوئے اور امام حسنؓ کی انگلی پکڑے ہوئے اور حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لا رہے تھے اور اُن سے یہ فرما رہے تھے کہ میں دعا کروں تو تم آمین کہنا وفد نجران کے سردار نے اور فرمائی صورتوں کو دیکھ کر یہ کہا کہ خدا کی قسم میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے اس بات کی درخواست کریں کہ یہ پہاڑ اس جگہ سے ہٹ جائیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ان کی درخواست قبول کرے گا لہٰذا تم ان سے مباہلہ کر کے اپنے کو ہلاک اور برباد نہ کرو۔ ورنہ

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا

تو کہہ اے کتاب والو آؤ ایک سیدھی بات پر جو ہمارے تمہارے

وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـــًٔـا وَّ

درمیان کی . کہ بندگی نہ کریں مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہرائیں اس کا کسی چیز کو اور

لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ

نہ پکڑیں آپس میں ایک ایک کو رب سوا اللہ کے .

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر اگر وہ قبول نہ رکھیں تو کہہ دو شاہد رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں .

دعوتِ اہلِ کتاب بلطف و عنایات

قال تعالے قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا ۔۔۔ فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔

ربط : ابتداء سورت سے یہاں تک نصاریٰ نجران سے محاجہ اور مناظرہ کا اور پھر مباہلہ کا بیان تھا محاجہ اور مناظرہ سے نصاریٰ پر دلیل اور برہان کے اعتبار سے حجت قائم کی اور مباہلہ کی دعوت سے ضمیر اور وجدان کے اعتبار سے ان پر حجت قائم کی اور ظاہر ہے کہ مباہلہ انتہائی اور آخری حجت ہے اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اس آخری حجت کے بعد اُن سے خطاب ہی چھوڑ دیا جاتا اس لیے کہ خطاب اس سے کیا جاتا ہے جو حق کا طالب ہو اور جو معاند اور متعصب ہو اس سے روگردانی ہی مناسب ہے لیکن باقتضاء رحمت و رأفت پھر اُن کو مخاطب بناتے ہیں کہ اگر تمہاری ہٹ دھرمی انتہا کو پہنچ چکی ہے مگر ہم اپنی بے پایاں رحمت سے پھر تم کو حق دیتے ہیں اس لیے آئندہ آیات میں پھر ان کو نرمی اور لطف کے ساتھ حق اور توحید کی دعوت دی جاتی ہے ۔

نیز گزشتہ آیات میں روئے سخن زیادہ تر نصاریٰ کی طرف تھا اب آئندہ آیات میں خطاب عام ہے جو یہود اور نصاریٰ دونوں کو شامل ہے نیز زبان سے یہود اور نصاریٰ دونوں توحید کے مدعی تھے کہ ہم خدا کو ایک مانتے ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ جب توحید ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے اور تمام انبیاء کرام اسی کی دعوت دیتے چلے آئے تو اس متفقہ اصول کا اقتضاء یہ ہے کہ سوائے خدا

کہ کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی کو رب ٹھہرایا جائے اور نہ کسی کو خدا کا بیٹا اور پوتا بنایا جائے اہل کتاب سب ہی زبان سے یہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا بے شک وحدہٗ لا شریک ہے مگر بایں ہمہ طرح طرح کے شرک میں مبتلا ہیں اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پھر ایک دفعہ حق کی دعوت دیجئے اور ان کے ان صفات سے ان پر حجت تام کیجئے جن کے تسلیم کئے بغیر ان کو چارہ نہیں تاکہ اس قدر اعلان اور منقبت ہو جانے کے بعد شاید کسی کو اتباع حق کا خیال پیدا ہو جائے اور وہ حق کو قبول کرلے اس لئے فرماتے ہیں قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍ (الآیۃ) اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے کہیئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمہ کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر مسلم ہے جس پر قرآن اور توریت اور انجیل اور تمام انبیاء کی خبریں متفق ہیں کسی کا اس میں اختلاف نہیں وہ توحید ہے کہ جس کا زبان سے سب اقرار کرتے ہیں یعنی اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ بنائیں آپس میں ایک دوسرے کو رب اور پروردگار خدا کو چھوڑ کر یہود اور نصاریٰ کی قوم ان تینوں باتوں کو تسلیم کرتے تھے مگر عمل ان تینوں باتوں کے برخلاف تھا حضرت عیسیٰ اور عزیر کو خدا کا بیٹا مانتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے اور نصاریٰ تو کھلم کھلا تثلیث کے قائل تھے کہ باپ اور بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدا ہوتے ہیں اور اپنے احبار اور رہبان یعنی پادریوں اور راہبوں کو رب اور پروردگار کے مرتبہ میں مانتے تھے یعنی احبار اور رہبان کا حکم اور مہر بھی حق تعالیٰ کے حکم کی طرح بے چون وچرا واجب الطاعت ہے اور ان کو اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال کریں اور جس کو چاہیں حرام کر دیں اور آیت میں ایک دوسرے کو رب بنانے سے یہی مراد ہے کہ اس کا ہر امر اور ہر نہی بے چون وچرا واجب الاطاعت ہو اور اس کو تشریع اور تحلیل اور تحریم کا کلی اختیار حاصل ہو اور یہی حقیقت شرک کی ہے کہ حق تعالیٰ کی صفات مختصہ اور حقوق مختصہ میں کسی کو شریک گردانا جائے چنانچہ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب یہ آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم تو ان کی عبادت نہیں کیا کرتے تھے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

بلى انهم حرموا عليهم الحلال	کیوں نہیں انہوں نے ان لوگوں کے لیے
واحلوا لهم الحرام فاتبعوهم	حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور لوگوں
فذلك عبادتهم اياهم اخرجه	نے ان کی پیروی کی پس یہی ان کو معبود
الترمذي واحمد:	اور رب بنانا ہے۔

یعنی غیر اللہ اور مخلوق کو رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے کہنے سے خدا کے حلال کردہ چیز کو حرام مان لیا جائے اور خدا کی حرام کردہ چیز کو کسی کے کہنے سے حلال ٹھہرا لیا جائے یہی ہی تقلید با خبر حرام بلکہ کفر اور شرک ہے اور یہی دون اللہ کا مصداق ہے کہ اللہ کے حکم کو چھوڑ کر غیر اللہ کے حکم کو مانا جائے۔

میری امت گمراہی پر متفق نہ ہوگی اور ارشاد خداوندی ہے کہ سبیل مؤمنین یعنی مسلمانوں کے اجماعی مسلک سے انحراف بُرے انجام کا باعث ہے۔

وقال ابن الهمام في التحرير انعقد الاجماع على عدم العمل بالمذاهب المخالفة للائمة الاربعة۔

اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے عقد الجید میں ائمہ اربعہ کی تقلید کو سواد اعظم کا اتباع قرار دیا ہے اور ہندوستان میں خاص امام اعظم ابو حنیفہؒ کی تقلید کو واجب قرار دیا ہے جس کا جی چاہے اصل کتاب کو دیکھ لے۔ پس اگر اصول مسلّمہ کے بعد بھی اہل کتاب نہ مانا کریں اور اس صاف اور سچی بات کو قبول نہ کریں جس پر تمام آسمانی کتابوں اور تمام پیغمبروں کا اتفاق ہے تو اے مسلمانو تم یہ کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں یعنی خدا کے فرمانبردار اور اس کے حکم کے تابعدار ہیں۔ حدیث میں ہے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب وفد نجران سے کہا اسلموا مسلمان ہو جاؤ تو کہنے لگے کہ اسلمنا ہم تو مسلمان ہیں اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ نصاریٰ نجران جو دعویٰ اسلام کا کرتے ہیں وہ غلط ہے اس لیے کہ جب توحید ہی کے قائل نہیں جو تمام شریعتوں کا مشترک اصل ہے تو پھر دعوائے اسلام بالکل غلط ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ

اے کتاب والو کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم پر ؟

وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ

اور توریت اور انجیل تو اتریں اس کے

بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ

بعد ، کیا تم کو عقل نہیں ؟ سنتے ہو تم لوگ

حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاۗجُّوْنَ

جھگڑ چکے ، جس بات میں تم کو خبر تھی ، اب کیوں جھگڑتے ہو

فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا

جس بات میں تم کو خبر نہیں ! اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں

تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا

جانتے ۔ نہ تھا ابراہیم یہودی اور نہ نصرانی ،

وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۗ وَمَا كَانَ مِنَ

اور لیکن تھا ایک طرف کا حکم بردار ۔ اور نہ تھا مشرک

الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ

والا ۔ لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے ان کو تھی

اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ وَلِيُّ

جو ساتھ تھے اس کے اور اس نبی کو اور ایمان والوں کو ، اور اللہ والی

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

ہے مسلمانوں کا ۔

ابطال دعوائے اہل کتاب درباره ملت ابراہیم علیہ السلام

قال تعالیٰ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ...... الیٰ وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔

(ربط) جس طرح دعوائے توحید میں سب مشترک تھے اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کی تعظیم و تکریم میں سب شریک تھے اور یہود اور نصاریٰ میں ہر ایک فرقہ یہ دعویٰ کرتا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ ہمارے دین پر تھے عیسائی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ نصرانی تھے اور ہم انہی کے طریقہ پر ہیں اور ان سے زیادہ قریب ہیں اور یہودی یہ کہتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے اور ہم ان کی ملت پر ہیں اور ان سے زیادہ قریب ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے اس دعوے کے رد اور ابطال کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ تم سب غلط کہتے ہو تم کو ابراہیمؑ سے کیا واسطہ تم سب مشرک ہو اور ابراہیم علیہ السلام موحد اور مسلم یعنی خدا کے فرمانبردار بندہ تھے۔ ابراہیمؑ سے محبت کرنے والے اور ان کے طریقہ پر چلنے والے یہ نبی اور مسلمان ہیں چنانچہ فرماتے ہیں اے اہل کتاب کیوں حجت اور نزاع کرتے ہو تم ابراہیمؑ کے بارہ میں کیوں جھگڑتے ہو اور ان کو یہودی یا نصرانی بتلاتے ہو اور حالانکہ توریت اور انجیل حضرت ابراہیمؑ کی بہت مدت وفات کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت اور نصرانیت توریت اور

انجیل کے نازل ہونے کے بعد پیدا ہوئی اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰؑ سے ایک ہزار سال مقدم تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال قبل تھے پس حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی ملت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور شریعت سے مقدم تھی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف یہودیت اور نصرانیت کی نسبت کیسے ممکن ہو سکتی ہے پس کیا تم کو اتنی عقل نہیں کہ ایسی باطل بات زبان سے نکالتے ہو کہ جو جو طریقہ (یہودیت اور نصرانیت) حضرت ابراہیمؑ کے ایک ہزار یا دو ہزار برس بعد ظاہر ہوا حضرت ابراہیم علیہ السلام اُس کے وجود سے پہلے کیسے اُس کے متبع تھے آگاہ ہو جاؤ تم ایسے لوگ ہو کہ اس چیز میں جھگڑ چکے ہو جس کا تم کو کچھ تھوڑا بہت علم تھا اور اس کے متعلق تمہیں کچھ شُد بُد تھی یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات اور نبی آخر الزمانؐ کی بشارت وغیرہ کی تمہیں کچھ خبر تھی حالانکہ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ جب تک آدمی کو پورا علم نہ ہو اس بارہ میں بحث اور مناظرہ نہ کرے پس اب ایسی چیزوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کا تمہیں علم نہیں یعنی حضرت ابراہیمؑ کا کیا مذہب اور مسلک تھا اور آج دنیا میں کون سی جماعت ان کے مسلک کے قریب ہے اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے اور جس چیز کو آدمی نہ جانتا ہو اس کو چاہیئے کہ اس کے علم کو خدا کے سپرد کرے اللہ ہی کو معلوم ہے کہ ابراہیمؑ کا کیا طریقہ تھا سنو ان کا طریق یہ تھا کہ ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی و لیکن حنیف تھے یعنی سب طرف سے بیزار ہو کر صرف ایک خدا کے فرمانبردار اور تابعدار تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے بلکہ موحد اور حنیف اور مسلم تھے حنیف کے معنی ہیں کہ سب باطل راہوں کو چھوڑ کر راہ حق پکڑے اور سب طرف سے ہٹ کر ایک طرف یعنی خدا کا ہو جائے اور مسلم کے معنی فرمانبردار اور تابعدار کے ہیں اور اے اہل کتاب تم نہ موحد ہو اور نہ حنیف ہو اور نہ مسلم ہو شرک میں مبتلا ہو حق تعالیٰ کو احبار کے پیچھے پڑے ہوئے ہو احکام خداوندی کو پس پشت ڈالے ہوئے ہو اور تثلیث کا عقیدہ رکھتے ہو اور حضرت عزیرؑ اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہو تو پھر تم کیسے دم بھرتے ہو کہ ہم ملت ابراہیمی پر ہیں تحقیق تمام لوگوں میں سے ملت اور مذہب کے اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ سب سے زیادہ قریب اور خصوصیت رکھنے والے البتہ اول تو وہ لوگ تھے جنہوں نے ان کے وقت میں حضرت ابراہیمؑ کا اتباع اور پیروی کی وہ آپ کی امت کے اہل حق تھے اور بالخصوص آپ کے دین پر تھے اور پھر یہ نبی آخر الزماں ہیں یہ نبی اور مسلمان حضرت ابراہیمؑ سے زیادہ نزدیک ہیں جن کی شریعت کے اکثر احکام ملت ابراہیمی کے مطابق ہیں اللہ کو ایک مانتے ہیں اور قربانی اور ختنہ کرتے ہیں اور خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے ہیں اور حج اور عمرہ بجا لاتے ہیں اور غسل جنابت کرتے ہیں اور جن باتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش ہوئی تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان میں پورے اُترے مسلمان اُن کو پوری طرح ادا کرتے ہیں اور اللہ مسلمانوں کا والی اور کارساز ہے اور جس کا خدا والی ہو اس کے برعکس کا واؤ نہیں چل سکتا اور نہ اس کو کوئی راہ حق سے ہٹا سکتا ہے خلاصۂ جواب خداوندی یہ ہے کہ تم جو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیمؑ ہمارے دین پر تھے یعنی معاذ اللہ یہودی یا نصرانی تھے اگر اس سے غرض یہ ہو کہ

وہ تورات و انجیل پر عمل کرتے تھے تو یہ صریح کذب ہے کیونکہ تورات حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی جو حضرت ابراہیم سے ایک ہزار برس بعد ہوئے اور انجیل حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی جو حضرت موسیٰ سے ایک ہزار برس بعد ہوئے تو حضرت ابراہیم کو یہودی یا نصرانی کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے اور اگر حضرت ابراہیم کو یہودی یا نصرانی کہنے کا یہ مطلب ہے کہ جس زمانہ میں ان کی ہدایت اور اچھے رہنماؤں کا نام یہودی یا نصرانی تھا تو یہ بات بھی غلط ہے اس لیے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو حنیف اور مسلم کہا ہے اور حنیف کے معنی یہ ہیں کہ جس نے تمام باطل راہوں کو چھوڑ کر ایک حق کی راہ پکڑ لی ہو اور مسلم کے معنی حکم بردار اور تابع دار کے ہیں کہ جس نے اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے حوالہ اور سپرد کر دیا ہو اب تم خود غور کرو کہ یہ صفت تم میں ہے یا مسلمانوں میں اور اگر حضرت ابراہیم کے یہودی یا نصرانی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سب دینوں میں یہود یا نصاریٰ کے دین کو حضرت ابراہیم کے دین سے زیادہ مناسبت ہے تو یہ بات بھی غلط ہے حضرت ابراہیم سے سب سے زیادہ مناسبت اگر ہے تو آپ کی امت کو تھی اور پچھلی امتوں میں سب سے زیادہ مناسبت امت محمدیہ کو ہے کہ جس کا پیغمبر خلقاً و خُلقاً و صورۃً و سیرۃً حضرت ابراہیم کے مشابہ ہے اور ان کی خاص دعا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ الخ اور آپ کی امت کا بھی وہی نام ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ اور آپ کی شریعت کے قواعد بھی وہی ہیں جو ملت ابراہیمی کے تھے اور غالباً اسی مناسبت کی وجہ سے درود شریف میں كَمَا صَلَّيْتَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ فرمایا، تشبیہ میں کسی اور نبی کا ذکر نہیں فرمایا۔

ضروری تنبیہ

یاد رہے کہ وَلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا میں ابراہیم علیہ السلام کے مسلم ہونے سے یہ مراد نہیں کہ آپ شریعت اسلامیہ کو مانتے تھے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی کیونکہ اس صورت میں بھی وہی اعتراض وارد ہوگا کہ یہ شریعت بھی تو تورات اور انجیل کی طرح ابراہیم علیہ السلام کے بعد میں نازل ہوئی پھر ابراہیم علیہ السلام اس شریعت کے کیونکر تابع ہو سکتے ہیں بلکہ اس آیت میں اسلام سے معنی لغوی یعنی تفویض اور تسلیم توحید اور اخلاص فی العمل اور فرمانبرداری کے معنی مراد ہیں جو تمام انبیاء کا وصف رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام اور صفت کو روشن کیا۔ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ۔ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ لِلْجَبِينِ۔ اور یہی تفویض اور تسلیم اور توحید و اخلاص فی العمل اصل حقیقت ہے شریعت محمدیہ یعنی اسلام کی اور اس سے اہل کتاب بھی انکار نہیں کر سکتے کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین یہی اسلام تھا کیونکہ خود ان کی کتابوں میں ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو کچھ آیا ہے وہ بالکل اسی معنی پر منطبق ہے اور تمام انبیاء اپنے اپنے وقت میں اسی معنی کر اسلام کی دعوت دیتے چلے آئے یعنی توحید اور اخلاص فی العمل اور یہی لفظ اسلام اسی معنی اور حقیقت کے اعتبار سے مسلمانوں کے دین اور مذہب کا نام ہو گیا ہے لیکن اگر اس نام اور صفت اور اس معنی اور حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو مسلمان بھی ابراہیم علیہ السلام

سے اقرب اور اشبہ ہوں گے، یہود و نصاریٰ کو حضرت ابراہیمؑ سے کیا نسبت۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ
آرزو ہے بعض کتاب والوں کو کسی طرح تم کو
يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾
گمراہ کریں، اور وہ گمراہ نہیں کرتے مگر آپ کو اور نہیں سمجھتے ۔
يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ
اے کتاب والو! کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے اور تم
تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ
قائل ہو ۔ اے کتاب والو! کیوں ملاتے ہو صحیح میں
بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَقَالَتْ
غلط ؟ اور چھپاتے ہو سچی بات کو جان کر ۔ اور کہا
طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى
ایک فرقہ نے اہل کتاب میں ، کہ مان لو جو کچھ اترا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ
مسلمانوں پر دن چڑھے ، اور منکر ہو جاؤ آخر دن، شاید وہ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ؕ قُلْ
پھر جاویں ۔ اور یقین نہ کیجو مگر اسی کا جو چلے تمہارے دین پر ۔ تو کہہ
اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ
ہدایت وہی جو ہدایت کرے اللہ ، اس واسطے کہ کسی کو ملا جیسا کچھ تم

أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ

کو ملا تھا۔ یا مقابلہ کیا تم سے تمہارے رب کے آگے۔ تو کہہ بڑائی اللہ

بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٧٣﴾

کے ہاتھ میں ہے دیتا ہے جس کو چاہے، اور اللہ گنجائش والا ہے خبردار ہے۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ

خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے۔ اور اللہ کا فضل

الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾ وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ

بڑا ہے۔ اور بعض اہل کتاب میں وہ ہے کہ اگر تو اس پاس امانت

بِقِنْطَارٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ

رکھے ڈھیر مال کا ادا کرے تجھ کو، اور بعض ان میں وہ ہے، اگر تو اس پاس امانت رکھے ایک

لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ

اشرفی، ادا نہ کرے تجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے اس کے سر پر کھڑا۔ یہ اس واسطے کہ انہوں

قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ

نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہم پر جاہلوں کے حق میں کچھ گناہ۔ اور جھوٹ

عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ بَلَىٰ مَنْ

بولتے ہیں اللہ پر جانتے ہوئے۔ کیوں نہیں!

أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٧٦﴾

جو کوئی پورا کرے اپنا اقرار اور پرہیزگار رہے تو اللہ چاہتا ہے پرہیزگاروں کو۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ

جو لوگ خرید کرتے ہیں اللہ کے اقرار پر اور اپنی قسموں پر

ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ

تھوڑا مول، ان کو کچھ حصہ نہیں آخرت میں،

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور نہ نگاہ کرے گا ان کی طرف قیامت کے دن

وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٧﴾ وَإِنَّ مِنْهُمْ

اور نہ سنوارے گا ان کو، اور ان کو دکھ کی مار ہے۔ اور ان میں

لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ

ایک فرقہ ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب، کہ تم جانو

مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ

وہ کتاب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں، اور کہتے ہیں

هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ وَ

وہ اللہ کا کہا ہے، اور وہ نہیں اللہ کا کہا، اور

يَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٨﴾

اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ

کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکم

اب آئندہ دو آیت میں یہود کی مسلمانوں کو دین حق سے گمراہ کرنے کی ایک عجیب وغریب سازش اور
مکر و فریب کو ظاہر کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ عبداللہ بن صیف اور عدی بن زید اور
حارث بن عوف نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے چند لوگ صبح کے وقت چل کر محمد صلے اللہ علیہ
وسلم پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر ظاہراً ایمان لے آئیں اور پھر شام کو اس کا انکار کر دیں تاکہ لوگ
شک اور تردد میں پڑ جائیں کہ یہ لوگ علماء اہل کتاب ہیں انہوں نے دین اسلام میں ضرور کوئی عیب
اور نقصان کی بات دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے شاید دوسرے لوگ بھی ہم کو
اس طرح دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس مکر سے مطلع کر دیا اور بتلا دیا کہ وہ
اس قسم کے مکر و فریب سے مسلمانوں کو گمراہ نہیں کر سکتے اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں۔ چنانچہ فرماتے
ہیں اور اہل کتاب کی ایک جماعت نے مشورہ کر کے یہ کہا کہ جو کتاب مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے
اس پر شروع دن میں ظاہراً ایمان لے آؤ اور پھر آخر دن میں اس کا صاف منکر ہو جاؤ شاید مسلمان بھی شک
میں پڑ جائیں اور اپنے دین سے پھر جائیں کہ یہ لوگ عالم ہیں اور بے تعصب ہیں کہ اسلام میں داخل
ہو گئے ان لوگوں نے دین اسلام میں ضرور کوئی خرابی دیکھی ہوگی جو داخل ہونے کے بعد اس سے پھر گئے
ہیں۔ خلاصہ یہ کہ صرف مسلمانوں کے دکھلانے کے لیے صرف ظاہری طور پر مسلمانوں کی کتاب پر ایمان
لاؤ اور صدق دل سے کسی کے قول کی تصدیق نہ کرو یعنی سچا ایمان جس میں دل اور زبان موافق ہوتے
ہیں وہ کسی کے لیے بھی نہ لاؤ مگر جو شخص تمہارے دین کا پیرو ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہود مسلمانوں کے
پاس جا کر شروع دن میں ظاہراً ان کی کتاب پر ایمان لائیں اور بطور نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کریں ان کو
یہ بات ملحوظ رہے کہ وہ اس ظاہری زبان کی وجہ سے اپنے کو مسلمان نہ سمجھیں بلکہ صدق دل سے اپنے
کو یہودی ہی سمجھیں اور سچے دل سے اسی شخص کی بات کو قبول کریں جو ان کے دین کا پیرو ہو سوائے
اپنے مذہب والوں کے کسی کی بات کا یقین نہ کریں اس صورت میں لِمَنْ تَبِعَ میں لام زائدہ ہوگا اور بعض
نے وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ کے یہ معنی بیان کیے ہیں کہ تمہارا صبح کے وقت ظاہری طور پر
ایمان لانا بھی محض ان لوگوں کے دین کی حفاظت کے لیے ہو جو تمہارے ہم مذہب اور تمہارے دین کے
پیرو ہیں اس صورت میں لِمَنْ تَبِعَ کا لام انتفاع کے لیے ہوگا یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی
حفاظت مقصود ہونی چاہیے کہ وہ آئندہ چل کر مسلمان نہ ہو جائیں یا جو بھولے ہم مذہب مسلمان ہو
چکے ہیں وہ اس تدبیر سے پھر واپس آ جائیں۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ یہود کے ان علماء اور رؤسا

حاشیہ: اشارہ اس طرف ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا کا عطف اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ پر ہے اور
یہ پوری آیت کلام یہود کا بقیہ ہے اور ان کے کلام سابق پر معطوف ہے وکذا قال ابن عطیۃ
لا خلاف بین اھل التاویل ان ھذا القول من کلام الطائفۃ، انتہی۔

اہلِ کتاب میں سے اہلِ امانت کی مدح اور اہلِ خیانت کی مذمت

گذشتہ آیت میں اہلِ کتاب کی تلبیس اور کتمانِ حق کا بیان تھا اب اس آیت میں اُن کی خیانت فی الاموال کا ذکر ہے کہ ان لوگوں میں امانت داری اور خدا ترسی نہیں چند پیسوں کے لیے خیانت سے دریغ نہیں کرتے، ورنہ امور آخرت کے معاملہ میں ان پر کیسے بھروسہ کیا جائے البتہ ان میں بعض بعض اب بھی امین ہیں جن کو حق کے قبول کرنے میں دریغ نہیں چنانچہ فرماتے ہیں اور بعضے اہلِ کتاب سے ایسے امین بھی ہیں کہ اے مخاطب اگر تو ان کے پاس کوئی خزانہ یا مال کا ڈھیر بھی امانت رکھ دے تو وہ تیری امانت تجھ کو ادا ہی دے دیں گے اگرچہ قرآن سے اپنی امانت کا مطالبہ بھی نہ کرے جو شخص مخلوق کے معاملہ میں اس درجہ امین ہو تو وہ خالق کے معاملہ میں بدرجۂ اولیٰ امین ہوگا ایسا شخص توریت کے احکام میں اور نبی آخر الزمان کی بشارتوں میں ذرہ برابر خیانت نہ کرے گا اس لیے کہ وہ اللہ کی امانت ہیں۔ جیسا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کسی شخص نے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے پاس ایک ہزار اور دو سو اوقیہ سونا امانت رکھا آپ نے بعینہٖ اس کی امانت ادا کر دی۔ یہ آیت ان کے بارہ میں نازل ہوئی اور بعض ان میں سے ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس تو ایک اشرفی امانت رکھ دے تو وہ تجھ کو ادا نہ کرے گا مگر جب تک تو اس کے سر پر کھڑا رہے۔ یعنی جب تک تو تقاضا کرتا رہے تب امانت ادا کرے۔ یہ آیت فنحاص بن عازوراء یہودی کے بارہ میں نازل ہوئی جس کے پاس کسی شخص نے ایک اشرفی امانت رکھی تھی — اور ان لوگوں کی ادائے امانت میں یہ خیانت اس وجہ سے ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم پر امیوں اور ان پڑھوں یعنی عربوں کے مال میں ہم پر کوئی راہ نہیں یعنی ہم پر خدا کے یہاں عربوں کے مال میں کوئی مواخذہ نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے جو عربوں کے مال ہمارے لیے حلال ہیں۔ اہلِ کتاب کا یہ عقیدہ تھا کہ ہم اہلِ کتاب ہیں اور سارا دین ہمارا ہے اور غیر اہلِ کتاب مثلاً قریش وغیرہ کے مال میں خیانت کرنے میں ہم پر کچھ گناہ نہیں جیسے کہ برہمنوں نے شودروں کے بہکانے کے لیے بہت سی باتیں بنا رکھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس دعوے کی تکذیب میں فرماتے ہیں۔ اور یہ لوگ اللہ پر دیدہ و دانستہ جھوٹ بولتے ہیں اللہ تعالیٰ نے کسی مخالف اور دشمن کے مال میں چوری اور خیانت کی بھی اجازت نہیں دی ان لوگوں نے پرایا مال کھانے کے لیے یہ مسئلہ بنا لیا اور غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت جائز سمجھ جان بوجھ کر جھوٹ بنا لیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے امانت میں خیانت کی کبھی اجازت نہیں دی اور شریعت اسلامیہ کا مسئلہ بھی یہی ہے کہ مسلمان ہو یا کافر ہندو ہو یا یہودی یا نصرانی کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں اور یہ لوگ خود بھی جانتے ہیں کہ توریت میں کوئی ایسا حکم نہیں اور آج کل یورپ کی اقوام کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً اور ایشیائی اقوام کے ساتھ عموماً عہد و پیمان کا پورا کرنا ضروری

قد بدلوا كتاب الله و غيّروه وكتبوا بأيديهم الكتاب وقالوا هو من عند الله ليشتروا به ثمنا قليلا ألا ينهاكم ما جاءكم من العلم عن مسألتهم ولا والله ما رأينا منهم رجلا قط يسألكم عن الذي أنزل عليكم كذا في تفسير ابن كثير تحت تفسير قوله تعالى الذين يكتبون الكتاب بأيديهم (ج ۱ طبع بیروت ص۱۱۶)

برابر شاہد ہو کبھی نہیں جس کی بعض اہل کتاب پڑھتے ہو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے تم کو بتلا دیا ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب یعنی توریت وغیرہ میں تغیر و تبدل کر دیا ہے اور بہت سی چیزیں اپنے ہاتھ سے لکھ کر اس میں شامل کر دی ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ دنیا کا فائدہ حاصل کریں کیا جو علم اور شاہدہ تمہارے پاس آیا ہے وہ تم کو اہل کتاب سے سوال اور استفادہ سے منع نہیں کرتا یعنی علم کے ہوتے ہوئے محرف کتاب کی طرف کیوں نظر کرتے ہو علاوہ ازیں تمہارا اہل کتاب سے سوال کرنا غیرت کے بھی خلاف ہے واللہ یعنی کہ خدا کی قسم ہم نے تو اہل کتاب کو کبھی نہیں دیکھا کہ وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن کے متعلق تم سے کچھ سوال کرتے ہوں پھر تم کیوں ان سے سوال کرتے ہو۔ (رواہ البخاری)

اور تفسیر کبیر ص ۲۳۷ ج ۲ اور تفسیر قرطبی ص ۱۲۳ ج ۴ میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ آیت اُن یہود کے بارہ میں نازل ہوئی جو کعب بن اشرف یہودی کے پاس توریت کا ایک نسخہ لے کر گئے جس میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی اُن صفات اور علامات کو بدل دیا تھا جو توریت میں آئی تھیں بنی قریظہ نے اُن کی نعت بدلی ہوئی کتاب کو لیا اور اپنی کتاب میں اس کو ملا دیا۔

اور قفال مروزی اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے تھے یلوون السنتہم سے یہ مراد ہے کہ یہود بعض الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو زبان موڑ کر اس طرح پڑھتے تھے کہ جس سے لفظ کے معنی بدل کر کچھ ہو جاتے تھے جیسے راعنا کے معنی یہ ہیں کہ آپ ہمارا رعایت فرمائیے لیکن یہود جب اس لفظ کو زبان موڑ کر پڑھتے تو یہ لفظ راعینا بن جاتا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں جو سراسر تحقیر ہے یا یہ کہ عبرانی کا لفظ عبرانی اور سریانی زبان میں گالی کا تھا۔

عنه نقل عن ابن عباسؓ انه قال ان النفر الذين لا يكلمهم الله يوم القيامة ولا ينظر اليهم كتبوا شيئا حذفوا فيه نعت محمد صلى الله عليه وسلم وخلطوه بالكتاب الذي كان فيه نعت محمد صلى الله عليه وسلم ثم قالوا هذا من عند الله (تفسير كبير ص ... ج ۲)

وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ، الحمد للہ قرآن کریم جس طرح تحریف لفظی سے محفوظ ہے اسی طرح تحریف معنوی سے بھی محفوظ ہے اس لیے کہ احادیث نبویہ اور اقوال صحابہ و تابعین کے بعد قرآن کریم کی مراد اس درجہ واضح ہو گئی ہے کہ اب اس میں کسی ملحد و زندیق کی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہی فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

اطلاع: جس شخص کو کتب سابقہ کی تحریف لفظی و معنوی کی پوری تفصیل درکار ہو تو وہ ازالۃ الشکوک اور ازالۃ الاوہام اور اظہار الحق جو مصنفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی کی مراجعت کرے۔

ایک ضروری تنبیہ: عبداللہ بن عباسؓ اور امام بخاریؒ کی طرف یہ منسوب ہے کہ وہ تحریف معنوی کے قائل ہیں اس لیے کہ صحیح بخاری میں ہے۔

قال ابن عباس يحرفون يزيلون وليس احد يزيل لفظ كتاب من كتب الله ولكنهم يحرفونه يتأولونه على غير تأويله.

ابن عباس رضی اللہ عنہ یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مواضعہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں یہود تحریف کرتے ہیں اور کتاب الٰہی کے الفاظ کو ہٹا دیتے ہیں اور کسی مخلوق کو یہ مجال نہیں کہ اللہ کی کسی کتاب کے کسی لفظ کو زائل اور فنا کر دے لیکن کتاب الٰہی میں تحریف: دور از کار تاویلیں کرتے تھے۔

اس عبارت سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہو گیا کہ عبداللہ بن عباسؓ تحریف لفظی کے منکر ہیں اور اسی کو امام بخاریؒ نے اختیار کیا ہے۔

یہ صحیح نہیں اس لیے کہ عبداللہ بن عباسؓ سے بطرق کثیرہ یہ منقول ہے کہ اہل کتاب نے توریت میں جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی صفات مذکور تھیں ان میں بڑا تغیر اور تبدل اور رد و بدل کر دیا تھا یہ روایتیں تفسیر در منثور صفحہ ۴۶ ج ۱- وغیرہ میں مذکور ہیں۔ وہاں دیکھ لی جائیں۔

لہٰذا یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ کتب سابقہ میں تحریف لفظی کے منکر ہیں خصوصاً جب کہ صحیح بخاری میں متعدد جگہ ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ اے گروہ مسلمین تم اہل کتاب سے کیوں دریافت کرتے ہو حالانکہ تمہاری کتاب (قرآن) ابھی خدا کی طرف سے تازہ بتازہ نازل ہوئی ہے اور خالص ہے اور اس میں ذرہ برابر کوئی آمیزش نہیں ہوئی اور تحقیق اللہ نے تم کو خبر دے دی ہے کہ اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل ڈالا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔

جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کتب سابقہ میں بہت سی چیزیں ملاوٹ کی ہیں اور قرآن کریم خالص و روشن ہے جس میں ذرہ برابر کسی قسم کی ملاوٹ نہیں۔

امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ کے قول کو ایک دوسرے طریق سے نقل کیا ہے وہ یہ کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے کسی مخلوق سے اس کا زائل کرنا اور فنا کرنا ممکن نہیں البتہ بندہ اس میں تاویل فاسد

تحریف کر سکتا ہے اور بندہ کا یہ فعل تاویل اور عمل تحریف حادث اور مخلوق ہے اس لیے کہ بندہ کے تمام افعال مخلوق اور حادث ہیں۔

امام بخاریؒ نے کتاب الرد علی الجہمیہ اسی غرض کے لیے مستقل تراجم اور ابواب رکھے ہیں سب سے مقصود یہی ہے کہ اللہ کا کلام قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا جو فعل کلام خداوندی سے متعلق ہو یعنی بندہ کا تلفظ اور اس کی قرأت اور اس کی تلاوت اور اس کی کتابت یہ سب مخلوق اور حادث ہیں۔ یعنی کلام ملفوظ اور مقروء اور کلام متلو قدیم اور غیر مخلوق ہے اور بندہ کا تلفظ اور قرأت اور کتابت سب حادث ہے اسی طرح بندہ کا یہ فعل یعنی تحریف اور تاویل فاسد بھی مخلوق اور حادث ہوگا۔

اہل کتاب کا حضرات انبیاء پر افتراء اور اس کی تردید

گزشتہ آیت میں یہ ذکر تھا کہ اہل کتاب اللہ کی کتاب میں تحریف کرتے ہیں اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اب اس آیت میں حضرات انبیاء پر ان کی افتراء پردازی کا بیان کرتے ہیں کہ اہل کتاب یہ کہتے ہیں۔ معاذ اللہ۔ حضرات انبیاء نے تثلیث اور الوہیت کے عقیدہ کی تعلیم دی ہے چنانچہ عیسائی الوہیت مسیح اور تثلیث کے مسئلہ میں جب دلیل اور برہان کے پیش کرنے سے عاجز ہوتے تو یہ کہنے لگے کہ ہم کیا کریں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم کو ایسا ہی حکم دے گئے ہیں خود حضرت مسیحؑ نے اپنے کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے اور اسی قسم کے کلمات کا بھی ذکر کرتے ہیں جن سے اپنے زعم میں حضرت عیسیٰؑ اور روح القدس کو شریک الوہیت ہونا ثابت کرتے ہیں آئندہ آیت یعنی مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ الخ ان کی تردید اور جواب میں نازل ہوئی جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو کتاب اور حکمت دے کر بھیجتے ہیں وہ خدا پرستی ہی کی دعوت دیتا ہے یہ ناممکن ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنی بندگی کی طرف بلائے اور توریت اور انجیل میں صد ہا مقامات پر خدا پرستی کی صریح تعلیم موجود ہے لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ حضرت مسیحؑ نے اپنے آپ کو خدا اور خدا کا بیٹا کہا ہے صریح کذب اور افتراء ہے اور ان کی تصریحات کے صریح خلاف ہے بلکہ حضرت مسیحؑ نے توحید کے بعد تم سے اس بات کا بھی عہد اور اقرار لیا تھا کہ جب تم نبی آخر الزمان کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان کی تصدیق کرنا اور ان پر ایمان لانا اور ان کی نصرت اور اعانت کرنا اور ان کا دین وہی دین ہوگا جو تمام انبیاء و مرسلین کا دین ہے یعنی دین اسلام چنانچہ فرماتے ہیں کسی بشر کے لیے بشر ہوتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور شریعت اور نبوت عطا فرمائیں بایں ہمہ اس کے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم مجھ کو میرے بندے بن جاؤ اس لیے کہ بشر کے ملنے اپنی بشریت کی عاجزی اور درماندگی ظاہر ہوگی اور عاجزی

اور مدارِ عمل کے ہوتے ہوئے ادنیٰ عقل والا بھی ایسی ادعاءِ ربوبیت کا گمان تک نہیں کر سکتا، اور جس کو کتاب، حکمت اور نبوت عطا ہوئی وہ وہی شخص ہوگا جو لوگوں کو ایک خدا کی عبادت کی دعوت دے، بعثت کا مقصد ہی توحید و تفرید ہے جس کا امر بالشرک کے ساتھ جمع ہونا ناممکن اور محال ہے اس لئے وہ نبی تو یہ کہے گا کہ تم اللہ والے ہو جاؤ یعنی ایک خدا کی محبت اور اطاعت میں فنا ہو جاؤ اس لئے کہ تم دوسروں کو اللہ کی کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور اس وجہ سے بھی کہ تم خود بھی اس کتاب الٰہی کو پڑھتے پڑھاتے ہو جو توحید و تفرید کی تعلیم سے بھری پڑی ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ نبی تم کو ربانیت کے حکم کے بعد یہ حکم دے کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو پروردگار ٹھہراؤ۔ فرشتے اور پیغمبر معاذ اللہ خدا اور پروردگار نہیں بلکہ بندگانِ خدا تک پہنچنے کا واسطہ اور ذریعہ ہیں اور انبیاء تو کفر اور شرک کے مٹانے کے لئے مبعوث ہوئے ہیں کیا وہ نبی تم کو کفر اور شرک کی طرف لوٹنے کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم اس کی تعلیم و تلقین سے مسلمان اور موحد ہو چکے ہو۔ ابن اسحٰق اور بیہقی نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ جب وفد نجران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے ان کو اسلام کی دعوت دی تو ابو رافع قرظی یہودی نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی ایسی ہی پرستش کریں جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں آپ نے فرمایا معاذ اللہ اور اس پر ما کان لبشر سے مسلمون تک آیت نازل ہوئی۔

شاہ صاحبؒ موضح القرآن میں فرماتے ہیں یہود مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تمہارا نبی یہ چاہتا ہے کہ بندگی کرو اللہ کی ہم تو آگے سے اسی کی بندگی کرتے ہیں مگر وہ (یعنی تمہارا نبی) یہ چاہتا ہے کہ میری بندگی کرو سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نبی کرے اور وہ لوگوں کو کفر سے (یعنی غیر اللہ کی عبادت سے) نکال کر مسلمان بنا دے پھر ان کو کیوں کر کفر سکھا دے مگر تم کو (اے اہل کتاب) یہ کہتا ہے کہ تم میں جو آگے پیشوا لوگ تھے کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ اب تم میں باقی نہیں رہی اب میری صحبت میں وہی کمال حاصل کرو یعنی اب میری صحبت میں قرآن پڑھو اور پڑھاؤ اور سیکھو اور سکھاؤ اور علم ربانی اور عارف یزدانی بنو۔

ف عبادت اور بندگی تو اللہ ہی کی ہے مگر اطاعت اور پیروی نبی کی بھی ضروری اور لازم ہے شاید اس معترض نے عبادت اور اطاعت میں فرق نہ کیا اور اعتراض کر دیا کہ معاذ اللہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے اپنی بندگی چاہتے ہیں یہ اعتراض بالکل لغو اور مہمل تھا عبادت اور اطاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے عبادت خالص خدا کا حق ہے اور رسولِ خدا کا حصہ اطاعت اور پیروی نبی کا حق ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ

اور جب لیا اللہ نے اقرار نبیوں کا کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا

مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ

کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتادے

لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ ۚ قَالَ

تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا

أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۖ قَالُوا

کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر لیا میرا ذمہ؟ بولے ہم

أَقْرَرْنَا ۚ قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ

نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اب شاہد رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ

الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾ فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ

شاہد ہوں۔ پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد تو وہی لوگ

الْفَاسِقُونَ ﴿٨٢﴾

ہیں بے حکم۔

تذکیر میثاق انبیاء و توبیخ بر انحراف از آں

قَالَ تَعَالَىٰ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ ... الی ... فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔

(ربط) گزشتہ آیت میں یہ بتلایا کہ جو رب اور معبود خاص اللہ کا حق ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی اپنی بندگی کی تعلیم دے۔ اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور بے چون و چرا اُن کی اطاعت کریں اور ہمیشہ ان کی مدد کریں جو نبی کے زمانہ میں

جو امت سے یہی عہد لیا گیا ہے جس سے اہل کتاب اعراض اور روگردانی کر رہے ہیں اور پختہ عہد کے بعد روگردانی کرنا صریح فسق ہے اور اس آیت کے اخیر میں فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ میں فسق سے یہی عہد شکنی مراد ہے چنانچہ فرماتے ہیں اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے عہد و پیمان لیا پیغمبروں سے کہ البتہ جو کچھ میں تم کو کتاب اور حکمت یعنی شریعت کا علم دوں اور پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول جس کے ساتھ دلائل نبوت اور شواہد رسالت ہوں اور وہ رسول تصدیق کرنے والا ہو تمہاری اس کتاب اور شریعت کی جو تمہارے ساتھ ہے تو البتہ تم اس رسول پر ضرور ایمان لانا اور فقط ایمان اور تصدیق پر اکتفا نہ کرنا بلکہ جان و مال سے اس کی پوری پوری مدد بھی کرنا اور ان کے دین اور شریعت کی تبلیغ اور ترویج میں کوئی دقیقہ اٹھا کر نہ رکھنا پھر اس عہد کے بعد مزید تاکید اور توثیق کے لیے حق تعالیٰ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور اس کام پر میرے پختہ عہد و پیمان کو قبول کر لیا سب نے کہا ہم نے اقرار کیا فرمایا تو اب شاہد اور گواہ رہو ایک دوسرے کے اقرار پر اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے گواہ ہوں۔ یہ تمام الفاظ عہد و میثاق کی تاکید و توثیق کے لیے فرمائے کہ جس عہد اور پیمان پر حق تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کی گواہی ہو اور مدعا علیہ کا اقرار اور شہادت بھی اس کے ساتھ مقرون ہو تو اس عہد کے پختہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے پس جو شخص پھر جائے ایسے پختہ عہد سے جس پر خدا تعالیٰ کی اور اس کے تمام پیغمبروں کی گواہی ہو اور باوجود عہد اور اقرار کے نہ اس رسول پر ایمان لاوے اور نہ اس کی مدد کرے تو ایسے ہی لوگ پرلے درجہ کے بدعہد اور بدکردار اور نافرمان ہیں جو ایسے پختہ عہد و پیمان کی بھی پروا نہیں کرتے جاننا چاہیے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرات صحابہ و تابعین کے دو قول ہیں ایک یہ کہ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ میں رسول سے عام رسول اور عام نبی مراد ہے دوسرا قول یہ ہے کہ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔

تشریح قول اول

اگر ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ میں رسول سے عام نبی اور پیغمبر کے معنی مراد ہوں تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ حق تعالیٰ نے ہر نبی سے جو آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک آئے یہ عہد لیا کہ جس کو ہم کتاب و حکمت دے کر بھیجیں اور اس کے بعد دوسرا نبی آئے جو پچھلے انبیاء کی نبوت اور ان کی کتابوں اور حکمت کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرنے والا ہو تو ضروری ہے کہ پہلا نبی بعد میں آنے والے نبی کی تصدیق کرے اور اس کی صداقت پر ایمان لانے اور اس کی مدد کرے یہ نہ ہو کہ پہلے نبی کا علم اور حکمت دوسرے نبی کی تصدیق اور نصرت سے مانع ہو اور اگر خود اس دوسرے نبی کا زمانہ نہ پائے تو اپنی امت کو اس کی پوری پوری ہدایت اور وصیت کر جائے کہ اگر بعد میں آنے والے پیغمبر کا زمانہ پاؤ تو اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ یہی وصیت بھی آنے والے نبی کی نصرت اور اعانت میں داخل ہے۔

اور اس عموم میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم بھی داخل ہوں گے کیونکہ جب عام طور پر اللہ تعالیٰ نے

عہد لے چکا کہ جو نبی اپنے سے پہلی کتاب و حکمت کا مصدق ہو اس کی تصدیق اور نصرت ضروری ہے تو نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و نصرت بھی بطریق اولیٰ اس عہد میں داخل ہوگی کیونکہ آپ بھی دلائل و شواہد کے ساتھ اللہ کے رسول ہیں اور سابق کتاب اور حکمت تورات و انجیل کے مصدق ہیں۔
لہٰذا یہود و نصاریٰ کو اپنے انبیاء کے عہد و پیمان کی بنا پر آپ پر ایمان لانا اور آپ کی مدد کرنی چاہئے مقصود یہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ کو انبیاء سابقین کا عہد و پیمان یاد دلا کر ان کو متوجہ کیا جائے تاکہ معقول پسند طبیعتیں کفر اور انکار سے باز آکر آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں۔

تشریح قول دوم اور اگر ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات قدسی صفات مراد ہو تو آیت کے یہ معنی ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء اور انبیاء کے ذریعہ ان کی قوموں اور امتوں سے اس بات کا عہد لیا کہ اگر محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں اور تم ان کا زمانہ پاؤ تو فرداً فرداً ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا حضرت علی اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم سے آیت کے یہی معنی منقول ہیں۔ اور یہی ممکن ہے کہ آیات سابقہ سے یہ کہ آیت متعلق ہو کیونکہ ایک بڑا سلسلہ کلام آپ ہی کی نبوت کے اثبات میں چلا آ رہا ہے اور یہی قول جمہور مفسرین کے نزدیک مختار اور راجح ہے امام قرطبی فرماتے ہیں کہ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ میں حضرت علی اور ابن عباس کے قول کے مطابق خاص محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مراد ہیں لفظ رسول اگرچہ نکرہ ہے مگر اشارہ معین اور مخصوص کی طرف ہے جیسے حق تعالیٰ کے قول ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً الی قولہ۔ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ میں رسول سے حضور پُرنور صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات مراد ہے (تفسیر قرطبی ص ۱۲۵ ج ۴)

دونوں قولوں میں فرق ان دونوں تفسیروں میں فرق یہ ہے کہ اگر رسول سے عام نبی کے معنی مراد ہوں تو اس سے مقصود یہ ہوگا کہ حضرات انبیاء کرام باہم متحد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مصدق اور معین و مددگار ہوتے ہیں جیسا کہ ایک بادشاہ ایک وقت میں دو حاکم مستقل دو علاقوں میں بھیجے تو ہر حاکم پر دوسرے حاکم کے عمل اور حکومت کی تصدیق اور عندالضرورت اس کی نصرت اور امداد ضروری ہے اگرچہ دونوں حاکموں کے قوانین اور احکام جزئیہ میں کچھ اختلاف ہو لیکن حکومت کے دستور اساسی میں دونوں متفق ہوتے ہیں البتہ عمل اور علاقے کے حالات مختلف ہونے کی وجہ سے عملی اور تفصیلی احکام ہر صوبہ کے الگ ہوتے ہیں۔

---

۱ قال علی بن ابی طالب وابن عمہ ابن عباس رضی اللہ عنہما ما بعث اللہ نبیا من الانبیاء الا اخذ علیہ المیثاق لئن بعث اللہ محمدا صلی اللہ علیہ وسلم وھو حی لیؤمنن بہ ولینصرنہ وامرہ ان یاخذ المیثاق علی امتہ لئن بعث محمد وھم احیاء لیؤمنن بہ ولینصرنہ۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۳۷۸ ج ۱)

ہاں اگر دو رسول بیک وقت ایک قوم میں بھیجے جائیں تو وہ دونوں شریعت کی ہر بات میں متفق ہوں گے جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام دونوں کی شریعت کے احکام بالکل ایک تھے اور اگر ایک نبی اور رسول دوسرے نبی اور رسول کے بعد آئے تو جائز ہے کہ بعد میں آنے والا نبی پہلے نبی کے بہت سے احکام کو منسوخ کر دے مگر اصول دین میں تمام انبیاء و رسل اول سے آخر تک متفق رہے ہیں۔

اور دوسرے قول کی بنا پر کہ رسول سے خاص حضور پرنور کی ذات بابرکات مراد لی جائے تو مقصود آیت سے آپ کی سیادت اور فوقیت کو بیان کرنا ہوگا کہ آپ تمام اولین و آخرین کے سردار ہیں کہ آپ کے اتباع اور نصرت کا عہد تمام انبیاء سے لیا گیا جب کہ شب معراج میں آپ نے انبیاء کی امامت فرمائی اور قیامت کے دن شفاعت کبریٰ کے مقام پر آپ تنہا کھڑے ہوں گے اور تمام بنی آدم آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے یہ تو عملی ظہور آپ کی سیادت عامہ اور رسالت کبریٰ کا۔ اور آپ کے خاتم النبیین ہونے کی دلیل یہ ہوئی کہ حق تعالیٰ نے تمام انبیاء سے یہ فرمایا ثُمَّ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌ کہ تم سب کے بعد ایک عظیم الشان رسول آئے گا، اس سے معلوم ہوا کہ اس عظیم الشان رسول کی آمد سب کے بعد ہوگی، اور اس کے بعد کسی کو نبی نہیں بنایا جائے گا، یہی معنی خاتم النبیین کے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ سے پہلے نبی بن چکے ہیں۔ البتہ علامت قیامت کی طرح سے اخیر زمانہ میں آپ کی امت کی مدد کے لئے آپ کی شریعت کے تابع ہو کر آسمان سے نازل ہوں گے۔

ف یہ عہد یا تو عالم ارواح میں لیا گیا ہے جس وقت حضرت آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو نکالا گیا، اور پھر عالم شہادت میں ہر نبی کے زمانہ میں اس سب کی تجدید ہوئی اور عہد الست کی طرح حضرات انبیاء نے اس عہد کو یاد دلایا تاکہ یاد کے بعد اس عہد کا ایفاء کریں۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ

اب کیا اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا اللہ کے دین کے، اور اسی کے حکم میں ہے جو

فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّ

کوئی آسمان اور زمین میں ہے، خوشی سے یا زور سے اور

اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ

اسی کی طرف پھر جاویں گے ۔ تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا

عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ

ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر اور اسمٰعیل پر اور

اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى

اسحٰق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو

وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ

اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے ہم جدا نہیں کرتے

اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ

ان میں کسی کو اور ہم اسی کے حکم پر ہیں ۔ اور جو

يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ

کوئی چاہے سوا حکم برداری کے اور دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور

هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِي

وہ آخرت میں خراب ہے ۔ کیونکر راہ دے گا

اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا

اللہ ایسے لوگوں کو کہ منکر ہوگئے مان کر اور جان چکے کہ

اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ

رسول سچا ہے ۔ اور آئیں ان کو نشانیاں ۔ اور اللہ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ

راہ نہیں دیتا بے انصاف لوگوں کو ۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ

أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ

یہ کہ ان پر لعنت اللہ کی، اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب

أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خٰلِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ

کی ۔ پڑے رہیں اس میں ، نہ ہلکا ہو اُن پر

الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ

عذاب ، اور نہ ان کو فرصت ملے ۔ مگر جنہوں نے

تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوا ۟ فَإِنَّ اللّٰهَ

توبہ کی اس کے بعد ، اور سنوار پکڑی تو البتہ اللہ

غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ

بخشنے والا مہربان ہے ۔ جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر

ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَ

بڑھتے رہے انکار میں ، ہرگز قبول نہ ہوگی اُن کی توبہ اور

أُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَ

وہی لوگ ہیں راہ بھولے ۔ جو لوگ منکر ہوئے اور

مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ

مر گئے منکر ہی ، تو ہرگز قبول نہ ہوگا ایسے کسی سے

مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۗ أُولٰٓئِكَ

زمین بھر کر سونا ، اگرچہ بدلہ دیا چاہے یہ کچھ ۔ ان کو

اور ان پر جو کہ خدا نے نبی بنایا اور جن پر خدا کی کتابیں اور صحیفے نازل ہوئے اور اس پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئی اور اس چیز پر بھی جو تمام پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی اور ہم انبیاء میں تفریق نہیں کرتے جیسا کہ یہود و نصاریٰ کا حال ہے کہ کسی کی تصدیق کرلی اور کسی کی تکذیب سب خدا کے برگزیدہ اور فرستادہ تھے اور سب دین حق پر تھے، دین سب کا ایک تھا صرف ان کی شریعتوں کے قوانین اور احکام میں جو اختلاف تھا وہ محض طور اس زمانہ اور اس ملک اور ان کے باشندوں کے لحاظ سے تھا اور یہ سب اسی ایک خدا کے خاص فرمانبردار تھے خالص خدا کی بندگی یہ دین اسلام کا خلاصہ ہے اور جو شخص اسلام کے سوا یعنی اللہ کی خالص بندگی کے سوا کوئی اور دین طلب کرے تو وہ دوسرا دین اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اس لیے کہ یہ دین وہ دین نہیں جس کا اللہ نے حکم دیا ہو اور ایسا کر بیٹھنے کا ہو اور وہ آخرت میں خسارہ والوں میں سے ہوگا یعنی اس کی تمام محنت ضائع ہوگی اللہ کے حکم کے سامنے گردن ڈال دینے کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کرام کا دین اور مذہب ہے اس کے علاوہ کوئی دین قابل قبول نہیں۔

بیان حکم مرتدین

اب تک ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اسلام میں داخل ہونے سے اعراض کیا اب آئندہ آیت میں ان لوگوں کا بیان ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر گئے ایسے لوگوں کو شریعت کی اصطلاح میں مرتد کہتے ہیں پھر یہ مرتدین دو قسم کے ہیں ایک وہ ہیں جو اپنے کفر اور ارتداد پر قائم رہے اور ایک قسم وہ ہے جو تائب ہو کر پھر صاف دل سے اسلام میں واپس آ گئے آئندہ آیت میں دونوں کا بیان ہے۔ اول یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت اور توفیق اور شفاعت سے نوازے جو دل سے ایمان لانے کے بعد کافر ہوئے اور زبان سے اس کی شہادت اور اس اقرار کے بعد کہ یہ رسول اللہ کے برحق پیغمبر ہیں اور بعد اس بات کے کہ ان کے پاس آپ کی نبوت اور اسلام کی حقانیت کی واضح دلیلیں اور روشن نشانیاں پہنچ چکی ہیں اسلام سے پھر گئے اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو ہدایت اور توفیق نہیں دیتا کہ اقرار کرنے کے بعد پھر جائیں۔ ایسے لوگوں کو توبہ کی بھی توفیق نہیں ہوتی ظالم سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہٹ دھرم اور ضدی ہیں ایسے لوگوں کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور تمام فرشتوں کی وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت سے دور رکھے اور ان پر تمام لوگوں کی لعنت ہے مؤمنین تو صراحۃً ان پر لعنت بھیجتے ہیں اور کافر بھی حق بات نہ ماننے والے پر لعنت کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس لعنت کا مصداق وہ خود ہی ہیں ہمیشہ رہیں گے اس لعنت میں اور عذاب لعنت میں داخل ہونے کے بعد نہ عذاب میں ان سے کوئی تخفیف کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی مگر جن لوگوں نے اس کفر اور ارتداد کے بعد توبہ کرلی اور صدق دل سے ایمان کی طرف واپس آ گئے اور نفس کی اصلاح کرلی اور قول کے بعد عمل کو درست کرلیا تو بے شک اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو قبول

دل میں ایمان نہیں، دل حق کی عداوت اور باطل کی محبت سے لبریز ہے، محض زبان سے یا کسی مصلحت سے توبہ کی جا رہی ہے یا توبہ کا وقت نکل چکا ہے اور وقت نکلنے کے بعد مجبور ہو کر توبہ کر رہا ہے، پہلا اس آیت یعنی لَنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ میں ایسے ہی لوگوں کا ذکر ہے۔ اور تیسرے وہ کہ جو تمام عمر کفر پر قائم رہے اور دوران حیات کفر میں ترقی کرتے رہے اور بالآخر بغیر توبہ کے مر گئے اس آخری آیت یعنی فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا الخ میں یہی لوگ مراد ہیں، پہلی آیت میں پہلی قسم کے لوگوں کا حکم بیان ہوا اور دوسری آیت میں دوسری قسم کے لوگوں کا اور اس آخری آیت میں تیسری قسم کے لوگوں کا کہ ایسے لوگ اگر بالفرض والتقدیر قیامت کے دن روئے زمین کے برابر سونا بھی عذاب کے بدلے میں دینا چاہیں تو وہ قبول نہ ہوگا اس لئے کہ آخرت میں ایمان اور اعمال صالحہ قبول ہوں گے مال زر کی وہاں کوئی حقیقت نہیں۔

الحمد للہ کہ آج بروز دو شنبہ ۲۰ شوال ۱۳۹۰ھ بوقت چاشت شہر [illegible] میں تیسرے پارہ کی تفسیر سے فراغت ہوئی۔

فللّٰه الحمد والمنة اوّلًا وآخرًا ووفقنا لاتمام التفسير وتكميله على ما تحب وترضى فانك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التواب الرحيم، آمين

[illegible]

تصدیق نامہ

مکتبۃ المعارف دارالعلوم الحسینیہ شہداد پور کی مطبوعہ
تفسیر معارف القرآن۔ مصنفہ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی
کی جلد اول از سورۃ الفاتحہ تا اختتام پارہ سوم کے متن قرآن کریم
کو بغور پڑھا۔ تصدیق کی جاتی ہے کہ اس کے متن قرآن کریم میں
کسی کمی بیشی یا اعراب کی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم۔

عبدالرحمٰن ... شہداد پور

۱۴ محرم ۱۴۲۶ھ

www.ahlehaq.org